منتخب التواریخ

جلد دوم وسوم

مؤلف

مُلّا عبدالقادر بدایونی

مترجم

ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

منتخب التواریخ

جلد دوم وسوم

مؤلف

مُلّا عبدالقادر بدایونی

مترجم

ڈاکٹر علیم اشرف خاں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔ 066 110

پہلی اشاعت	:	2008
تعداد	:	550
قیمت	:	-/555 روپے (سیٹ: -/890 روپے)
سلسلہ مطبوعات	:	1297

Muntakhabut Tawareekh, Vol.II & III

ISBN : 81-7587-233-0
81-7587-234-9(set)

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159
ای۔میل: urducoun@ndf.vsnl.net.in، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: گیتا آفسیٹ پرنٹرس، سی۔90، اوکھلا انڈسٹیریل ایریا، فیز۔I، نئی دہلی۔110 020

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے ان اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔

وادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہردلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم وفنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہل علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر علی جاوید

ڈائریکٹر

منتخب التواریخ

جلد دوم

فہرست

عرض مترجم

مجھے بے حد خوشی ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی کا شاہکار منتخب التواریخ کا اردو ترجمہ مکمل ہوا۔ مترجم کو یہ بھی احساس ہے کہ ترجمہ ایک نہایت دشوار اور پیچیدہ کام ہے جس میں روح مطلب کا مفقود ہونا عام بات ہے۔ بہرحال یہ ترجمہ ہے نہ کہ اصل تالیف، مزید برآں یہ کوئی صحیفۂ آسمانی نہیں ہے جو سہو، اشتباہات اور کمیوں سے مبرا ہو۔

مؤلف منتخب التواریخ کا نام عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی ہے جو شاعر تھے اور قادری تخلص کرتے تھے نیز فن تاریخ گوئی میں بھی ان کا منفرد مقام ہے۔ خاص طور سے یہ بات بھی نہایت اہم ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی عہد وسطیٰ کے معروف مورخ ابوالفضل کے معاصر ہیں۔ جن میں ایک کو دربار اکبری میں نہایت معتبر رتبہ ملا ہوا تھا اور دوسرا اپنی تمام کوششوں کے باوجود اس درجۂ اعتبار اور قربت کو حاصل نہ کر سکا تھا۔

ملا عبدالقادر بدایونی کی ولادت 947ہجری/ 1540-41 عیسوی میں ہوئی جس کے لیے شاہد منتخب التواریخ میں یوں آیا ہے:

''مجھے خدا نے 60سال کی عمر میں لڑکا عطا کیا جس کا نام محی الدین رکھا، جس کی ولادت پیاور میں ہوئی۔''

اسی طرح دوسری جگہ جلد اول میں عبدالقادر بدایونی رقم طراز ہیں:

''اس منتخب کا جامع 961 ہجری/ 54-1553 عیسوی میں 12 سال کی عمر میں اپنے والد کے ہمراہ تحصیل علم کے لیے سنبھل گیا تھا۔'' حالانکہ ان کی ولادت اور 12 سال کی عمر کے اعتبار سے سنین میں اختلاف موجود ہے۔

قرآن کی تعلیم سے متعلق یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میر سید محمد مکی سے قرآن پڑھا تھا جو سات قرأتوں کے قاری تھے۔ عربی کی تعلیم اپنے نانا مخدوم اشرف سے حاصل کی۔ بقول ملا عبدالقادر'' 961 ہجری قمری میں 12 سال کی عمر میں میاں حاتم سنبھلی سے ''قصیدۂ بردہ شریف' 'اور فقہ کی کتاب ''کنز'' کے بھی چند اسباق پڑھے تھے۔'' عبدالقادر بدایونی نے بہت سے علوم کے لیے ابوالفضل اور فیضی کے والد ملا مبارک ناگوری سے رجوع کیا اور باقاعدہ ان علوم کو اپنے استاد مبارک ناگوری سے حاصل کیا۔ میر غیاث الدین جو نقیب خاں کے نام سے پہچانے جاتے ہیں وہ ملا عبدالقادر بدایونی کے ہم سبق رہے تھے۔ اُن کی شادی 975 ہجری میں بدایوں میں ہوئی تھی۔ جلال خاں قورچی اور حکیم عین الملک کی سفارش پر ملا عبدالقادر بدایونی کو 981 ہجری میں بادشاہ وقت جلال الدین محمد اکبر کے دربار میں جگہ ملی اور بقول اکبر: ''یہ بدایونی عالم حاجی ابراہیم سرہندی کی خوب سرکوبی کرے گا۔'' کے مصداق دربار میں مامور ہوئے۔

قاضی علی کی سعی پیہم سے ملا عبدالقادر کو ہزار بیگھہ آراضی کی مدد معاش بھی دربار اکبری سے عطا ہوئی۔ دربار میں ملا عبدالقادر بدایونی کے ذمّے ترجمہ، تصنیف اور تالیف کے علاوہ کتابوں کا انتخاب بھی تفویض ہوا۔ انہیں دربار سے ''اتھربن وید'' کے ترجمے کا کام مِلا تھا مگر وہ اس کام میں کامیاب نہ ہوئے تو یہ کام بعد میں ابوالفیض فیضی کے سپرد کیا گیا۔ بدایونی کی دوسری کتاب ''الاحادیث'' ہے جس میں تیر اندازی اور جہاد کے سلسلے کی 60 حدیثیں جمع کی گئی ہیں۔ ایک کتاب ''تاریخ الفی'' کے لیے ایک ٹیم کا قیام کیا گیا جو سات افراد پر مشتمل تھی جس کے ایک رکن ملا عبدالقادر بدایونی بھی تھے۔ نقیب خاں اور بدایونی نے باہمی اشتراک سے ''مہابھارت'' کا ترجمہ ''رزم نامہ'' کے نام سے انجام دیا اور

''رامائن'' کو عبدالقادر نے 6 سال کی مدت میں انفرادی طور پر ترجمہ کیا تھا۔ ''جامع رشیدی'' کو ابوالفضل کے حکم اور مشورے سے ترجمہ کیا 'بحرالاسمار'' جو کشمیر کی تاریخ ہے اور اس کا ترجمہ سلطان زین العابدین نے کرایا تھا وہ بھی مکمل نہ ہوسکی تھی اس کی تکمیل بھی مُلّا عبدالقادر بدایونی نے کی۔ ''نجات الرشید'' کو بدایونی نے ذاتی طور سے اور ''انتخاب تاریخ کشمیر'' بھی بادشاہی حکم کے مطابق مکمل کیا۔ ''منتخب التواریخ'' ملا عبدالقادر بدایونی کی ضخیم اور 3 جلدوں پر مشتمل تاریخ ہے۔

ملا عبدالقادر بدایونی کو علوم معقول و منقول دونو ں میں کامل دستگاہ تھی۔ عربی و فارسی ان کی گھٹی میں تھی اور وہ فارسی کے صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز تھے۔ ملا کو نجوم، ریاضی اور ہندوستانی راگ اور راگنیوں سے بھی شغف تھا۔ تاریخ گوئی میں ان کا سکہ چلتا تھا اور انہیں عہد اکبری کے نابغۂ روزگار میں شمار کرنا حق شناسی کہی جائے گی۔ منتخب التواریخ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جلال الدین محمد اکبر کے 60 سالہ واقعات کو قلم بند کیا ہے۔ مزید اس کی سب سے عجیب خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنی حیات تک اس تالیف کا راز افشانہیں کیا۔ غالبًا قوی امکان ہے کہ اس میں جگہ جگہ پر جو حقیقت بیانی کا عنصر ہے وہ ملا عبدالقادر کے نزدیک مصلحت اندیشی اور دور بینی کے نظریے سے پوشیدہ رکھنا ہی زیادہ مناسب رہا ہوگا۔ مگر جب عہد جہانگیری میں اس تاریخ کا شہرہ ہوا تو جہانگیر نے ملا عبدالقادر بدایونی کے بچّوں کو بلا کر عتاب کیا اور باز پرس کی تو انھوں نے کہا کہ ہم تو چھوٹے اور ناسمجھ تھے۔ ہمیں اس کا کیا علم ہوسکتا ہے۔ مزید اُن بچو ں نے ایک مچلکہ لکھ کر جہانگیر کو دیا تھا کہ اگر یہ ہمارے پاس پائی گئی تو ہم سزا کے مستحق ہوں گے۔ منتخب التواریخ کا ماخذ مرزا نظام الدین احمد کی تاریخ ہے اور آخر کے دو سالوں کے حالات کو ملا عبدالقادر بدایونی نے خود جمع کیا ہے۔ ملا عبدالقادر بدایونی کو میر سید مہدی جونپوری کے داماد شیخ ابوالفتح گجراتی سے یک گونہ محبت وعقیدت کے باعث کچھ حضرات ملا عبدالقادر بدایونی پر مہدوی ہونے کا بھی الزام عائد کرتے ہیں۔

یہ امر بھی لائق توجہ ہے کہ عہد اکبری کے واقعات اور معاملات کو صحیح زاویۂ نگاہ سے

سمجھنے اور کوئی رائے قائم کرنے کے لیے جہاں اکبر نامہ از حد ضروری ہے وہیں منتخب التواریخ کے اندراجات کو بھی ''دیوانے کی بڑ'' کہہ کر خارج نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مترجم کوئی مورخ نہیں ہے جو منتخب التواریخ کی تاریخی اہمیت اور خصوصیات پر رائے زنی کرے، البتہ فارسی زبان و ادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے یہ کہہ سکتا ہے کہ جہاں تک اکبرنامے کا تعلق ہے تو ہمیں معلوم ہے کہ ابوالفضل کی تاریخ کو سرکاری اور درباری تاریخ کا درجہ ملا ہوا تھا۔ اس لیے اکبر بذات خود ابوالفضل کے اندراجات کو پڑھوا کر سنتا تھا اور حسب مرضی اس میں ردّ و بدل بھی کیا جاتا تھا اس لیے کسی حد تک اکبر نامہ کو ہم ایک ایسی تاریخ کہہ سکتے ہیں جس میں بادشاہ وقت کی رائے اور مرضی و مزاج کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ جب کہ ملا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ غیر سرکاری اور شخصی و ذاتی نوعیت کی تاریخ ہے جس میں ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کو دخل نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اگر بدایونی کو کسی بات سے اختلاف ہے تو شدید تنقید دیکھنے کو ملتی ہے جب کہ ابوالفضل کی تاریخ میں اس نوعیت کے اندراجات نہیں ہیں اور جو شاید ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ اسی لیے ہمیں عہد اکبری کے معاملات کو معروضی طریقے سے درک و استفہام کے لیے جہاں اکبرنامہ کی ضرورت ہے وہیں منتخب التواریخ بھی اہم اور نہایت لازمی محسوس ہوتی ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے وہ باتیں جنھیں ملا عبدالقادر بدیونی برملا نہیں کہہ سکتے تھے اسے انھوں نے خاتمہ میں نہایت اچھے پیرائے میں یوں بیان کر دیا ہے جو منتخب التواریخ کی سبب تالیف بھی کہی جاسکتی ہے۔ مُلّا رقم طراز ہیں:

''میرے اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرے کو صفحۂ قرطاس پر ثبت کر دیا ہے نہ معلوم میرے بعد آنے والے اس نقش زاغ پا کو دیکھ کر کیا کہتے اور اسے پڑھ کر کیا رائے قائم کرتے ہیں؟ بہرحال مجھے ڈر ہے کہ میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا ہے۔ لیکن مجھے توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کریں گے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرع مبین کی حمایت اور دین متین کی

طرفداری میں ہے۔

ارباب تصنیف و تالیف کا یہ وطیرہ ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتا کر کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف و تالیف کو منسوب کر کے اغراض و منافع کا راستہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روش کے خلاف کسی بھی طمع اور توقع کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک ہدیہ چھوڑنا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانے کے حالات و حقائق کے طالب ہوں، اس سے استفادہ کر سکیں۔

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانہ میں احکام دین میں جس طرح تغیر و تبدل کیا جا رہا ہے اس کی گذشتہ ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔ چنانچہ ہر وہ املاء و انشا کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کی بنیاد پر یا دوسرے فاسد اغراض کی خاطر حق پوشی سے کام لینے لگا ہے اور دین کو دنیا کے عوض فروخت کرنے، باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات و حسنات جتلانے میں بھی اسے ذرہ برابر خوف نہیں ہوتا۔ مجھے یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے میں جو کہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقائق ہیں، ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں، مزید اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہو جائے۔''

ظاہر ہے یہ سب بیانات ملا عبدالقادر بدایونی کی مصلحت کوشی، دور بینی اور دور اندیشی کی طرف واضح اور مثبت اشارے ہیں اور یہی منتخب التواریخ کی سب سے اہم اور جداگانہ اہمیت بھی ہے۔

اس ترجمے میں مترجم نے یہ خیال رکھا ہے کہ ہر باب کے اختتام پر ہی حواشی ثبت کر دئے جائیں جس سے قارئین کو کتاب کے آخر میں رجوع کرنے کی زحمت سے بچایا جا سکے۔

مترجم اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی سے بخوبی آشنا ہے۔ اس ترجمے میں کئی جگہ اشتباہات اور کمیاں ضرور رخ پا گئی ہوں گی۔ مزید برآں مترجم کی خواہش تھی کہ اس ترجمے کے ساتھ ساتھ اس ترجمے کے آخر میں اشاریۂ کتب، اشخاص اور اماکن بھی درج ہو جاتا مگر چونکہ ترجمہ پہلے ہی خاصا وقت لے چکا ہے اس لیے عملی طور پر اس کی گنجائش نہیں۔ مگر اس سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ ضرور ہوتا ہے۔ ممکن ہے دوسری اشاعت میں اس کام کو انجام دیا جا سکے۔ مزید اس کمی کو تفصیلی فہرست فراہم کر کے پُر کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ بہرحال جو بھی ہو سکا وہ پیش خدمت ہے۔ مترجم کی دلی خواہش ہے کہ صاحب علم و نظر اس ترجمے میں واقع کمیوں اور اشتباہات سے مترجم کو آگاہ فرمائیں گے تاکہ بعد میں اگر ممکن ہو تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔

آخر میں مترجم پر لازم ہے کہ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے ارباب حل و عقد کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرے۔ سب سے پہلے ادارہ ہذا کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر علی جاوید صاحب میرے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں جن کی ڈائریکٹرشپ میں فارسی کی ایک اہم تاریخی کتاب کا اردو ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ نیز محترمہ مسرت جہاں صاحب ریسرچ اسسٹنٹ کا شکریہ ادا کرنا بھی اس لئے لازمی ہے کہ ان کی انتھک کوششوں سے یہ کتاب منظر عام پر آ رہی ہے۔

8/ستمبر 2007ء

علیم اشرف خاں

ریڈر، شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی

دہلی 110007

سبب تصنیف منتخب التواریخ

فن تاریخ کی اہمیت

حمد ونعت کے بعد اس بات کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ ایک با وقعت علم اور لطیف فن کا نام ہے جو صاحبان علم وخبر کے لیے سرمایۂ عبرت اور وارثان خرد وہوش کے لیے ایک دوررس تجربے کا کام دیتا ہے۔ چنانچہ ارباب قلم نے ابتدائے آفرینش سے زمانۂ حال تک اس فن کے لیے زحمتیں برداشت کیں اور معتبر تصانیف اور مبسوط کتابیں وہ اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ یہ علمی ذخیرہ فن تاریخ کی اہمیت اور فضیلت پر معقول دلائل فراہم کرتا ہے۔

مطالعۂ تاریخ کے سلسلے میں ہم ان لوگوں کو کوئی اہمیت نہیں دینا چاہتے جو عقیدے کے کمزور اور شکوک و اوہام کے شکار ہیں اور جن کے متعلق یہ اندیشہ رہتا ہے کہ وہ تاریخ کے مطالعے سے کتاب و سنت کی سیدھی راہ سے منحرف ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ جو فطرتاً بے دینی کی طرف میلان رکھتے ہیں، تاریخ ہی کیا خود کلام الٰہی کا مطالعہ بھی ان کو ابدی شقاوت میں مبتلا کر دیتا ہے حالانکہ کلام پاک شفا اور رحمت ہے۔

"وانہ لم یھتدوا فیقولون ھذا افک قدیم"

ہمارا خطاب تو ان لوگوں سے ہے جو سلامتی طبع، حرمت ذہن اور شیوۂ انصاف سے مالا مال ہیں، جو لوگ منکر شرع ہیں، ہماری نگاہ میں وہ نہ تو قابل اعتبار ہیں نہ اہل بصیرت۔

امام بخاری اور قاضی بیضاوی سے لے کر اب تک کے اکثر علمائے حدیث وتفسیر اس علم کی تحریر و تدوین میں برابر دلچسپی رکھتے آئے ہیں اور انکے قول وعمل کو مشرق سے مغرب تک امت کے تمام گروہوں میں مستند تسلیم کیا گیا ہے۔ البتہ ایک مختصر سا گروہ ان بدعت پسند اشخاص کا ضرور رہا ہے جس نے اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے حقائق و واقعات میں تحریف و تخلیط سے کام لیا اور واقعات کی صحیح توجیہ اور تاویل کے بجائے ان کی نظر ہمیشہ صحابہ کرام کی معاصرانہ چشمک زنی پر رہی اور وہ صحابہ کے اس اختلاف کو بھی اپنے اختلافات پر محمول کر کے سادہ لوح اشخاص کے بہکانے اور اپنی دنیا بنانے کی فکر میں لگے رہے، یہ مشہور ہے:

اگر کوا کسی قوم کی رہبری کرنے لگے تو اس قوم کا ہلاک ہوجانا یقینی ہے'' وہ لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے نور یقین سے سرفراز کیا ہے اور توفیق الٰہی ان کے ہمراہ رہتی ہے، اس عالم کون و فساد میں رونما ہونے والے ہر سانحے اور حادثے کو صانع قدرت کی حکمت و قدرت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اگر ہم نظر تحقیق سے کام لیں تو یہ بات چھپی نہیں رہتی کہ یہ دنیا بذات خود ایک قدیم صحیفہ ہے جس کا آغاز و انجام ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے لیکن اس کا ہر ورق افراد انسانی پر گزرنے والے احوال وحوادثات کا مرقع اور ان لوگوں کے کارناموں کا مجموعہ ہے جن کے ہاتھوں میں مخلوق خدا کی باگ ڈور رہی ہے۔

منتخب التواریخ کس طرح لکھی گئی؟

علم تاریخ کی اسی اہمیت کے پیش نظر راقم سطور، داعی اسلام عبد القادر بن ملوک شاہ بدایونی نے کشمیر کی تاریخ کے انتخاب سے فارغ ہونے کے بعد شاہان دہلی کا تذکرہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ واضح رہے کہ کشمیر کی تاریخ کو اکبر بادشاہ کے حکم پر ہندوستان کے ایک فاضل شخص نے ہندی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ہندوستان کی تاریخ لکھنے کا مجھے ایک زمانے سے خیال تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابتدائے اسلام سے اس زمانے تک کے حالات اختصار کے ساتھ ضبط تحریر میں آجائیں تاکہ ایک ایسا تاریخی مجموعہ بن جائے جس میں ہر بادشاہ کا اجمالاً تذکرہ ہو جو صاحبان علم کے لیے ایک ''اشاریہ'' کا کام دے سکے۔ میری آرزو تو بس

یہی ہے کہ اس کے مطالعہ سے پڑھنے والے عبرت حاصل کریں اور ان کی نگاہیں اس سرائے فانی کے آئینے میں عالم ملکوت کی جھلک کو دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔

لیکن بدقسمتی سے میں اپنی مالی الجھنوں اور احباب و اقارب سے جدائی کے باعث ایسا پریشان رہا کہ یہ کام برابر ٹلتا ہی رہا یہاں تک کہ ایک مخیر دولت مند نے جس کو میرے ساتھ تعلق خاص تھا اور مجھے بھی اس سے وابستگی تھی، تاریخ نظامی کی تصنیف میں جو ایک ضخیم کتاب ہے دلچسپی لی۔ افسوس کہ اس مخلص دوست کا جلدی ہی انتقال ہوگیا۔ اسی زمانے میں مجھے کچھ سکون و یکسوئی حاصل ہوئی اور مذکورہ ارادہ از سرنو تازہ ہوگیا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اس اہم کام کو شروع کر دیا۔

مصنف کے ماخذ

پیش نظر تاریخ کی ترتیب و تدوین کے لیے میں نے شاہان ہند کے کچھ حالات تو تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی سے لیے ہیں اور کچھ اپنی معلومات کی بنا پر اضافے کیے ہیں۔ ان حالات کو لکھتے ہوئے میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے نہایت اختصار سے کام لیا اور عبارتی تکلفات اور استعارہ بازی میں اپنے قلم کو الجھنے نہیں دیا۔ اس مجموعے کا نام منتخب التواریخ رکھا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ تالیف جو صرف شاہان اسلام کے بقائے نام اور دنیا میں اپنی ایک یادگار چھوڑ جانے کے خیال سے مرتب کی گئی ہے، مؤلف کی مغفرت کا ذریعہ ثابت ہوگی۔

میری تمام تحریر تو راست بیانی پر مرکوز ہے پھر بھی اگر مجھ سے کوئی سہو رہ گیا ہو تو میں اللہ تعالی سے معافی کا امیدوار ہوں:

به بدگفتن زبان من مگر دان
زبان من ریان من مگر دان

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ

تخت نشینی

جلال الدین محمد اکبر بادشاہ بیرم خان خانخاناں کے مشورے اور تائید سے ماہ ربیع الاول کی دوسری تاریخ[1] 963ھ/1555ء میں باغ کلانور میں تخت نشین ہوا اور سرحد کے امراء کو اس نے تسلی آمیز فرامین بھیجے۔ دہلی میں بھی اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اکبر کی تاریخ جلوس ''از ہمہ شہزادہا اشرف'' سے نکلتی ہے ایک اور تاریخ ہے

جلال الدین محمد اکبر آن شہزادۂ دوران　　بتاریخ پدرمی گفت شاہنشاہ دورانم

''کام بخش'' بھی اس کے جلوس کا مادۂ تاریخ ہے۔

تخت نشینی سے پہلے ہی بیرم خان نے پیر محمد خاں شروانی کو جو ایک لشکر لے کر سکندر کا تعاقب کرتا ہوا سوالک کی پہاڑی میں موضع دھمیری تک پہنچ گیا تھا، کسی نہ کسی طرح بہانے بنا کر واپس بلالیا۔ غرض یہ تھی کہ ہمایوں کے مرنے کی خبر مشہور نہ ہونے پائے۔

ابو المعالی کی سرکشی

تخت نشینی کے موقعے پر امرائے دربار نے ابو المعالی کو بھی شرکت کے لیے بلایا، اس نے کہلوادیا کہ مجھے اس وقت کچھ پریشانی ہے اس لیے میں حاضر نہیں ہوسکتا۔ دوبارہ کہلوایا گیا

کہ ایک خاص مشورہ در پیش ہے اور اس میں تمہاری رائے نہایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اس مرتبہ بھی اس نے عذر معذرت کی اور کچھ ایسے مطالبات کیے جن کا پورا کرنا محال تھا۔ مصلحت وقت کے پیش نظر بیرم خان نے اس کے تمام مطالبے قبول کر لیے، لیکن جب وہ دربار میں آیا تو بیرم خان کے اشارے سے تو لک خان قورچی نے جو ایک طاقتور پہلوان تھا اسے پیچھے سے جکڑ لیا۔ وہ اسے جان سے ہی مار ڈالتا لیکن اکبر نے یہ کہہ کر کہ "پہلے ہی دن کسی بے گناہ کا خون مناسب نہیں"۔ اس کی جان بچائی البتہ اسے قید کر کے لاہور بھیج دیا۔

بیرم خان کا قصیدہ

ابو المعالی کاشغر کا رہنے والا اور سیدزادہ تھا۔ نہایت بہادر اور خوب صورت شخص تھا۔ اس سے ہمایوں کو بڑی محبت تھی چنانچہ اسے وہ اپنا بیٹا کہا کرتا تھا۔ بیرم خان نے صنعت توشیح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا قافیہ عظیم اور قدیم تھا۔ اس قصیدے میں چوبیس شعر تھے۔ خوبی یہ تھی کہ ہر شعر کے اول مصرعے کا ایک ایک حرف لیا جائے تو اس سے 'حضرت محمد ہمایوں بادشاہ' بن جاتا تھا اور اگر ہر شعر کے دوسرے مصرعے کا ایک ایک حرف لیں تو "شاہزادۂ جلال الدین محمد اکبر" نکلتا تھا۔ ہر شعر کے اول مصرعے کا آخری حرف جمع کر لیں تو "میرزا شاہ ابو المعالی" کا نام بن جاتا ہے۔ اگر اس کے قافیہ کے سارے "میم" جمع کر لیے جائیں تو 961ھ/ 1553ء یعنی قصیدے کو نظم کرنے کی تاریخ نکل آتی ہے۔

ابو المعالی کی جان بخشی

ابو المعالی کے متعلق یہ قصہ مشہور ہے کہ جس زمانے میں ہمایوں دوسری مرتبہ قندھار آیا ہوا تھا، ابو المعالی نے نشے کی حالت میں ایک خطیب کو قتل کر دیا۔ مقتول کے وارثوں نے بادشاہ کے پاس دعویٰ کیا۔ ہمایوں نے ابو المعالی کو طلب کیا۔ ابو المعالی نے سیاہ مخمل کی پوشاک زیب تن کر رکھی تھی جس کا استر سرخ تھا اور وہ تلوار جس سے اس نے قتل کیا تھا دامن میں چھپا رکھی تھی، مستی میں جھومتا ہوا دربار میں حاضر ہوا اور اس جرم سے صاف انکار کر دیا۔

بیرم خان نے اسی وقت یہ شعر پڑھا:

نشان شب روان دارد سر زلف پریشانش
دلیل روشن اینک چراغ زیر دامانش

ہمایوں کو یہ شعر بہت پسند آیا۔ جرم چونکہ بخوبی ثابت نہیں ہو سکا اس لیے ابو المعالی کی جان بچ گئی اور بیچارے مقتول کا خون رائیگاں گیا۔

ابو المعالی کا فرار

ابو المعالی لاہور کے قید خانے سے بھاگ کر کمال خان کھکر کے پاس چلا گیا۔ وہ علاقہ اس زمانے میں کمال خان کے چچا آدم کھکر کے قبضے میں تھا۔ اس نے ابو المعالی کی بڑی آؤ بھگت کی اور ایک بڑی فوج تیار کر کے کشمیر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔

ابو المعالی یہ فوج لے کر گیا۔ 965ھ/ 1557ء میں کشمیر کے حاکم غازی خان چک سے اس کا مقابلہ ہوا جس میں ابو المعالی بھیس بدل کر دیپالپور چلا گیا اور وہاں بہادر خان کے ایک افسر تولک نامی کے پاس پناہ لی۔ تولک نے اسے اپنے گھر میں چھپایا اور دونوں مل کر بغاوت کی سازش کر رہے تھے۔ بہادر خان اسی وقت سوار ہو کر آیا، تولک کو قتل کر دیا اور ابوالمعالی کو گرفتار کر کے بیرم خان کے پاس بھیج دیا۔ بیرم خان نے ابوالمعالی کو ولی بیگ ترکمان کی تحویل میں بھکر روانہ کر دیا۔ ولی بیگ راستے میں اس کو ایذا دیتا رہا اور وہاں سے گجرات روانہ کر دیا وہ علی قلی خان کے پاس بھاگ کر چلا گیا۔ بیرم خان نے علی قلی خاں کو فرمان بھیجا کہ ابوالمعالی آگرہ پہنچ گیا تو خود بیرم خاں کے بعض قضیے پیدا ہو گئے اور اکبر اس سے بدگمان ہو گیا۔ بیرم خان نے بادشاہ کی بدگمانی رفع کرنے کے لیے ابوالمعالی کو چند روز بیانہ کے قلعے میں قید کر دیا اور جب خود حج کے ارادے سے روانہ ہوا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ مگر کچھ دن بعد ہی ابوالمعالی اس کا ساتھ چھوڑ کر اکبر کے پاس لوٹ آیا لیکن غرور و تکبر کی وجہ سے اس نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے بادشاہ سے ملاقات کی۔ یہ بات اکبر کو بڑی ناگوار گزری اور اس نے ابوالمعالی کو دوبارہ قید کر دیا۔

سکندر سے مقابلہ

تخت نشینی کے بعد جب حکومت کا نظام بخوبی ترتیب پا گیا تو اکبر نے سکندر کے مقابلے پر پہاڑوں پر ایک فوج روانہ کی۔ سکندر اس فوج سے تین ماہ تک برابر لڑتا رہا، آخر شکست کھا کر مغلوب ہوگیا۔ اُنہی دنوں نگر کوٹ سے راجہ رام چندر، بادشاہ کی ملازمت میں حاضر ہوا۔

اکبر نے برسات کا موسم گزارنے کے بعد جالندھر کی طرف کوچ کیا اور وہاں پانچ ماہ تک مقیم رہا۔ جس وقت دہلی کے حاکم تردی بیگ خان کو ہمایوں کی وفات اور اکبر کے جلوس کی خبر ملی تو اس نے کامران کے بیٹے میرزا ابوالقاسم کو شاہی اسباب ولوازمات اور بہترین ہاتھی دے کر خواجہ سلطان علی وزیر خان اور اشرف خان میرمنشی کے ہمراہ بادشاہ کے حضور میں روانہ کر دیا تھا۔

اسی سال مرزا سلیمان نے ابراہیم مرزا کے ساتھ کابل کو فتح کرنے کا عزم کیا۔ قلعہ کابل میں منعم خان محصور ہوگیا۔ اس نے اس حملے کی اطلاع کے لیے اکبر کے پاس متعدد عرضیاں بھیجیں۔ اکبر نے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اور خضر خان ہزارہ کو بادشاہ بیگم اور دوسری بیگمات کو لانے کے لیے کابل روانہ کیا۔ ابھی یہ لوگ وہاں پہنچے نہ تھے کہ مرزا سلیمان نے قاضی نظام بدخشی کو جو ایک بڑے عالم تھے اور بعد میں انھیں قاضی کا خطاب ملا تھا اپنا سفیر بنا کر منعم خان کے پاس بھیجا اور صلح کے لیے یہ شرط پیش کی کہ منعم خان صرف ایک بار خطبے میں اس کا نام پڑھے۔ منعم خان نے مصلحتاً اس شرط کو قبول کر لیا اور مرزا سلیمان بھی اتنی بات پر خوش ہو کر بدخشاں کو واپس چلا گیا۔

پٹھانوں سے مقابلہ

جلوس کے پہلے ہی سال علی قلی خان کو خان زمان کا خطاب عطا ہوا اور اس نے سنبھل پر فوج کشی کر کے عدلی کے ایک امیر شادی خان پٹھان سے مقابلہ کیا۔ دونوں کے درمیان رہب ندی کے کنارے سخت لڑائی ہوئی جس میں خان زمان کو شکست ہوئی۔ وہ از سرِ نو جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھا کہ دہلی اٹاوہ اور آگرے سے اس کے نام خطوط آئے کہ

عدلی کی طرف سے ہمیو بقال ایک بڑی فوج لے کر یلغار کر رہا ہے اور اکثر علاقے فتح کرکے وہ دہلی کے قریب پہنچ چکا ہے۔

ھیمو کے حملے کی خبر سنتے ہی آگرہ سے سکندر خان ازبک، اٹاوہ سے قباخان گنگ، کالپی سے عبداللہ خان ازبک، بیانہ سے حیدر محمد خان اور بقیہ تمام امیر بھی اپنے اپنے علاقوں سے کوچ کرکے دہلی میں تردی بیگ خان کے پاس جمع ہوگئے۔ خان زمان کو جمنا کے دوسرے کنارے پر ہی ٹھہر جانا پڑا، اور وہ دہلی نہ پہنچ سکا۔

ہیمو بقال کا دہلی پر قبضہ

ہیمو سے مغل لشکر کا یہ مقابلہ تغلق آباد کے قریب ہوا۔ مغلوں کی کمان عبداللہ خان ازبک اور لعل خان بدخشی کے ہاتھ تھی۔ انھوں نے تیزی کے ساتھ ھیمو کی فوج پر حملہ کیا اسے پسپا کرکے ہوڈل اور پلول کے قصبوں تک اس کا تعاقب کیا اور کافی مال غنیمت اس سے چھین لیا۔

اس موقے پر ہمیو بہت سے ساتھیوں سمیت اپنے لشکر سے کٹ گیا تھا، اس نازک وقت میں اسے دور کی سوجھی اس نے مغلوں کو سنانے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ اس کی مدد کے لیے الور سے حاجی خان بڑی فوج لے کر آ پہنچا ہے اور اسی وقت اچانک تردی بیگ خان پر حملہ کر دیا۔ اس وقت تردی بیگ خان کے پاس تھوڑی سی جمیعت تھی اس لیے ایک ہی حملہ میں ھیمو نے تردی بیگ خان کو شکست دے کر بھگا دیا۔ لیکن اس ڈر سے ان کا تعاقب نہیں کیا کہ کہیں مغل دھوکہ دے کر دوبارہ پلٹ نہ پڑیں۔ مغلوں کے وہ امیر جو ھیمو کے میمنہ کے تعاقب میں دور تک نکل گئے تھے جب شام کے وقت لوٹ کر آئے تو انھیں بڑی حیرت ہوئی کیونکہ ان کے چھوڑے ہوئے مورچوں پر ھیمو کی فوج قبضہ کیے ہوئے نظر آ رہی ہے تھی۔ یہ رنگ دیکھ کر وہ آہستہ آہستہ دہلی سے نکل کر بھاگ گئے۔ خان زمان بھی میرٹھ کے راستے کوچ کرکے ان لوگوں سے سرہند میں آکر مل گیا۔

جب اکبر کو دہلی کی شکست کا حال معلوم ہوا تو اس نے سکندر کے مقابلے کے لیے خضر خان خواجہ کو مقرر کیا۔ اکبر کی پھوپھی گلبدن بیگم اسی خضر خان کے نکاح میں تھی اور خود

ھیمو کی سرکوبی کے لیے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ جس وقت اس نے سرہند میں قیام کیا تو ھیمو سے شکست کھا کر آنے والے امیر شاہی لشکر سے آ کر مل گئے۔

تردی بیگ کا قتل

خانخانان بیرم خان کو تردی بیگ خان سے سابقہ رنجش تھی اور وہ اسے دکھاوے کے لیے ''طوقان'' (بڑا بھائی) کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اسے موقع ملا تو اس نے اکبر کو یہ یاد دلایا کہ اس شکست کا ذمہ دار تردی بیگ ہے۔ تصدیق کے لیے خان زمان اوردوسرے امیروں سے شہادت بھی دلوادی اور بادشاہ کو مجبور کر کے اس کے قتل کی اجازت لے لی، پھر سیر کے بہانے تردی بیگ خان کے کیمپ میں جا کر اس کو اپنے خیمے میں بلا لایا۔ جب مغرب کا وقت ہوا تو طہارت کا بہانہ کر کے وہاں سے ٹل گیا اور اپنے آدمیوں کو جنھیں اس نے اس غرض سے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا، اشارہ کردیا ان لوگوں نے خیمے میں داخل ہو کر تردی بیگ کو قتل کر دیا۔ قتل کے دوسرے دن خانخاناں دربار میں حاضر نہ ہوا۔ اس نے اسی الزام میں تردی بیگ کے داماد خنجر بیگ اور خواجہ سلطان علی میر منشی کو بھی گرفتار کر لیا تھا لیکن یہ لوگ کچھ دن بعد رہا ہو گئے تھے۔

پانی پت میں فوجوں کی آمد

اس عرصہ میں ہیمو نے دہلی میں بڑی قوت پیدا کرلی اور اپنا خطاب راجہ بکر ماجیت رکھ کر خود مختار حکمراں بن بیٹھا۔ اسلامی قوانین کو منسوخ کر دیا۔ جب اسے اکبر کے کوچ کی اطلاع ملی تو ایک ہزار پانچ سو جنگی ہاتھی کافی مال و دولت اور کثیر لشکر لے کر پانی پت پہنچ گیا۔ اس کا توپ خانہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میدان میں آ چکا تھا۔ ادھر اکبر کے بھی چند امیر خان زمان، اسکندر خان وغیرہ بھی لشکر سے آگے نکل کر پانی پت پہنچ چکے تھے انھوں نے پہل کر کے ہیمو کے ہراول پر حملہ کردیا اور تھوڑی سی لڑائی کے بعد اس کا توپ خانہ چھین لیا۔

ہیمو نے اپنے لشکر کے پٹھانوں کو جن کا سردار شادی خان میواتی تھا مناصب اور جاگیروں میں اضافے کا لالچ دے کر اور ان کو کافی روپیہ اور انعام و اکرام دے کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا، لیکن یہ پٹھان ہیمو کی حرکتوں سے سخت بیزار ہو چکے تھے اور دل سے اس کی شکست اور بربادی کے خواہاں تھے۔ بہر حال ہیمو اپنی کثیر فوج کو لے کر ہوائی نامی ایک ہاتھی پر سوار ہوا اور راتوں رات کوچ کرتے ہوئے پانی پت پیچھے چھوڑ کر موضع کھرسندہ میں جا کر پڑاؤ ڈال دیا۔

پانی پت کی دوسری لڑائی

دس محرم 964ھ/ 1556ء جمعہ کے دن صبح خان زمان اور سکندر خان ہراول کے امیروں سے اس کا مقابلہ ہوا۔ اکبر بھی شاہی لشکر کے ساتھ معرکہ گاہ سے تین کوس کے فاصلے پر پہنچ چکا تھا اور وہاں سے لشکر کے امراء کو مدد کر رہا تھا۔ ھیمو کے ساتھ جو امیر تھے وہ سب کے سب اس سے برہم اور بد دل ہو چکے تھے۔ ان کے اس رویہ کی وجہ سے ہیمو صرف ہاتھیوں کی لڑائی پر بھروسہ کیے ہوا تھا، چنانچہ اس نے پہلے حملے ہی میں ہاتھیوں کا ایک بڑا غول لے کر اکبری فوج پر حملہ کر دیا یہ حملہ بڑا سخت اور ہولناک تھا شاہی لشکر میں افراتفری سی پھیل گئی، لیکن جلد ہی اکبر کے امیروں نے اپنی اپنی صفوں کو سنبھال کر منظم طریقے سے تیروں کی بوچھار کردی اور ہیمو کے ہاتھی بوکھلا گئے۔ اسی حملے میں جب ہیمو فوری طور پر کامیاب نہ ہوسکا تو اس نے اپنا رخ بدل دیااور ہاتھیوں کو دوسرے حملے پر جہاں خان زمان کماندار تھا، پہنچا دیا۔ خان زمان نے بھی اس کی ہاتھی سوار فوج کو تیروں کی زد پر رکھ لیا۔اس موقعے پر ہیمو باؤلے کتے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑ رہا تھا اور چلا رہا تھا کبھی کچھ منتر پڑھنے لگتا اور کبھی مارو مارو کا غل مچانے لگ جاتا تھا۔اسی دوران ایک تیر ایسا آ کر لگا کہ وہ بیہوش ہوکر گر پڑااور اس کی فوج بد حواس ہوکر منتشر ہوگئی۔ شادی خان میواتی بھی اس معرکہ میں مارا گیا۔

مغل فوج کی کامیابی

ھیمو کی فوج کے پسپا ہوتے ہی شاہ قلی خان محرم یلغار کرتا ہوا ہیمو کے ہاتھی پر حملہ آور ہوا۔فیل بان نے کہا مجھے مار کر کیا کرو گے.تمہارا دشمن ہیمو اسی ہاتھی پر عماری میں پڑا ہوا ہے۔ اُسی بے ہوشی کی حالت میں ہیمو کو گرفتار کر کے اکبر کے پاس پیش کیا گیا۔ شیخ گدائی کنبوہ اور دوسرے امرا نے عرض کیا'' چونکہ یہ حضور کا پہلا جہاد ہے اس لیے آپ بھی اس پر اپنی تلوار آزمائیں'' اکبر نے ان کو جواب دیا'' یہ مردہ پڑا ہوا ہے اگر اس میں کچھ جان ہوتی تو میں تلوار آزماتا''۔ آخر خانخاناں نے سب سے پہلے ہیمو پر تلوار چلائی۔ اس کے بعد شیخ گدائی نے پھر دوسروں نے بھی اس فرض کو ادا کیا اور اس بد بخت کی لاش کے چیتھڑے اڑ گئے۔

اکبری فوج کو پانی پت کی اس فتح کے نتیجے میں ایک ہزار پانچ سو ہاتھی اور بے شمار خزانہ اور کافی مال و اسباب غنیمت میں ملا۔ ہیمو نے شکست کھائی اور فوج کے تعاقب میں پیر محمد خان اور مہدی قاسم خان کا داماد حسین خان روانہ ہوئے ہیمو کی بیوی ایک بڑا خزانہ ہاتھیوں پر لدوا کر پہلے ہی نکل بھاگی تھی۔ پیچھا کرنے والے دستوں نے اس کو الور کے آگے جا کر گھیر لیا اور وہ خزانہ چھوڑ کر بجوارہ اور کوا کی پہاڑی میں جان بچا کر بھاگ گئی۔ اس کا خزانہ کچھ تو جاٹوں نے لوٹ لیا اور کچھ مغل لشکریوں کے ہاتھ آیا۔ پھر بھی وہ اتنا تھا کہ سپاہیوں نے ڈھالوں میں بھر بھر کر اس کو بانٹ لیا۔ جس راستے سے ہیمو کی بیوی گزری تھی اس پر اشرفیاں اور سونے کی اینٹیں اتنی گری تھیں کہ ایک عرصے تک وہ راہ گیروں کو ملتی رہیں۔ یہ وہ خزانہ تھا جو شیر شاہ کے زمانے سے عدلی کے عہد تک جمع ہوتا رہا تھا زمانے کے ہاتھوں وہ اس طرح تباہ و تاراج ہوا۔

فتح کے دوسرے دن اکبر پانی پت پہنچا اور وہاں فتح کی خوشی میں پھولوں کا ایک مینار لگوایا۔ پھر وہاں سے کوچ کر کے بڑے جاہ و حشم کے ساتھ دہلی میں داخل ہوا منبر پر از سر نو اس کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ بادشاہ ایک مہینے تک دہلی میں مقیم رہا اور وہاں سے اس نے آگرہ اور سنبھل کی طرف امرا کو روانہ کیا۔ دہلی کے قیام ہی میں یہ خبر ملی کہ لاہور

سے بیس کوس پر موضع چمپاری میں اکبری امیر خضر خان کو سکندر نے حملہ کر کے شکست دے دی اور وہ بھاگ کر لاہور آ گیا ہے اس پر اکبر نے دوبارہ پنجاب کا رخ کیا، جب جالندھر پہنچا تو سکندر پھر کوہ سوالک کی طرف بھاگ گیا۔ اکبر نے دیسوڑہ اور دھمیری تک اس کا پیچھا کیا۔

یہ واقعات ابتدائے جلوس سے متعلق تھے۔

سکندر افغان کی اطاعت

سکندر برابر اکبر کی فوج سے برسر پیکار تھا اسی سال وہ قلعۂ مانکوٹ میں محصور ہو گیا۔ مغل لشکر روزانہ اس پر حملے کر رہا تھا۔ ان حملوں سے اس کی جان عذاب میں آ گئی تھی۔ اکبری فوج میں سے مہدی قاسم خان کے داماد محمد حسین خان نے ان معرکوں میں بڑی جاں نثاری اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کا بھائی حسن بیگ بھی اسی لڑائی میں مارا گیا تھا۔ اکبر نے حسین خان کے دلیرانہ کارناموں کی بڑی قدر کی اس کو روز بہ روز اونچے درجوں پر ترقی ملتی رہی اور اچھی سے اچھی جاگیریں بھی اُسے ملتی گئیں آخر میں لاہور کی حکومت پر اسے فائز کیا گیا۔

جب محاصرہ طویل ہو گیا اور قلعہ بند فوج غلے کی کمی کی وجہ سے بھوکوں مرنے لگی تو سکندر کے رفیق کھسکنے لگے، چنانچہ سید محمود بارہہ وغیرہ سکندر سے ٹوٹ کر اکبر سے آ کر مل گئے۔ یہ صورت حال دیکھ کر سکندر نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی اور اپنے بیٹے عبد الرحمٰن کو غازی خان سور کے ہمراہ اتکہ خان اور پیر محمد خان کو وسیلہ بنا کر بادشاہ کی خدمت میں بھیجا۔ یہ سفارت 27 رمضان 964ھ/1556ء کو بارگاہ شاہی میں باریاب ہوئی۔ اس نے بہت سے ہاتھی نذر گزارے اور قلعہ بھی سپرد کر دیا۔

اکبر نے شرائط صلح کے متعلق جو فرمان لکھوایا تھا اس کی رو سے جونپور عارضی طور پر سکندر کی جاگیر میں اس شرط پر دیا گیا تھا کہ جب وہ دوسرے اور علاقوں کو فتح کرے تو جونپور پر خان زمان اس کا قائم مقام ہو جائے گا۔ اس فرمان کے بدلے سکندر پہاڑوں کے راستے سے کوچ کرتے ہوئے جونپور پہنچ گیا۔ بعد میں جب خان زمان نے جونپور پر قبضہ کر لیا تو حسب

فرمان سکندر نے گوڑ پر لشکر کشی کی لیکن وہاں اسے ایسے حادثوں سے دوچار ہونا پڑا کہ گوڑ تو اس کے ہاتھ کیا آتا چند دن بھی نہ گزرے تھے کہ خود وہ گور کی آغوش میں چلا گیا۔ اکبر نے جس زمانے میں قلعہ مانکوٹ کا محاصرہ کر رکھا تھا، محمد قلی خان اور دوسرے چند امرا کابل جا کر بادشاہ بیگم اور خانوادۂ شاہی کے دوسرے افراد و مستورات کو اپنے ساتھ لشکر میں لے آئے تھے۔

اکبر کی لاہور کو روانگی

بادشاہ نے دوسری شوال 964ھ/ 1556ء کو لاہور کا رخ کیا اسی سفر کے دوران خانخاناں اور اتکہ خان میں بدگمانی اور شکر رنجی پیدا ہوگئی۔ قصہ یہ ہوا کہ کسی منزل میں شاہی ہاتھی دوڑتے ہوئے خان خاناں کے سراپردہ پر سے گزر کیا خانخاناں کو شبہ ہوا کہ یہ حرکت اتکہ خان نے قصداً کی ہے۔ جب لشکر لاہور پہنچا تو اتکہ خان اپنے تمام بیٹوں کو لے کر خانخاناں کے پاس آیا اور کلام پاک کی قسم کھا کر اس نے اپنی بریت ظاہر کی اور خان خاناں کی بدگمانی رفع ہوگئی۔

اسی سال ملا عبد اللہ سلطان پوری کے توسط سے سلطان آدم کھکر لاہور آکر اکبر کے حضور میں باریاب ہوا۔ لاہور میں خانخاناں کے ساتھ اس کا بڑا یارانہ ہوگیا اور اکبر نے اس قضیے کا فیصلہ کر دیا جو سلطان آدم اور اس کے بھتیجے کمال خان کے مابین جاری تھا۔ اسی طرح سلطان آدم بڑی عزت و احترام کے ساتھ اپنے وطن کو لوٹ گیا۔

دہلی میں داخلہ

برسات کا موسم ختم ہونے پر اکبر نے دہلی کی طرف کوچ کیا۔ جالندھر میں جب قیام ہوا تو ہمایوں کی بھانجی اور میرزا نور الدین محمد کی لڑکی سلیمہ سلطان بیگم کا نکاح خان خانان بیرم خان کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے ہوا اور ایک بڑا جشن شادی کی تقریب میں منعقد کیا گیا۔ دونوں طرف سے دل کھول کر روپے لٹائے گئے۔

25 جمادی الثانی 965ھ/1557ء کو اکبر دہلی میں داخل ہوا۔ اس زمانہ میں خان

خانان ہر ہفتے دو مرتبہ دربار شاہی میں حاضر ہو کر دوسرے امراء کے تعاون سے مشورے اور انتظامی معاملات اور مقدمات کے فیصلے کیا کرتا تھا۔

خان زمان اور شاہم بیگ کا معاملہ

اس زمانہ میں جو واقعات پیش آئے ان میں شاہم بیگ کے ساتھ خان زمانہ کی عشق بازی کا قصہ نہایت دلچسپ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ ہمایوں بادشاہ کے قورچیوں کے عملے میں دو خوبصورت اور خوش مزاج لڑکے شامل تھے ایک کا نام خوشحال بیگ اور دوسرے کا نام شاہم بیگ تھا۔ شاہم بیگ طہماسپ کے ساربان کا لڑکا تھا۔ یہ دونوں لڑکے نہ صرف خوش خلق و پسندیدہ اطوار تھے بلکہ دلیری اور بہادری میں بھی ہم چشموں میں امتیاز رکھتے تھے۔

اس زمانہ میں جب کہ خان زمان کا سنبھل پر تقرر نہیں ہوا تھا اسے شاہم بیگ سے بڑا تعلق خاطر پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حال شاعر کے اس مفہوم سے مختلف نہ تھا:

نشان برتختۂ ہستی نبود از عالم و آدم
کہ جان در مکتب شوق از تمنائی تو میزد دم
کہ دارد این چنین عیشی کہ در عشق تو من دارم
شرابم خون کبابم دل ندیمم در دلم غم

ہمایوں کے انتقال کے بعد جب خان زمان اکبر بادشاہ کی خدمت سے وابستہ ہوا تو اس نے شاہم بیگ سے اس بات کا قول و قرار لیا کہ وہ شاہی ملازمت ترک کر کے اس کے پاس آجائے گا۔ چنانچہ اس نے لکھنؤ سے اپنے چند آدمی دہلی بھیجے کہ وہ شاہم بیگ کو بھگا کر لے آئیں۔

ماوراء النہر کے دوسرے عیاش امیروں کی طرح جو نوجوانوں کو شاہی مراتب کا لالچ دے کر بہار کا موسم عیش و نشاط میں گزارا کرتے ہیں۔ خان زمان بھی شاہم کی خاطر داری اور خوشامد میں لگا رہتا تھا اور اسے ''بادشاہ'' کہہ کر خطاب کرتا تھا۔ اس کے عشق میں اپنے آپ کو بھول گیا تھا اور اکثر اوقات اس کی رکاب پکڑ کر خدمت گاروں کی طرح اس کی

خدمت میں کھڑا رہتا تھا۔

میں (مؤلف منتخب التواریخ) نے ابو الغیث بخاری دہلوی کی زبان سے جن سے شاہم بیگ کو بڑی عقیدت تھی، یہ بھی سنا ہے کہ جس زمانہ میں شاہم بیگ لشکر شاہی سے جون پور گیا تھا، باجماعت نماز، درود خوانی اور تلاوت کلام پاک کا بڑا پابند تھا۔ ہمیشہ طہارت و پاکی کا خیال رکھتا تھا اور برائیوں کی طرف اس کا میلان نہ تھا، شاہم بیگ کی خاطر خان زمان بھی بڑا متقی اور پرہیز گار بن گیا۔ اپنے لشکر میں بھی اس نے غیر شرعی باتوں کی روک تھام کے لیے محتسبوں کا تقرر کردیا تھا اور شاہم بیگ کی تعلیم کے لیے میر سید محمد مکی کو جو سات قرأتوں کے قاری تھے، مقرر کیا تھا۔ راقم نے بھی سلیم شاہ کے عہد میں سنبھل میں مکی صاحب کے سامنے اپنی قرأت کی اصلاح کی تھی۔ غرض خان زمان اس خوبرو لڑکے کی ہرطرح خاطر داری کرتا رہتا تھا۔ لڑکوں کی پاک بازی کم سنی تک ہی رہتی ہے، شاہم بیگ کے چال چلن بھی بہت جلد بگڑ گئے۔

آرام جان

آرام جان نامی ایک حسین اور دلربا طوائف تھی۔ شاہم بیگ کا اس پر دل آگیا اور وہ بھی دل و جان سے اس نوجوان پر فریفتہ ہوگئی۔ یہ طوائف پہلے سے خان زمان کے نکاح میں تھی۔ اس نے شاہم بیگ کو جب اس کی طرف مائل پایا تو اس طوائف کو اس کے حوالے کردیا۔ شاہم بیگ نے چند دن اس کے ساتھ خوب رنگ رلیاں منائیں۔ جب جی بھر گیا تو اسے اپنے ایک جانی دوست عبد الرحمٰن بن مؤید بیگ کو بخش دیا۔

عشق بازی کے یہ قصے جب بادشاہ سلامت کے سننے میں آئے تو غیرتِ سلطانی جوش میں آگئی اور شاہم بیگ کی حاضری کے فرمان آگرے اور دہلی سے جونپور پہنچے۔ اس علاقہ کے جاگیرداروں کے نام بھی فرمان صادر ہوا کہ اگر خان زمان تعمیل حکم میں پس و پیش کرے تو سب مل کر اس کو سزا دیں۔

خان زمان نے اپنے ایک معتمد آدمی برج علی کو اپنے قصوروں کی تلافی کے خیال سے

دہلی روانہ کیا۔ برج علی سب سے پہلے خان خانان کے نائب بیرمحمد خان کے مکان پر گیا۔ برج علی پہنچا تو وہ ایک برج میں بیٹھا ہوا تھا۔ برج علی نے خان زمان کے پیغام سے مطلع کیا۔ غالبًا باتوں باتوں میں کوئی ناگواری پیدا ہوگئی اور بیرمحمد خان نے برج علی کی کسی سخت بات پر اسے اس برج سے اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ اس صدمہ سے وہ بے چارہ مٹی کا ڈھیر بن گیا اور اس ظالم نے سنگ دلی کے ساتھ قہقہہ لگا کر کہا ''یہ کمینہ اب اسم بامسمّٰی بنا ہے''

خان زمان کو جب اس حادثہ کی اطلاع ملی تو اس نے جدائی کا پتھر اپنے سینے پر رکھ کر شاہم بیگ کو سرہر پور کے پرگنے میں بھیج دیا، یہ پرگنہ جونپور سے اٹھارہ کوس پر اس کے دوست عبد الرحمٰن بیگ کی جاگیر میں تھا۔ مقصد یہ تھا کہ شاہم بیگ کچھ عرصہ تک وہاں سیر و شکار میں مصروف رہے، جب بادشاہ سلامت کا غصہ ٹھنڈا پڑے تو وہ لوٹ آئے۔

شاہم بیگ کا انجام

سرہر پور میں شاہم بیگ کی عبد الرحمٰن بیگ کے ساتھ بڑی اچھی گزر رہی تھی۔ آرام دہ و خوبصورت مکان تھا جس کے ساتھ سرسبز و شاداب باغ جو خوش منظر تالاب کے کنارے تھا۔ دونوں دوست عیش و نشاط کے جلسے مناتے رہتے تھے۔ ایک دن جب کہ شراب و کباب کی مجلس جمی ہوئی تھی:

سرود و عاشقی و می پرستی
سبب شد ہر سہ چیز بہر مستی

عالم مستی میں شاہم بیگ نے عبد الرحمٰن بیگ سے آرام جان کو بلانے کا مطالبہ کیا۔ اس نے نکاح کر لینے کا بہانہ کر کے اس کی فرمائش ٹال دی۔ اس بات سے شاہم بیگ کو بڑا رنج ہوا اور دونوں کی دوستی دیکھتے ہی دیکھتے دشمنی میں تبدیل ہوگئی اور شاہم بیگ نے غرور اور مستی کی وجہ سے آدمیوں کو حکم دیا کہ عبد الرحمٰن کو گرفتار کرلیں، پھر اس نے اس گھمنڈ میں کہ آرام جان پہلے اس کی تھی، عبد الرحمٰن کے مکان سے اپنے پاس بلوالیا اور اس کے ساتھ خوش وقتی میں مشغول ہوگیا۔

عبد الرحمٰن کے چھوٹے بھائی مؤید بیگ کو اس کی اس حرکت پر بڑی غیرت آئی اور وہ ایک جمیعت لے کر اس بالاخانہ کی طرف گیا جس میں شاہم بیگ آرام جان کو ساتھ لیے ہوئے تھا۔ شاہم بیگ بھی مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں باقاعدہ جنگ چھڑ گئی شاہم بیگ کو اس نشہ کی حالت میں ایک تیر ایسا آکر لگا کہ وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

خان زمان کی معرکہ آرائی

ان چند سالوں میں خان زمان نے باوجود مختصر جمیعت کے افغانوں کی ایک بھاری فوج سے دلیرانہ جنگ کر کے فتح حاصل کی۔ اس سلسلے کی اس نے جتنی لڑائیاں لڑیں وہ بلا شبہ اس کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔ انہی لڑائیوں میں سے لکھنوٴ کی جنگ بھی ہے جس میں حسن خان بچکوتی بیس ہزار سپاہیوں کو لے کر حملہ آور ہوا تھا۔ خان زمان کے پاس تین چار ہزار سے زیادہ کی جمیعت نہیں تھی۔

جب غنیم نے کردتی ندی کو پار کر کے بہادر خان کی فوج پر حملہ کر دیا تو خان زمان کھانے کے لیے دسترخوان پر بیٹھ گیا۔ جب لوگوں نے آکر کہا کہ غنیم سر پر آ پہنچا ہے تو اس نے شطرنج لانے کا حکم دیا اور بڑے اطمینان سے شطرنج کھیلتا رہا۔ پھر لوگ دوڑتے ہوئے آئے اور کہا کہ دشمن نے آدمیوں کو پسپا کر دیا ہے تو اس نے ہتھ . منگائے۔ جس وقت دشمن کے سپاہی سراپردوں کو لوٹتے پھر رہے تھے اور اس کا سارا لشکر منتشر ہو چکا تھا خان زمان نے بہادر خان کو رخصت کر دیا اور خود تھوڑے سے آدمیوں کو ساتھ لے کر نقارہ بجاتے ہوئے دشمن کے مقابلے پر آیا اور ایسا دلیرانہ حملہ کیا کہ غنیم کے پیر اکھڑ گئے اور پٹھان بھاگ نکلے۔خان زمان نے سات آٹھ کوس تک اس کا پیچھا کیا اور بہت سارے پٹھانوں کو تہہ تیغ کر دیا۔

لکھنوٴ کی جنگ کی طرح جونپور کی لڑائی بھی اس کی بہادری کا ایک کارنامہ ہے۔ بنگالہ میں کوریہ نے سلطان بہادر خطاب رکھ کر اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا، پھر وہ بنگال سے تیس چالیس ہزار سوار لے کر جونپور پر حملہ آور ہوا۔ مقابلے میں خان زمان کا

سارا لشکر تباہ و برباد ہوگیا۔ جس وقت غنیم پہنچا ہے خان زمان دسترخوان سے اٹھ کر بس گیا ہی تھا۔ حملہ آوروں نے دسترخوان کو اسی طرح جما ہوا پایا تو بھوکوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور سب کچھ لوٹ لیا۔ پھر خان زمان ایک مختصر سی جمعیت اکٹھی کر کے پٹھانوں پر بلائے ناگہانی کی طرح ٹوٹ پڑا اور انھیں شکست دے کر بھگا دیا۔ بہت سے پٹھان قتل اور بہت سے گرفتار ہوئے۔ اس قدر مال غنیمت مغل لشکریوں کے ہاتھ لگا کہ انھیں اور کسی چیز کی آرزو نہ رہی۔

سچ تو یہ ہے کہ بادشاہ کے اقبال سے اس نے اور اس کے بھائی نے اپنی فوج کے ساتھ مشرقی ہندوستان میں جیسی فتوحات حاصل کیں وہ کم ہی کسی کو نصیب ہوئی ہونگی۔ اگر ان کا دامن معصیت سے داغدار نہ ہوتا تو کیا عجب کہ شاہی اعزاز سے نوازے جاتے۔ اپنی سرکشی کی وجہ سے انھوں نے اپنے سارے کارنامے خاک میں ملا دیے۔ ان کا باقی حال مناسب موقعے پر بیان کیا جائے گا۔

اسی سال خان خانان نے خواجہ کلاں بیگ کے لڑکے مصاحب بیگ کو جو نہایت شر پسند اور ظالم تھا، قتل کرا دیا۔

اکبر کا آگرے میں داخلہ

17 محرم 965ھ/1557ء کو جلوس کے تیسرے سال، اکبر کی شاہانہ سواری آگرے میں داخل ہوئی۔ یہی وہ سال ہے جس میں پیر محمد خان کو عروج بھی نصیب ہوا اور سال بھر کے اندر زوال بھی آ گیا۔ پیر محمد خان پہلے صرف مُلّا تھا۔ مُلّا گیری سے وہ امارت کے اس درجہ پر پہنچا کہ تمام امور مملکت میں وہ خانخاناں کی نیابت کرنے لگا تمام امرا اس کے دروازے پر حاضر ہوا کرتے تھے اور بہت کم لوگوں کو باریابی کا موقع ملتا تھا۔

پیر محمد خان کا عروج و زوال

اس کے جاہ و حشم کا یہ حال تھا کہ جس وقت لشکر دہلی سے آگرہ جا رہا تھا تو اثنائے راہ میں

خان خانان پیر محمد خان کے ساتھ شکار کے لیے نکل گیا۔ خان خانان کو جب بھوک لگی تو اس نے اپنے رکاب داروں سے پوچھا کہ ہمارے ہمراہ کچھ کھانے کا سامان بھی ہے؟ پیر محمد خان نے عرض کیا: ''اگر آپ یہاں ٹھہر جائیں تو جو کچھ میرے ساتھ ہے خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ خانخانان اپنی جمعیت کے ساتھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ پیر محمد خان رکاب خانہ سے اس وقت تین سو شربت کے پیالے اور سات سو کھانے کی رکابیاں دسترخوان پر چنی گئیں۔ اس کے اس ٹھاٹ باٹ کو دیکھ کر خان خانان حیران رہ گیا بہ ظاہر تو کچھ نہ کہہ سکا لیکن دل ہی میں بہت پیچ و تاب کھاتا رہا، اسی وقت سے خان خانان کا دل اس سے پھر گیا۔

آگرہ پہنچنے کے بعد پیر محمد خان کچھ دن تک بیماری میں مبتلا رہا۔ ایک دن خان خانان اس کی عیادت کے لیے گیا تو اس کے ایک غلام نے اسے داخل ہونے سے روک دیا کیوں کہ پیر محمد خان نے امرا وغیرہ کے داخلے پر پابندی لگا رکھی تھی اور خان خانان سے کہا جب تک اجازت آجائے آپ تشریف رکھیے۔ خان خانان کے لیے یہ بات جلتے پر تیل سے کم نہ تھی۔ جب پیر محمد خان کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ مرض کی نقاہت کے باوجود دوڑا ہوا آیا اور خان خانان سے معافی چاہی کہ ''دربان نے آپ کو پہچانا نہیں''۔ خان خانان نے اس کے جواب میں صرف ایک معنی خیز جملہ کہا: '' اور تم نے بھی نہیں۔'' اس واقعہ کے باوجود پیر محمد خان کے دربانوں نے خان کے ملازموں میں سے کسی اور کو اندر نہ جانے دیا۔ صرف طاہر محمد سلطان، میر فراغت بڑی کوشش کے بعد اندر مجلس میں پہنچ سکے تھے خان خانان کچھ دیر بیٹھ کر واپس چلا آیا اور پیر محمد خان کے ہوش درست کرنے کا ارداہ کرلیا۔

دو تین دن بعد خان خانان نے خواجہ انبیا جو بعد میں خواجہ جہان بنا اور میر عبد اللہ بخشی کو خدمت گاروں کی ایک جماعت کے ساتھ پیر محمد خان کے پاس بھیجا اور یہ کہلوایا کہ ان دنوں کو تو بھول گیا ہے جب تو طالب علمی کے لباس میں نہایت خستہ حال قندھار پہنچا تھا۔ ہم نے اس وقت تجھ میں قابلیت اور خلوص کے جذبے کو دیکھ کر اور چند عمدہ خدمات

کے بجالانے کی وجہ سے زمین سے اٹھا کر آسمان تک پہنچا دیا اور تجھے مُلّا گیری سے امارت کے اعزاز پر پہنچنا نصیب ہوا، پھر ہم نے ترقی دے کر تجھے امیرالامرائی کا عہدہ عطا کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرا ظرف دولت و مرتبے کی سمائی کے لائق نہیں اور تیری طرف سے فتنہ و فساد کا اندیشہ ہو چلا ہے اس لیے ہم چند دن کے لیے وہ ساز و سامان تجھ سے چھین لیتے ہیں جو ترے اس غرور کا باعث ہے تا کہ تیرا دماغ ٹھکانے آ جائے، تیرے لیے یہی مناسب ہے کہ تو فوراً ہی علم و نقارہ اور ساز و سامان سرکاری آدمیوں کے حوالے کردے''۔ پیر محمد خان نے خان خانان کے حکم کی تعمیل کی اور سارا ساز و سامان اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا۔ پھر وہ امیر الامراء کے درجے سے دوبارہ ملا پیر محمد بن گیا بلکہ اس کا حال اس سے بھی کہیں زیادہ برا ہو گیا۔

خان خانان نے چند دن بعد ہی اسے قلعہ بیانہ میں بھیج کر قید کر دیا۔ اسی قید کے زمانے میں اس ''برہان تمانع'' کی بحث پر جو "**لو كان فيهما الهة الا الله لفسدتا**" کی آیت پر مبنی ہے اور یہ متکلمین کے درمیان ایک مشہور بحث ہے پر چند رسالے لکھ کر خان خانان کے نام سے موسوم کیے تا کہ اس وسیلے سے اسے رہائی مل جائے، لیکن ایسی باتوں کا کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ چند دن بعد خان خانان کے حکم سے اسے مکہ معظمہ کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ تقدیر اچھی تھی، جب وہ گجرات پہنچا تو خان خانان خود سازشوں کا شکار ہو گیا۔ یہ خبر جب پیر محمد خان کو ملی تو وہ گجرات سے لوٹ آیا اور اکبر کے پاس باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب عطا کر کے خان خانان کے پیچھے روانہ کر دیا۔ ان وقعات کے بعد خان خانان کی نیابت کا عہدہ پیر محمد خان کے بجائے خان خانان کے ہی ایک ملازم حاجی محمد خان سیستانی کو دیا گیا تھا۔

شیخ گدائی کا اقتدار

ایک اور شخص شیخ گدائی کنبوہ تھا۔ یہ دہلی کے شاعر جمالی کنبوہ کا لڑکا تھا۔ جب ہندوستان دوبارہ فتح ہوا تو سفر کی حالت میں شیخ گدائی گجرات کے مقام پر خان خانان کی خدمت

میں حاضر ہوا تھا اور اس سے اس کی اچھی راہ و رسم ہوگئی تھی۔ انہی سابقہ روابط کی بنا پر خان خانان نے اس کی سرپرستی کی اور اسے صدرالصدور کا عہدہ دے کر تمام ہندوستانی اورخراسانی امیروں میں اس کا مرتبہ بڑھادیا۔ یہ شخص نہایت مکار اور ریاکار تھا۔ اس نے صوفیانہ وضع اختیار کر رکھی تھی اور اپنے گھر پر سماع کی محفلیں منعقد کیا کرتا تھا ان محفلوں میں خان خانان بلکہ خود بادشاہ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہندوستان میں اسلام کا آغاز ہی تھا اس لیے ایسے مکار لوگ جو غلامانہ ذہنیت اور پست فطرت رکھتے تھے اور ان کے نفاق و ریاکارانہ زہد کی وجہ درویشی انہی پر جمتی نہیں تھی، مکر و تزویر سے بہ آسانی اپنا رنگ جما لیتے تھے۔ شیخ گدائی بھی اسی قبیل کا آدمی تھا۔ لوگوں کو تو اس کے عالی نسب ہونے میں بھی شبہ تھا۔ غرض اس کے اس بڑھتے ہوئے اعزاز و مرتبے کی وجہ سے اہل علم اور امرا کی محفلوں میں ماتم برپا ہوگیا:

در تنگنائی حیرتم از نخوت رقیب
یا رب مبادآنکہ گدا معتبر شود

شیخ گدائی نے قدیم امیر زادوں اور پیرزادوں کی جاگیریں ضبط کرادیں۔ وہ صرف انہی کو جاگیر عطا کرتا تھا جو اس کے دربار میں جانے کی ذلت گوارا کر لیتے تھے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں تھی جو ایک گز زمین جاگیر میں حاصل کرنے کے لیے اس کی خوشامد نہ کرتے ہوں ان میں ولایت (ایران) سے آنے والے معزز لوگ بھی شامل تھے۔

میر عبد اللطیف قزوینی

انہی دنوں عراق سے میر عبد اللطیف[2] جو قزوین کے معزز خاندان سادات سیفی کے سربرآوردہ آدمی تھے۔ 963ھ/1555ء میں ہندوستان تشریف لائے تھے۔ بادشاہ نے لسان الغیب حافظ شیرازی کا دیوان ان سے سبقاً سبقاً پڑھنا شروع کیا۔

ان کے لڑکے کا نام غیاث الدین تھا جس کو نقیب خان کا لقب دیا گیا تھا۔ یہ شخص نہایت ذہین اور جامع العلوم ہے چنانچہ علم سیرت، تاریخ اور اسماء الرجال اور دوسرے تمام

مروجہ علوم میں ان کی نظر بڑی گہری تھی وہ بلا شبہ اس دور میں باعث برکت، بلکہ صحیح معنوں میں ''ثانی لوح محفوظ'' تھے۔ راقم الحروف کو بھی اس کے ساتھ ہم جماعتی، ہم عصری اور دینی اخوت کا شرف حاصل ہے۔ وہ ان دنوں بادشاہ سلامت کی خدمت میں تاریخ نظم و نثر اور دوسرے علوم کی کتابوں کے پڑھنے پر مامور ہے۔

گوالیار کے قلعہ پر قبضہ

966ھ/1558ء میں گوالیار کا قلع فتح ہوا۔ گوالیار کے قلعے میں عدلی کا ایک غلام بھبل خان نامی قبضہ جمائے ہوئے تھا۔ اس نے امان حاصل کر کے قلعے کی کنجی شاہی کارندوں کے حوالے کر دی۔

رنتھنبور کا قضیہ

اسی سال عدلی کے ایک اور غلام سنکرام خان نے رنتھنبور کا قلعہ رائے سرجن ہارا کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اس واقعے کی تفصیل یہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے آگرہ میں آنے سے پہلے امیروں کی ایک جماعت کو جن میں ہندو بیگ اور دوسرے مغل امیر شامل تھے، قلعہ رنتھنبور کی تسخیر کے لیے مقرر کیا تھا۔ ان امیروں نے سنکرام خان پر حملہ کر کے قلعے کے مضافات کو بری طرح لوٹا، لیکن ان سے قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ جب بیانہ کی جاگیر خان خانان کے ایک غلام حبیب خان کو دی گئی اور پیاور و تودہ ترک علی جو تودہ بھون کے نام سے مشہور ہے چغتائی خان کے حوالے ہوا تو حبیب خان کو میر لشکر بنا کر رنتھنبور کی مہم پر مقرر کیا گیا۔ اس نے قلعے کو ایک سال تک محاصرے میں رکھا۔ اس طویل محاصرے سے قلعے والے تنگ آ گئے اور صلح کی بات چیت کرنے پر مجبور ہو گئے سنکرام خان نے حبیب خان کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ اپنا ایک قاصد ہمارے پاس روانہ کریں تا کہ ہم اپنی شرائط اسے بتا دیں۔

مغل سرداروں نے میرے والد (صاحب تصنیف) کو حاجی بھیکن پیاوری کے ساتھ اس سفارت کے لیے منتخب کر کے روانہ کیا۔ بڑی ردّ و کد کے بعد سنکرام خان چند شرطوں پر

قلعہ سپرد کرنے کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ایک شرط یہ تھی کہ اسے نقد روپیہ اور مال واسباب دیا جائے، دوسری یہ کہ شاہی ملازمت میں اس کے معاش کی بھی کوئی سبیل نکالی جائے۔ امیروں نے اس کے ان مطالبوں کی پابجائی میں ٹال مٹول سے کام لیا۔ ان کے پاس روپیہ بھی نہیں تھا جو اسے دیتے، اس لیے وہ قلعے پر زبردستی ہی قبضہ کر لینے کی فکر کرنے لگے تھے۔ امراء کے اس رویہ کو دیکھ کر اس نے رنتھنبور کا قلعہ رائے سرجن کے ہاتھ فروخت کردیا۔ شاہی لشکر نے قلعہ پر قبضہ کر لینے کی ہر طرح کوشش کرلی لیکن ان کو کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

قلعے کو حوالے کر دینے کے بعد سنگرام خان تو حاجی خان الوری کے ساتھ گجرات کی طرف نکل گیا اور رائے سرجن نے قلعہ میں کافی رسداور سامان جنگ پہنچا کر اسے اچھی طرح مستحکم کرلیا اوررسد و محصول کی وصولیابی کے بہانے قلعے سے متعلقہ بعض پرگنوں پر بھی قابض ہوگیا۔ غنیم کے اس تسلط کے بعد رجیب علی خان اوردوسرے امیر کافی نقصان اٹھا کر اپنی اپنی جاگیروں کولوٹ گئے۔

چنار کے قلعے پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے جو چنار پر قابض تھا ایک قاصد دربار میں بھیجا اور درخواست کی کہ اگر بادشاہ کسی تجربے کار لائق آدمی کو روانہ کریں تو میں قلعہ اس کے حوالے کردونگا۔ اس کے عریضہ پر خان خانان نے مہر علی بیگ سلاحدوز کو جس نے بعد میں خانی کا اعزاز پایا تھا اور قلعہ چتوڑ کا حاکم مقرر ہوا تھا، جمال خان کے قاصد کے ساتھ روانہ کیا اور جمال خان کے نام ایک تسلی آمیز فرمان بھی بھیج دیا۔

اس زمانے میں، میں (صاحب تصنیف) پڑھنے کے ارادے سے وطن سے پساور اور وہاں سے آگرہ پہنچا تھا اور مہر علی بیگ سے تعارف ہو جانے کی وجہ سے اسی کے گھر پر رہا کرتا تھا۔ مہر علی بیگ نے اس سفر میں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے جانے کے لیے بڑا اصرار کیا اور میرے استاد مرحوم شیخ مبارک ناگوریؒ اور والد مرحوم شیخ ملوک شاہ سے بھی سفارش کرائی،

یہاں تک مجبور کیا کہ اگر وہ میرے ساتھ نہ چلے گا تو میں اس سفر کا ارادہ ہی ترک کر دوں گا۔ دونوں بزرگوں نے معرفت و آشنائی کی وجہ سے مجھے اس سفر کی اجازت دے دی۔ میں بھی مجبوراً تعلیم ترک کر کے عین برسات میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

ہم لوگ قنوج، لکھنو، جونپور اور بنارس کی سیر کرتے، جگہ جگہ کے عجائبات دیکھتے اور ہر شہر کے علماء و مشائخ کی صحبتوں سے استفادہ کرتے ہوئے ماہ ذی قعدہ 966ھ/1558ء میں گنگا کے کنارے آئے اور دریا پار کر کے چنار پہنچے۔

جمال خان نے اپنے آدمیوں کو ہمارے استقبال کے لیے بھیجا۔ یہ لوگ مہر علی کو قلعے کے اندر لے گئے اور وہاں اسے شیر شاہی اور سلیم شاہی دور کی عمارتیں دکھائیں اور قلعے کے ساز و سامان کا معائنہ کرایا۔ قلعے والوں نے ہماری مہمانی اور ضیافت بڑی کشادہ دلی کے ساتھ کی جس وقت جمال خان کو شاہی فرمان پڑھ کر سنایا گیا جس میں قلعہ چنار کے عوض جونپور کے پانچ پرگنے دیے جانے کا وعدہ تھا تو جمال خان نے جسے اس سے زیادہ کی توقعات تھیں یہ چاہا کہ مہر علی کو اس وقت تک قلعے میں روک لے جب تک کہ دربار سے اس کے عریضے کا جواب آجائے۔

اس اثنا میں اس نے خان زمان سے علیٰحدہ بات چیت شروع کر دی اور تیسری طرف فتح خان افغان پنی سے بھی جو اپنی جمعیت کے ساتھ رہتاس کے قلعے پر قابض تھا، قلعہ سپرد کر دینے کا وعدہ کرلیا۔ جب مہر علی کو اس کے اس مکر و فریب کا علم ہوا تو اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں فتح خان اور جمال خان مل کر اسے کسی آفت میں نہ ڈال دیں اس ڈر کے مارے وہ ہمیں (صاحب تصنیف اور دیگر افراد جو ہمراہ تھے) اسی جگہ چھوڑ کر سیر کے بہانے قلعہ سے نکلا اور گنگا پار کر کے تنہا چلا گیا۔ اس کے تمام ساتھی قلعے میں رہ گئے۔

اس صورت حال کو دیکھ کر میں نے جمال خان سے چاپلوسی کی باتیں کیں اور اسے یہ یقین دلایا کہ میں کسی طرح مہر علی کو واپس لاتا ہوں تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی چنانچہ میں شام کے وقت ایک کشتی میں بیٹھ کر گنگا پار کرنے لگا۔ اتفاق سے کشتی پہاڑ کے دامن میں ایک خوفناک بھنور میں پھنس گئی۔ یہ بھنور

قلعے کی دیوار کے قریب ہی تھا اسی وقت ہوا کا ایک تیز سناٹا آیا اور کشتی ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ اگر اس وقت اللہ کی مہربانی شامل حال نہ ہوتی تو بلا شبہ کشتی اس بھنور میں چکراتی ہوئی پہاڑ سے ٹکراتی اور اس کے پرخچے اڑ جاتے:

رسیدم من بہ دریائی کہ موجش آدمی خوار است
نہ کشتی اندران دریانہ ملاحی عجب کار است

غرض بڑی مشکلوں سے کشتی ساحل سے جا کر لگی اور ہم اس جنگل میں جو کوہ چنار کے دامن میں ہے شیخ محمد غوث کے ٹھکانے پر پہنچے۔ یہ ہندوستان کے ممتاز شیخ اور صاحب دعوت بزرگ تھے اور اس ویرانے میں بارہ سال سے مقیم تھے۔ ان کی گزر بسر جنگل کے پھول اور درختوں کے پتوں پر تھی۔ دعوت دین کی برکت کی وجہ سے ان کو یہ مرتبہ حاصل ہوا کہ عالی مرتبت بادشاہ خلوص وعقیدت کے ساتھ ان کے آستانے پر سر جھکاتے تھے۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

جب مہر علی آگرہ پہنچ گیا تو چنار کے قلعہ پر عدلی کے غلام فتو نے قبضہ کرلیا۔ 966ھ/1558ء میں شیخ موصوف اپنے مریدوں اور معتقدوں کے ہمراہ بڑی شان وشوکت کے ساتھ گجرات سے آگرہ پہنچے۔ اکبر بادشاہ نے بھی نہایت عقیدت مندی کے ساتھ ان کی زیارت کی۔ شیخ گدائی کو حسد اور نفاق کی وجہ سے آگرہ میں ان کا قیام نہایت ناگوار گزرا کیونکہ شیخ محمد غوث کی وجہ سے اس کی مشیخت کی دکان پھیکی پڑ رہی تھی:

بہ نزد خرد این سخن روشن است
کہ ہم پیشہ ہم پیشہ را دشمن است

خان خانان کے مزاج میں شیخ گدائی کا بڑا دخل تھا اس لیے خان خانان بھی شیخ محمد غوث سے کھل کر نہیں ملا بلکہ اس نے کئی ایک مجلسیں منعقد کیں وہ ان مجلسوں میں شیخ کا ایک رسالہ پڑھ کر سناتا تھا جس میں شیخ نے اپنی معراج کا حال لکھا ہے کہ حالت بیداری میں مجھ سے خدا نے گفتگو کی اور حضور اکرم ﷺ پر مجھے ترجیح دی۔ ان مجلسوں میں یہ اور ایسی

دوسری خرافات کا تذکرہ کر کے شیخ کی ذات پر کیچڑ اچھالا جاتا تھا۔ ان باتوں کی وجہ سے شیخ محمد غوث ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے اور وہاں ہدایت و رشد کی مہم میں مشغول رہے۔ ایک کروڑ کی جاگیر جو انھیں بادشاہ کی طرف سے ملی تھی صبر کر لی۔

اسی سال خان زمان کا بھائی بہادر خان سزاول خان کے لڑکے باز بہادر کے مقابلہ پر گجرات کی طرف مامور کیا گیا۔ وہ سیرؔی کے قصبہ تک پہنچا تھا کہ خان خانان کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے چنانچہ وہ دربار میں واپس آ گیا۔

اسی سال اندرؔی سے حسین خان آگرؔہ اور چندسرؔ سے باہر گئے امراء کو اپنے ساتھ لے کر رنتھنبور کی طرف گیااور سوپرؔ پہنچ کر اس نے بڑے نمایاں کارنامے انجام دیے اور پھر وہاں سے اس نے قلعہ رنتھنبور پر حملہ کیااور رائے سرجن کو شکست دے کر اسے اپنے ساتھ قلعہ میں لے کر گیا اور اس نے قلعہ داری کا جائزہ لے لیا، لیکن وہ بھی خان خانان کے جھگڑے کی وجہ سے اس مہم کو ادھورا چھوڑ کر گوالیار آ گیا اور وہاں سے مالوؔہ جانے کا ارادہ کیا تھا کہ خان خانان نے اسے آگرہ میں طلب کر لیا۔

اکبر دہلی میں

967ھ/1559ء میں اکبر نے شکار کے ارادے سے جمنا کو پار کیا۔ اس موقع پر مطلب پرستوں نے جن میں ادہم خان جو ماہمؔ اتکہ کی فرزندی کی وجہ سے سب سے زیادہ مقرب تھا اور صادق محمد خان پیش پیش تھے، خان خانان کے خلاف بادشاہ کے کان بھرنے لگے کیونکہ ان تمام امیروں کو خان خانان سے اس کی مستقل وکالت کی وجہ سے بڑا حسد تھا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ خان خانان سلطنت پر اس طرح قابض تھا کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھوں تنگ آ چکا تھا۔ اس کی بادشاہت تو بس برائے نام تھی، سب کچھ خان خانان کے ہاتھ میں تھا۔ بعض وقت تو ضروری اخراجات کے لیے بھی بادشاہ کو خود بڑی تنگی ہو جاتی تھی۔ خزانہ بالکل ہی خالی تھا۔ بادشاہ کے عملہ کے جتنے لوگ تھے وہ سخت پریشانی میں مبتلا رہتے تھے۔ انھیں جاگیریں بھی بڑی خراب دی گئی تھیں۔ اس کے برعکس خان خانان کے

جتنے ملازم تھے وہ بڑے خوشحال رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بادشاہی امرا خان خانان کے زوال کے آرزومند رہتے تھے۔

بیرم خان کے خلاف سازشیں

جب شہنشاہ کی سواری دہلی سے نصف مسافت پر سکندرہ راؤ میں پہنچی تو وہاں ماہم اتکہ نے اطلاع دی کہ دہلی میں بیگم بادشاہ سخت بیمار ہیں اور بادشاہ سلامت کو باربار یاد کرتی ہیں۔ یہ سن کر اکبر نے دہلی کا ارادہ کیا۔ جب شاہی لشکر دہلی پہنچا تو دہلی کے حاکم شہاب الدین احمد خان نے استقبال کیا۔ دہلی میں تمام امیروں نے مل کر خان خانان کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی اور رائی کا پہاڑ بنا کر بادشاہ کو اس کے خلاف بھڑکا دیا

خال وخط وزلف و ابرویت یک جا شدند
از برائی کشتن مسعود محضر می شود

ان لوگوں نے خان خانان کے مقابلہ میں اپنی بے بسی اور مظلومی دکھلانے کے لیے ایسا ڈھونگ رچایا کہ کہنے لگے حضور کی دہلی میں تشریف آوری پر خان خانان یہی سمجھے گا کہ ہم لوگ ہی آپ کو یہاں لے کر آے ہیں اور وہ یقیناً ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے گا۔ ہم چونکہ اس سے مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے مناسب یہی ہے کہ حضور ہمیں مکہ معظّمہ چلے جانے کی اجازت دیں۔

اکبر کو ماہم اتکہ کی جدائی گوارا نہیں تھی اس لیے اس نے تمام امیروں کی دلدہی کی اور خان خانان کو پیغام بھیجا کہ ''ہم تمہاری اجازت بغیر دہلی چلے آئے اور اب ہمارے تمام ملازم تمھاری طرف سے خوفزدہ ہیں، تمہیں چاہیے کہ تم ان سب کو تسلی دو تا کہ یہ سب مطمئن ہو جائیں۔''

خان خانان نے خواجہ امینا، حاجی محمد خان سیستانی اور ترسون محمد خان کو شہنشاہ کے دربار میں بھیج کر اپنی طرف سے بڑی معذرخواہی کی اور اپنی خیر خواہی اور خلوص کو جتلانا چاہا لیکن اکبر نے ان باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی اور ان لوگوں کو بھی واپسی سے روک دیا اور

تمام امور سلطنت شہاب الدین احمد خان اور ماہم اتکہ کے ذریعے انجام پانے لگے۔ ان لوگوں نے اس بات کی خوب افواہ پھیلائی کہ: ''بادشاہ سلامت خان خانان سے ناراض ہو چکے ہیں'' آگرہ میں جتنے امیر تھے سب ایک ایک کر کے دہلی پہنچنے لگے۔ سب سے پہلے قیام خان گنگ آگرہ چھوڑ کر آیا۔ وہاں سے جو امیر بھی آتا تھا شہاب الدین احمد خان وغیرہ اس کی جاگیر اور منصب میں اضافہ کر دیتے تھے۔ ان امیروں نے دور اندیشی سے کام لیا اور قلعہ کی مضبوطی کا بخوبی انتظام کر لیا۔

بیرم خان کی مکہ کے لیے روانگی

خان خاناں نے جب بساط[3] الٹتی ہوئی دیکھی تو اپنے مصاحبوں وغیرہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ شیخ گدائی وغیرہ نے رائے دی کہ ایک منٹ ضائع کیے بغیر دہلی جا کر بادشاہ کو اپنے قبضہ میں کر لیا جائے، لیکن خان خانان نے یہ تجویز پسند نہ کی اور کہا کہ اکبر کا مزاج میری طرف سے پھر گیا ہے، اس لیے اب میرا اور اس کا نبھاؤ ہونا مشکل ہے اس سے قطع نظر میری ساری عمر خیر خواہی میں گزری ہے اب بڑھاپے میں نمک حرامی کا داغ لگا کر میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتا۔

خان خانان نے ہر طرف سے مایوس ہو کر حج کا اردہ کیا اور بیانہ کی طرف کوچ کر دیا۔ آگرہ کے تمام سرداروں اور امراء کو اپنے اس ارداہ سے مطلع کر کے دہلی رخصت کر دیا۔ مالوہ سے بہادر خان کو بھی بلا کر ان لوگوں کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ بیانہ کے قید خانہ سے محمد امین دیوانہ کو بھی رہا کر دیا۔

دہلی میں امراء نے اکبر کو سمجھایا کہ خان خانان پنجاب کا عزم کیے ہوئے ہے اور اس کی نیت ٹھیک نہیں معلوم ہوتی، چنانچہ اکبر نے میر عبد اللطیف قزوینی کے ذریعے خان خانان کو پیغام بھیجا کہ اب ہم نے سلطنت کا سارا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھ لیا ہے تم عرصہ سے حج پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے، اس لیے تم کوئی علاقہ اپنی جاگیر کے لیے تجویز کر لو، تمہارا نمائندہ اس کی آمدنی مکہ میں تمہارے پاس بھیجتا رہے گا۔

خان خانان پہلے ہی سے یہ عزم کیے ہوئے تھا، یہ فرمان قبول کر کے وہ میوات سے ناگور کی طرف چلا گیا۔ سرداروں میں سب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔البتہ ولی بیگ ذوالقدر، حسن قلی خان جو بعد میں خان جہان بنا، اسماعیل قلی خان اور اس کے بھائی شاہ قلی خان اور حسین خان خویش اور مہدی قاسم خان اس کے ہمراہ ناگور تک آئے۔ ناگور پہنچ کر خان خانان نے سارا سامان، جلوس، نقارہ اور علم وغیرہ حسن قلی خان کے ہاتھ دربار میں بھیج دیا۔ جب وہ بیکانیر کی حد میں پہنچا تو شیخ گدائی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر نکل گیا۔

ابو المعالی کی گرفتاری

اکبر نے دہلی سے پنجاب جانے کا ارادہ کیا۔ جس دن اس نے قصبۂ جھجھر میں قیام کیا حسن قلی خان مع سازو سامان کے حاضر ہوا۔ اسی قیام میں شاہ ابو المعالی بھی خدمت شاہی میں حاضر ہوا لیکن اس نے یہ گستاخی کی کہ سواری کی حالت میں بادشاہ کو تسلیمات ادا کی۔ اکبر کو اس کی یہ حرکت سخت ناگوار گزری اور اسے گرفتار کر کے شہاب الدین احمد خان کے سپرد کر دیا۔

بیرم خان کا تعاقب

اسی قیام میں پیر محمد خان شیروانی بھی، جو خان خانان کا حال سن کر گجرات سے لوٹ آیا تھا، باریاب ہوا۔ اکبر نے اسے ناصر الملک کا خطاب اور سرداری کا سامان دے کر خان خانان کے پیچھے روانہ کیا تا کہ وہ جا کر خان خانان کو جلد از جلد مکہ روانہ کر دے اور ہندوستان میں ٹھہرنے کی مہلت نہ دے۔ پیر محمد خان فوراً ہی شاہی لشکر گاہ سے رخصت ہو گیا اور ناگور کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور ایک دو منزل کی مسافت پر یہ شعر ایک رقعہ میں لکھ کر خان خانان کے پاس بھیج دیا:

آیدم در دل اساس عشق محکم ہم چنان
با غمت جان بلا فرسودہ ہمدم ہم چنان

خان خانان نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

''آمدن مردانہ، اما نزدیک رسیدہ توقف کردن نامردانہ''

(تم آئے یہ تمہاری بہادری تھی لیکن قریب آکر ٹھٹک گئے یہ تمہاری نامردی ہے۔)

خان خانان کو پیر محمد خان[4] کے تعاقب سے بہت رنج ہوا اور وہ ناگور سے کوچ کر گیا۔ چونکہ جودھپور کے راجہ مالدیو نے بڑی جمعیت کے ساتھ گجرات کا راستہ روک رکھا تھا اسی لیے وہ بیکانیر کی طرف چلا گیا۔ یہاں بعض لوگوں نے اسے بہکایا اور اُس نے گجرات کے بجائے پنجاب کا رخ کیا۔ اپنے تمام اہل وعیال کو اپنے تین سال کے لڑکے مرزا عبد الرحیم سمیت جو اس وقت خان خانی اور سپہ سالاری کے عہدہ پر فائز ہیں شیر محمد خان دیوانہ کی جاگیر میں تبر ہندہ کو روانہ کر دیا۔ خانخاناں نے شیر محمد خان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا اسی بھروسے پر اس نے اس کی پناہ میں اپنے خاندان کو بھیج دیا، لیکن شیر محمد خان نے اس کی سابقہ مہربانیوں کا کوئی لحاظ نہ کیا اور اس کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور اس کے خاندان کی ہر طرح سے توہین کی۔ خان خانان دیپالپور پہنچا تھا کہ اسے یہ حال معلوم ہوا، اس نے شیر محمد خان کی فہمایش کے لیے خواجہ مظفر علی دیوانہ اور درویش محمد اوزبک کو روانہ کیا تاکہ یہ لوگ اس کو ان حرکتوں سے باز رکھیں۔ شیر محمد خان نے ان کی کچھ نہ سنی بلکہ اس نے خواجہ مظفر علی کو قید کر کے بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ خان خانان کو سب سے زیادہ صدمہ شیر محمد خان کی اس طوطا چشمی سے ہوا۔

بیرم خان کی شکست

خان خانان نے اب جالندھر کا رخ کیا۔ یہاں اکبر کے اشارہ سے پنجاب کے امیروں شمس الدین خان اتکہ، اس کے بیٹے یوسف محمد خان اور شہاب خان کے داماد حسین خان وغیرہ نے اس کا راستہ روک دیا، موضع کنور پھلور پرگنہ دکھدار میں سخت مقابلہ ہوا[۵] خانخاناں کی طرف سے مہدی قاسم خان کے داماد حسین خان نے بڑی مردانگی دکھائی، لیکن زخمی ہو کر گرفتار ہو گیا۔ اسے ولی بیگ اور اس کے بیٹے اسمٰعیل قلی خان کے ہمراہ بادشاہ کے حضور بھیج دیا گیا۔ خان خانان یہاں سے شکست کھا کر بھاگ گیا۔ اس لڑائی میں اس کا

جو کچھ مال واسباب تھا سب کا سب لٹ گیا۔ لوٹ کے اس مال میں ایک مرصع علم بھی تھا جس پر موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے، اسے خان خانان نے ایک کروڑ کے خرچ سے حضرت امام علی بن موسیٰ رضا کے مزار پر چڑھاوے کے لیے مشہد مقدس روانہ کرنے کے لیے تیار کرایا تھا۔ اتکہ خان نے مال غنیمت کے ساتھ یہ علم بھی بادشاہ کے پاس بھیجوایا۔

اکبر نے پنجاب سے دہلی واپس ہونے کے بعد کابل سے منعم خان کو وکالت کا عہدہ دینے کے لیے بلوایا تھا۔

بیرم خان کی فیاضی

اسی سال خان خانان نے ہاشمی قندھاری کی ایک غزل اپنے نام سے مشہور کردی تھی اور اسکے عوض اس نے شاعر کے پاس ساٹھ ہزار تنکہ روانہ کر کے اس سے پوچھا تھا: ''یہ رقم کم تو نہیں''؟ شاعر نے بطور لطیفہ لکھا کہ کم ہے اور ساٹھ بہت کم ہے۔ خان نے چالیس ہزار تنکہ مزید روانہ کر کے ایک لاکھ پورے کردیے، وہ غزل یہ ہے:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وزدست دل بہ راہ غم از پا فتادۂ
دیوانہ وار در کمر کوہ گشتۂ
بی اختیار سر بہ بیابان نہادۂ

خان خانان نے اسی طرح باوجود خزانہ خالی ہونے کہ رام داس لکھنوی کو ایک مجلس میں ایک لاکھ تنکہ نقد وجنس کی صورت میں بطور انعام دیا تھا۔ رام داس سلیم شاہ کے گویّوں میں سے تھا، موسیقی میں اسے تان سین ثانی کہا جاسکتا ہے، یہ گویا خلوت وجلوت میں خان خانان کا ہمدم تھا اور وہ اس کی خوبصورتی سے اپنی آنکھیں سینکا کرتا تھا۔

اسی طرح حجاز خان بدایونی کو خان خانان کے نام پر ایک قصیدہ لکھنے کے صلہ میں ایک لاکھ تنکہ نقد خان خانان کے خزانہ سے دیے گئے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے سرہند کی پوری سرکار کا امین بنا دیا گیا تھا۔ حجاز خان کو علم اور نقارہ کا امیرانہ اعزاز تھا اور وہ پہلے

افغانی امرا کے زمرے میں شامل تھا۔ آخر عمر میں اس نے سپاہ گری ترک کر کے معمولی معاش پر صبر کرلیا اور زہد و عبادت کی روش اختیار کرلی تھی جس قصیدہ پر خان خانان نے اسے یہ گراں بہا صلہ دیا تھا اس کا مطلع یہ ہے:

چون مہرۂ نگین سما شد فرو بہ آب
پرکار خاتمش بہ زمین داد لعل ناب

یہاں خواجہ کلاں بیگ کی یہ بات پوری صادق آتی ہے کہ عالم بالا کی شعر شناسی کا حال بھی کھل گیا۔ بہر حال خان کی ہمت بلند کے سامنے ایک لاکھ بس ایک کے برابر تھے۔

اسی سال ماہ ذی قعدہ میں پنجاب پر اتکہ خان کے تقرر کے بعد دربار شاہی سے خواجہ عبد المجید ہروی کو آصف خان کا خطاب ملا اور وہ دہلی کی حکومت پر فائز ہوا۔ حسین قلی خان کو اس بنا پر کہ اس کا باپ ولی بیگ اور اس کا بھائی اسماعیل قلی خان خان خانان کے ہمراہ تھے، آصف خان کے سپرد کردیا گیا اور بادشاہ کی سواری پنجاب کی طرف روانہ ہوئی۔

منعم خان کی وزارت

اسی سفر کے دوران حسب الحکم منعم خان کابل سے تردی بیگ خان کے بھانجے مقیم خان کے ساتھ جس کو بعد میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا، آکر لدھیانہ کے سفر میں حاضر ہوا۔ اسے خان خانان کا خطاب اور قلم دان وزارت سے سرفراز کیا گیا تھا۔

اتکہ خان کے فتح پانے اور خان خانان کے سوالک کی پہاڑی کی طرف فرار ہونے کی خبر بھی اسی سفر میں موصول ہوئی تھی اور بادشاہ نے اسیران جنگ کا معائنہ کر کے ان کو قید خانہ میں بھجوادیا، ولی بیگ جو بری طرح زخمی ہوگیا تھا قید خانہ ہی میں دنیا سے کوچ کر گیا اور اس کا سر کاٹ کر دہلی بھیج دیا گیا، حسین خان کو اس کے سالے ملک محمد خان ولد ملال قاسم خان کے حوالے کردیا گیا، آخر میں بادشاہ کی نظر عنایت اس پر ہوئی اور اسے پٹیالی کا قصبہ بطور جاگیر عنایت ہوا۔ پٹیالی دریائے گنگا کے کنارے ہے اور امیر خسرو کی جائے پیدائش ہے۔[6]

بیرم خان کی اطاعت

شکست کے بعد خان خانان بیرم خان تلواڑہ میں جاکر قلعہ بند ہوگیا۔ تلوارہ شمالی پہاڑی کے دامن میں ایک بلند اور مستحکم مقام ہے اور راجہ گوبند چند کی عمل داری میں ہے۔ شاہی فوج نے بھی تلوارہ پر حملہ کرکے جنگ چھیڑ دی۔ بادشاہی لشکر میں سے سلطان حسین جلائیر جو نہایت خوش قامت اور بہادر نوجوان تھا ہلاک ہوگیا۔ لوگ جب مبارکباد دیتے ہوئے اس کا سر خانخانان کے پاس لے گئے تو اس نے اس کی آنکھوں کو چوم لیا اور اس کی حسن خدمت کو یاد کرکے ہائے ہائے کر کے رونے لگا اور کہا ''میری زندگی پر ہزار لعنت کہ میرے نفس کی خاطر ایسے ایسے جوانوں کی زندگی خاک میں مل رہی ہے''۔ اس علاقہ کے ہندوؤں نے خان خانان کو بڑا حوصلہ دلایا، لیکن مسلمانوں کا غم اس کے دل میں ایسا لگا تھا کہ سارے ارادے ترک کرکے اپنی عاقبت کے ڈر سے اپنے قصوروں کا معافی نامہ ایک غلام جمال خان نامی کے ہاتھ بادشاہ کے حضور میں بھیج دیا اور خدمت شاہی میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، ملا عبد اللہ سلطان پوری مخدوم الملک کو اس کو لانے اور دلاسہ دینے کے لیے روانہ کیا گیا۔ دونوں طرف سے قاصد آجا رہے تھے اور ساتھ ہی حملہ کا بازار بھی گرم تھا۔ منعم خان چند آدمیوں کو ساتھ لے کر دلیرانہ خان خانان کے مقام پر جا پہنچا اور اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ جب خان خانان کی آمد کی اطلاع ہوئی تو بادشاہ کے حکم سے تمام امیر اس کے استقبال کے لیے روانہ ہوئے۔ حسب سابق کورنش بجالا کر اس کی تعظیم کی گئی۔ شہنشاہ نے اس کے قصور[7] معاف کردیے اور خاص خلعت اور گھوڑا عطا ہوا۔ منعم خان اسے اپنے ٹھکانہ پر لے گیا اور اس کے لیے تمام ساز و سامان کے ساتھ سراپردہ وغیرہ کا انتظام کردیا۔ شایان شان سفر خرچ اسے دے کر مکہ معظمہ کو رخصت کردیا گیا۔ چھوٹے بڑے تمام امیروں اور مصاحبوں نے اس کی مدد کے لیے نقد اور جنس کا چندہ کر کے جسے ترک ''چندوغ'' کہتے ہیں اس کی خدمت میں پیش کیا۔ حاجی محمد خان سیستانی کو اس کی رہبری کے لیے نامزد کرکے دہلی کی طرف روانہ کیا گیا اور بادشاہ سلامت وہاں سے سیروشکار کے ارادہ سے حصار فیروزہ کی طرف روانہ ہوئے۔ چار ربیع الاول 968ھ/

1560ء کو شاہانہ سواری دہلی پہنچی، وہاں سے بذریعہ کشتی 2 ربیع الثانی کو دارالخلافہ آگرہ میں یہ قافلہ اترا۔

خار مغیلان

کہتے ہیں خان خانان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ناگور کے راستے سے گجرات کی طرف جارہا تھا ایک جنگل میں ببولوں کے جھنڈ میں سے گزرنا پڑا، وہاں اس کی دستار کانٹوں میں الجھ کر گر پڑی۔ یہ ایک برا شگون تھا اس لیے خان خانان کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

بیرم خان کی شہادت

جس وقت خان خانان پٹن سے گجرات پہنچا تو پٹن کے حاکم موسیٰ خان فولاد اور حاجی خان الوری نے اس کی تعظم وتکریم کی اور اس کی ضیافت کا اہتمام کیا۔ قیام کے دوران ایک دن خانخاناں سہنس لنگ نامی ایک تالاب کی سیر کے لیے گیا۔ مغرب کی نماز کے لیے جب وہ کشتی سے اترا تو ایک پٹھان مبارک خان نامی کہ خان خانان نے ہندوستان کی فتح کے زمانے میں اس کے باپ کے قتل کا حکم دیا تھا اوباشوں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر آیا، بہانہ ملاقات کا تھا اور نیت قتل کی، چنانچہ اس نے اچانک خنجر سے بھر پور وار کیا اور بوڑھا خان اسی جگہ شہید ہوگیا۔ اس کی تاریخ شہادت ہے:

بیرم بہ طواف کعبہ چون بست احرام
در راہ شہید گشت نا یافتہ کام
تاریخ شہادتش زدل پرسیدم
گفتا کہ شہید شد محمد بیرام

خان خانان بڑا رقیق القلب انسان تھا۔ بزرگوں اور مشائخوں کا نہایت احترام کرتا تھا۔ اس کی مجلس میں ہمیشہ اللہ رسول کا ذکر رہتا تھا۔ ایک دن سیکری میں وہ ایک گوشہ نشین درویش کی ملاقات کے لیے گیا اور ان سے آیت **"وتعز من تشاء و تذل من تشاء"** کا مطلب پوچھا، چونکہ اس درویش نے تفسیر نہیں پڑھی تھی اس لیے اس کا جواب نہ دیا۔

خان خانان نے خود آیت کی وضاحت کی۔ ''تو عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے قناعت کے ذریعے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے سوال کے ذریعہ''

بیرم خان[8] بڑا پابند اوقات تھا، کبھی جماعت اور جمعہ کی نماز قضا نہ ہوئی، لیکن عقائد میں تفضیل کی طرف میلان رکھتا تھا۔ حافظ محمد امین خطیب سے کہا کرتا تھا دوسرے صحابہ کی نسبت حضرت امیر علی کرم اللہ وجہہ کی شان میں تعظیم کے چند کلموں کا اضافہ ہونا چاہیے۔

مالوہ کی فتح

اسی سال 12 رجب کو حاکم مالوہ باز بہادر ولد سزاول خان بڑا لاؤ لشکر اور ہاتھی لے کر ادہم خان اور پیر محمد خان کے مقابلہ پر سارنگ پور سے سات کوس کے فاصلہ پر آیا، یہاں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی جس میں باز بہادر کو شکست ہوئی۔ اس کا سارا ساز وسامان غنیمت میں آیا اور اس کے حرم کی عورتیں بھی گرفتار ہوگئیں۔

جس دن یہ فتح ہوئی مذکورہ دونوں سردار اپنے خیموں میں بیٹھے ہوئے تھے اور قیدیوں کو ان کے سامنے پیش کر کے قتل کر دیا جاتا تھا، اس وقت پیر محمد خان طنز سے فقرے چست کر رہا تھا۔ ''اس مقتول کی گردن کتنی موٹی تھی''۔ ''اوہ اس لاش میں سے تو ڈھیروں خون نکلا''۔ انسان اشرف المخلوقات ہے اور خلقت الٰہی کی اساس ہے، اس سنگ دل کی نظر میں اس دن انسان کھیرے ککڑی نظر آرہے تھے وہ انسانی جان کا اس طرح مذاق اڑا رہا تھا۔ مالوہ کے سید اور مشائخ قرآن اٹھائے ہوئے جان کی سلامتی مانگتے ہوئے آئے۔ ظالم نے ان بے قصوروں کو بھی قتل کرا دیا۔

ادہم خان نے فتح کی ساری روداد شہنشاہ کے پاس لکھ کر روانہ کی اور غنیمت میں ملنے والے چند ساتھی صادق محمد خان کے ذریعے حضور میں روانہ کر دیے۔ جتنے عمدہ عمدہ ہاتھی تھے اپنے لیے اور باز بہادر کی حرم کی[9] عورتوں اور طوائفوں کو بھی اپنے حرم میں داخل کر لیا۔

اکبر کو جب یہ حال معلوم ہوا تو وہ بہ نفس نفیس 21 شعبان 968ھ/1560ء کو آگرہ سے سارنگ پور پہنچا اور ادہم خان سے سارا مال[10] وصول کر کے 29 رمضان کو آگرہ واپس آ گیا۔

خان زمان سے بدگمانی

اسی سال عدلی کے بیٹے شیر خان نے جو باپ کے مرنے پر چنہار میں اس کا قائم مقام بنا ہوا تھا ایک بڑی فوج لے کر جونپور پر حملہ کردیا۔ خان زمان نے ابراہیم خان اوزبک، مجنوں خاں قاقشال اور شاہم خان جلایر کی مدد سے اسے شکست دی اور نمایاں کامیابی حاصل کی۔

اس واقعہ کے بعد ہی اکبر کو خان زمان کے متعلق بدگمانی ہوگئی اور وہ خود جونپور کے ارادے سے عازم سفر ہوا۔ جب کالپی پہنچا تو وہاں کے حاکم عبداللہ اوزبک نے بادشاہ کی مہمانی کا شرف حاصل کیا۔ یہاں سے سواری کڑہ کی طرف گئی۔ کڑہ میں خان زمان اور بہادرخان بھی جونپور سے آکر حاضر خدمت ہوئے اور نذرانے میں عمدہ ہاتھی اور نفیس تحائف پیش کیے۔ بادشاہ نے ان دونوں کو خلعتیں اور گھوڑے دے کر ان کی جاگیروں پر رخصت کردیا۔

اسی سال 17 ذی الحجہ کو بادشاہ سلامت آگرہ واپس تشریف لے آئے۔

اجمیر کی زیارت

969ھ/1551ء میں اکبر نے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی زیارت کے لیے اجمیر کا ارادہ کیا اور وہاں پہنچ کر درگاہ کے مجاوروں کو کثیر انعامات عطا کیے۔ اسی سفر میں جب شاہی قافلہ سانبھر کے قصبہ میں پہنچا تو انبیر کے حاکم راجہ پہاڑمل اور اس کا بیٹا رائے بھگوان داس حاضر ہوئے۔ راجہ نے اپنی ایک بیٹی بھی بادشاہ کے نکاح میں دے دی۔

اکبر نے مرزا اشرف الدین حسن کو جس کی جاگیر اجمیر کے علاقے میں تھی، میرٹھ کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ قلعہ اجمیر سے بیس کوس پر تیمل راجپوت کے قبضے میں تھا۔ اس مہم کے انتظام کے بعد اکبر دارالسلطنت واپس ہوگیا۔

میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی

مرزا شرف الدین میرٹھ کے قلعہ پر چڑھائی کر کے محصور کی اس شرط پر جان بخشی کہ وہ

سب قلعہ خالی کر کے نکل جائیں اور مال و اسباب قلعہ ہی میں چھوڑ دیں۔ محصور صلح کی شرائط کے مطابق قلعہ کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن اس کے ایک سپاہی دیوداس نے قلعہ سے نکلتے وقت کچھ لوگوں کی مدد سے سارے مال و اسباب میں آگ لگادی اور شرف الدین کے لشکر پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کردیا۔ آخر خود بھی لڑتے ہوئے مارا گیا اور اس کے ساتھ جو دو سو آدمی تھے وہ بھی ہلاک ہوگئے۔ قلعہ، شاہ بداغ خان اور اسکے بیٹے عبدالمطلب خان اور دوسرے امیروں کی کوشش سے فتح ہوا۔

باز بہادر کا انجام

جب ادہم خان دربار میں چلا گیا تو مالوہ میں پیر محمد خان حاکم ہوگیا اور وہاں اس نے ایک بڑا لشکر جمع کر کے برہانپور اور بیجا گڑھ کے قلعوں کو فتح کیا۔ نربدا ندی کے دوسرے ساحل تک فوجی کاروائی کر کے اس طرح قتل عام کیا کہ وہ سارا علاقہ بے چراغ ہوگیا۔

باز بہادر شکست کھانے کے بعد اس علاقہ کے کئی اور حاکموں کے ساتھ یہاں سے وہاں پھر رہا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ پیر محمد خان اپنے لشکر سے جدا ہوگیا۔ باز بہادر نے موقع پاکر اس پر حملہ کردیا۔ پیر محمد خان گھبرا کر منڈو کی طرف بھاگا، دشمن کے خوف سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دریائے نربدا میں گھوڑے ڈال دیے۔ اس وقت کچھ اونٹ بھی دریا پار کررہے تھے۔ ایک اونٹ بدحواس ہوکر اس کے گھوڑے پر آگرا اور وہ اس کے ساتھ ہی ڈوب کر مرگیا۔ پیر محمد خان کی وفات کے بعد مالوہ پر متعینہ سردار وہاں ٹھہر نہ سکے اور دربار میں واپس چلے آئے حسب الحکم انھیں قید کردیا گیا چند روز بعد انکو رہائی ملی۔

مغل سرداروں کی واپسی کے بعد باز بہادر نے اپنے وطن پر دوبارہ قبضہ کرلیا۔ بعد میں عبداللہ خان اوزبک نے معین الدین احمد خان فرنخودی کی مدد سے دوبارہ حملہ کر کے اسے پھر مالوہ سے بے دخل کر دیا۔ باز بہادر چند روز تو رانا اودے سنگھ کی پناہ میں چتوڑ اور اودے پور میں رہا۔ چند دن اس نے گجرات میں گزارے، آخر مجبور ہوکر دربار شاہی حاضر ہوکر اکبر کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔ چند دن اسے قید میں رکھا گیا تھا بعد میں رہا کردیا

گیا۔ لیکن موت سے چھٹکارا کہاں؟ رہائی کے چند دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ مالوہ کی مہم کے بعد عبداللہ خان اوزبک ہانڈیہ کو اور اس کے معاون امیر اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے اور معین الدین احمد خان دربار میں حاضر ہوگیا۔

اسی سال خواجہ عبد اللہ مروارید (جو ایک مشہور وزیر گزرا ہے) کا پوتا خواجہ محمد صالح صدارت کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اسکو صرف دیوان کے اختیارات حاصل تھے انعامات، اراضی کے عطیات اور امداد و ظائف دینے کا اسے اختیار نہیں دیا گیا تھا۔

سفیر ایران کی آمد

اسی سال شاہ طہماسپ کی طرف سے ایک سفیر سید بیگ ولد معصوم بیگ ہمایوں بادشاہ کی تعزیت کے سلسلے میں شاہی مکتوب لے کر آیا۔ دربار میں اس سفیر کی تعظیم و تکریم کی گئی اور بادشاہ نے اسے سات لاکھ تنکہ انعام دیا اور خلعت اور گھوڑا عطا فرمایا۔ امرا نے بھی اس کی ضیافت کی اور تحفے دیے۔ وہ ہندوستان سے بے شمار تحائف لے کر لوٹا۔

ادہم خان کی بغاوت

بادشاہ نے اتکہ خان کو جس کا لقب اعظم خان تھا، پنجاب سے بلاکر مملکت کا وزیر مطلق بنا دیا تھا۔ ادہم خان کو بادشاہ کے تقرب پر بڑا ناز تھا اور وہ اس بات سے سخت ناراض بھی تھا کہ ماہم اتکہ سے وکالت کا عہدہ چھین کر اتکہ خان کو دے دیا گیا۔ اس پر چند حاسد امیروں نے خاص طور سے منعم خان اور شہاب الدین احمد خان نے اسے اتکہ خان کے خلاف اس قدر ورغلایا کہ اس نے غضب ناک ہوکر عین دربار میں اتکہ خان پر حملہ کر کے اسے ٹکرے ٹکرے کردیا اور اسی طرح سے تلوار لے کر حرم شاہی کے دروازہ پر جاکر کھڑا ہوگیا۔ شاہنشاہ بھی تلوار کھینچے ہوئے باہر نکلے اور اس سے پوچھا ''یہ آخر تو نے کیا کیا''؟ اس نے بے باکی سے جواب دیا'' ایک غدار کو میں نے کیفر کردار تک پہنچا دیا''۔ شہنشاہ کے حکم(11) سے ادہم خان کے ہاتھ پیر باندھ کر محل کی چھت پر سے نیچے گرادیا گیا۔ اس کے

جسم میں چونکہ جان باقی رہ گئی تھی اس لیے شہنشاہ نے حکم دیا ''اسے دوبارہ گراؤ''۔

ادہم خان کے چالیسویں کا کھانا کھلانے کے بعد اس کی ماں ماہم اتکہ [12] بھی بیٹے کی غم میں مرگئی۔ اسی سال میرے والد (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) شیخ ملوک شاہؒ بھی 27 رجب کو آگرہ میں انتقال فرما گئے۔ میں نے ان کی میت بساور میں لے جاکر دفن کی تھی۔ یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ والد مرحوم کے پیر شیخ پنجو سنبل جن کے ساتھ مرحوم کی بڑی عقیدت و ارادات تھی اسی سال وہ محبوب حقیقی سے جا ملے۔

منعم خان کا فرار اور گرفتاری

منعم خان خانخاناں اور محمد قاسم خان میر بحر اس خوف کے مارے کہ کہیں وہ ادہم خان کو بہکانے کے الزام میں پکڑے نہ جائیں اور دوسری بعض وجوہات کی بنا پر بھی سیر کے بہانہ سے کشتی میں بیٹھ کر دریا پار کر گئے اور وہاں کے بعض زمینداروں کی مدد سے دو تین سورا ساتھ لے کر روپڑ اور بجوارہ کے راستے پہاڑ کے دامن کی طرف نکل گئے۔ وہاں سے ان کا ارادہ کابل چلے جانے کا تھا کیونکہ وہاں منعم خان کا لڑکا غنی خان حاکم تھا، لیکن جب وہ دوآبہ میں سمرت کے پرگنہ پہنچے جو میر محمد منشی کی جاگیر میں تھا تو قاسم علی خان سیستانی نے جو پرگنہ کا شقدار تھا، جنگل میں ان کو دیکھ لیا اور ان کے انداز کو دیکھ کر سمجھ گئے کہ یہ بھاگے ہوئے ہیں اُس نے وہاں کے اوباشوں کی ایک جمعیت لے کر انھیں گھیر لیا اور دونوں کو باندھ کر سید محمود بارہہ کے آدمیوں کو جو اس علاقہ میں ٹھہرے ہوئے تھے مطلع کیا۔ سید محمود نے اپنے عزیزوں اور لڑکوں کو ان دونوں کے ہمراہ کر کے ان کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ آگرہ بھیج دیا۔ جب ان کے واپس آنے کی خبر ملی تو شاہنشاہ نے افسروں کی ایک جماعت کو ان کے استقبال کے لیے روانہ کیا اور دوبارہ وکالت کا عہدہ پہلے سے کہیں زیادہ اعزاز کے ساتھ منعم خان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اس ذمہ داری کو شہاب خان اور خواجہ جہان کی مدد سے سرانجام دے۔

کھکروں کی شکست

اسی سال خان کلاں میر محمد خان اتکہ نے کمال خان کھکر کی مدد کے لیے ایک بڑی فوج لے کر کھکروں کے وطن پر چڑھائی کی اور سخت جنگ کر کے کمال خان کے چچا سلطان آدم کو اسیر کر لیا اس کا لڑکا لشکری کشمیر کی جانب بھاگ گیا لیکن بعد میں گرفتار ہوگیا اور دونوں باپ بیٹے اپنی موت مر گئے۔ خان کلاں وہ سارا علاقہ کمال خان کھکر کے حوالے کر کے آگرہ واپس آ گیا۔

ایک روز شاہنشاہ نے ایک بڑا جشن منعقد کیا تھا۔ اس محفل میں خان کلاں میر اتکہ نے ایک قصیدہ جسے وہ اپنے خیال میں بڑا کارنامہ سمجھ رہا تھا، پڑھنا چاہا۔ محفل میں تمام امراء، سردار، اہل علم اور بڑے بڑے شاعر جمع تھے۔ جب خان کلاں نے اپنے قصیدہ کا مطلع اٹھایا اور یہ مصرع پڑھا:

بحمد اللہ کہ دیگر آدم فتح کھکرہ کردہ

اچانک اس کا رشتہ دار عبد الملک خان اٹھ کر آگے آیا۔ اس وقت شاہنشاہ پوری توجہ سے اس کا قصیدہ سن رہے تھے، بلکہ یہ مجلس اسی قصیدہ کے لیے منعقد کی گئی تھی اور خان کلاں کو بادشاہ سے بھاری صلے کی امید تھی، عبد الملک خان نے سامنے آکر بلند آواز سے کہا:

میرے خان ''دیگر آدم، نہیں بلکہ'' دیگر آدمیم'' کہو، کیونکہ دوسرے بہت سے بد نصیب بھی تمہارے ساتھ تھے۔ عبد الملک کی اس اصلاح پر ساری مجلس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ خان کلاں نے اپنی پگڑی زمین پر رکھ دی اور فریاد کی۔

''اس بد تمیز مسخرے سے حضور ہی میرا انصاف کریں گے اس نے تو میری ساری محنت خاک میں ملادی''۔

عبد الملک بڑا پر مذاق آدمی تھا، چنانچہ اس نے اپنے نام کا سجع بھی بڑا مضحکہ خیز بنایا تھا:

عبد را چون با ملک افزون کنی
پس الف لامی دروا ندرون کنی

ملا شیری ہندی شاعر نے اپنا مشہور قصیدہ ''مدح وقدح'' اسی کے نام پر لکھا تھا۔ اس قصیدہ کا ایک شعر ہے:

اگر گوار بیاید مقابل تو گریز
کہ صباحی و مقابل نمی شوی بگوار

مدرسۂ خس

اسی سال مولانا علاؤالدین لاری جنھوں نے شرح ''عقائد نسفی'' پر حاشیے لکھے ہیں، خان زماں کے پاس جونپور گئے۔ یہاں انھوں نے ایک چھپر ڈال کر مدرسہ قائم کیا اور تعلیم و تدریس میں مشغول ہوگئے۔ اس مدرسہ کی تاریخ بناء ہے:

''مدرسۂ خس''

بعد میں وہ حج کے لیے تشریف لے گئے اور اسی سفر میں سفر آخرت کے لیے کمر باندھ لی۔

کابل کے ہنگامے

اسی سال کابل کے حالات بھی خراب ہوگئے اور ایک مختصر سی مدت میں کابل پر کئی ایک حاکموں کا تقرر و تبادلہ ہوگیا۔ منعم خان جب کابل سے ہندوستان آیا تھا تو اس نے حیدر خان آختہ بیگی کو وہاں اپنا نائب بنادیا تھا، لیکن اس کی بدسلوکی کی وجہ سے اس کی جگہ اپنے بیٹے غنی خان کو قائم مقام بنادیا، وہ بھی نالائقی میں حیدر خان سے کچھ کم نہیں تھا چنانچہ اس نے کابل کے ایک صاحب اقتدار میر تولک خان قوچین کو بے سبب ہی قید کر دیا۔ بعد میں تولک خان نے قابو پاکر غنی خان کو قید میں ڈال دیا۔ غنی خان بڑے وعدے وعید کے بعد اس قید سے رہائی پائی، پھر اس نے تولک خان سے بدعہدی کی اور اس پر حملہ کر دیا۔ تولک خان نے اس سے مقابلہ نہ کیا اور اپنی جاگیر چھوڑ کر ہندوستان چلا آیا۔ ہمایوں بادشاہ کی بیوی جوبک بیگم نے جو ہمایوں کے دس سالہ لڑکے مرزا حکیم بیگ کی والدہ تھی، شاہ ولی بیگ اتکہ اور منعم خان کے بھائی فضائل بیگ (مرزا کامران نے اسے اندھا کردیا تھا اس

لیے اس کو کور کہتے تھے) اور اس کے لڑکے ابو الفتح بیگ کی مدد سے کابل کے قلعہ کے دروازے بند کر لیے اور غنی خان کو اندر داخل نہ ہونے دیا۔ غنی خاں بھی مجبور ہو کر ہندوستان آ گیا چونکہ باپ (منعم خاں) اس سے ناراض تھا اس لیے یہاں اس کی سرخروئی کا کوئی ذریعہ نہ نکل سکا اور وہ جونپور میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اسی حال میں وہ اپنے دن پورے کر گیا۔

فضائل بیگ مذکور تو بیگم کی جانب اور ابو الفتح بیگ باپ کی جانب سے کابل کے نائب بن کر گئے اور وہاں انھوں نے اپنے لیے اچھی اچھی جاگیریں مخصوص کر لیں اور مرزا کی عمل داری میں کمزور جاگیریں چھوڑ دیں۔ شاہ ولی اتکہ کو ان کی یہ کاروائی بڑی ناگوار گزری اس نے علی محمد اسپ کی مدد سے بیگم کے اشارے پر ایک رات ابو الفتح بیگ کو جب کہ وہ نشے میں چور تھا، قتل کر دیا۔ اس کا باپ اپنا سارا مال متاع لے کر ہزارہ کی طرف کوچ کر گیا میرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے اسکو تہہ تیغ کر دیا۔

جوبک بیگم کا اقتدار

شاہ ولی بیگ نے بیگم کی تائید و مدد سے کابل کا سارا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لے کر اپنا خطاب عادل شاہ رکھ کر خود مختار بن بیٹھا۔ اس کی مرمت کے لیے شہنشاہ نے منعم خان کو کابل کی حکومت اور میرزا حکیم بیگ کی اتالیقی پر مقرر کر کے چند امراء کے ساتھ روانہ کیا۔ منعم خان کے مقابلے پر جوبک بیگم میرزا کو ہمراہ لے کر کابل کے پورے لشکر کے ساتھ جلال آباد پہنچ گئی۔ بیگم کے مقابلہ میں منعم خان اور اس کے تمام مددگار امیروں محمد قلی خان برلاس، شہاب خاں کے بھائی حسن خان وغیرہ کو پہلے ہی حملہ میں بری طرح شکست کھانی پڑی۔ یہ لوگ سارا لاؤ لشکر تباہ کر کے بڑی بری حالت میں بادشاہ کی خدمت میں واپس آئے۔ اس فتح کے بعد بیگم[13] نے شاہ ولی کو غداری کے الزام میں گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔

شاہ ابو المعالی کی بغاوت

اسی سال شاہ ابو المعالی مکہ سے واپس آیا، اسی زمانہ میں میرزا اشرف الدین حسین آگرہ سے بھاگ گیا تھا اس کے تعاقب میں بادشاہ نے حسین قلی خان اور صادق محمد خان وغیرہ کو مقرر کیا تھا۔ جب شاہ ابو المعالی راستے سے وہاں پہنچا تو میرزا اشرف الدین کے بہکانے سے اس نے بھی بغاوت کا رخ اختیار کر لیا اور فتنہ و فساد مچاتے ہوئے ہر جگہ لوٹ مار کرنے لگا۔ حسین قلی خان کے رشتہ دار اسماعیل قلی خان احمد بیگ اور اسکندر بیگ اسکا پیچھا کرنے لگے۔ اسی تاخت و تاراج میں شاہ ابوالمعالی نے نارنول کے قلعہ کے سرکاری خزانے کو لوٹ کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردیا۔

محمد صادق خان اور اسماعیل قلی خان نے حملہ کر کے نارنول کے علاقے میں ابو المعالی کے بھائی خان زادہ کو جسے شاہ سوندان بھی کہتے تھے، گرفتار کرلیا۔ بھائی کی گرفتاری سے ابو المعالی بے چارہ ہوگیااور مجبوراً اس نے ہندوستان کو چھوڑ کر کابل کی راہ لی۔ پنجاب میں اس نے اسکندر بیگ اور احمد بیگ کو جو اپنے ساتھی امیروں سے جدا ہو گئے تھے۔ ان کے ملازموں سے سازش کر کے گھیرلیا اوراسے قتل کردیا۔ ماہ جوبک بیگم والدۂ میرزا محمد حکیم کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا جس میں اس نے مرحوم ہمایوں بادشاہ کے ساتھ اپنے خلوص و عقیدت کا اظہار کیا تھا اور اس کے سرنامے پر یہ شعر لکھا تھا:

مابدین درنہ پی حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بدحادثہ این جابہ پناہ آمدہ ایم

جوبک بیگم نے اس کے جواب میں لکھ بھیجا:

کرم نما وفرود آکہ خانہ خانۂ تست

ابوالمعالی کا کابل پر قبضہ

جب شاہ ابو المعالی وہاں پہنچا تو بیگم نے اس کے ساتھ اپنی لڑکی کا نکاح بھی کر دیا اور کابل کا سارانظم ونسق ابو المعالی کے ہاتھ میں آ گیا۔ کچھ دن بعد ہی ابو المعالی نے بعض شر

پسندوں جیسے شوکون ولد قراجہ خان وغیرہ کے بہکانے سے بیچاری بیگم کو قتل کرادیا، حیدر قاسم کوہ بر کو بھی جو شاہ ولی بیگ کے بعد کچھ عرصے تک کابل کا وزیر مطلق رہا تھا شہید کردیا اور اس کے بھائی محمد قاسم کوہ بر کو قید میں ڈال دیا۔

شاہ ابو المعالی کے اس خون خرابے پر لوگ بگڑ گئے اور ایک بڑی جماعت بیگم کے انتقام کے لیے مقابلہ پر آ گئی۔ کابل کے قلعہ میں فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ ان لوگوں نے محمد قاسم کو قید خانہ سے نکال لیا۔ محمد قاسم یہاں سے نکل کر بدخشاں چلا گیا اور وہاں مرزا سلیمان کو شاہ ابو المعالی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے آمادہ کیا۔ میرزا محمد حکیم نے اپنے قاصد بھیج کر اس کو کابل آنے کی دعوت دی۔

مرزا شرف الدین حسین کی بغاوت

میرزا شرف الدین حسین نے بادشاہ کا بخوبی اعتماد حاصل کرلیا تھا اور ناگور سے دارالخلافہ آگرہ آ گیا تھا۔ میرزا کا خاندانی تعلق چار واسطوں سے خواجہ عبید اللہ احرارؒ سے ملتا ہے شرف الدین حسین ولد خواجہ معین الدین ولد خواجہ خاوند ولد خواجہ یحییٰ ولد خواجہ احرار۔ آگرہ میں رہتے ہوئے ان دنوں جب کہ اس کے والد مکہ معظّمہ کی زیارت سے واپس آ چکے تھے۔ شرف الدین حاسدوں کے بہکاوے میں آ کر بغیر کسی ظاہری وجہ کے بادشاہ کی طرف سے بدگمان ہوگیا اور ناگور واپس چلا گیا۔ بادشاہ نے اس کے تعاقب میں صادق محمد خان اور ایک جمعیت کو حسین قلی خان کے ہمراہ کر کے روانہ کیا اور انھیں ہدایت کی کہ پہلے تو اسے تسلی اور دلاسہ دے کر سیدھی راہ پر لائیں اور اگر نہ مانے تو کام تمام کردو۔ مرزا شرف الدین ناگور جاتے ہوئے اجمیر کا قلعہ بترخان دیوانہ کے حوالہ کرتا گیا، لیکن دیوانہ بھی قلعہ خالی کر کے اس کے پیچھے چلا گیا۔ جالور کے مقام پر مرزا شرف الدین حسین کی شاہ ابو المعالی سے ملاقات ہوئی تھی، ان دونوں نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ شاہ ابوالمعالی تو حسین قلی خان کی فوج پر جو حاجی پور میں رُکی ہوئی تھی حملہ کرے گا، اس کے آنے تک مرزا شرف الدین اسی جگہ شاہی فوج کو پریشان کرتا رہے گا۔ اس منصوبے پر پوری طرح عمل نہ ہوسکا

کیونکہ جب شاہ ابو المعالی کو خبر ملی کہ صادق محمد خان اور دوسرے امیر اس کے مقابلہ پر بڑی فوج لے کر آ رہے ہیں تو وہ اس قرار داد کو چھوڑ کر پہلے نارنول گیا اور وہاں کے حاکم میر گیسو شقدار کو گرفتار کر کے اس سے کچھ روپیہ وصول کر لیا۔ پھر سیدھا کابل کی طرف نکل گیا۔ شاہی لشکر سے احمد بیگ، اسکندر بیگ، صادق محمد خان اور اسماعیل قلی خان الگ ہو کر اس کا پیچھا کرنے لگے۔

احمد بیگ اور اسکندر بیگ نے مرزا شرف الدین کے چند آدمیوں کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا تھا اور ان پر کافی بھروسہ کرنے لگے تھے۔ ان ملازموں نے ایک مفسد شخص زمانہ قلی نامی کے ذریعے شاہ ابو المعالی کو یہ پیغام بھیجا کہ تم فلاں جگہ رُکے رہو، جس وقت یہ دونوں سردار وہاں پہنچیں گے ہم ان کا کام تمام کر دیں گے۔ اس سازش کے مطابق جب وہ دونوں مقررہ مقام سے گزرے تو شاہ ابو المعالی نے اچانک گھات سے نکل کر ان پر حملہ کر دیا اور ان مفسد مخبروں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مقتول سرداروں کے ساتھی منتشر ہو کر بھاگ گئے۔

دہلی میں ہلچل

جب اس واقعہ کی تفصیلات اکبر کو معلوم ہوئیں تو وہ اس بغاوت کو ختم کرنے کے لیے خود دہلی آیا۔ بادشاہ کی آمد کے بعد دہلی میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ دہلی پہنچنے کے بعد بادشاہ کے دل میں آیا کہ وہ دہلی کے امرا اور شرفاء کی بیٹیوں سے نکاح کر لے، چنانچہ بادشاہی خواجہ سرا اور مشاطہ عورتیں لڑکیوں کے انتخاب کے لیے دہلی کے گھرانوں میں آنے جانے لگیں اور دہلی والوں میں بڑی ہلچل سی مچ گئی۔ اکبر کو اس بات پر شیخ بدھ اور آگرہ کے امرائے بہرہ نے آمادہ کیا تھا۔ بادشاہ کا دل دہلی کی ایک عورت پر آ گیا تھا، وہ عورت عبد الواسع کی زوجہ تھی۔ بادشاہ کی خواہش اور مطالبہ پر عبد الواسع نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اسے شاہی حرم سرا میں داخل کر دیا گیا اور بیچارہ عبد الواسع اس شرم کے مارے دہلی چھوڑ کر دکن میں بیدر جا کر بس گیا۔

قاتلانہ حملہ

دہلی کے قیام کے دوران ایک دن بادشاہ سیر کرتے ہوئے بیگم کے مدرسہ کی طرف جا نکلا، مدرسہ کی چھت پر سے فولاد نامی ایک لڑکے نے جو مرزا شرف الدین حسین کا غلام تھا، بادشاہ کو نشانہ بنا کر تیر چھوڑ دیا، نشانہ چوک گیا اور تیر بادشاہ کے جسم کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ خوش قسمتی سے بادشاہ کی جان بچ گئی۔ امراء نے مجرم کے خلاف باقاعدہ تحقیقات کرنے اور مقدمہ چلانے کی رائے دی تاکہ ان سب لوگوں کا پتہ چل جائے جو اس قاتلانہ حملہ کی سازش میں شریک ہیں، لیکن بادشاہ نے اس بات کو قبول نہ کیا اور اس لڑکے کو اسی وقت قتل کرا دیا وہاں سے سوار ہو کر قلعہ دین پناہ میں آکر ٹھہر گیا۔ طبیبوں کے علاج سے چند دن میں ہی وہ زخم اچھا ہو گیا۔ صحت پانے کے بعد بادشاہ دہلی سے لوٹ کر 970 ھ/1562 میں آگرہ واپس آ گیا۔

مرزا سلیمان کی کابل پر فوجی کاروائی

اسی سال شاہ ابو المعالی کا معاملہ بھی ختم ہو گیا۔ محمد قاسم کوہ برکی تحریک پر مرزا سلیمان نے بدخشاں سے کابل پر فوجی کاروائی کی۔ ابو المعالی میرزا حکیم کو ساتھ لیکر مقابلہ کے لیے آیا۔ دونوں میں یہ لڑائی غوربند کے کنارے پر ہوئی۔ سخت مقابلہ کے بعد شاہ ابو المعالی کی فوج کا ایک پہلو پسپا ہونے لگا۔ اس محاذ کو سنبھالنے کے لیے ابو المعالی خود اس طرف روانہ ہوا اور سلیمان مرزا کے مقابلہ پر مرزا محمد حکیم کو چھوڑ گیا۔ اس کے پیٹھ پھیرتے ہی مرزا محمد حکیم نے اپنے خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر دریا پار کیا اور سلیمان مرزا سے جا کر مل گیا۔ اس صورت میں ابو المعالی کے قدم اکھڑ گئے، وہ میدان جنگ چھوڑ کر فرار ہو گیا لیکن سلیمان مرزا کے آدمیوں نے اس کا پیچھا کر کے جاریکاروں کے قصبہ میں اسے گرفتار کر لیا۔ کابل میں سلیمان مرزا کے سامنے اسے لایا گیا۔ سلیمان مرزا نے اسے اسی طرح مرزا محمد حکیم کے پاس بھیج دیا۔ شہزادہ نے اسی وقت اسے پھانسی پر چڑھا کر اپنی ماں کے قتل کا انتقام لے لیا۔ یہ واقعہ 17 ماہ رمضان 970 ھ/1562ء میں پیش آیا۔

ان واقعات کے بعد سلیمان مرزا نے اپنی بیٹی کا عقد مرزا محمد حکیم سے کردیا اور اپنے ایک معتمد ملازم امید علی کو اس کا وکیل مقرر کر کے بدخشاں واپس چلا گیا۔

چنار کے قلعہ پر قبضہ

اسی سال عدلی کے ایک غلام جمال خان نے چنار کا قلعہ ایک دوسرے غلام فتو نامی کے سپرد کردیا۔ فتو نے قلعہ پر قابض ہونے کے بعد بادشاہ کے دربار میں عریضہ روانہ کیا، جس کے جواب میں بادشاہ نے فتو کے پیر شیخ محمد غوث اور آصف خان خواجہ عبدالحمید ہروی کو فتو کے پاس روانہ کیا ان لوگوں نے شرائط صلح طے کر کے فتو سے قلعہ کا قبضہ لے لیا اور قلعہ داری حسن خان ترکمان کو دے دی۔ فتو کو اپنے ہمراہ دربار شاہی میں لے آئے۔ یہاں اس نے بڑی عزت اور مرتبہ پایا۔ اسی دوران میں شیخ محمد غوث کا انتقال ہوگیا۔

اسی سال میرے نانا (صاحب منتخب التواریخ) مخدوم اشرف نے 20 رمضان کو رحلت کی۔

خواجہ اور راجہ کی نوک جھونک

971ھ/ 1563ء خواجہ مظفر علی تربتی کو خان کا خطاب اور وزارت کا عہدہ ملا۔ اس کے تقرر کا مادۂ تاریخ ''ظالم'' ہے۔ خواجہ کی راجہ ٹوڈرمل سے نہ نبھ سکی ان دونوں کے درمیان ذرا ذرا سی بات پر ہر روز ہی جھگڑا رہتا تھا۔ کسی ظریف نے ان دونوں کے متعلق اس ضرب المثل کو

سگ کاشی بہ از صفا ھانی   گرچہ صد بار سگ زکاشی بہ

اس طرح بدل کر کہا ہے:

سگ راجہ بہ از مظفر خان   گرچہ صد بار سگ ز راجہ بہ

امرائے دربار نے راجہ ٹوڈرمل کے خلاف محاذ سا بنا لیا اور انھوں نے بادشاہ سے اس کی شکایتیں کیں۔ اکبر نے جواب دیا ''تم سب اپنی اپنی جاگیروں میں ہندوؤں کو ملازم رکھتے

ہو، یہ ہماری سرکار کا ہندو ہے، پھر کیوں ناراض ہوتے ہو؟''
ایک شخص نے راجہ کی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

آنکہ شد کار ہندو از و مختل
راجۂ راجہاست ٹوڈرمل

اسی سال بادشاہ نے قاضی لال کو جو بڑا ظریف آدمی تھا کسی جرم میں برن سے طلب کر کے قتل کرادیا تھا۔

رانی درگاوتی

اسی سال عدلی کے ایک بڑے امیر غازی سور نے بغاوت کی۔ یہ شخص کئی بار بادشاہی دربار میں حاضر ہوااور ہر مرتبہ سرکش ہوکر بھاگ گیا، اس مرتبہ اس نے کٹرہ کے علاقے میں اچھی خاصی جمیعت فراہم کرلی اور آصف خان پر حملہ کردیا۔ آصف خان نے اسے شکست دی وہ اسی لڑائی میں مارا گیا۔اس فتح سے آصف خان کا اثر و اقتدار بہت بڑھ گیا اور اس نے قوت حاصل کرکے کٹرہ اور کنتلہ کے علاقہ پرحملہ کردیا۔اس علاقہ میں اس وقت ستر ہزار گاؤں آباد تھے اور اس کا صدر مقام قلعہ چوڑا گڑھ تھا۔ وہاں کی رانی بڑی خوبصورت اور حسین عورت تھی اس کا نام درگاوتی تھا۔ آصف خان کے مقابلہ پر رانی بیس ہزار سوار پیادے اور سات سو جنگی ہاتھی لے کر آئی، فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی،آخر ایک محاذ پر رانی تیر لگنے سے بری طرح زخمی ہوگئی۔ اپنی ناموس کے خیال سے اس نے فیل بان کو حکم دیا کہ وہ اسے قتل کردے، فیل بان نے ایک خنجر مارکراس کا کام تمام کردیا،لیکن حملہ آوروں میں سے ایک اوباش سپاہی نے رانی کے لاشہ سے ہی اپنی ہوس نکالی۔ رانی کو شکست دینے کے بعد آصف خان نے چوڑا گڑھ پر حملہ کردیا، وہاں رانی کے لڑکے سے کچھ مقابلہ ہوا لیکن وہ مارا گیا۔آصف خان کو مال غنیمت میں اتنا خزانہ ملا جو شمار سے باہر تھا۔ اسی مال کا غرور تھا کہ آصف خان میں بڑی نخوت پیداہوگئی لیکن جلدی ہی اس کا غرور خاک میں مل گیا۔

ہاتھیوں کا شکار

اسی سال 12 ذی قعدہ کو عین موسم برسات میں بادشاہ نے ہاتھیوں کے شکار کے ارادہ سے نرور کی طرف کوچ کیا اوراس شکار میں اس نے ہاتھیوں کو گرانے اور پکڑنے کے لیے چند نئے طریقے ایجاد کیے۔ نرور سے شاہی سواری سارنگ پور ہوتی ہوئی مندو کے علاقہ میں پہنچی۔ عبد اللہ خان اوزبک اپنے بعض جرائم کی وجہ سے خوف زدہ تھا اس لیے وہ مندو سے بھاگ کر گجرات چلا گیا۔ مقیم خان نے جس کو اس مہم میں شجاعت خان کا خطاب ملا تھا اوزبک کو جا کر بہت کچھ سمجھایا اور اسے دلاسہ دیا لیکن وہ مطمئن نہ ہوا۔ بادشاہی ہراول سے اس نے کچھ مقابلہ بھی کیا۔ جب اکبر قریب پہنچ گیا تو وہ اپنے اہل وعیال اور مال واسباب کو چھوڑ کر چند آدمیوں کے ساتھ گجرات میں چنگیز خان کے پاس چلا گیا۔ بادشاہ کے آدمی گجرات کی حدود تک عبد اللہ خان کا پیچھا کرتے رہے اور اس کے حرم اور ہاتھیوں وغیرہ کو پکڑ لائے۔ جو بچ گئے انھیں جاٹوں نے دھر لیا۔

گجرات کا حاکم چنگیز خان

چنگیز خان سلطان محمود گجراتی کا غلام تھا۔ سلطان کے مرنے کے بعد گجرات کا حاکم بن گیا تھا۔ عام طور پر مشہور ہے کہ اس کے عہد میں گجرات ایسا آباد تھا کہ پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ علم وفضل کا وہاں بڑا دور دورہ تھا۔ جو بے سہارا بھی خان کا سپاہی بن جاتا تھا وہ ہر طرح سے خوشحال ہو جاتا تھا۔ چنگیز خان بڑا فیاض شخص تھا، وہ ہر روز اپنے پہننے کے پانچ چھ جوڑے لوگوں میں تقسیم کرا دیتا تھا اور اس کا ہر جوڑا پچاس، ستر یا اسی اشرفی سے کم دام کا نہیں ہوتا تھا۔

اس کی سخاوت کا ایک معمولی واقعہ مشہور ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں کے ساتھ سیر کر رہا تھا، عبد اللہ خان اوزبک بھی اس کے ساتھ تھا، اتفاق سے اسی وقت نقدی اور اسباب سے بھری ہوئی دو تین کشتیاں اس کے نذرانے میں پیش کی گئیں، اس نے اسی وقت وہ کشتیاں عبداللہ خان کو بخش دیں۔

شاہ عارف ایک عامل، جنوں کی تسخیر کے عمل میں بہت مشہور تھا۔ میں نے اسے لاہور میں دیکھا تھا۔ وہ لوگوں میں خزانے کے خزانے لٹایا کرتا تھا۔ یہ ساری دولت اسے گجرات ہی سے ملی تھی کیوں کہ اس کی اشرفیوں پر بھی چنگیز خان کا ہی سکہ کندہ تھا۔

اسی سفر کے دوران برہان پور کے میران مبارک شاہ نے قاصد بھیج کر اطاعت کا اظہار کیا۔ بادشاہ نے اپنے خواجہ سرا اعتماد خان کو ان قاصدوں کے ہمراہ بھیجا اور وہ جا کر میران شاہ کے بیٹے کو بڑے تحفوں اور نذرانوں سمیت اپنے ساتھ لے آیا۔

اسی سال دکن کے ایک نامی امیر مقرب خان نے بھی آ کر اطاعت قبول کی۔

محرم 972ھ/ 1554ء میں بادشاہ نے مندو سے قصبۂ نالچہ کا رخ کیا اور اس علاقہ کی حکومت قرا بہادر خان کو عطا کی۔ یہاں سے شکار کھیلتے ہوئے اجین، سارنگ پور اور گوالیار کے راستہ سے بادشاہ 3 ربیع الاول کو آگرہ واپس آ گیا۔

اسی سال محل شاہی میں کسی حرم کے بطن سے حسن اور حسین نامی دو توام لڑکے پیدا ہوئے لیکن ایک مہینہ زندہ رہ کر دونوں مر گئے۔

نگر چین نامی شہر کی تعمیر

اکبر بادشاہ نے شہر نگر چین کو اسی سال تعمیر کرایا تھا جس وقت اکبر نامہ کی تصنیف ہو رہی تھی۔ ابو الفضل نے اس شہر کی تعریف میں چند سطریں مجھ (یعنی مصنف منتخب التواریخ) سے لکھوائی تھیں اب اس شہر اور اسکی عمارتوں کا کوئی نشان تک نہیں رہا۔

صدر الصدور کا عہدہ

اسی سال یا سال گذشتہ بادشاہ نے اندری کرنال کے قصبہ سے شیخ عبد القدوس گنگوہیؒ[14] کے پوتے شیخ عبد النبی محدث کو بلا کر صدر الصدور بنایا اور انھیں یہ اجازت دی کہ مظفر خان کی مدد سے لوگوں کے روزینے اور معاش مقرر کیا کریں۔ چند دن بعد ہی وہ مستقل طور پر صدر الصدور ہو گئے۔ شروع شروع میں انھوں نے لوگوں کو اس قدر انعامات اور

روز ینے عطا کیے کہ اگر سابقہ بادشاہوں کے تمام عطیوں کو بھی جمع کیا جائے تو اس کے برابر نہ ہوں، بعد میں ان کا طرز عمل بالکل ہی برعکس ہو گیا۔

اسی سال خواجہ معظم سے جو رشتے میں بادشاہ کا خالو ہوتا تھا بعض نامناسب حرکتیں سرزد ہوئیں۔ اکبر اسے نصیحت کرنے اور ان باتوں سے منع کرنے کے لیے ان کے گھر گیا لیکن وہ بادشاہ کے آنے کی خبر سے اس قدر دہشت زدہ ہوا کہ اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا۔ اکبر نے اسے گرفتار کر کے سزا دی۔ پانی میں غوطے دلائے اور گوالیار کے قلعہ میں قید کر دیا جہاں وہ مر گیا۔

کابل پر تیسرا حملہ

اسی سال تیسری مرتبہ مرزا سلیمان نے کابل کا رخ کیا۔ اس مرتبہ اس کے یہاں آنے کی وجہ یہ تھی کہ جب وہ شاہ ابو المعالی کے سد باب اور میرزا محمد حلیم کو حاکم بنانے کے بعد واپس ہو رہا تھا تو اس نے کابل کے اکثر علاقے اپنے لشکریوں میں بطور جاگیر تقسیم کر دیے تھے۔ اس کے آدمیوں اور مرزا کے درمیان ان بن ہو گئی اور مرزا نے بدخشانی امیروں کو کابل سے بے دخل کر دیا اس کا انتقام لینے کے لیے مرزا سلیمان نے ایک بھاری لشکر لے کر کابل پر چڑھائی کر دی۔ مرزا محمد حکیم میں اس سے مقابلہ کی قوت نہ تھی، اس لیے وہ باقی قاقشال اور چند معتمد سرداروں کو کابل میں چھوڑ کر جلال آباد چلا گیا۔

جب مرزا سلیمان نے اس کا پیچھا کیا تو وہ جلال آباد میں نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے دریائے نیلاب کے کنارے پہنچ کر اس نے اکبر بادشاہ کے پاس ایک عریضہ روانہ کیا۔ مرزا سلیمان نے جلال آباد میں اپنے ایک سردار قنبر نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر رکوا دیا اور خود پشاور سے کابل واپس چلا گیا۔ اکبر کے حکم کے بموجب پنجاب کے تمام امیر جیسے محمد قلی خان برلاس، اتکہ خان اپنی تمام جمعیت سمیت اور ملا قاسم خان، کمال خاں گھکر وغیرہ مرزا محمد حکیم کی مدد پر پہنچ گئے۔ ان لوگوں نے جلال آباد پر حملہ کر کے قنبر کو تین سو آدمیوں سمیت تہہ تیغ کر دیا اور قنبر کا سر فتح کی خوشخبری کے ساتھ کابل میں باقی قاقشال کے پاس

بھیج دیا۔ اب مرزا سلیمان کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ وہ بدخشاں کی طرف بھاگ گیا اور مرزا حکیم فاتحانہ کابل میں داخل ہوا۔ اکبر بادشاہ نے اس کی اتالیقی کے لیے خان کلاں کو مقرر کیا۔ وہ تو وہاں رہ گیا اور دوسرے امرائے لشکر اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ گئے۔

خواجہ حسن نقشبندی

کچھ عرصہ بعد مرزا محمد حکیم نے اپنی بیوہ بہن کو جو شاہ ابو المعالی کے نکاح میں تھی، خان کلاں سے مشورہ کیے بغیر خواجہ نقشبندی کی اولاد میں سے خواجہ حسن نقشبندی کے نکاح میں دے دیا۔ خواجہ حسن کا مرتبہ اس رشتہ کی وجہ سے بڑھ گیا اور وہ کابل کا وکیل مطلق بن گیا۔ تمام امور سلطنت اس کے ہاتھوں انجام پانے لگے۔ اس کے دور حکومت پر ظریفوں نے یہ پھبتی کسی ہے:

گر خواجۂ ما خواجہ حسن خواہد بود
مارا نہ جوال ونی رسن خواہد بود

خواجہ حسن کے اثر ورسوخ کی وجہ سے خان کلاں کے ہاتھ بندھ گئے اور وہ معطل ہوکر رہ گیا۔ یہ صورت حال جب ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ لاہور چلا آیا اور کابل کے سارے حالات بارگاہ شاہی میں لکھ کر روانہ کردیے۔

شیخ الاسلام فتح پوری

اسی سال شیخ الاسلام فتح پوری چشتی نے جو 971ھ/1563ء میں حرمین شریفین سے تشریف لائے تھے، ایک نئی خانقاہ تعمیر کرائی۔ اس کی عمارت ایسی خوش وضع ہے کہ دنیا میں شاید ہی اس جیسی کوئی خانقاہ ہو انکی آمد پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے عربی میں ایک خط لکھ کر بدایوں سے روانہ کیا تھا اور انکے خیر مقدم کی دو تاریخیں درج کی تھیں۔ پہلی تاریخ یہ ہے:

شیخ الاسلام مقتدای انام
رفع اللہ قدرہ السامی

از مدینہ چو سوی ھند آمد
آن ہدایت پناہی نامی
ھند از مقدم ہمایونش
یافت از سر خجستہ فر جامی
گیر حرفی و ترک کن حرفی
بہر سالش ز شیخ الاسلامی

دوسری تاریخ ہے:

شیخ اسلام ولی کامل آن مسیحانفس و خضر قدم
لامع از جبہہ او سر ازل طالع از چہرۂ او نورقدم
از مدینہ چوسوی ہندوستانت آن مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفی و مشمر حرفی بہر تاریخ زخیر المقدم

جس خانقاہ کا ذکر کیا گیا، وہ آٹھ سال میں مکمل ہوئی تھی۔

انھی دنوں آگرہ میں بنگالی محل اس کے علاوہ ایک اور محل کی تعمیر مکمل ہوئی۔ اس تعمیر کے سلسلے میں قاسم ارسلان نے یہ تاریخ کہی ہے:

چون از پی عشرت شہ زیبا منظر فرمود بنا در خانہ فیض اثر
تاریخ یکی از عشرت آمد بیرون شد خانہ بادشاہ تاریخ دگر

بادشاہ سلامت نے 982 ھ/ 1574ء میں ہاتھیوں کے شکار[15] کے لیے نرور اور کرہرہ کا ارادہ کیا اور وہاں شکاریوں کو ہاتھی پکڑنے کے لیے مقرر کر کے شاہانہ سواری گوالیار پہنچ گئی۔ گوالیار میں گرمی کی وجہ سے بادشاہ کو بخار آ گیا۔ جب بادشاہ صحت یاب ہوئے تو دارالخلافہ لوٹ آئے۔

آگرہ کے قلعہ کی تعمیر

اکبر نے اسی سال آگرہ کے قلعہ کا ارادہ کیا اور وہاں کے خشتی قلعہ کو ڈھا کر سنگین قلعہ بنانے کا حکم دیا۔ قلعہ کی تعمیر کے اخراجات کے لیے بادشاہ کے حکم سے فی جریب تین سیر

غلہ کا محصول لگایا گیا۔ یہ محصول سارے ملک میں امراء اور جاگیرداروں سے تحصیل کے کارندوں نے وصول کیا۔ یہ قلعہ پانچ سال میں بن کر تیار ہوگیا، اس کی دیوار کا عرض دس گز اور بلندی چالیس گز ہے۔ فصیل کے گرد جو گہری خندق ہے اس کے دونوں اطراف پتھر اور چونے کے پسے ہوئے گارے سے بنا ہوا ہے۔ اس خندق کا عرض بیس گز اور پانی کی سطح تک گہرائی دس گز ہے۔ خندق میں دریائے جمنا سے پانی لایا گیا ہے۔ قلعہ ہر لحاظ سے ایسا ہے کہ دنیا میں اس کا ثانی نہ ہو۔ اس کے دروازے کی تاریخ شیخ فیضیؔ نے ''بنائی در بہشت'' کہی ہے۔ اس قلعہ کی تعمیر پر تقریباً تین کروڑ روپیہ خرچ ہوا۔ جب قلعہ مکمل ہوگیا تو اس میں ہندوستان کی تمام مالیات کا صدر خزانہ قائم کیا گیا اسی مناسبت سے یہ تاریخ نکالی گئی۔

''شد بنائی قلعہ بہرزر''

جو روپیہ اس قلعہ [16] میں پڑا ہوا ہے نہ معلوم کب اپنی بربادی کی داستان سنائے وہ اپنے زبان سے حال اس طرح بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''اخرجت الارض اثقالھا''

زراز بہر خوردن بود ای پسر
زبہر نہادن چہ سنگ و چہ زر

اوزبک سرداروں کی بغاوت

اسی سال خان زمان، ابراہیم خان اور اسکندر خان اوزبک نے بغاوت کی۔ اس بغاوت کا قصہ یہ ہے کہ عبد اللہ خان اوزبک کی سرکشی کی وجہ سے اکبر تمام اوزبکوں کی طرف سے بد گمان ہوگیا تھا۔ سکندر خان اوزبک اودھ کا جاگیردار تھا۔ اکبر نے نرور سے اشرف خان میر منشی کو بلا کر سکندر خان کو لانے کے لیے اودھ روانہ کیا۔ ابراہیم خان اوزبک تمام اوزبکوں کا سردار، جاگیردار اور حاکم بھی تھا، اودھ پہنچنے کے بعد تمام اوزبک سرداروں نے اکٹھا ہو کر مشورہ کیا اور سب نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فیصلہ کر کے اشرف خاں کو قید کر لیا اور خود جونپور میں خان زمان کے پاس چلے گئے۔

اوزبکوں نے دومقامات سے بغاوت شروع کی۔لکھنؤ میں بغاوت کی ابتدا اسکندر خان اور ابراہیم خان کی سرکردگی میں ہوئی اور کڑہ مانک پور میں بغاوت کے سرگروہ خان زمان اور بہادر خان تھے۔کڑہ پر باغیوں نے شاہم خان جلائیر اور شاہ بداغ خان پر حملہ کر کے شکست دے دی اور یہ دونوں نیم کھار کے قلعہ میں بند ہوگئے۔محمد امین دیوانہ اسی بغاوت میں باغیوں کے ساتھ شہید ہوگیا۔مجنون خان قاقشال بھی باغیوں کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور وہ مانک پور کے قلعہ میں بند ہوگیا اور آصف خان کڑہ اور کنٹلہ کا علاقہ ایک جمعیت کی حفاظت میں دے کر کافی بڑے خزانے اور بھاری لشکر کے ساتھ مجنون خان کی مدد کے لیے پہنچ گیا اور خزانے کا منہ کھول دیا اس نے لشکریوں کا دل ہاتھ میں لے لیا۔ اس کے لشکر میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ان لوگوں نے خان زمان کے مقابلہ میں ایک مضبوط محاذ بنا لیا اور بارگاہ شاہی میں عریضے روانہ کیے، ثانی خان نے اپنے عریضے میں یہ شعر لکھا تھا:

ای شہسوار معرکہ آرائی روز رزم
از دست رفت معرکہ پادر رکاب کن

باغیوں پر اکبر کی فوجی کارروائی

جس وقت بادشاہ سلامت مالوہ کے سفر سے لوٹے تو انھیں اس بغاوت کی اطلاع ملی بادشاہ نے اسی وقت منعم خان خانخاناں کو آگے روانہ کردیا تاکہ وہ دریائے گنگا کو قنوج کے گھاٹ سے پار کرکے باغیوں کے مقابلہ میں صف آرائی کرے۔ اس کی روانگی کے بعد اکبر ماہ شوال970 ھ/1562 ء میں میدان جنگ کے لیے سوار ہوا۔ جب سواری قنوج پہنچی تو قباخان گنگ جو باغیوں کے ساتھ ہوگیا تھا خانخاناں کی سفارش پر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے اس کے جرم معاف کردیے، وہاں سے شاہی لشکر حملہ آور ہوتے ہوئے لکھنؤ پہنچا۔ سکندر خان کو مقابلہ کی ہمت نہیں ہوئی اور وہ لڑے بغیر پسپا ہوگیا نیز خان زمان اور بہادر خان سے جاکر مل گیا۔ یہ سب لوگ آصف خان اور مجنون خان کے مقابلہ کو ترک کر کے جونپور

کی طرف فرار ہو گئے اور اپنے اہل و عیال کے ساتھ نرہن ندی کو پار کر کے خیموں میں رہنے لگے۔

جون پور میں چھاؤنی

ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے شاہی لشکر سے یوسف محمد خان ولد اتکہ خان کو نامزد کیا گیا اس کے پیچھے بادشاہ نے بھی کوچ کیا اور جون پور کے سامنے چھاؤنی ڈال دی۔ اسی جگہ آصف خان، مجنون خان کے ہمراہ پانچ ہزار تجربہ کار سپاہیوں کے ساتھ لشکر میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی خدمت میں نذرانے پیش کیے۔ جمعہ کے دن 975 ھ/1562ء میں اکبر جونپور کے قلعہ میں داخل ہوا۔ آصف خان کو لشکر کی کمان دے کر باغیوں کے مقابلہ پر رخصت کیا۔ اس نے نرہن کے راستہ پر خان زمان کے مقابل اپنا کیمپ لگا دیا۔ بادشاہ نے اس دوران حاجی محمد خان سیستانی کو بنگالہ کے حاکم سلیمان کرانی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ سلیمان کی خان زمان سے بڑی دوستی تھی اور اندیشہ تھا کہ وہ باغی خان کی مدد کرے گا۔ اس سفارت کی عرض یہ تھی کہ اسے خان زمان کی مدد سے روک دیا جائے۔ لیکن جب حاجی محمد خان رہتاس کے قلعہ پر پہنچا تو وہاں کے پٹھانوں نے جو خان زمان سے ملے ہوئے تھے اسے گرفتار کر کے خان زمان کے پاس بھیج دیا۔ خان زمان نے قدیم روابط اور آشنائی کی وجہ سے حاجی محمد خان کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنی والدہ کو اس کے ہمراہ کر کے بادشاہ کے پاس اپنے قصور معاف کرانے کے لیے روانہ کیا۔

جون پور کے قیام کے دوران اکبر نے حسن خان خزانچی اور مہاپاتر بھاٹ کو جو شیر شاہ اور سلیم شاہ کے دربار کا رکن تھا اور ہندی شاعری و موسیقی میں بے نظیر مہارت رکھتا تھا، اوڑیسہ کے راجہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا کہ وہ نہ تو خان زمان کی مدد کرے اور نہ ہی اسے اپنے یہاں پناہ دے بلکہ اپنے اثر سے کام لے کر سلیمان کو بھی مخالفانہ حرکتوں سے روک دے۔ سلیمان نے اس بات کو مان لیا اور بادشاہ کے لیے نفیس تحفے اور عمدہ ہاتھی روانہ کر کے اطاعت اختیار کر لی۔ یہ دونوں سفیر لوٹ کر آگرہ میں ملے۔

آصف خان کا فرار ہونا

انہی دنوں مظفر خان اور دوسرے چند با اثر سردار آصف خان کے مخالف ہو گئے ان کو آصف خان سے بھاری انعام و تحائف کی توقع تھی اور وہ مارے لالچ کے ان مطالبات کو کسی نہ کسی طرح سے ظاہر کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے اس سے صاف صاف چورا گڑھ کے مال غنیمت کا مطالبہ کر دیا۔ آصف خان نرہن کی سڑک پر خان زمان کے مقابلہ میں محاذ جمائے ہوئے تھا۔ اس موقع پر ان لوگوں کے مطالبوں اور مخالفتوں سے وہ سخت پریشان ہو گیا اور آدھی رات کے وقت اپنے چھوٹے بھائی وزیر خان کو لے کر اپنی جمعیت کے ہمراہ کنخلہ کے راستے کڑہ کو چلا گیا۔ جب اس کے محاذ چھوڑ کر چلے جانے کی اطلاع بارگاہ شاہی میں پہنچی تو لشکر کی کمان منعم خان خانخاناں کو دے دی گئی اور شجاعت خان کو آصف خان کے تعاقب پر مقرر کیا۔

رہتاس کا قلعہ

شجاعت خان مانک پور سے کشتیوں پر سوار ہو کر آگے بڑھا تھا کہ اس کی آنے کی خبر آصف خان کو ملی اور وہ لوٹ کر دریا کے کنارے مقابلہ کے لیے آ گیا اور دونوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی اور اس نے شجاعت خان کی کشتیوں کو گنگا پار کرنے سے روک دیا۔ مجبوراً شجاعت خان رات کے وقت پیچھے ہٹ کر گنگا کے دوسرے کنارے پر اتر گیا اور آصف خان نے فوجی کاروائی کر کے اس طرف کے سارے علاقے کو اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ شجاعت خان دوسرے راستہ سے کڑہ چلا گیا اور وہاں سے دشمن کا پیچھا شروع کیا لیکن آصف خاں کافی دور نکل گیا تھا اس لیے وہ جون پور آ کر رکا۔

انہی دنوں رہتاس کے قلعہ کے حاکم فتح خان افغان بتنی نے اپنے بھائی حسن خان کو بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ 972ھ/1564ء میں سلیمان کرانی[17] نے اس قلعہ پر حملہ کیا تھا لیکن جب اس نے شہنشاہ کے آنے کی خبر سنی تو محاصرہ اٹھا لیا تھا۔ غرض حسن خان نے حاضر ہو کر مناسب نذرانے گزارے اور درخواست کی کہ کسی سردار کو مقرر کر دیا

جائے تاکہ ہم قلعہ اس کے سپرد کریں۔ بادشاہ نے جون پور سے خلیج خان کو اس کے ہمراہ روانہ کردیا۔ بعد میں فتح خان اپنے بھائی کو اس سفارت پر بھیجنے سے پشیماں ہوا اور قلعہ میں کافی رسد کا سامان جمع کر کے اپنے بھائی کو لکھ کر بھیجا کہ تم جلد از جلد لوٹ آؤ کیوں کہ اب قلعے میں رسد وغیرہ کا ذخیرہ ہوچکا ہے اور قلعہ سپرد کرنے کا ارادہ نہیں ہے۔ حسن خان نے اس خط کے ملنے پر خلیج خان کو دھوکہ میں رکھنے کی کوشش کی، بظاہر وہ اس کی بڑی اطاعت کرتا رہتا تھا لیکن خلیج خان جلد اس کی منافقت سے آگاہ ہوگیا اور قلعہ کا خیال چھوڑ کر خالی ہاتھ لوٹ آیا۔

رہتاس کا یہ قلعہ بہار کے صوبہ میں چودہ کوس کے طول اور تین کوس کے عرض میں واقع ہے۔ اس کی بلندی پانچ کوس ہے۔ قلعہ کے اندر زراعت ہوتی ہے۔ پانی کی اتنی فراوانی ہے کہ جہاں کیل گاڑو پانی نکل آتا ہے۔ جب سے شیر شاہ نے یہ قلعہ فتح کیا تھا پٹھانوں کے قبضہ میں چلا آرہا تھا یہاں تک کہ فتح خان اس کا حاکم بنا اور اس نے سلیمان کے سامنے ہار نہ مانی، آخر کار فتح خان سے شاہی لشکر نے یہ قلعہ چھین لیا۔

صلح میں کہاسنی

جونپور میں بادشاہ چھاؤنی ڈالے ہوئے مقیم تھے اور انھوں نے منعم خان کو مقدمۃ الجیش کا سردار بنا کر خان زمان کے مقابلہ میں بھیجا تھا اور خود امور سلطنت کی انجام دہی میں مشغول رہے۔ جب منعم خان نرہن گھاٹ پر اسکے مقابلہ کے لیے پہنچا تو خان زمان نے بہادر خان کو سردار بنا کر سرور کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ اس علاقہ میں شورش برپا کر کے جہاں تک ممکن ہے قبضہ کرلیں۔ باغیوں کی اس کاروائی کو روکنے کے لیے بادشاہ نے معزالملک مشہدی کو جو قطعاً سردار کی اہلیت نہیں رکھتا تھا، مقرر کیا۔ اس کے ساتھ لشکر کے بڑے امرا جیسے شاہ بداغ خان، اس کا لڑکا عبدالمطلب خان، سعید خان اور محمد معصوم خان فرنخودی وغیرہ کو بھی نامزد کیا گیا۔

اسی دوران منعم خان نے خان زمان سے سابقہ روابط کی بنا پر سفارت و مراسلت جاری

رکھی اور اسی میں اس نے چار پانچ مہینے گزار دیے اور باغیوں کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی۔ آخر بادشاہ نے صلح یا جنگ کے قطعی فیصلہ کی خاطر خواجہ جہان اور دربار خان کو جون پور سے نرہن روانہ کیا۔ ان لوگوں کے آنے پر صلح کی باقاعدہ گفتگو ہوئی باغیوں کی طرف سے خان زمان دو تین آدمیوں کے ساتھ اور لشکر شاہی کے ساتھ کشتیوں میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے ملے۔ آخر کار صلح اس شرط پر طے پائی کہ خان زمان اپنی والدہ کو اپنے چچا ابراہیم خان کے ہمراہ دربار میں بھیج دے اور جتنے مشہور اور عمدہ ہاتھی اسکے پاس ہیں وہ شاہی کارندوں کے سپرد کردے۔ جب اسے معافی مل جائے تو سکندر اور بہادر بھی دربار میں حاضر ہوجائیں۔ جب صلح طے پاگئی تو دربار خان واپس چلا گیا اور بادشاہ کو اسکی اطلاع دی۔

دوسرے دن خانخاناں اور خواجہ جہان خان کی والدہ اور ابراہیم خان کو ہمراہ لے کر مع ہاتھیوں کے بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گئے اور دونوں نے خان زمان کے قصور کو معاف کر دینے کی سفارش کی، شاید اسے معافی مل جاتی، لیکن اسی وقت سردار سے میر معزا لملک کی شکست اور فرار کی اطلاع پہنچی جسے سنتے ہی شہنشاہ کا پارہ چڑھ گیا اور وہ صلح ادھوری رہ گئی۔

معز الملک کی فوجی کاروائی

معز الملک کی شکست کا قصہ یہ ہوا کہ جب سکندر اور بہادر کے مقابلہ پر شاہی فوج پہنچی تو یہ دونوں اس جگہ رُک گئے، جہاں تک کہ وہ پیش قدمی کرچکے تھے اور معز الملک کو پیغام دیا کہ تم ہمارا واسطہ بن کر دربار سے ہمارے جرم کو معاف کرادو تاکہ جو کچھ ہاتھی اور مال غنیمت ہم نے جمع کر رکھا ہے وہ سب ہم دربار میں روانہ کردیں۔ جب ہماری خطائیں معاف ہوجائیں گی تو ہم خدمت میں حاضر ہوجائیں گے۔ میر معز الملک ایک فرعون صفت آدمی تھا اور یہ غرور شاید مشہدی سیدوں کو وراثت ہی میں ملا ہے اس لیے مشہور ہے:

اہل مشہد بجز امام شما
لعنۃ اللہ بر تمامِ شما

ان کی شان میں ایک شعر یہ بھی ہے:

روی زمین گر چہ زمردم خوش است
مشہدی از روی زمین گم خوش است

چنانچہ اس نے بڑے تکبر اور بد اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور انکے اظہار اطاعت پر کہلا بھیجا کہ اب صرف تلوار ہی تمہارا فیصلہ کرے گی۔ ابھی معاملہ اسی نوبت پر تھا کہ بادشاہ کی طرف سے لشکر خان میر بخش اور میر ٹوڈرمل پہنچے تاکہ صلح یا جنگ کوئی ایک بات جلد از جلد طے پاجائے اگر مناسب ہو تو جنگ کریں ورنہ سکندر اور بہادر کو تسلی اور دلاسہ دے کر اپنے ساتھ لیتے آئیں۔

جنگ کی پیشکش

بہادر خان خود شاہی لشکر کی چھاؤنی کے قریب آیا اور اس نے میر معز الملک کو چند امیروں کے ساتھ بلا کر صلح کی گفتگو چھیڑی اور کہا کہ ”خان زمان اپنی والدہ اور ابراہیم خان کو صلح کے لیے دربار میں بھیج رہا ہے بلکہ اب تک وہ بھیج بھی چکا ہوگا، اس لیے ہم کو اپنے قصوروں کی معافی کی امید اور توقع ہے، ہم اس سفارت کے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔ جب تک یہ معاملہ ٹھیک نہیں ہوجاتا ہم لڑائی چھیڑنا نہیں چاہتے تم بھی دربار سے جواب آنے تک کچھ دن تک لڑائی کو ملتوی رکھو تو بہتر ہے“۔

معز الملک کی شکست

جنگ کے لیے بہادر خان کا یہ مطالبہ نہایت معقول تھا لیکن میر معز الملک کو اتنی سمجھ کہاں؟ وہ تو بس آگ بنا ہوا تھا اور راجہ ٹوڈرمل تیل سے کم نہیں تھے، وہ برابر اس آگ کو بھڑکاتے رہے، چنانچہ انھوں نے بہادر خان کو منہ توڑ جواب دیا ان کے اس رویہ سے بہادر خان اور اسکندر خان مایوس ہوگئے اور مقابلے کے لیے صف آرا ہوئے۔ میر معز الملک نے اس کے مقابلے پر محمد امین دیوانہ کو لشکر کی رہبری پر مقرر کیا اور آگے بڑھایا اور خود لشکر کے بیچ رُکا رہا۔ اپنے ساتھ تجربہ کار سپاہیوں اور عبدالمطلب خان، سلیم خان، کاکر علی خان، بیگ

نورین خان سرداروں کو مقرر کر کے دوسرے امیروں کو میمنہ اور میسرہ پر لگا دیا۔ دوسری طرف باغیوں کے ہر اول پر تو سکندر خان اور اس کا داماد محمد یار تھا، قول بہادر خان خود کمان سنبھالے ہوئے تھا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ جلد ہی محمد یار قتل ہوگیا اور اسکندر خان گھبرا کر کالی ندی میں کود پڑا اور تیر کر نکل گیا۔ اس کے اکثر ہمراہی ندی میں غرق ہوگئے۔ جو بچے وہ دشمن کی تلوار کا نشانہ بن گئے۔ ساری فوج لوٹ مار میں منتشر ہوگئی۔ میدان میں میر معز الملک اپنے چند سرداروں کے ساتھ ساتھ تنہا رہ گیا۔ بہادر خان ابھی تک اپنے مورچے پر جما ہوا تھا، اس نے جب میر کو تنہا پایا تو اچانک اس پر حملہ کردیا اور ایک ہی حملہ میں اس کے قدم اکھاڑ دیے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سے جنگجو جوانوں نے خاص طور سے حسین خان خویش، مہدی قاسم خان اور باقی محمد خان وغیرہ نے جو میر معز الملک کی سرداری اور راجہ ٹوڈرمل کے حکم چلانے سے رنجیدہ تھے جس قدر جد و جہد کرنی چاہیے تھی، نہیں کی۔ البتہ شاہ بداغ خان نے بہادری کے خوب جوہر دکھائے۔ لڑتے لڑتے وہ گھوڑے سے گر پڑا، اس کے بیٹے عبد المطلب خان نے اس کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا آخر اپنی جان بچا کر نکل گیا اور اس کا باپ اوزبکوں کے ہاتھ قید ہوگیا۔ راجہ ٹوڈرمل اور خان کا لشکر پسپا ہوگیا، رات میں ان لوگوں نے ہاری ہوئی جنگ جیتنے کے لیے باغیوں پر حملہ کیا لیکن کچھ نہ کر سکے، باغیوں نے انکو منتشر کر کے بھگا دیا۔ دوسرے دن یہ سب اکٹھا ہوکر شیر گڑھ کی طرف چلے گئے اور ساری روداد دربار میں لکھ بھیجی۔

باغیوں کی اطاعت اور معافی

جب خان خاناں، خان زمان کی والدہ ابراہیم خان اور خان زمان کے معتمد آدمیوں میر ہادی صدر اور نظام آغا کو دربار میں لے کر آیا اور جنگی ہاتھی بھی حضور میں پیش کیے تو ابراہیم خان سر برہنہ گردن میں تلوار لٹکائے اور بجائے چادر کے کفن لپیٹے ہوئے زبان حال و قال سے کہہ رہا تھا:

''خواہی بدار خواہی بکش رائی رای تست''

خان خاناں بھی ان لوگوں کی سفارش کرتے ہوئے ان کی خدمات کا تذکرہ کر رہا تھا، بادشاہ نے ان سب کے جرم معاف کردیے، ان کی جاگیریں بحال کردیں اور حکم دیا کہ جب تک لشکر یہاں ہے یہ لوگ دریا پار نہ کریں اور ان کے نمائندے آگرہ میں آکر فرامین حاصل کر کے حسب فرمان اپنی جاگیروں کو سنبھال لیں۔ خان زمان کی والدہ نے یہ خوشخبری اپنے بیٹوں کے پاس بھیج دی اور بہادر وسکندر نے کوہ پارہ اور صف شکن ہاتھیوں کو جن کی وجہ سے یہ سارا فتنہ برپا ہوا تھا۔ نذرانوں اور تحفوں کے ساتھ بادشاہ کے پاس بھیج دیا۔ عین اسی مرحلہ پر ٹوڈرمل اور لشکر خان کا عریضہ جس میں لڑائی اور شکست اور امرا کی منافقت کا ذکر تھا پہنچا۔ اس پر بادشاہ نے حکم دیا، ہم نے خانخاناں کی خاطر سے خان زمان اور دوسروں کو معافی دے دی ہے اب تمام امیر دربار میں لوٹ آئیں۔ اسی سلسلے میں میر معز الملک اور راجہ ٹوڈرمل پر شاہی عنایات نازل ہوئیں جن لوگوں نے منافقت سے کام لیا تھا وہ عرصہ تک کورنش و تسلیمات سے محروم کردیے گئے بعد میں پھر ان کو اپنے اپنے اعزاز دوبارہ مل گئے۔

خان زمان کی وعدہ خلافی

اسی زمانہ میں بادشاہ نے کوچ کیا، چنار کے قلعہ کی سیر کی اور اس قلعہ کے جنگل میں ہاتھیوں کا شکار کرنے کے بعد لشکر میں لوٹ آئے۔ جس زمانہ میں چنار کے قلعہ میں چھاؤنی تھی خان زمان نے عجلت کر کے دریائے گنگا کو پار کیا اور معاہدۂ صلح کے خلاف قصبۂ مئو کے ملحقہ دیہات محمد آباد میں آگیا اور اپنے گماشتوں کو جون پور اور غازی پور پر قبضہ کرنے کے لیے بھیج دیا۔شہنشاہ کو اس کی حرکت ناگوار گزری،انھوں نے اشرف خان میر منشی کو جون پور بھیجا تا کہ خان زمان کی والدہ کو قلعہ میں نظر بند کر کے باغیوں کو گرفتار کرلیا جائے۔ پھر بادشاہ نے لشکر کو خواجہ جہان اور مظفر خان کی تحویل میں چھوڑا اور خود خان زمان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ جب بادشاہ سروار ندی کے کنارے پہنچے تو غنیم کی مال و اسباب سے لدی ہوئی کشتیاں بادشاہی آدمیوں کے ہاتھ آگئیں۔ بادشاہ نے ندی کے کناروں پر چوکیاں قائم کر کے گھنے جنگلوں کو طے کیا۔ جب معلوم ہوا کہ خان زمان سوا لک

کی پہاڑی کی طرف بھاگ گیا ہے تو اس کا پیچھا چھوڑ کر لوٹ آئے۔

اسی اثنا میں بہادر خان چند بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کے ساتھ جون پور پہنچا اور کمندوں کے ذریعے قلعہ پر چڑھ کر اپنی والدہ کو چھڑا لایا اور اشرف خان کو قید کرلیا لیکن جب اس کو بادشاہ کے لوٹ آنے کی خبر ملی تو وہ سکندر خان کے ہمراہ نرہن گھاٹ کے ذریعہ گنگا کو پار کر کے بھاگ گیا۔

بادشاہ کی سالگرہ کا جشن

پانچ رجب 973 ھ/1565 ء کو جون پور کے ملحقہ پرگنہ نظام آباد میں اکبر کی سالگرہ ہوئی۔ معمول یہ تھا کہ سالگرہ پر بادشاہ کو تولنے کا جشن منعقد ہوتا تھا جس میں شمسی اور قمری تاریخوں کے حساب سے سال میں دوبار سونے چاندی اور ہر قسم کے اجناس سے بادشاہ کو تولا جاتا تھا پھر یہ تول برہمنوں اور دوسرے محتاجوں میں تقسیم کردیا جاتا تھا اس رسم کی مناسبت سے شعرا نے بڑے اچھے اشعار بھی کہے ہیں۔

اکبر کی واپسی۔ آگرہ

سالگرہ کے جشن کے بعد بادشاہ جون پور کے قلعہ میں داخل ہوئے۔ جب خان زمان کو بادشاہ کے قیام کی اطلاع ملی تو اس نے میرزا میرک کو جسے بعد میں رضوی خان کا خطاب ملا تھا خان خاناں کے پاس سفارش کروانے بھیجا وہ خان زمان کی والدہ کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا، خان زمان کا پیغام اطاعت پیش کیا۔ خان خاناں نے میر عبد اللطیف قزوینی، ملا عبد اللہ مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی صدر کے ساتھ دوبارہ خان زمان کے قصور معاف کرنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے یہ درخواست قبول کرلی۔ خواجہ جہاں مرتضیٰ شریفی(18) اور مخدوم الملک کو خان زمان کو توبہ کرانے اور معافی کی خوش خبری سنانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ خان زمان نے ان لوگوں کا استقبال کیا اور قسمیں کھا کر اطاعت کا عہد کیا اور اپنے عزیزوں کو دربار میں کورنش بجالانے کے لیے کہا۔ خان زمان کے معاملہ کو سلجھانے کے بعد

بادشاہ نے 973ھ/1565ء کے آخر میں آگرہ واپس پہنچ کر آرام کیا۔ پھر وہاں سے نئے شہر نگر چین میں جا کر چوگان بازی، کتوں کی دوڑ اور جانوروں کے شکار میں مشغول ہو گئے۔ اسی موقع پر بادشاہ نے ایک آتشیں گولہ ایجاد کیا جسے اندھیری رات میں چھوڑا جاتا تھا۔ انہی دنوں محمد یوسف خان ولد اتکہ خان کی کثرت شراب نوشی سے موت ہو گئی تھی۔

اسی سال بادشاہ نے آصف خان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مہدی قاسم خان اُس کے داماد حسین خان اور خالدی خان کو چند اور امرا کے ساتھ تین چار ہزار کی جمعیت دے کر کڑہ کنخلہ کی طرف روانہ کیا۔ آصف خان نے چوراگڑھ کے قلعہ کو خالی کر دیا اور دربار میں معافی کے لیے عریضہ روانہ کیا لیکن، اس کی درخواست قبول نہ کی گئی۔ مجبور ہو کر اس نے خان زمان کو ایک خط لکھا اور خود بھی اپنے بھائی وزیر خان کو لے کر جون پور میں خان زمان کے پاس آ گیا، لیکن خان زمان نے پہلی ملاقات میں ہی اس سے ایسی لاپروائی برتی کہ وہ یہاں آنے پر سخت پشیمان ہو گیا۔

اس عرصہ میں مہدی قاسم خان نے کڑہ کے علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر جاگیر داروں میں تقسیم کر دیا اور آصف خان کے تعاقب کو چھوڑ کر ہندیہ کے راستہ سے مکہ معظمہ کے ارادہ سے چلا گیا۔ حسین خان اپنے آدمیوں کے ساتھ اس کو چھوڑنے کے لیے دکن کے قریب ستواس کے قلعہ تک گیا تھا۔

مرزاؤں کی بغاوت

اسی زمانہ میں اچانک سلطان محمد مرزا کے بیٹوں ابراہیم حسین مرزا، شاہ مرزا اور محمد حسین مرزا نے بغاوت کر دی۔ سلطان محمد مرزا کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف سے تو امیر تیمور صاحبقراں اور ماں کی طرف سے سلطان حسین مرزا سے ملتا ہے اور اب وہ کافی بوڑھا ہو چکا ہے، بادشاہ نے اعظم پور کا پرگنہ اس کو جاگیر میں دیا تھا۔ اس کے بیٹوں نے سنبل کے علاقہ میں بغاوت کا رخ اختیار کیا تھا۔ اس وقت بادشاہ، خان زمان کے قصہ سے فارغ ہونے کے بعد محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو دبانے کے لیے پنجاب گئے ہوئے تھے۔ منعم خان نے ان

بھائیوں کی مدافعت کی۔ وہ منعم خان کے مقابلے سے بھاگ کر دوآبہ میں چلے گئے اور دہلی سے گزر کر مالوہ جا پہنچے۔ وہاں سے تو دو بھائی شاہ میرزا اور محمد حسین مرزا تو ہندیہ چلے گئے اور ابراہیم حسین مرزا نے سنو اس کا رخ کیا جو دس کوس کے فاصلے پر تھا۔ حسین خان دکن کے ایک امیر مقرب خان کی مدد سے قلعہ ستواس میں قلعہ بند ہوگیا۔ قلعہ میں کافی ذخیرہ نہ تھا اس کے لشکری گھوڑے، اونٹ اور بیل تک کاٹ کر کھا گئے، فاقہ اور بھوک سے ان کا برا حال تھا اور کسی طرف سے کوئی مدد نہیں پہنچ رہی تھی اس کے باوجود ان لوگوں نے میرزا ابراہیم حسین کی صلح کی پیشکش کو قبول نہیں کیا اور قلعہ میں بند فوج نے لڑنے میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا ابراہیم حسین نے ہندیہ میں مقرب خان کے بھائی برق دم خان کو قتل کر دیا تھا اور اس کے اہل وعیال کو بھی قید کر لیا تھا۔ جب مقرب خان اور حسین خان صلح پر راضی نہیں ہوئے تو اس نے برق دم خان کا سر نیزہ پر بلند کر کے مقرب خان کو دکھایا اور اس کی ماں کو بھی اس کے سامنے لا کر کہا کہ ھندیہ فتح ہو چکا ہے، تمہارے عزیز رشتہ دار اور وہاں کے سارے لوگ گرفتار ہو چکے ہیں اب تم کس کے بھروسہ لڑائی پر کمر باندھے ہوئے ہو؟ یہ دیکھ اور سن کر مقرب خان کے ہوش اڑ گئے اور وہ اطاعت قبول کر کے مرزاؤں کی خدمت میں حاضر ہوگیا۔ انھوں نے اسے سلامتی کے ساتھ چھوڑ دیا۔ جب 975ھ/1567ء میں شہنشاہ لاہور سے آگرہ تشریف لائے تھے تو حسین خان دربار میں حاضر ہوا تھا، اس موقع پر اس کی جاگیر میں پٹیالی کے ساتھ شمس آباد کا پرگنہ بھی اضافہ کر دیا گیا تھا۔

حسین خان کی مصاحبت

میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس سے ایک سال پہلے پٹیالی گیا تھا وہاں حسین خان سے جب ملاقات ہوئی تو میں نے اسے نہایت با اخلاق، منکسر مزاج، درویش صفت، بہادر، سخی، خوش اخلاق، پکا سُنی، علم پرور اور علم دوست پایا۔ وہ میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آیا، چنانچہ اس کی رفاقت چھوڑ کر دوسری جگہ جانا اور کسی اور کی ملازمت اختیار کرنا میں نے مناسب نہ جانا اور اسی جگہ ٹھہر گیا اور دس سال اس گوشہ گمنامی میں اس کی دوستی اور رفاقت

میں گزار دیے۔ آسمان بھلا اس خوش وقتی کو کہاں دیکھ سکتا تھا، ہماری آپس میں کچھ ایسی رنجش ہوگئی کہ جدائی کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔ اس نے میری خفگی کو دور کرنے کے لیے بڑی کوشش کی اور معذرت چاہی، یہاں تک کہ بدایوں جاکر والدۂ مرحومہ تک کو بیچ میں ڈالا، لیکن میرا دل ایسا پھرا تھا کہ میں اس کے پاس نہ گیا اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا:

دل کہ رنجید کسی خورسند کردن مشکل است
شیشۂ بشکستہ را پیوند کردن مشکل است

آصف خان کا فرار

خان زمان نے آصف خان اور بہادر خان کو پٹھانوں کے علاقوں پر فوج کشی کے لیے مقرر کیا اور وزیر خان کو کسی بہانے اپنے پاس روک کر نظر بند کر دیا۔ دونوں بھائیوں نے آپس میں خط و کتابت کر کے فرار ہو جانے کی ٹھانی، چنانچہ ایک مقرر رات کو وزیر خان تو خان زمان کے پاس سے بھاگ گیا اور اس کا بھائی آصف خان، بہادر خان کے پاس سے بھاگ کر آگرہ اور مانک پور کے راستہ پر تین کوس تک چلا گیا۔ بہادر خان نے آصف خان کا پیچھا کر کے راستہ روک دیا اور دونوں میں جون پور اور مانک پور کے درمیان ایک سخت جنگ ہوئی جس میں آصف خان کو شکست ہوئی اور وہ گرفتار ہو گیا۔ بہادر خان اسے ہاتھی پر عماری میں بیٹھا کر اپنے ساتھ لے چلا۔ اسی اثنا میں وزیر خان جون پور سے بھائی کو چھڑانے کے لیے وہاں پہنچ گیا اس وقت بہادر خان کی جمعیت مال غنیمت لوٹنے کے لیے منتشر ہوگئی تھی اس لیے وزیر خان کے اچانک حملہ کی بہادر خان مدافعت نہ کر سکا اور اسی حال میں اس نے حکم دیا کہ آصف خان کو عماری میں ہی قتل کر دیں۔ لوگوں نے آصف خان پر حملہ کر دیا۔ تلوار کا ایک زخم اسکی ناک پر آیا اور اس کی دو تین انگلیاں بھی کٹ گئیں، عین اس موقع پر وزیر خان نے تیزی سے بڑھ کر آصف خان کو قاتلوں کے گھیرے سے چھڑا لیا اور دونوں بھائی وہاں سے بھاگ کر کڑہ کی طرف چلے گئے اور بہادر خان کو خالی ہاتھ لوٹ جانا پڑا۔ جس زمانہ میں اکبر بادشاہ مرزا محمد حکیم کا پیچھا کرتے ہوئے لاہور کے

علاقے میں پہنچے تھے اور وہاں شکار میں مصروف تھے، وزیر خان خدمت سلطانی میں حاضر ہوگیا۔ مظفر خان کے وسیلہ سے اسے باریابی نصیب ہوئی۔ بادشاہ نے آصف خان کے نام معافی اور مہربانی کا فرمان لکھ دیا۔

کابل پر مرزا سلیمان کا چوتھا حملہ

اسی سال مرزا محمد حکیم بھی لاہور پہنچا تھا اس کے لاہور آنے کا سبب یہ تھا کہ جب تیسری مرتبہ مرزا سلیمان کابل سے واپس ہوگیا اور کابل پر مرزا حکیم کا پوری طرح قبضہ ہوگیا تو اس نے بادشاہی امیروں کو ہندوستان واپس کردیا اور خواجہ حسن نقشبندی کو اپنی وکالت کے عہدہ پر مستقل کردیا۔ اس کی اس کاروائی سے رنجیدہ ہوکر خان کلاں کابل چھوڑ کر لاہور چلا گیا۔ مرزا سلیمان کے لیے اس سے اچھا کیا موقع ہوسکتا تھا چنانچہ اس نے میدان کو صاف دیکھ کر چوتھی بار اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کی مدد و تائید سے کابل پر چڑھائی کردی اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس موقع پر مرزا حکیم نے کابل محمد معصوم کوکہ کے حوالہ کردیا اور خود خواجہ حسن نقشبندی کے ساتھ غور بند کی طرف چلا گیا۔ یہ محمد معصوم وہی شخص ہے جس نے بعد میں ہندوستان پہنچ کر بڑے فتنے اور بغاوتیں برپا کیں، ویسے یہ نہایت بہادر اور دلیر شخص تھا۔

جب مرزا سلیمان کابل پر بزور تلوار قبضہ نہ کرسکا تو اس نے اپنی بیوی ولی نعمت بیگم کے ذریعہ مکرو فریب سے کام لینا چاہا، چنانچہ بیگم وہاں سے قراباغ پہنچی جو کابل سے دس کوس پر غور بند کی سرحد پر واقع ہے۔ وہاں اس نے مرزا سے صلح کا سلسلہ بنایا اور بڑی سخت قسمیں کھاکر اسے صلح کی گفتگو کے لیے بلایا۔ میرزا چند آدمیوں کے ساتھ اس کے لیے روانہ ہوگیا۔ خواجہ حسن بھی مصالحت پر آمادہ ہوگیا تھا لیکن باقی مسلئے پر آمادہ نہیں ہوا تھا اُس نے کھل کر کہہ دیا تھا کہ یہ عورت نہایت مکار اور چالباز ہے اس کے بھرّے میں نہیں آنا چاہیے۔ اس کا خیال صحیح تھا کیوں کہ ابھی مرزا محمد حکیم قراباغ پہنچنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا سلیمان ایک بھاری جمعیت لے کر حملہ کرتا ہوا کابل سے وہاں پہنچ گیا اور گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ مرزا محمد حکیم کے چند آدمیوں کی مرزا سلیمان کے

لشکریوں سے مڈبھیڑ ہوگئی، انھوں نے فوراً اس کی اطلاع مرزا حکیم کو پہنچادی اور وہ وہاں سے الٹے پاؤں غوربند بھاگ گیا۔ حملہ آوروں کے ڈر سے وہاں بھی اس کے قدم نہیں رکے اور وہ ہندوکش کی پہاڑی کے راستہ پر چلا گیا۔خواجہ حسن تو چاہتا تھا کہ اسے حاکم بلخ پیرمحمد خان کے پاس مدد حاصل کرنے کے لیے لے جائے لیکن باقی قاقشال نے اس ارادہ کی سختی سے مخالفت کی اور مرزا کو اکبر بادشاہ کے حضور میں لے جانے کے لیے پنجشیر کے راستے جلال آباد پہنچا۔ وہاں سے یہ لوگ دریائے نیلاب کے کنارے کنارے آگے بڑھے اور دریائے سندھ کو پار کرکے بارگاہ شاہی میں عریضہ ارسال کیا۔ یہ تو ادھر آئے اور خواجہ حسن اپنی جمعیت کو لے کر بلخ چلا گیا۔ کچھ مدت بعد وہاں وہ ایسی پریشانیوں میں گھر کر رہ گیا کہ زندگی اس پر عذاب بن گئی۔

مرزا حکیم فرار ہواتو مرزا سلیمان نے کوتل کے سنجد دَرّے تک اس کا تعاقب کیا اور اس کے لشکر کے پیچھے والے حصہ کو گھیر لیا۔ اس کا سارا مال واسباب لوٹ کر اسی جگہ اپنا پڑاؤ ڈال دیا۔

مرزا سلیمان کی واپسی

جب مرزا سلیمان، مرزا حکیم کی فکر میں کابل سے ہٹا تو محمد معصوم کابلی نے قلعہ سے نکل کر اس کے لشکر پر حملہ کردیا اور اس کے سردار محمد قلی شفالی کو شکست دے کر چار باغ میں چھپ گیا۔ جب سلیمان کو یہ اطلاع ملی تواس نے قاضی خان بدخشی کو سفیر بنا کر بھیجا۔ محمد معصوم پہلے توصلح پر بالکل راضی نہ ہوا۔ قاضی خان چونکہ اس کا استاد تھا۔ اس لیے بعد میں وہ اس کا کہا ماننے پر راضی ہوگیا اورمرزا اس سے تھوڑی بہت پیش کش لے کر بدخشاں واپس چلا گیا۔

خوش خبرخان کی فتنہ پردازی

اس سے پہلے کہ مرزا محمد حکیم کا ایلچی دربار میں پہنچے اکبر نے کابل کے اس نئے ہنگامہ کا حال سن کر خوش خبر خاں سلول کے ذریعہ مرزا حکیم کے لیے سونے کے مرصع لگام والا گھوڑا

ہندوستان کے نفیس تحائف کافی رقم اور امرائے پنجاب کی امدادی فوجیں ایک فرمان کے ہمراہ روانہ کردی تھیں مرزا محمد حکیم نے فرمان شاہی کا بڑھ کر استقبال کیا اور دربار شاہی میں حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا۔ اسی اثناء میں وہاں فریدوں خان[19] پہنچ گیا، جسے بادشاہ نے کابل کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے نگر چین سے روانہ کیا تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کرمرزا کو الٹی پٹی پڑھائی اور سارے معاملہ کو ایک دوسرے ہی رخ پرڈال دیا۔ مرزا کو بہکانے میں شہاب خان کے بھائی حسن خان کا جواس زمانہ میں کابل ہی میں تھا اور سلطان علی نامی خبرنویس کا جو ہندوستان سے بھاگ کر ایسے ہی کسی واقعہ کا انتظار کررہا تھا، بڑا ہاتھ ہے۔ ان دونوں نے فریدون خان کی ہاں میں ہاں ملاکر مرزا حکیم کو مطمئن کردیا کہ لاہور پر قبضہ کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ لیکن خوش خبر خان کے حامیوں نے اس کی مخالفت کی آخر کار سب نے خوش خبر خان کو گرفتار کر لینے کا فیصلہ کیا۔ مرزا حکیم طبعاً بڑا با مروت آدمی تھا، اس نے خوش خبر خان کو علیحدہ بلا کر اسے وہاں سے رخصت کردیا۔ یہ خوش خبر خان اُس زمانہ میں جبکہ بادشاہ لاہور کے علاقہ میں شکار میں مصروف تھے، دریائے راوی میں ڈوب کر مرگیا۔

مرزا محمد حکیم کا لاہور پر حملہ

مرزا محمد حکیم نے بہرحال بغاوت پر کمر باندھ لی اور لوٹ مار کرتا ہوا بھیرہ تک پہنچ گیا اور وہاں سے غارت گری اور مسلسل کوچ کرکے لاہور کے سامنے دریائے راوی کے کنارے مہدی قاسم خان کے باغ میں اپنا کیمپ لگا دیا۔ اس کے مقابلے کے لیے میر محمد خان اورتمام اتکہ کے امرا نے پوری تیاری کرلی اور قلعہ میں بند ہوگئے۔ مرزا حکیم نے فصیل پر حملہ کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن ان امیروں نے اس کو حصار کے قریب ٹک پھٹکنے نہ دیا۔

جب ان امیروں کے عریضے بارگاہ سلطانی میں پہنچے تو بادشاہ نے آگرہ کو خان خاناں اور مظفر خان کی حفاظت میں دے کر 3 جمادی الاول 974ھ/1566ء میں خود کوچ کیا اور دہلی و سرہند کے راستے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ مرزا محمد حکیم کو جیسے ہی بادشاہ کے

حملہ کی اطلاع ملی اس کے ہاتھ پیر پھول گئے اور وہ جس راستہ سے آیا تھا اسی راستہ سے کابل واپس چلا گیا۔

لاہور سے مرزا کے تعاقب میں قطب الدین محمد خان اور کمال خان گکھر کو روانہ کیا گیا یہ لوگ کچھ دور تک جاکر بھیرہ سے واپس چلے آئے۔ انہی دنوں سندھ کے حاکم محمد باقی ترخان ولد مرزا محمد عیسیٰ کا عریضہ دربار میں پہنچا جس میں اس نے اپنی اطاعت کا اظہار کیا تھا، اور بھکر [20] کے حاکم سلطان محمود کی شکایت کی تھی کہ اس نے سندھ اور لاہور کے علاقے میں مداخلت کر کے نقصان پہنچایا ہے۔ بادشاہ نے اسکے حسب مدعا سلطان محمود کے نام فرمان لکھ دیا۔ لاہور میں قیام کے دوران خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ معز مرزا اور شاہ مرزا نے جن کو سنبل اور اعظم پور کے توابعات میں ہنتور کی جاگیر دی گئی تھی اپنے چچا ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے بہکانے سے بغاوت کردی ہے۔ خالصہ کے بعض پرگنوں پر قبضہ کرلیا ہے اور جب ان کا پیچھا کیا گیا تو یہ مالوہ کی طرف بھاگ گئے ہیں۔

سیر و شکار

انہی دنوں بادشاہ نے ہانکے کا شکار کھیلا۔ اس شکار کے لیے تقریباً چالیس کوس سے جانوروں کو ہنکا ہنکا کر گھیرے میں لایا گیا اور بتدریج اس گھیرے کو تنگ کر دیا گیا۔ اس گھیرے میں ہر قسم کے تقریباً ہزار جانور آ گئے تھے۔ بادشاہ نے خاص و عام کو درجہ بدرجہ شکار کرنے کا حکم دیا۔ شکار سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے اپنا گھوڑا دریائے راوی میں ڈال دیا۔

سوائے ایک دو آدمیوں کے جن میں خوش خبر خان بھی تھا باقی سارے ہمراہی سلامتی کے ساتھ دوسرے کنارے پر پہنچ گئے۔

اسی شکار کے دنوں میں مظفر خان وزیر خان کو اپنے ہمراہ لایا تھا اور بادشاہ نے آصف خان اور مجنون خان کے نام فرمان جاری کر دیا تھا کہ دونوں مل کر کڑہ اور مانک پور کی سرحدوں کی حفاظت کریں۔

خان زمان کی دوبارہ بغاوت

اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ خان زمان، بہادر خان اور سکندر خان نے وعدہ خلافی کر کے بغاوت کردی ہے اور اپنے کچھ آدمی مرزا محمد حکیم کے پاس اس کو حملہ کرنے کی دعوت دینے بھیجے ہیں۔ جونپور میں میرزا حکیم کے نام کا خطبہ و سکہ بھی جاری کرنے کی فکر میں ہیں۔ ملا غزالی مشہدی نے مرزا حکیم کے متعلق یہ سجع نکالا تھا:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم وارث ملک است محمد حکیم

مہا بھارت کی یادگار

بادشاہ کو جب اس بغاوت کی خبر ملی تو انھوں نے خان زمان کے نمائندہ میرزا مبارک رضوی کو خان باقی خان کی حراست میں دے دیا اور پنجاب کے تمام معاملات خان کلاں اور اتکہ کے امرا کے سپرد کر کے 12 ماہ رمضان 974ھ/1566ء کو آگرہ کا ارادہ کیا۔ راستہ میں قصبۂ تھانیسر کی سیر کی جو قدیم دور کا بہت بڑا مذہبی مقام تھا۔ تھانیسر میں کرکھیت کا تالاب ہے جس میں آج سے چار ہزار سال پہلے کوروں اور پانڈوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے قول کے مطابق اس لڑائی میں تیراسی کروڑ بلکہ اس سے بھی زیادہ لوگ مارے گئے تھے۔ اس جگہ ہر سال ایک بڑا میلہ لگتا ہے۔ اس زیارت گاہ میں ہندو سونا، چاندی، جواہرات، قیمتی کپڑے اور نفیس چیزیں چڑھاتے اور خیرات کرتے ہیں اور پوشیدہ طور پر روپے دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ اس تیرتھ میں سنیاسی اور جوگی، کورو اور پانڈو کی لڑائی کی یادگار میں ایک دوسرے سے جنگ بھی کرتے ہیں۔ بادشاہ نے ان کی جنگ کا تماشا بھی دیکھا اور بادشاہ کے اشارہ پر کچھ سپاہیوں نے اپنے بدن پر راکھ مل کر سنیاسیوں کا بھیس بنالیا اور سنیاسیوں کی طرف سے لڑنے لگے، کیوں کہ سنیاسی بیچارے صرف تین سو تھے اور ان کے مقابلے میں جوگی پانچ سو سے زیادہ تھے، لڑائی بڑی دلچسپ تھی۔ ادھر ادھر سے کچھ لوگ مارے گئے، آخر کار سنیاسوں کو فتح ہوئی۔

جب اکبر نے دہلی میں قدم رکھا تو مرزا میرک رضوی خان، باقی خان کی قید سے

چھوٹ کر اپنے آقاؤں کے پاس چلا گیا۔ خان باقی خان بھی سزا کے خوف سے باغیوں سے جا کر مل گیا۔

دہلی کے قیام میں حاکم دہلی تتار خان کی سعی سے پرگنہ بھوجپور کا جاگیردار شاہ فخر الدین مشہدی، شہاب خان ترکمان گرفتار ہوکر حضور میں پیش کیا گیا اور اسے اس جرم میں کہ محمد امین دیوانہ جب لاہور سے بھاگ کر اس کے پرگنہ میں گیا تھا تو اس نے پناہ دی تھی اور اسے گھوڑا اور سفر خرچ دے کر باغیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے سزا کا حکم واپس لے لیا۔

باغیوں کے خلاف اکبر کی فوجی کاروائی

جب سواری آگرہ پہنچی تو خبر ملی کہ خان زمان نے شیر گڑھ عرف قنوج پر حملہ کر کے یوسف خان مشہدی کا محاصرہ کرلیا ہے۔ اکبر نے آگرہ کو خان خاناں کی نگرانی میں چھوڑا اور 26 شوال 974 ھ/ 1566 ء میں جون پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت اتنی سخت گرمی پڑ رہی تھی کہ ہڈیوں میں گودا تک حرارت کے مارے جلا جا رہا تھا۔

جب سکتیہ کے قصبہ میں چھاؤنی قائم ہوئی تو معلوم ہوا خان زمان مانک پور کی طرف جہاں اس کا بھائی بہادر خان تھا، بھاگ گیا ہے۔ بادشاہ نے قصبہ بھوجپور پہنچ کر چھے ہزار تجربہ کار سواروں کی جمعیت کو محمد قلی خان برلاس، مظفر خان، راجہ ٹوڈرمل، شاہ بداغ خان اور اس کے لڑکے عبد المطلب خان اور حسین خان کی سرداری میں اسکندر خان پر حملہ کرنے کے لیے اودھ کی جانب مقرر کر دیا۔

لشکر کے ہراول کی کمان داری پر پہلے حسین خان کو مقرر کیا تھا، لیکن وہ قلعہ بندی کی مصیبتیں اٹھا کر پریشان حال اور بد حال ہوکر آیا تھا اور اپنے لشکر کے اخراجات کی وصولی کے لیے پرگنۂ شمس آباد کی طرف جو اسے ابھی ابھی جاگیر میں ملا تھا، گیا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے واپس آ کر لشکر کے ساتھ ہمرکاب ہونے میں کچھ دیر ہوگئی اس لیے بادشاہ نے اس کی جگہ ہراولی پر قیا خان کو مقرر کر دیا۔

ان دنوں میں حسین خان مذکور کے ساتھ وہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کوچ کرگیا تھا، اس لیے میں اسی قصبہ میں ٹھہر گیا۔ وہاں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا تھا جس کی شہر کے معتبر لوگوں نے شہادت دی تھی کہ کچھ ہی دن پہلے ایک دھوبی کا چھوٹا بچہ گنگا کے کنارے گھاٹ پر سوگیا تھا۔ اچانک وہ دریا میں گر پڑا اور تیز موج نے اسے وہاں سے بہا کر دس کوس کے فاصلے پر قصبہ بھوجپور کے کنارے ڈال دیا۔ وہاں اسکے رشتہ دار دھوبیوں نے بچہ کو پہنچان لیا اور صبح ماں باپ کے پاس پہنچا دیا۔

باغیوں پر اکبر کا حملہ

جب رائے بریلی میں شاہی کیمپ لگا تو خبر آئی کہ خان زمان اور بہادر خان گنگا پار کر کے کالپی کی طرف جارہے ہیں اسلئے بادشاہ نے لشکر کو خان جہاں کی سرکردگی میں کٹرہ کی طرف روانہ کردیا اور خود نہایت تیزی کے ساتھ مانک پور پہنچ کر ہاتھی پر سوار ہوکر دریا پار کیا۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ پندرہ سولہ آدمیوں سے زیادہ نہیں تھے، مجنون خان اور آصف خان جو ہراول پر مقرر تھے ہر گھڑی باغیوں کی خبر پہنچارہے تھے، انھوں نے خبر دی کہ خان زمان اور بہادر خان جن کے سروں پر قضا منڈلا رہی تھی، رات بھر شراب پینے اور رنڈیوں کا ناچ دیکھنے میں مشغول رہے ہیں اور اب ان کی سرکشی کا پیمانہ بس لبریز ہو چلا ہے۔ خان زمان وغیرہ کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ بادشاہ خود انکے سر پر آ پہنچا ہے کیونکہ یہ لوگ میدان جنگ کی ہر آنے والی خبر کے متعلق یہی خیال کیے ہوئے تھے کہ یہ صرف مجنوں خان کی پیش قدمی سے متعلق ہے، چونکہ وہ مجنون خان کو گھاس کے تنکہ کے برابر بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے اس لیے انکو اس حملہ کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔

خان زمان کی ہلاکت

بادشاہ اس دن سندر نامی ہاتھی پر سوار تھے اور اپنے ساتھ عماری میں انھوں نے مرزا کوکہ اعظم خان کو بٹھا رکھا تھا، شاہی سواری تو لشکر کے قلب میں تھی۔ آصف خان اور امرائے

اتکہ میمنہ میں تھے۔ مجنون خان کچھ اور لوگوں کے ساتھ میسرہ پر مقرر تھا۔ ادھر خان زمان خان صبح کے وقت اپنے لشکر کو کوچ کا حکم دے کر سو گیا تھا کہ اچانک موت کی آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ جب اس نے اچھی طرح دیکھا تو لشکر کی سج دھج دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ خود شہنشاہ لشکر میں موجود ہیں، چنانچہ اس نے اپنی فوج کو فوراً بلا لیا اور صف آرائی کر لی۔ ایک بہادر جمعیت کو شاہی ہراول کے مقابلہ پر آگے بڑھایا۔ جب یہ دستہ آگے آیا تو بابا خان قاقشال اوقچیوں کے سردار نے اسکو تیروں کی زد پر لے لیا اور پیچھے دھکیل کر خان زمان کی لشکر گاہ تک پہنچا دیا۔ اس موقع پر بھاگنے والوں میں سے کسی کا گھوڑا پوری قوت سے جا کر خان زمان کے گھوڑے سے ٹکرا گیا اس صدمے سے خان کی پگڑی اس کے سر سے اتر کر کمند کی طرح اس کے گلے میں لپٹ گئی۔ بہادر خان نے جب یہ حال دیکھا تو بڑی بہادری کے ساتھ اس نے بابا خان پر حملہ کر دیا اور سے دھکیلتے ہوئے مجنون خان کی صفوں تک پہنچا دیا اس بھگدڑ میں مجنون خان اور بہادر خان ایک دوسرے کے مقابل آ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے سے نہایت دلیری اور بہادری کے ساتھ جنگ کی۔ عین اس وقت ایک تیر بہادر خان کے گھوڑے کو لگا اور وہ بدک کر زمین پر گر پڑا بہادر خان کو لوگوں نے گھیر کر گرفتار کر لیا۔ اس وقت بادشاہ ہاتھی سے اتر کر گھوڑے پر سوار ہو گئے اور حسب الحکم کوہ پیکر ہاتھیوں کے حلقہ کو خان زمان کے لشکر پر دوڑا دیا گیا۔ ہیرانند نامی بادشاہی ہاتھی باغیوں کے ہاتھی ادریا سے جا کر بھڑ گیا اور اسے اتنی زور کی ٹکر ماری کہ وہ میدان میں ڈھیر ہو گیا۔ اس ہنگامہ میں ایک تیر خان زمان کے گھوڑے کو بھی لگا۔ وہ اسے نکالنے لگا تھا کہ گھوڑے کو ایک اور تیر آ کر لگا اور گھوڑے کے بھڑک جانے سے خان زمان نیچے گر پڑا۔ اسی وقت نرسنگھ نامی ہاتھی کے ہاتھی بان نے خان زمان کی طرف رخ کیا خان زمان نے اس سے بہت کچھ کہا کہ میں ایک بڑا سردار ہوں اگر تو زندہ بادشاہ کے پاس پکڑ کر لے جائے تو تجھے بڑا انعام ملے گا، لیکن اُجڈ ہاتھی بان نے اس پر ہاتھی کو دوڑا دیا۔ خان زمان ہاتھی کے پیروں کے نیچے اس طرح پامال ہو گیا کہ اس کی ہڈیاں تک سرمہ ہو گئیں۔

بہادر خان کا قتل

جب جنگ کا میدان ٹھنڈا پڑا تو نظر بہادر، بہادر خان کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے لے آیا۔ بادشاہ اسے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے اس لیے اس سے پوچھا کہ ''بہادر کہو کیا حال ہے؟ اس نے جواب میں کہا: "الحمد لله علی کل حال" جب اس نے پانی مانگا تو بادشاہ نے اپنے خاصہ میں سے پانی کا پیالہ اسے دیا۔ امراء اس کے زندہ رہنے کو خطرناک سمجھتے تھے اس لیے انھوں نے اصرار کر کے اس کو قتل کرادیا۔ کچھ دیر بعد خان زمان کا سر بھی ملاحظے میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ پس و پیش میں تھا کہ یہ خان زمان کا سر ہے یا نہیں؟ اسی وقت خان زمان کا وکیل رائے ارزانی جو اسیروں کی صف میں کھڑا تھا، اگے آیا اور مقتول کے سر کو اٹھا کر اپنے سر سے لگایا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ اس کے علاوہ خواجہ دولت سرانے جو خان زمان کی ملازمت چھوڑ کر بادشاہ کی ملازمت میں آ گیا تھا اور اسے دولت خان کا خطاب ملا تھا اس نے کہا ''خان زمان کے سر کی علامت میں بتاتا ہوں۔ وہ چونکہ ہمیشہ پان سیدھے کلے میں رکھا کرتا تھا، اس لیے اس کی سیدھی جانب کے دانت سیاہ ہو گئے تھے''۔ یہ لڑائی بروز پیر کیم ذی الحجہ 974ھ/1566ء کو پیراک عرف الہاباس کے مضافات میں منکر وال کے قصبہ میں جلوس کے بارہویں سال میں ہوئی تھی۔

اس معرکہ میں جو لوگ قتل ہوئے ان میں ایک مرزا خوشحال بیگ بھی ہے، میں (صاحب منتخب التواریخ) نے مرزا کو مالوہ کے لشکر میں ادہم خان اور پیر محمد خان کے ساتھ ایک محفل میں دیکھا تھا۔ بلا شبہ وہ حسن صورت اور حسن سیرت کا مکمل نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت دل سے بھلائی نہیں جاسکتی تھی۔

اسی سال علامہ عصر میر مرتضی شیرازی اس دنیائے فانی سے عالم بقا کو پہنچے۔ انکو پہلے دہلی میں امیر خسرو کے قریب دفن کیا گیا تھا، بعد میں جب صدر الصدور قاضی اور شیخ الاسلام نے عرض کیا کہ امیر خسرو ہندوستانی اور سنی تھے اور میر مرتضی عراقی اور رافضی ہیں اس لیے امیر خسرو کو اُن کی قربت سے اذیت ہوگی۔ اس گزارش پر بادشاہ نے دوسری جگہ

دفن کرنے کا حکم دے دیا۔ یہ بات دونوں مرحومین کے بارے میں ہے بہر حال افسوس ناک تھی۔

اسی سال میرے ایک شناسہ شیخ ابو الفتح جو شیخ سعد اللہ ولد شیخ بدھ کے بھائی ہوتے تھے اور بیانہ کے معززین میں سے تھے انتقال کر گئے۔

آگرہ میں افواہیں

میرزا نظام الدین سے میرے (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) بڑے اچھے تعلقات تھے۔انھوں نے خود مجھ سے کہا تھا اور اس واقعہ کو اپنی تصنیف'' تاریخ نظامی'' میں بھی درج کیا ہے کہ خان زمان کی جنگ کے موقع پر افواہ باز خاص طور سے پوستی افیونی طرح طرح کی وحشت ناک خبریں پھیلاتے رہتے تھے۔ ایک دن چار احباب بیٹھے ہوئے خوش گپیاں کر رہے تھے تفریحاً ہم نے بھی سوچا بڑا مزا آئے گا اور ہم نے یہ افواہ پھیلا دی کہ بادشاہی فوج خان زمان اور بہادر خان کا سر لے کر آ رہی ہے چنانچہ یہ خبر ہم نے چند لوگوں کو سنائی اور یہ سارے شہر میں پھیل گئی۔ اتفاق دیکھو کہ جس دن یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی اس دن خان زمان اور بہادر خان قتل کئے گئے تھے اور تیسرے دن مراد بیگ کا باپ عبد اللہ ان دونوں کے سر لے کر آگرہ میں آیا اور وہاں سے دہلی، لاہور اور کابل لے کر گیا۔

اس فتح کے بعد جس کا باغیوں کو گمان بھی نہیں تھا اکبر الہ آباد گیا اور ان لوگوں کو جو بارگاہ سے بھاگ گئے تھے یا باغیوں کا ساتھ دے رہے تھے گرفتار کر کے سرکاری افسروں کے سپرد کر دیا۔ میرزا میرک رضوی کو جو دہلی سے بھاگ گیا تھا ہاتھی کے تلے دے دیا گیا مگر ابھی ہاتھی نے اسے اپنی سونڈ سے رگید نا شروع ہی کیا تھا کہ بادشاہ نے اس کے سید ہونے کا خیال کر کے معافی عطا کر دی۔ چند دوسرے باغی بھی اپنی سزا کو پہنچے۔ خان زمان کے کچھ آدمیوں کی جنھوں نے اطاعت اختیار کر لی تھی جان بخشی کر دی گئی۔

دو دن بعد بادشاہ بنارس اور وہاں سے جون پور پہنچے اور اس شہر میں تین دن تک قیام کیا اس کے بعد تین چار دن میں حملہ کرتے ہوئے چار پانچ اشخاص کے ہمراہ کڑہ اور

مانک پور کی سڑک پر گنگا کے کنارے پہنچے شاہی لشکر اسی جگہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں سے کشتی پر بیٹھ کر کٹرہ کے قلعہ میں سواری پہنچی۔

قاضی طوائیسی کی حق گوئی

جس وقت خان زمان کے آدمیوں کو قتل کیا جارہا تھا، قاضی طوائیسی لشکر کے قاضی نے جو نہایت دیانت دار اور حق گو آدمی تھا، عرض کیا کہ ان لوگوں کو شکست دینے اوران کے اموال پر قبضہ کر لینے کے بعد ان کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ بادشاہ کو اس کی یہ بات بری لگی اس لیے اس کو قضاوت سے معزول کر کے کٹرہ کے قاضی یعقوب کو جو علم فقہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے اور شیر شاہ کے قاضی فضیلت کا جسے لوگ قاضی فضیحت کہا کرتے تھے، داماد تھا۔ ان کو منتخب کر کے طوائیسی کی جگہ قاضی بنا دیا۔ یہ شخص علم و فضیلت کے باوجود مسخرہ پن اور ہزل گوئی کا عادی تھا۔ دس سال بعد اُسے بھی معزول کردیا گیااور اس عہدہ پر قاضی جلال الدین ملتانی کا تقرر ہوا۔

اکبر نے خان خانان کی طلبی کے لیے فرمان روانہ کردیا تھا چنانچہ خان خاناں اسی منزل میں آگرہ سے آکر باریاب ہوا۔ بادشاہ نے بہادر خان اورخان زمان کی ساری جاگیر جون پور اور بنارس سے غازی پور اور قلعہ چنار تک اور ادھرزمانیہ سے لے کر چوسہ ندی کی گزرگاہ تک اس کو عطا کردی اور گھوڑا و خلعت عطا فرمایا اور اس کام پر رخصت کردیا۔ اس انتظام کے بعد اکبر نے ماہ ذی الحجہ کی 974ھ/1566ء میں عین بارش کے موسم میں کوچ کیا اورمحرم 975ھ/ 1567ء میں پایہ تخت پہنچ گیا۔

سکندر اوزبک کے خلاف فوج کشی

محمد قلی خان برلاس اور مظفر خان کی جمعیت کو اودھ میں سکندر اوزبک کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا تھا ان لوگوں نے سکندر کو اودھ کے قلعہ میں گھیر لیا۔ جب اس کو خان زمان اور بہادر خان کے قتل کی اطلاع ملی تو وہ بھی بدحواس ہوگیا اورامیروں سے صلح کے

مذاکرات کرتا رہا۔ مصالحت کا تو بہانہ تھا امرائے شاہی کو دھوکہ میں رکھ کر وہ کشتی میں سوار ہوگیا اور سریو ندی کے دوسرے کنارے پر جا پہنچا۔ پھر وہاں سے اس نے مصالحت کی دوبارہ بات چھیڑی، چنانچہ شاہی لشکر کے چند امیر اس سے گفتگو کے لیے گئے۔ وہ بھی اپنے تین چار آدمیوں کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر آیا اور دونوں فریقوں نے صلح کا عہد و پیان کرلیا۔ طے یہ پایا تھا کہ امرائے مذکور اسے بارگاہ شاہی میں لے جائیں گے اور سفارش کریں گے مگر اسے کچھ ایسا ہول تھا کہ اس عہد پر قائم نہیں رہ سکا اور پٹھانوں کے علاقہ میں چلا گیا۔ امیروں نے گورکھ پور تک اس کا پیچھا کیا اور سارا ماجرا دربار میں لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے بذریعہ فرمان امراء کو طلب کیا اس وجہ سے اودھ میں محمد قلی خان برلاس کو مقرر کرکے یہ لشکر دارالسلطنت کی جانب چلا گیا۔

چتوڑ کے قلعہ پر حملہ

975 ھ/1567 ء میں چتوڑ کی تسخیر کا ارادہ کیا گیا اور بادشاہ نے بیانہ کو حاجی محمد خان سیستانی سے لے کر آصف خان کی جاگیر میں دے دیا، اس کے علاوہ اسے یساور، وزیر پور اور ماندل گڑھ کی جاگیریں بھی عطا کی گئیں، تاکہ وہ پہلے جاکر لشکر کا ساز وسامان تیار کرلے۔ اس کے جانے کے بعد بادشاہ نے کوچ کیا اور باری کے راستہ سے شکار کھیلتے ہوئے مئو، میدانہ اور پھر وہاں سے سوپر کی طرف گیا۔ لشکر شاہی کی آمد پر رائے سرجن کے آدمیوں نے سوپر کے قلعہ کو خالی کردیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ پر نظر بہادر کو اور کوتہ بلایہ کے قلعہ پر شاہ محمد خان قندھاری کو مقرر فرمایا۔ یہاں سے لشکر قلعہ کا کرون پہنچا اور شہاب الدین احمد خان اور شاہ بداغ خان کو مالوہ کا علاقہ جاگیر میں دے کر ان کو بادشاہ نے محمد سلطان کے بیٹوں میرزا الغ اور شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا یہ دونوں باغی ہوکر گجرات میں سلطان محمود کے غلام چنگیز خان حاکم گجرات کے پاس چلے گئے اور مالوہ کا سارا علاقہ بغیر کسی جنگ کے محروسہ کے علاقے میں شامل کرلیا گیا۔

اکبر کی فوج کشی پر رانا اودے سنگھ[21] نے چتوڑ کے قلعہ پر اپنے ایک بہادر

اور دلیر سردار رائے جے مل کو جو قلعہ مرٹھ میں میرزا شرف الدین حسین سے جنگ کر کے بھاگ نکلا تھا، مقرر کر دیا اور خود اودے پور کی طرف کوہ نیلو کے گھنے جنگلوں اور بلند پہاڑوں میں جا کر چھپ گیا۔ آصف خان نے بہرام پور پر جو اس علاقہ کا آباد اور بارونق شہر ہے حملہ کیا اور تلوار کے زور پر قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کا سارا علاقہ پامال ہوگیا۔ حسین قلی خان نے اودے پور کوہ نیلو پر فوج کشی کی اور بڑی تباہی مچائی رانا مجبور ہوکر وہاں سے دوسرے مقام پر منتقل ہوگیا۔

قیامت خیز محاصرہ

بادشاہ قلعہ چتوڑ[22] کا محاصرہ کیے ہوئے تھے حکم شاہی کے مطابق قلعہ پر چڑھائی کے لیے سرنگیں کھدوائی گئیں۔ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ دس سوار اس میں اچھی طرح سے آجاسکتے تھے اور بلندی اتنی تھی کہ ہاتھی سوار ہاتھ میں نیزہ لیے ہوئے بہ آسانی گزر سکتا تھا۔ قلعے والوں کی آتش باری اور سنگ اندازی سے لشکر کے بہت سے آدمی ہلاک ہو رہے تھے۔ ان کی لاشیں سرنگ میں پتھر اور اینٹ کی جگہ لگادی جاتی تھیں کافی عرصہ میں جا کر سرنگ اور نقب قلعے کی بنیادوں تک پہنچی۔ قلعہ کے دو متصل برجوں کو نیچے سے کھوکھلا کر کے بارود سے بھر دیا گیا اور بہادر مسلح سواروں کی ایک جمعیت ان برجوں کے قریب پہنچ کر سرنگ کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی کہ جیسے ہی یہ برج گرے وہ اس راستے سے قلعہ میں داخل ہوجائیں۔ اتفاق ایسا ہوا کہ دونوں نقبوں میں جب آگ لگائی گئی تو ایک نقب جس کا فتیلہ نسبتاً چھوٹا تھا، جلد پھٹ گئی دوسری نقب کا فتیلہ کچھ لمبا تھا اس لیے اس کے پھٹنے میں دیر لگی۔ پہلی نقب کے پھٹتے ہی ایک برج بنیاد سے اکھڑ کر فضا میں بکھر گئی اور حصار میں ایک بہت بڑا شگاف پیدا ہوگیا۔ منتظر سواروں نے جن کو دوسرے فتیلہ کا خیال نہیں رہا تھا بے محابا حملہ کردیا اور قریب پہنچ کر اندر جانے کا راستہ ڈھونڈنے لگے عین اسی وقت دوسرا فتیلہ سلگ اٹھا اور دوسرے برج کو بھی جہاں غیر اور اپنے تھے اڑادیا۔ چنانچہ لشکر کے اکثر غازی، بہادر سب کے سب سو سو، دو دو سو من وزنی پتھروں کے نیچے دب کر رہ

گئے۔ ہر طرف ہنگامہ مچ گیا:

این بہ جنت دادآب و آن بدوزخ بردجون
گرچہ خون گبر ومومن ہردو یک جامی دوید

انسانی لاشوں پر کوّے او رگدھ کافی دنوں تک جشن مناتے رہے۔ ایسے پانچ سو سپاہی جن میں سے اکثر کو بادشاہ کا تقرب حاصل تھا اس حادثہ کی نذر ہوگئے۔ ہندوؤں کے مقتولین تو شمار سے باہر تھے۔ محصورین نے راتوں رات زور لگا کر ان برجوں کی درمیانی دیوار کو دوبارہ تعمیر کرلیا اور محاصرہ میں کم وبیش تقریباً چھ مہینے لگ گئے۔

چتوڑ کے قلعہ کی فتح

25 شعبان 975ھ/ 1567ء منگل کی رات کو شاہی لشکر نے ہر طرف سے حملہ کر کے قلعہ کی دیوار میں شگاف ڈال دیئے۔ اس موقع پر مسلمان حملہ آوروں کی توپوں اور بندوقوں کے شراروں سے جو روشنی پھیلی تو جے مل کی شکل اس روشنی میں دکھائی دی تو ایک بندوقچی نے اس کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور وہ اسی جگہ سرد ہوگیا۔ اس کے گرتے ہی یہ عالم تھا جیسے چڑیوں کی دَل پر پتھر آن گرا ہو۔ قلعہ بند فوج اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ گئی اور لوگ اپنے اہل وعیال سمیت آگ میں کود گئے۔ اس طرح آگ میں جل کر مرنے کو ہندوستان میں ''جوہر'' کہا جاتا ہے۔ جو بچ گئے وہ اکبری تلوار کی نذر ہوئے اور تھوڑی سی تعداد قید ہوگئی۔ اس ہولناک رات میں ساری رات جنگجوؤں کی تلوار نیام سے باہر ہی رہی۔ دوسرے دن قیلولہ کے وقت تک مقتول راجپوتوں کی تعداد آٹھ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ اس خونی واقعہ کی تاریخ ہے:

دل گفت کہ بکشاد بزودی چتوڑ

دوپہر کے بعد قتال و جدال کا یہ سلسلہ بند ہوا اور سپاہی اپنے ٹھکانے پر لوٹ کر آگئے۔ بادشاہ تین دن تک چتوڑ میں ٹھہرے رہے اور ہر طرف فتح نامے روانہ کیے اور آصف خان کو وہاں کی حکومت سپرد کرکے بروز منگل 25 شعبان کو شاہانہ سواری نے آگرہ کی طرف کوچ کیا۔

اجمیر کا پیدل سفر

جیسا کہ بادشاہ نے منت مانی تھی، اجمیر جانے کے لیے پیدل جانے کا ارادہ کیا اور بروز اتوار 7 رمضان کو اجمیر پہنچ کر حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی اور وہاں صدقہ، خیرات اور نذر گزار کر دس دن بعد واپسی کے لیے سوار ہوئے۔ اجمیر سے بادشاہ نے الور کا رخ کیا اور وہاں شیر کا شکار کیا۔ اس شکار میں شاہ محمد خان نے جو بہادری میں ایک دوسرا شیر تھا، شیر سے تنہا مقابلہ کیا۔ نتیجہ میں دونوں شیر مارے گئے بادشاہ یہاں پر لشکر سے علیحدہ ہوگئے اور نارنول پہنچے۔ نارنول میں شیخ نظام نارنولیؒ بڑے پایہ کے بزرگ تھے اکبر نے انکی زیارت کی اور اپنے لئے ان سے دعا کرائی پھر مسلسل کوچ کرتے ہوئے دار الخلافہ لوٹ آیا۔

اسی سال بدایوں میں میری دوسری شادی ہوئی۔ اسی سال اولیاء و مشائخ میں برگزیدہ شیخ عبد العزیز دہلویؒ نے آخری سفر اختیار کیا۔

976ھ/1567ء میں بادشاہ نے پنجاب سے تمام امراء، اتکہ خیل، کمال خان کھکر کو دربار میں بلالیا اور ان کی جاگیریں حسین قلی خان اور اس کے بھائی اسماعیل قلی خان کے سپرد کر کے انھیں اس صوبہ پر نامزد کر دیا۔ حسین قلی خان اور اس کا بھائی ناگور سے آئے اور رنتھنبور کی فتح کے بعد آگرہ سے پنجاب کی صوبہ داری کے لیے رخصت ہوئے۔ سنبھل اور بریلی کی سرکار خان کلاں کو دے دی گئی۔

باغی مرزاؤں کا تعاقب

محمد سلطان مرزا کے لڑکے گجرات میں چنگیز خان کی پناہ میں چلے گئے تھے۔ گجرات کے حاکم سے بھی ان کی بنھ نہ سکی اور وہ یہاں کی جاگیروں میں مداخلت کر کے بھاگ کر مالوہ آگئے۔ ان کے مقابلے میں محمد مراد خان اور مرزا عزیز اللہ مشہدی اجین کے قلعہ میں محفوظ ہوگئے۔ اشرف خان میر منشی اور صادق محمد خان ایک بھاری لشکر کے ساتھ رنتھنبور کی مہم پر بھیجے گئے انکو جب مرزاؤں کی حملے کی خبر ملی تو انھوں نے بادشاہ سے اجازت لے کر خلیج

خان کے ساتھ جسے ان کے بعد اس قلعہ کو تسخیر پر مقرر کیا گیا تھا۔ مرزاؤں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے اجین کا رخ کیا۔ سرونج میں شہاب الدین احمد خان اور سارنگ پور میں شاہ بداغ خان بھی ان امیروں سے آکر مل گئے، اس طرح ایک بڑی فوج منظم ہوگئی۔ مرزاؤں کو جیسے ہی اس لشکر کشی کی اطلاع ملی وہ اجین سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہی امیروں نے ان کا پیچھا کیا جب مرزاؤں نے نربدا ندی کو پار کیا تو انھیں معلوم ہوا کہ جھجھار خاں حبشی نے ترپولیہ کے میدان میں چنگیز خان کو غافل پاکر قتل کردیا ہے اور گجرات ترکتازیوں کے لیے خالی پڑا ہے۔ اس خبر کے ملتے ہی ان لوگوں نے گجرات کا رخ کیا اور پہلے ہی حملہ میں چمپانیر کے قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ وہاں سے بڑھ کر بھڑوچ کے قلعہ کو گھیر لیا اور کچھ عرصہ بعد محصور قلعہ دار رستم خان رومی کو سازش اور حیلہ سے گرفتار کرکے قتل کردیا اور اس قلعہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ قلیچ خان اور صادق محمد خان دوسرے شاہی امیروں کے ساتھ نربدا کے کنارے سے لوٹ کر دربار میں آگئے اور مندو کے جاگیردار اپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے۔

رنتھنبور کے قلعہ کی فتح

اسی سال 976ھ/1567ء کی پہلی رجب کو بادشاہ دہلی تشریف لائے اور چند دن پالم کے پرگنے میں ہانکے کا شکار کھیلتے رہے یہاں سے آخر ماہ شعبان کو شاہی لشکر قلعہ رنتھنبور پہنچا۔ تھوڑی مدت میں سرنگیں قلعہ کی دیواروں تک کھود لی گئیں۔ قلعہ کے مقابل رن کی نہایت دشوار گزار پہاڑی تھی۔ شاہی حکم پر سات آٹھ سو کہاروں نے مل کر پندرہ بڑی بڑی توپیں جو پانچ پانچ سات سات من کا گولہ پھینکتی تھیں اس پہاڑی پر پہنچادیں۔ ان توپوں کی گولہ باری سے پہلے ہی دن قلعہ کے اندر کی عمارتیں خاک میں مل گئیں۔ قلعہ کے حاکم رائے سرجن نے قلعہ چتوڑ کی بربادی اور وہاں کی تباہی و ذلت دیکھ کر اس کے ڈر سے ہتھیار ڈال دیے اور اپنی لڑکیوں وددا اور بھوج کو بعض زمینداروں کے ہمراہ بارگاہ شاہی میں بھیج دیا اور جان بخشی کی اجازت طلب کی۔ حسین قلی خان جہاں اس کی تسلی کے لیے روانہ کیا گیا جو رائے سرجن کو دربار میں لے آیا۔ اس نے قلعہ کی کنجی سپرد کردی۔ اسی طرح بدھ کے دن 3

شوال کو یہ قلعہ فتح ہوگیا۔

اکبر نے دوسرے دن چند آدمیوں کے ہمراہ قلعہ کی سیر کی اور قلعہ مہتر خان سلطانی کے سپرد کر دیا اور خود حضرت خواجہ اجمیریؒ کے مزار کی زیارت کے لیے چلا گیا۔ اجمیر سے بادشاہ کی سواری بہت جلد 24 ذی قعدہ 976ھ/ 1567ء کو آگرہ واپس ہوگئی اسی سال آگرہ کے نئے قلعہ کا دروازہ ہتیاپول بن کر مکمل ہوگیا۔

اکبر شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں

بادشاہ کے مسلسل کئی ایک لڑکے ہوئے تھے لیکن وہ کمسنی ہی میں اس دنیا سے گزر گئے اس سال بادشاہ کی ایک بیوی[23] حاملہ ہوئی۔ بادشاہ نے شیخ سلیم چشتی سیکری[24] سے دعا کرائی اور اس بیوی کو شیخ کے گھر پر بھجوادیا۔ شیخ نے اس سے پہلے ہی شاہزادہ کی ولادت کی خوشخبری دی تھی اور شاہنشاہ کو اس سے بڑی مسرت ہوئی تھی اس لیے وہ اکثر شیخ کے گھر پر جاتے رہے اور بے چینی سے اس وعدہ کا انتظار کرنے لگے۔

شیخ سے اس تعلق و ربط و ضبط کی وجہ سے بادشاہ نے کوہ سیکری پر شیخ کی قدیم خانقاہ کے قریب ایک بڑی عمارت[25] کا سنگ بنیاد رکھا اور ایک نئی خانقاہ بنوائی جو وسعت و بلندی میں پہاڑ کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں ایسی مسجدیں کم ہی ہوں گی۔ یہ مسجد تقریباً پانچ سال کی مدت میں تعمیر ہوئی اس بستی کا نام فتح پور[26] رکھا گیا اس میں بازار، حمام، چوک وغیرہ بنائے گئے۔ امیروں نے بھی وہاں محل، باغات اور عمارتیں تیار کرائیں۔

شیخ سلیم چشتی نے اپنے گھر کی عورتوں کو بادشاہ سے بے پردہ کردیا تھا، ان کے عزیزوں اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ آپ نے ہماری عورتوں کو ہم سے بیگانہ کردیا ہے۔[27] شیخ نے جواب دیا، تم کو میں نے امیر بنا دیا ہے۔ دنیا میں عورتوں کی کمی تو نہیں ہے، دوسری بیویاں کرلو، آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے:

یا مکن با فیل بانان دوستی
یا بنا کن خانۂ در خورد فیل

ایک دلگداز داستانِ عشق

اس سال کا دلچسپ وعجیب واقعہ سید مکری گرم سیری کے لڑکے سید موسیٰ کی موت کا سانحہ ہے۔ سید موسیٰ کالپی کے معزز سادات گھرانے کا نوجوان تھا اور بادشاہی فوج میں ملازم تھا۔ وہ آگرہ میں ایک سنار کی لڑکی موہنی نامی پر عاشق ہوگیا اور دونوں میں عشق ومحبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ جس وقت رنتھنبور پر لشکر کشی ہوئی تھی وہ لشکر کے ساتھ نہیں گیا اور آگرہ کے قلعہ کے پاس جمنا ندی کے کنارے اپنی محبوبہ کے پڑوس میں ایک مکان لے کر رہنے لگا۔ یہ مکان میر سید جلال متوکل کے گھر کے قریب تھا۔ اس کا عشق جنون تک جا پہنچا تھا۔ چنانچہ اپنے بھروسے کے چند آدمیوں کو لے کر ایک دوبار اپنی معشوقہ کو اس کے گھر سے نکال لایا۔ لیکن ہر مرتبہ یا تو محافظ سپاہیوں نے یا سناروں نے اسے گرفتار کرلیا۔ اس طرح کوئی دوسال چار مہینے گزر گئے۔ اس عرصے میں یہ عاشق ومعشوق کبھی کبھی دور سے ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کرلیتے تھے۔ لیکن عشق تو روکے نہیں رُکتا اور یہ درد آخر کب تک؟ ایک رات موہنی کے اشارہ پر وہ کمند لگا کر اپنے محبوب کے کوٹھے پر جا پہنچا اور وہ رات دونوں نے ایک دوسرے کی ہم آغوشی میں گزاری لیکن دونوں پاکباز اور باعفت ہی رہے۔

رخصت ہوتے وقت اچانک دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موہنی اپنے گھر بار کو وداع کرکے اور ننگ وناموس کا خیال چھوڑ کر اپنے چاہنے والے کے ساتھ ہی نکل جائے۔ غرض ووہ دونوں اس محلّہ سے نکل کر بھاگ کر موسیٰ کے ایک دوست کے گھر پر پہنچے اور وہاں تین دن تک چھپے رہے۔ موہنی کے عزیزوں نے سید موسیٰ کے گھر کا محاصرہ کرکے ایک فتنہ مچادیا۔ سید موسیٰ جس کا میرے ساتھ بڑا یارانہ تھا۔ موسیٰ نے سناروں کو کسی نہ کسی طرح ٹال کر رخصت کردیا۔ جب موہنی کو اس ہنگامہ کی اطلاع ملی تو اسے سید موسیٰ کی زندگی کی فکر ہوئی کہ کہیں اس کے عزیز حاکم شہر کے ذریعہ اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے چاہنے والے کو رخصت کردیا اور اس سے دوبارہ ملاپ کا وعدہ کیا۔ خود بدنامی سے بچنے کے لیے اپنے گھر لوٹ گئی۔ گھر جاکر اس نے ایک بڑا دلچسپ اور کارگر بہانہ کیا

کہ "اس رات میں بے خبر سو رہی تھی ایک حسین و جمیل شخص آیا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میری آنکھ کھل گئی تو میں نے اس شخص کو موجود پایا اچھی طرح دیکھا تو اس کے سر پر جواہرات جڑاؤ تاج رکھا تھا اور اس نے میرے چہرے پر کوئی افسون پڑھ کر پھونکا اور جب میں مارے حیرت کے دم بخود رہ گئی تو مجھے اس نے اپنے پروں میں چھپالیا اور ایک ایسے شہر میں لے گیا جس کا ذکر داستانوں میں ملتا ہے۔ وہاں لے جاکر اس نے مجھے ایک نہایت خوبصورت اور شاندار محل میں رکھا۔

جاہل سناروں نے اس افسانہ کو صحیح سمجھ لیا۔ مصلحت یہی تھی کہ وہ اس واقعہ کو چھپاتے، لیکن غصہ کے مارے انھوں نے چند دن تک موہنی کو بالا خانہ میں قید کردیا۔ سید موسیٰ بے چارہ دردِ فراق میں تڑپتا رہا۔ موہنی کے خیال میں تقریباً دیوانہ ہی ہوگیا۔ ان دونوں کی عشق بازی کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا جہاں چار آدمی مل بیٹھتے بس یہ داستان چھڑ جاتی، پھر جس کے منھ جو بات چڑھتی کوٹھوں پہنچ جاتی، آخر کار موہنی نے ایک مشاطہ کے ذریعہ موسیٰ کے پاس کہلوا بھیجا اور اسے تسلی دی کہ میں نے بڑی مشکل اور حیلہ گری سے کام لے کر ان لوگوں کے ہاتھ سے نجات حاصل کرلی ہے اور ہر طرح مطمئن ہوں۔ سید موسیٰ نے اپنی محبوبہ کے کہنے پر عمل کیا اور ایک دن صبح اس کے پاس جاکر رخصت ہوا۔ دونوں نے رو دھوکر ایک دوسرے کو الوداع کیا۔ ایک راز دار کو وہاں چھوڑ کر وہ اپنی ملازمت پر رنتھنبور چلا گیا۔

موہنی نے موسیٰ کو خود سے دور بھیج تو دیا لیکن اس کے چلے جانے پر دن گزارنا اور رات کاٹنا اس کے لیے دوبھر ہوگیا جب فراق کے صدمے سہے نہ جاسکے تو چند دن بعد اس نے اس رازدار سے مل کر کہا رات کے وقت تم ہمارے گھر آکر فقیروں کی طرح صدا لگانا اور میں دان دینے کے بہانے گھر سے نکل آؤنگی، پھر تم مجھے اس شہر سے نکال کر لے جانا چنانچہ مقررہ وقت پر وہ اپنے ماں باپ کے گھر سے نکل آئی۔ اس خادمہ کو جو اس کی نگرانی پر مقرر تھی کسی کام کے بہانے بھیج دیا اور راز دار کے ساتھ بھاگ گئی۔

ان لوگوں نے سفر کی تیاری پہلے ہی سے کر رکھی تھی۔ تین دن تک تو شہر میں چھپے رہے۔ جب ہر طرح اطمینان کرلیا تو فتح پور اور بیانہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ لیکن خدا کو

منظور نہ تھا۔ اتفاق سے موہنی کا ایک رشتہ دار اسی راستہ پر آنکلا اور اس نے موہنی کو پہنچان کر پکڑ لیا۔

اس زمانہ میں آگرہ کا کوتوال پہلوان جمال تھا۔ اس کے سپاہی موقع پر آپہنچے۔ انھوں نے موہنی کو تو اس کے رشتہ داروں کے حوالہ کیا اور بھگا لے جانے والے کو قید میں ڈال دیا۔ وہ بیچارا کافی عرصہ تک قید خانہ کی مصیبت میں مبتلا رہا آخر بڑی مشکل سے رہائی نصیب ہوئی۔

جب بے چارے سید موسیٰ کو اس واقعہ کی خبر ملی تو وہ پہلے ہی درد و فراق میں سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی اس پر ایسی مایوسی چھائی کہ بس مرنے کے قریب آگیا۔ وحشت و جنون کے عالم میں آگرہ جانا چاہتا تھا، لیکن بھائیوں اور دوستوں نے سمجھا بجھا کر، ڈانٹ ڈپٹ کر اسے اس ارادے سے باز رکھا۔ جب لشکر دار الخلافہ کو لوٹ آیا تو سید موسیٰ کا حال اور برا ہوگیا۔ چونکہ موہنی کو ایک محفوظ مقام پر رکھا تھا اس لیے ہزار کوشش کے باوجود وہ غریب اپنی محبوبہ کی ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکا۔ سید موسیٰ کا ایک دوست قاضی جمال نامی ہندی کا شاعر تھا۔ یہ شخص کالپی کے علاقے میں سیوکن پور کا رہنے والا تھا۔ اپنے دوست کی یہ حالت اس سے دیکھی نہ گئی، جرأت سے کام لے کر ایک دن وہ مغرب کے وقت اُس مکان پر جا پہنچا جہاں پر موہنی نظر بند تھی اور اسے وہاں سے نکال کر ایک تیز گھوڑے پر سوار کر لیا اور دریائے جمنا کے چڑھاؤ کی طرف کنارے کنارے گھوڑے کو بھگا دیا۔ موہنی کے رشتہ دار اس کا پیچھا کرنے لگے اور سامنے سے شہر کے لوگ بھی دوڑ کر پہنچ گئے۔ گھوڑا بہت تیز تھا مگر راستہ میں بہت نالے اور گڑھے تھے اس لیے بچ کر نکل نہ سکا۔ جب موہنی نے یہ حال دیکھا تو اس نے خود کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور قاضی سے کہا کہ تم بچ کر نکل جاؤ میرا سلام اس بے چارے تک پہنچا دینا۔

جب سید موسیٰ کو اس ناکامی کی خبر ملی تو وہ بالکل ہی مایوس ہوگیا، آگرہ کے قلعہ میں اپنے دروازے کو بند کر بیٹھ رہا اور اس صدمے کے مارے جلد ہی اس کی روح دنیا کی قید سے چھوٹ گئی۔ مرتے وقت اس نے انتہائی یاس و محرومی کے ساتھ یہ شعر تین مرتبہ پڑھا:

ازیار دلم ہزار جان یافت
یاری بہ از و نمی توان یافت

پھر اس نے کہا" اے اللہ اس درد کو مجھ بد نصیب کی روح کے ساتھ وابستہ رکھنا"۔

بزن بر سینہ ام خنجر جدا فگن سر از تن ہم
درین خانہ تاریک رابکشای در و روزن ہم

جب وہ مر گیا تو اس کی میت کو دفنانے کے لیے اٹھایا گیا۔ لوگ اس جوان مرگ کی موت پر ماتم کرنے لگے، اس کا جنازہ موہنی کے گھر کی طرف سے نکالا گیا۔ موہنی کو اس کے گھر والوں نے پیروں میں زنجیر ڈال کر قید کر رکھا تھا۔ اس نے کوٹھے پر سے اس شہید کا جنازہ دیکھا، تو جس حال میں تھی اسی حال میں مبہوت و متحیر رہ گئی۔ اس کا معمول یہ بن گیا کہ صبح سے شام تک کھوٹھے پر کھڑی پُر اسرار نگاہوں سے اس طرح تکتی رہتی جیسے وہ برابر جنازہ کو سامنے سے گزرتا ہوا دیکھ رہی ہے۔ آخر کار اس کی یہ بے حسی ختم ہوئی اور اچانک بے قرار ہو کر اسی حالت میں ایک چیخ مار کر اونچے کوٹھے پر سے نیچے کود گئی اور پیروں کی زنجیر توڑنے لگی ننگے پیر دیوانہ وار بھاگتی ہوئی اپنے بد نصیب عاشق کے محلے میں جا پہنچی۔ اس کی حالت برابر بگڑتی چلی گئی۔ کبھی تو بے حس و حرکت مدہوش رہتی اور کبھی خاموش و حیرت زدہ نظر آتی۔ ماں باپ نے اس کا یہ حال دیکھا تو صبر کر کے بیٹھ رہے اور اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

جلد ہی اس بے چاری کا برا حال ہو گیا دیوانوں کی طرح اپنے آپ میں الجھتی رہتی۔ سینہ پیٹتی اور سید موسیٰ کے نام کا ورد کرتی رہتی۔ اسی حالت میں میر سید جلال متوکل کے جو ایک بزرگ درویش و عالم تھے آستانہ پر پہنچی اور ان کے سامنے کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کیا اور پھر اپنے عاشق کی قبر پر جا کر کھڑے قد سے اس طرح گری کہ پھر نہیں اٹھی۔ قارئین مجھے معاف کریں (صاحب تصنیف) میں نے اختصار کا وعدہ کیا تھا لیکن کیا کروں عشق کی اس دل گداز داستان نے میرے قلم کو بے قابو کر دیا۔

شیخ زادہ محبت کے جال میں

عشق و محبت کا ایسا ہی ایک واقعہ پہلے بھی پیش آچکا تھا۔ گوالیار میں شیخ محمد غوث کے

عزیزوں میں ایک نوجوان شیخ زادہ تھا جو پاک بازی اور نیک چال چلن میں مشہور تھا۔ آگرہ میں وہ ایک طوائف پر عاشق ہوگیا۔ یہ خبر شاہنشاہ کو ملی تو انھوں نے اس گانے والی کو ایک مصاحب مقبل خان کے حوالہ کردیا۔ اس شیخ زادے نے جان ہتھیلی پر لے کر اس محل پر کمند لگائی جس میں اس کی محبوبہ کو چوکی پہرہ میں رکھا گیا تھا اور وہاں سے اسے نکال کر لے گیا۔ بادشاہ نے شیخ محمد غوث کے لڑکے شیخ ضیاء الدین کو جو اس وقت اپنے باپ کے گدی نشین ہیں ان دونوں کو حاضر کرنے کا حکم دیا۔ انھوں نے سمجھا بجھا کر ان دونوں کو بادشاہ کے رو برو لے جا کر کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کا نکاح کردینا چاہا لیکن شیخ ضیاء الدین اور کچھ دوسرے لوگوں نے بادشاہ کو اس ارادے سے روک دیا۔ نوجوان شیخ زادہ اس مخالفت کی تاب نہ لا سکا اور خنجر کھینچ کر اپنا کام تمام کرلیا۔

اس کی تجہیز و تکفین پر علماء میں بڑا اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ شیخ ضیاء الدین کا کہنا تھا کہ حدیث شریف **"من عشق و عف و کتم ثم مات مات شہیداً"** کے مطابق وہ شہید عشق ہے اس لیے اس کو شہید کی شان و شوکت سے دفنانا چاہیے۔

ان کے علی الرغم شیخ عبد النبی اور دوسرے عالم اور قاضی کہتے تھے وہ ناپاک مرا ہے آلودۂ فسق ہے نہ کہ آسودۂ عشق واللہ اعلم۔

اپنے عاشق کے پیچھے اس مطربہ کا برا حال ہوگیا چنانچہ اس نے سب کچھ چھوڑ کر ایک کفنی گلے میں ڈال لی اور عاشق کے مزار پر مجاور بن کر جا بیٹھی۔ چند ہی دن بعد اپنے چاہنے والے سے جا ملی۔

اسی سال شیخ گدائی کنبوہ دہلوی جو معزول کوتوال کی طرح بے آبرو جی رہا تھا اور جو زمانہ کی ڈھیل کی وجہ سے نہایت متکبر و مغرور ہو چکا تھا، فوت ہوگیا۔

کالنجر کے قلعہ پر قبضہ

977ھ/1569ء میں جب چتوڑ اور رنتھنبور کے قلعوں کی فتح کی خبریں ملک میں ہر جگہ پہنچیں

اور ہندوستان کے سارے قلعے شاہی حملے کی بدولت زمین بوس ہوتے ہوئے نظر آئے، تو بھٹہ کے حاکم چندر نے بڑی دوراندیشی سے کام لیا، اس سے پہلے کہ ذلیل وخوار ہونا پڑے، اس نے کالنجر کا قلعہ، جسے اس نے خوانده بہادر خان شروانی کے لڑکے بجلی خان سے بھاری قیمت دے کر خریدا تھا، بادشاہ کے سپرد کردینے کا فیصلہ کیا اور قلعہ کی کنجی نفیس تحائف کے ساتھ دربار میں بھجوادی۔ بادشاہ نے کالنجر کی کنجی مجنون خان قاقشال کو جس کی جاگیر قلعہ سے قریب تھی عطا کردی اور راجہ رام چندر کے نام تسلی آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے جھوسی اور پریاگ کے قریب پرگنہ اربل بشمول تمام عمارتوں کے جاگیر میں عطا کیا۔

شاہزادہ سلیم کی پیدائش

17 ربیع الاول 977ھ/1569ء دن کے سات بجے فتح پور میں شیخ سلیم چشتیؒ کے مکان پر[28] شاہزادہ سلطان سلیم کی ولادت ہوئی۔

شہنشاہ آگرہ سے نہایت تیزی کے ساتھ فتح پور پہنچے اور انتہائی خوشی کے عالم میں انھوں نے تمام قیدیوں کو رہا کردینے کا حکم دیا۔ شہزادہ کی ولادت کی مسرت میں سات دن تک شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ اس موقع پر شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے کہے۔ خواجہ حسین مروی نے جو قصیدہ کہا تھا اس کے ہر مصرع سے بادشاہ کی تاریخ جلوس اور دوسرے مصرع سے شاہزادہ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ اس قصیدہ کے صلے میں بادشاہ نے اسے دولاکھ تنکہ کا انعام دیا۔ اس قصیدہ کا مطلع ہے:

للہ الحمد از پی جاه جلال شہریار
گوهر مجد از محیط عدل آمد برکنار

آخری شعر ہے:

شاه ما پاینده باد و باقی آن شہزاده ہم
روزهای بی حساب و سالہای بی شمار

آخر میں تاریخ کے متعلق مروی نے کہا ہے:

پادشاہا سلک لولوئی نفیس آوردہ ام　　هدیہ کان آمد باز جوی گو شدار
کس ندارد ہدیہ زین بہ اگر دارد کسی　　ہر کہ دارد گو بیا چیزی کہ دارد گو بیار
یک بہ یک اشعار مروی بسکہ بی عیب آمدہ　　ہر یکی جوئی زوی مقصود در پای دربار

مصرع ازل ز وی سال جلوس بادشاہ

از دوم مولود نور دیدۂ عالم بر آر

شیخ یعقوب صیرفی کشمیری نے بھی اسی اسلوب میں ایک قصیدہ کہا تھا لیکن کیا فائدہ جس کو صلہ ملنا تھا مل چکا۔

جمعہ 12 شعبان کو بادشاہ نے اپنی منت کے مطابق شہزادے کی ولادت کے شکرانے میں آگرہ سے پیدل اجمیر کا سفر کیا۔ ہر روز چھ سات کوس طے کرتے تھے۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ[29] کی زیارت کرنے کے بعد رمضان المبارک میں وہاں سے واپس آئے اور دہلی میں قیام فرمایا۔ چندن دہلی کے اولیاء اللہ کی زیارت کی پھر جمنا کے دوسرے کنارے پر شکار کھیلا اور وہاں سے دارالخلافہ لوٹ آئے۔

رافضیوں کو قتل کی سزا

اس سال بادشاہ نے میرزا مقیم اصفہانی اور ایک شخص میر یعقوب کشمیری کو رافضی ہونے کے جرم میں فتح پور میں قتل کرادیا۔

مرزا مقیم لکھنؤ میں کچھ عرصہ تک حسین خان کی ملازمت میں رہا تھا۔ حسین خان سیدوں کا بڑا معتقد تھا اس لیے وہ مرزا کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا اس نے مرزا کو اپنی سرکار کا وکیل بھی بنا دیا تھا۔ حسین خان کے عزیزوں اور بھائیوں نے خان کو بتلایا کہ یہ مرزا کٹر رافضی ہے اس لیے خان اس سے نفرت کرتے لگا، مرزا بھی حسین خان کی ملازمت چھوڑ کر بارگاہ شاہی میں جا پہنچا۔ بادشاہ نے اس پر مہربانی کی اور اسے کشمیر کے حاکم حسین خان کے پاس وکیل بنا کر بھیج دیا۔ اس زمانہ میں کشمیر میں چند

متعصب رافضیوں نے قاضی حبیب کو جو پکے سنی تھے، مذہبی تعصب میں حملہ کرکے زخمی کردیا۔ قاضی ابھی زندہ ہی تھے کہ کشمیر کے حاکم حسین خان نے مفتیوں کے فتوے کے مطابق قاتل کو سزائے موت دے دی۔ مرزا مقیم نے اس معاملہ میں مداخلت کی اور اپنے اثر سے کام لے کر اُن مفتیوں کو اس جرم میں کہ انھوں نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا؟ ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کردیا اس نے قاتل کے قتل کا فتویٰ کیوں دیا، ایک نہایت متعصب اور شرپسند رافضی کے حوالہ کردیا اس نے تین چار مفتیوں کو قتل کردیا۔ اس معاملے کے کچھ عرصہ بعد ہی مرزا مقیم اور حسین خان کا وکیل میر یعقوب حسین خان کی لڑکی کو بادشاہ کے پاس پیش کش کی رسم کے لیے لے آئے۔ اس موقع پر یہ واقعہ بادشاہ کے علم میں لایا گیا۔ بادشاہ نے ان دونوں کو شیخ عبد النبی اور اس کے رشتہ دار دوسرے چند علماء کے فتوے پر فتح پور کے میدان میں قتل کرادیا۔ اس واقعہ کا ذکر کشمیر کی تاریخ میں بھی جیسا میں (صاحب تصنیف یعنی ملا عبد القادر بدایونی) نے مرتب کیا ہے درج کیا گیا ہے۔

سوالک پہاڑی کے بت خانے

مہدی قاسم خان حج سے واپس آکر قلعہ رنتھنبور میں حاضر ہوا تھا۔ اکبر بادشاہ نے لکھنؤ کا پرگنہ حسین خان سے لے کر اس کی جاگیر میں دے دیا۔ اس کاروائی سے حسین خان کو بہت رنج ہوا۔ مہدی قاسم خان کی لڑکی اس کے نکاح میں تھی، اس سے خان کو محبت بھی تھی لیکن محض انتقام کے مارے اس نے اپنے چچا غضنفر بیگ کی لڑکی سے نکاح کرلیا اور مہدی قاسم خان سے تعلقات منقطع کرلیے۔ کچھ عرصے بعد اس نے مہدی قاسم خان کی لڑکی کو خیرآباد میں اس کے بھائیوں کے پاس بھیج دیا اور جہاد کا ارادہ کرکے لکھنؤ سے اودھ کے راستے سوالک کی پہاڑی کا رخ کیا۔ پہاڑی کے بت خانوں کے متعلق یہ جھوٹی شہرت تھی کہ وہاں بت کدوں کی اینٹیں سونے اور چاندی کی ہیں اور بڑے بڑے خزانے جمع ہیں۔ سوالک کی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں اس نے اس مہم کا راستہ اختیار کیا تھا۔

حسین خان کا سوالک پر حملہ

پہاڑیوں کا طریقہ ہے کہ جب بھی کوئی ان کے علاقہ پر حملہ کرتا ہے تو وہ تھوڑا بہت مقابلہ کر کے پہاڑوں کے اندر چھپ جاتے ہیں اور وہاں اونچی اونچی خطرناک پہاڑیوں پر مضبوط مورچہ بندی کر لیتے ہیں۔ حسین خان بھی انکو پسپا کرتے ہوئے اس مقام تک جا پہنچا جہاں پر محمد خان کا بھانجہ سلطان محمود شہید ہوا تھا۔ اس جگہ شہیدوں کی بہت سی قبریں تھیں۔ حسین خان نے شہدا کے لیے فاتحہ پڑھی اور ان کی شکستہ قبروں پر چبوترے کی تعمیر کرائی اور پھر وہاں پہاڑوں کے اندر اور آگے تک پیش قدمی کی اور وہاں کے ایک بہت بڑے زمیندار راجہ رنگا کے علاقہ پر حملہ کر کے قصبہ و جرائیل کا سارا علاقہ تاخت و تاراج کر دیا۔ وہاں سے اجمیر تک جو راجہ رنگا کا پایہ تخت تھا اور تبت کے مال واسباب، مشک، ریشم اور سونے چاندی کی بہت بڑی منڈی تھی وہاں تک، صرف دو دن کا راستہ رہ گیا تھا، لیکن جیسا کہ ان پہاڑوں کی خصوصیت ہے کہ گھوڑوں کے ہنہنانے، نقارہ کی آواز اور آدمیوں کے شور کی وجہ سے سخت بارش ہونے لگی اور جلد ہی غلہ اور گھاس کا قحط پڑ گیا، لشکری بھوکے مرنے لگے۔ حسین خان نے اپنے لشکر کو، شہر فتح کرنے کی بہت ترغیب دی اور وہاں کے سونے جواہر اور خزانوں کا بڑا لالچ دیا لیکن لشکری ایسے بدحواس ہو چکے تھے کہ وہ کسی طرح بھی اقدام کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے اور اسے واپسی پر مجبور کر دیا۔ واپسی کے وقت ہندوؤں نے حسب معمول راستے روک دیے اور لشکریوں پر تیروں کی بوچھار کر دی ان کے تیروں میں زہر آلود ہڈیوں کے پھل لگے ہوئے تھے لشکر کو جگہ جگہ پر گھیر گھیر کر سنگ باری کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حسین خان کے اکثر تجربہ کار اور جنگ آزما بہادر، ان پہاڑوں میں شہید ہو گئے اور جو لوگ زخمی ہو کر واپس آئے وہ بھی پانچ چھ ماہ سے زیادہ نہ رہ سکے۔ زہر کے اثر سے وہ بھی اپنے ساتھیوں سے جا ملے۔ اس واقعہ کی تاریخ ''تلخ بی مزہ'' نکالی گئی۔

حسین خان کی ناکام واپسی

حسین خان سوالک کی پہاڑی سے ناکام و نامراد دربار میں لوٹ کر آیا۔ اس نے پہاڑیوں

سے انتقام لینے کے لیے بادشاہ سے کانت و کولہ کی جاگیر کے لیے جو اس پہاڑ کے دامن میں واقع ہے درخواست کی، بادشاہ نے اس کی درخواست قبول کرلی۔ اس نے وہاں جاکر کئی بار پہاڑ کے دامن کے علاقوں پر حملہ کیا اور ان کو تہ وبالا کردیا لیکن پہاڑ کے اندرونی علاقوں میں داخل نہیں ہوسکا۔ اس کے لشکر کے بہت سے آدمی جو پہلی مرتبہ موت کے پنجے سے بچ کر نکل آئے تھے اس مرتبہ وہاں کے زہریلے پانی کے اثر سے بغیر جنگ کے ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرگئے۔ چند سال بعد حسین خان نے جان ہتھیلی پر لے کر پہاری علاقے پر جی جان سے حملہ کیا اور دور تک اندر چلا گیا، لیکن اسے ان خونی پہاڑوں میں واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

بھائی اور بیٹے کا انتقال

اس سفر کے موقع پر میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبد القادر بدایونی) حسین خان سے اجازت لے کر لکھنؤ سے بدایوں آ گیا تھا۔ بدایوں آنے کے بعد میں نے اپنے مرحوم بھائی شیخ محمد کو جسے میں نے دل و جان سے پالا پوسا تھا اور وہ اپنے اخلاق و عادات میں نہایت سعادت مند لڑکا تھا، ایک اچھے گھرانے میں شادی کروادی۔ یہ شادی، شادی نہیں بلکہ بربادی تھی کیوں کہ تین ماہ بعد ہی شیخ محمد اور میرا لڑکا عبد اللطیف بیمار پڑے اور ایک کے پیچھے ایک اس سرائے فانی سے کوچ کر گئے۔

ہمایوں کے مقبرہ کی تعمیر

اسی سال دہلی میں جمنا کے کنارے میرک مرزا غیاث کے زیرنگرانی ہمایوں بادشاہ کا مقبرہ اٹھ نو سال بعد مکمل ہوگیا۔ یہ عمارت واقعی نہایت حیرت انگیز اور پر فضا ہے۔

شاہزادہ مراد کی ولادت

جمعرات کے دن تیرہ ماہ محرم978ھ/1570ء کو شیخ سلیمؒ کے مکان پر شاہزادہ مراد کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ نے سابقہ جشن کی طرح ایک شاہانہ جشن منعقد کیا۔

قلعہ اجمیر کا سنگ بنیاد

فتح پور میں بادشاہ نے بارہ دن قیام کیا،اس کے بعد نذر گزارنے کے لیے اجمیر تشریف لے گئے اس مرتبہ وہاں ایک قلعہ کی بنیاد رکھی اور امراء کو عمارتوں کی تعمیر کا حکم دیا گیا۔ جمعہ کے دن 4 جمادی الآخر کو وہاں سے کوچ ہوا اور بادشاہ ناگور پہنچے۔ اس شہر کے بڑے تالاب کو کھدوانے کے لیے امیروں کو مامور کیا گیا اور اس کا نام ''شکر تلاؤ'' رکھا گیا۔

اسی زمانہ میں حاکم مارواڑ مالدیو کا لڑکا چندر سین دربار میں حاضر ہوا۔ بیکانیر کا راجہ رائے کلیان مل بھی اپنے لڑکے رائے سنگھ کے ساتھ آیا، کلیان مل اپنی لڑکی کو پیش کش کے لیے لایا تھا چنانچہ وہ حرم میں داخل کر لی گئی، باپ کو تو بیکانیر واپس جانے کی اجازت مل گئی لیکن بیٹے کو خدمت شاہی میں ہمراہ رہنے کا حکم ہوا۔ راستہ میں بادشاہ نے گورخر کا شکار کیا۔ یہ شکار اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ ۔ پھر بادشاہ شیخ فریدالدین گنج شکر کی زیارت کے لیے اجودھن کی طرف جو پاک پٹن کے نام سے مشہور ہے، گئے۔ وہاں مرزا عزیز کوکہ اعظم خان جاگیر دار تھا، اس نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑا پر تکلف جشن منعقد کیا اور بادشاہ کے نذرانے میں نفیس اور قیمتی تحفے دیے ایسی ضیافت کم ہی دیکھنے میں آئے گی۔

پٹن سے بادشاہ لاہور تشریف لائے اور حسین قلی خان کے مہمان رہے، پھر حصار فیروزہ کے راستے دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور وہاں سے مسلسل کوچ کر کے فتح پور لوٹ آئے۔

بھکر کی فتح

میر خلیفہ کا لڑکا محب علی خان پیشۂ سپاہ گری ترک کر کے مدت سے بیٹھا ہوا تھا، اس کی بیوی ناہید بیگم کی سفارش پر جس کی ماں مرزا عیسیٰ خان حاکم ٹھٹھہ کے عقد میں تھی، بادشاہ نے اسے علم ونقارہ عطا کیا اور ملتان میں جاگیر عطا فرمائی۔ حاکم ملتان سعید خان مغل کو اس کی مدد کے لیے فرمان لکھا اور اسے اس کے پوتے مجاہد خان کے ساتھ جو ایک دلیر اور بہادر نوجوان تھا ٹھٹھہ کو فتح کرنے کے لیے مقرر کر دیا وہ دارالخلافہ سے ملتان آیا اور اپنی جاگیر

کے انتظام کے لیے چار سو سوار مقرر کر کے بھکّر کے حاکم محمد سلطان کے پاس پیغام بھیجا کہ ''تم نے بارہا یہ بات کہی تھی کہ اگر تم جیسلمیر کے راستے سندھ کی فتح کا ارادہ کرو تو میں تمہارے لیے مدد روانہ کروں گا ورنہ میں بھکّر سے اس فوجی مہم کی اجازت نہیں دونگا کیوں کہ مجھے تم پر بھروسہ نہیں ہے''۔ اس کے اس انکار پر محبّ علی خان اور مجاہد خان کو اس لڑائی میں فتح حاصل ہوئی اور بھکّر کی فوج شکست کھا کر ماتیلہ کے قلعہ میں محصور ہوگئی۔ آخر وہ قلعہ بھی صلح اور امان کی شرط پر محبّ علی خان کو مل گیا۔ سلطان محمود نے بھکّر کے قلعہ سے اپنے بقیہ لشکر کو توپچیوں اور تیر اندازوں کے ساتھ مقابلہ پر بھیجا۔ وہ بھی شکست کھا کر بھاگے اور قلعہ میں بند ہو گئے اس حملہ کے وقت قلعہ میں لوگوں کا ہجوم سا ہو گیا تھا۔ لوگوں کی کثرت کی وجہ سے قلعہ کی ہوا خراب ہوگئی اور قلعہ والوں میں وبا پھوٹ پڑی۔ یہ وبا ایسی سخت تھی کہ روزانہ کم و بیش ہزار آدمی جان سے جا رہے تھے۔ 983ھ/ 1575ء میں اسی معرکہ کے دوران سلطان محمود جو کافی بوڑھا اور ضعیف ہو چکا تھا فوت ہو گیا اور بھکّر کا قلعہ بادشاہی فوج کے قبضہ میں آ گیا۔ بادشاہ نے قلعہ کے ذخیروں اور مال و اسباب کی تحقیق کے لیے میر گیسو کو فتح پور سے روانہ کیا تھا۔

اسکندر خان اوزبک کی اطاعت اور وفات

اسکندر خان اوزبک پٹھانوں کو چھوڑ کر منعم خان خان خانان کے پاس اپنی جان کی حفاظت کے سبب آ گیا۔ چنانچہ منعم خان جون پور سے اس کو لے کر اسی سال دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے دونوں کو مرصع تلوار، چہار پارچہ خلعت اور سنہری زین والا گھوڑا انعام میں دیا نیز اسکندر خان کو لکھنؤ کی جاگیر عطا فرمائی۔ اسے خان خانان کی مدد پر مقرر کر کے جونپور رخصت کر دیا۔ اسکندر خان نے لکھنؤ پہنچنے کے کچھ عرصہ بعد ہی دس جمادی الاول 980ھ/ 1572ء میں وفات پائی۔

میرا ایک دوست جمال ولد شیخ منگن بدایونی جو نہایت حسین و جمیل شخص تھا، سنبھل میں عید قرباں کے دن تیراندازی کر رہا تھا، اسے ایک اجنبی شخص نے پان کا بیڑا دیا۔ جیسے

ہی اس نے یہ پان کھایا وہ مر گیا۔

979ھ/1571ء میں آگرہ میں ایک شاندار محل اور اس طرح فتح پور کے نئے شہر میں دوسرا محل بن کر تیار ہو گیا۔

شیخ سلیم چشتیؒ کی وفات

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخر میں شیخ سلیم چشتیؒ فتح پوری نے جو ہندوستان کے برگزیدہ شیخ اور بلند مرتبہ بزرگ تھے، رحلت فرمائی۔

عشق کا خمیازہ

اس سال مجھے (صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی) ایک ہولناک واقعہ سے دوچار ہونا پڑا۔ قصہ یہ ہے کہ جس وقت محمد حسین خان کو کانت وکولہ کی جاگیر دی گئی تو میں بھی تقدیر کا مارا کچھ عرصہ تک اس کی ملازمت میں اس جگہ رہا۔ مجھے اس صوبہ کی صدارت اور فقرا کی خدمت سپرد کی گئی تھی۔ قنوج کے علاقے میں بمقام مکن پور حضرت شاہ مدار[30] کا مزار ہے میں اس کی زیارت کے لیے وہاں گیا ہوا تھا۔ انسانوں کی کمزوری آدم سے چلی آرہی ہے۔ آخر میں نے بھی انسان کا دودھ پیا ہے، خطا و نسیان سے بالا تر نہیں ہوں میری آنکھوں پر بھی غفلت و جہالت کا پردہ پڑ گیا اور یہاں ایک خوبرو کی کرشمہ دار ادا نے مجھے محبت کے جال میں پھنسا لیا۔ میں اس حرص و ہوس کو عشق سمجھ بیٹھا۔ پھر جو کچھ گزری گزری، اس درگاہ میں مجھ سے جو بے ادبانہ حرکت سرزد ہو گئی تو اس کا خمیازہ خدا کا شکر ہے کہ مجھے اس دنیا میں ہی مل گیا۔ میرے معشوق کی قوم کے چند افراد نے حملہ کر کے مجھے زخمی کر دیا چنانچہ میرے سر ہاتھ کندھے پر پے در پے تلوار کے نو زخم لگے مگر دوسرے تمام زخم تو مندمل ہو گئے لیکن سر کا زخم بڑا گہرا تھا تلوار ہڈی کو توڑتی ہوئی بھیجے تک پہنچ گئی تھی اور بائیں ہاتھ کی ایک انگلی کی رگ بھی کٹ کر انگلی لٹکنے لگی تھی بس صرف جان رہ گئی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں اس حادثہ کو جھیل گیا۔ قصبۂ بانگر مئو میں ایک ماہر جراح نے علاج کیا

اور ہفتہ بھر کے اندر ہی تمام زخم ٹھیک ہو گئے۔ اسی بیماری اور مصیبت میں میں نے منت مانی کہ اچھا ہو جاؤں تو حج کروں گا، لیکن افسوس ہے میں نے ابھی تک اپنے وعدے کو پورا نہیں کیا ہے۔ غرض کچھ صحت پانے کے بعد میں وہاں سے کانت وکولہ چلا گیا، غسل صحت کے بعد ہی میں دوبارہ بیمار ہو گیا۔ حسین خان کو خدا جنت عطا کرے، باپ اور بھائی کی طرح میری خدمت کی۔ ان دنوں سردی سخت پڑ رہی تھی اس لیے سر کا زخم دوبارہ ہرا ہو گیا تھا۔ اس نے چوب گز[31] کا مرہم اور کھانے کے لیے گز کا حلوا تیار کرا دیا۔ میں وہاں سے بدایوں چلا آیا۔ وہاں طبیب نے سر کے زخم کو دوبارہ کھول کر مرہم پٹی کی۔ اس علاج میں ایسی تکلیف ہوئی کہ بس میں موت کے منھ میں جا کر نکل آیا۔ اسی دوران ایک دن میں نے کچھ نیند اور کچھ بیداری کے عالم میں ایک خواب دیکھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ سپاہی مجھے پکڑ کر آسمان پر لے گئے ہیں، وہاں با قاعدہ کچہری لگی ہوئی ہے جس میں دایوانی کے کارندے اور محرر کام میں مصروف ہیں اور چوکیداروں کا ایک جتھا شاہی اجلاس کی طرح ہاتھ میں چھڑیاں لیے ہوئے لوگوں کو ہٹانے اور مودب رکھنے میں مصروف ہے۔ مجھے پیش کیا گیا تو ایک محرر ایک کاغذ کو ہاتھ میں لے کر بغور دیکھنے لگا پھر اس نے کہا" یہ وہ شخص نہیں" اسی عالم میں میری آنکھ کھل گئی اور میں بہت شرمندہ ہوا۔ میں نے بچپن میں جو افواہ[32] سن رکھی تھی اس موقع پر مجھے اس کا یقین سا ہو گیا۔

بدایوں کی آتشزدگی

اسی سال بدایوں میں آتش زدگی کا بہت بڑا واقعہ پیش آیا۔ اس حادثہ میں اتنے ہندو اور مسلمان ہلاک ہوئے کہ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔ جلی ہوئی لاشوں کو گاڑیوں میں بھر بھر کر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ ہندو اور مسلمان میت کی کوئی تمیز نہ تھی۔ بہت سے لوگ آگ سے بچ کر قلعہ کی فصیل پر چڑھ گئے تھے لیکن آگ نے پیچھا نہ چھوڑا اور وہاں تک پہنچ گئی، چنانچہ بہت سی عورتیں اور مرد فصیل پر سے دوسری طرف کود گئے، بہت سے گر کر مر گئے اور جو بچے وہ معذور و اپاہج ہو گئے۔ آگ بجھانے کے لیے جس قدر پانی ڈالتے تھے اس کے شعلے اور

بلند ہوتے جاتے تھے۔ پانی بھی تیل کا کام کر رہا تھا۔ میں (صاحب منتخب التواریخ یعنی ملا عبد القادر بدایونی) نے اس آتش زدگی کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس کی لپٹیں میرے کان تک پہنچ چکی تھیں۔ اس حادثہ سے پہلے کا قصہ ہے کہ دوآبہ کا ایک مجذوب بدایوں آیا تھا میں اسے اپنے گھر لے آیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ تنہائی میں اس نے مجھ سے کہا ''اس شہر سے نکل جاؤ''۔ میں نے پوچھا ''کیوں؟'' مجذوب نے جواب دیا ''یہاں قدرت ایک کھیل کھیلنے والی ہے''۔ وہ عجب رند و مست معلوم ہو رہا تھا اس لیے مجھے اس کی بات کا یقین نہ آیا لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا:

چہ پرسی از بداؤن و ز احوال پریشانش — کہ آیات عذاب النار نازل گشتہ در شانش

گجرات پر فوج کشی

980ھ/1572ء میں گجرات فتح ہوا۔ گجرات میں بڑا انتشار اور طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے گجرات پر حملہ کی تیاریوں کا حکم دے دیا اور فوج کو حاضر ہوجانے کے لیے فرمان جاری کر دیے۔ گجرات کی مہم کے لیے 20 صفر کو پایہ تخت سے روانگی عمل میں آئی۔ 15 ربیع الاول کو اجمیر میں لشکر نے چھاؤنی قائم کی۔ اجمیر میں بادشاہ نے پہلے تو حضرت معین الدین چشتیؒ کے مزار کی زیارت کی پھر دوسرے دن وہ میر سید حسین خنگ سوارؒ کی زیارت کے لیے پہاڑ کے اوپر تشریف لے گئے میر موصوف کی شان میں یہ شعر مشہور ہے:

شکر اللہ بدل تاختہ انوار علی — از حسین ابن علی ابن حسین ابن علی

ان زیارتوں سے فارغ ہو کر بادشاہ نے ہراول میر محمد خان کلاں کی سرکردگی میں آگے روانہ کر دیا اور شاہی سواری مسلسل کوچ کر کے نویں جمادی الاول کو ناگور پہنچی۔

شاہزادہ دانیال کی ولادت

اجمیر کے قیام کے دوران میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبد القادر بدایونی)

جمعرات کی رات کو دوسری ماہ جماد ی الاول کو ایک مجاور شیخ دانیال کے گھر میں شاہزادہ دانیال کی ولادت ہوئی۔ بادشاہ کو یہ خوشخبری ناگور کی دوسری منزل میں پہنچائی گئی شیخ دانیال کی نسبت سے شاہزادہ کا نام دانیال تجویز کیا گیا۔

سروہی کی جنگ

جب لشکر شاہی میرٹھ پہنچا تو خبر ملی کہ سروہی کے مقام پر ایک راجپوت نے ایلچی گری کے بہانے خان کلاں پر جمد ہر[33] سے حملہ کر دیا۔ جمد ہر، خان کے سینہ میں اندر تک گھُپ گیا اور اس کی نوک شانہ کی پیچھے نکل آئی۔ لوگوں نے حملہ آور کو اسی وقت مار ڈالا۔ خان کلاں کو گہرا زخم آیا تھا، لیکن خیریت ہوئی کہ وہ زخم دس پندرہ دن میں بھر گیا۔ جب لشکر سروہی پہنچا تو سو ڈیڑھ سو راجپوتوں نے اپنی رسم کے مطابق کچھ نے نوبت خانہ میں اور کچھ نے راجہ سروہی کے محل میں جان دے دینے کا اقرار کیا او رمقابلہ کرنے کے لیے نکل آئے۔ سب کے سب مارے گئے۔ دہلی کے حاکم تاتار خان کا لڑکا دوست محمد جسے ''تاتار چہ'' کہا جاتا تھا اسی جنگ میں شہید ہو گیا۔

اسی جگہ بادشاہ نے بیکانیر کے رائے سنگھ کو جودھ پور پر مقرر کیا تاکہ گجرات کا راستہ محفوظ رہے اور گولکنڈہ اور کوہنلیر کے حاکم رانا کیکا کی طرف سے کوئی مزاحمت پیش نہ آئے۔ راجہ بھگوان داس کے لڑکے مان سنگھ کو ایک تیار شدہ فوج کے ساتھ ایدر کی طرف مقرر کیا گیا تاکہ وہ شیر خان فولادی کے لڑکوں کا پیچھا کرے جو اپنے اہل و عیال سمیت اس جانب جا رہے تھے۔

احمد آباد کی فتح

پہلی رجب کو ٹپن شہر کے سامنے شاہی لشکر نے کیمپ لگا دیا۔ پٹن سید محمود کے بھائی سید احمد خان بارہہ کو جاگیر میں ملا تھا۔ اسی مقام پر پٹھانوں کا پیچھا کرنے کے بعد مان سنگھ کافی مال غنیمت لے کر حاضر ہوا۔ بشیر خان افغان، سلطان محمود گجراتی کے غلام اور وزیر مطلق

اعتماد خان کے ساتھ تقریباً چھ ماہ سے احمد آباد[34] کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔اصل میں اعتماد خان نے سلطان محمود گجراتی کے لڑکے مظفر کو قید کر رکھا تھا اور اس کے نام سے خود حکمرانی کر رہا تھا۔ جب اسے اکبر کے فوجی مہم کی اطلاع ملی تو محاصرہ اٹھالیا اور پٹھانوں کی جمعیت پریشان ہوگئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر بروز اتوار 9/رجب کو سلطان مظفر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوگیا۔بادشاہ نے اسے شاہ منصور وزیر کے، جس کا حال آگے آئے گا، سپرد کردیا اور اس کے خرچ کے لیے ماہانہ تیس روپے کی رقم منظور کی۔ بعد میں وہ شاہی قید سے بھاگ گیا، لیکن راجہ سورت کے ہاتھوں قید ہوگیا۔ جس وقت راجہ نے اس کو گرفتار کر کے جوناگڑھ میں اعظم خان کے پاس روانہ کیا تو اس نے راستہ میں اُسترے سے اپنے آپ کو ہلاک کرلیا۔

دوسرے دن اعتماد خان، شاہ ابو تراب، سید حامد بخاری، اختیار الملک حبشی، ملک الشرق، وجیہ الملک، الغ خان حبشی، جھجھار خان حبشی اور گجرات کے دوسرے تمام امراء بارگاہ سلطانی میں حاضر ہوئے۔اعتماد خان احمد آباد شہر کی کنجی اپنے ساتھ لیتا آیا تھا۔ بادشاہ نے اپنی ایک حرم کا لحاظ کر کے جیشو کو معتمد امرا کے سپرد کردیا۔

جمعہ کے دن 14 رجب کو احمد آباد کے ساحل پر خیمہ گاہ بنائی گئی اور اکبر کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اسی مہینہ کی 20 تاریخ کو سید محمود خان بارہہ اور شیخ محمود بخاری نے شاہی بیگمات کو لشکر میں پہنچایا۔ پیر کے دن دوسری شعبان کو لشکر نے احمد آباد سے کھنبایت کی طرف کوچ کیا۔ یہ فوجی مہم ابراہیم حسین مرزا اور محمد حسین مرزا کے خلاف کی گئی تھی ان لوگوں نے عرصہ سے بھڑوچ، بڑودہ اور سورت پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی موقع پر اختیار الملک حبشی جو گجرات کا نامی گرامی سردار تھا احمد آباد سے احمد نگر کی طرف بھاگ گیا۔ بادشاہ نے بے اعتباری کی وجہ سے اعتماد خاں کو شہباز خاں کنبوہ کے حوالے کردیا۔ شعبان کی 6/تاریخ کو کھنبایت کی بندرگاہ پر قیام ہوا اور 14/تاریخ کو لشکر بڑودہ کے قصبے میں پہنچا۔ بادشاہ نے گجرات کا سارا نظم ونسق میرزا عزیز کوکہ کے سپرد کر کے اس کو احمد آباد رخصت کردیا۔

ابراہیم حسین مرزا سے مقابلہ

17 ماہ شعبان کو خبر پہنچی کہ ابراہیم حسین میرزا نے قلعۂ بھڑوچ میں رستم خان رومی کو قتل کرایا ہے اور اب وہ اس راستہ سے بھاگنا چاہتا ہے جو لشکر گاہ سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر تھا۔ بادشاہ نے شاہزادہ سلیم کی کمان میں لشکر کو اسی جگہ ٹھہرالیا۔ خواجہ جہاں اور دوسرے امراء کو بھی لشکر کی نگہداشت کے لیے مقرر کیا۔ شہباز خان کو سورت پر متعینہ امیروں سید محمود بارہہ اور شاہ قلی خان محرم کو بلانے کے لیے روانہ کردیا اور ملک الشرق گجراتی کو بدرقہ پر مقرر کر کے میرزا ابراہیم حسین کے بغاوت کو کچلنے کے لیے حملہ کیا۔ جب وہ مہندری ندی کے کنارے پہنچے تو رات ہوچکی تھی۔ چالیس سواروں نے ندی پار کی اور دوسری طرف کی خبر لے کر آئے کہ میرزا ابراہیم حسین دوسرے کنارے پر قصبہ سرنال میں ٹھہرا ہوا ہے۔ امرائے شاہی نے ہتھیار سجالیے۔ سورت پر متعینہ امیر بھی اسی رات آکر لشکر سے مل گئے۔ بادشاہ نے مان سنگھ کو ہراول پر مقرر کیا اور ایک سو سپاہیوں نے ندی پار کرلی۔

مرزا ابراہیم حسین کے ساتھ ایک ہزار سوار تھے۔ اسے شاہی لشکر کے حملے کی خبر ملی اور وہ سرنال کے قصبہ سے ایک دوسرے راستہ سے نکل گیا اور ایک جنگل میں پہنچ کر مقابلہ کی تیاری کرنے لگا۔ مہندری ندی کے کٹاؤ اور راستہ کی خرابی کی وجہ سے مان سنگھ ایک طرف نکل گیا اور بادشاہ کسی اور راستہ پر جا پہنچے۔ آخر کار دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی اور ابراہیم حسین نے بابا خان قاقشال پر حملہ کر کے اگلے دستہ کو کافی دور تک پسپا کردیا۔ دونوں طرف سے کچھ لوگ مارے گئے اور انھوں نے بادشاہ کی جمعیت پر حملہ کردیا۔ اس وقت بادشاہ ایک ناہموار تنگ مقام پر جو جھاڑیوں سے گھرا ہوا تھا، ٹھہرے ہوئے تھے۔ حملہ آوروں میں سے تین شخص آگے بڑھے، ایک نے راجہ بھگونت داس کا رخ کیا۔ راجہ نے جھاڑی کے پیچھے سے اس پر نیزہ پھینک کر مارا اور وہ زخمی ہوکر بھاگ گیا۔ بادشاہ سب سے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ دوسرے شخص نے ان پر حملہ کردیا۔ لیکن وہ بادشاہ کے مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور بھاگ گیا۔ مقبول خان، غلام سرخ بدخشی اور دونوں کے تعاقب میں روانہ ہوا پھر

چاروں طرف سے بادشاہی لشکر نے میرزا ابراہیم حسین کی جمعیت کو گھیر لیا اور وہ مغلوب ہو کر جنگ کے میدان سے بھاگ گیا۔اسی معرکہ میں اس کے بے شمار آدمی مارے گئے اور چونکہ فتح ہو چکی تھی اس لیے بادشاہ نے لوگوں کو پیچھا کرنے سے روک دیا اور میرزا ابراہیم حسین چند گنتی کے ساتھیوں کے ساتھ احمد نگر کے راستہ سروہی کی طرف چلا گیا وہاں سے وہ ناگور پہنچا۔ جب امرائے شاہی نے اسے شکست دے کر وہاں سے بھگا دیا تو دہلی کے راستے سنبھل کے علاقے میں چلا گیا۔اس کا انجام کیا ہوا؟ یہ ہم آگے بیان کریں گے۔

سورت کے قلعہ کی فتح

بادشاہ اس معرکہ سے 18 شعبان کو رخصت ہو کر بڑودہ میں لشکر سے آ کر مل گئے اور وہاں سے سورت کے قلعہ کی فتح کے لیے روانہ ہوئے۔ اس قلعہ کو گجرات کے وزیر خداوند خان نے فرنگیوں کی روک تھام کے لیے سمندر کے کنارے 947 ھ/1540ء میں تعمیر کرایا تھا چنگیز خان کے مرنے کے بعد باغی مرزاؤں نے اس قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ جب گجرات فتح ہو گیا تو مرزاؤں نے اپنے اہل و عیال کو اس قلعہ میں ٹھہرایا اور وہاں کا نظم و نسق ہمایوں بادشاہ کے قورچی ہم زبان نامی کے سپرد کر دیا۔یہ شخص شاہی ملازمت میں تھا اور غداری کر کے مرزاؤں سے جاملا تھا۔اس انتظام کے بعد وہ سارے ملک میں فساد مچاتے پھر رہے تھے۔ جب مرزا ابراہیم حسین کی شکست کی خبر قلعہ والوں کو ملی تو کامران مرزا کی لڑکی گلرخ بیگم جو ابراہیم حسین مرزا کی بیوی تھی اپنے لڑکے میرزا مظفر حسین کو ساتھ لے کر دکن کی طرف رخصت ہوگئی۔ میرزا مظفر حسین کو اس وقت بادشاہ کی دامادی کا شرف حاصل ہے۔ شاہ قلی خان محرم اور صادق محمد خان نے میرزا کے خاندان کا پیچھا کیا اور تھوڑا بہت مال غنیمت چھین کر لوٹ آئے۔

بادشاہ اپنے پہنچنے سے پہلے راجہ ٹوڈرمل کو قلعہ میں آمد و رفت کے راستوں اور دوسرے حالات کی تحقیق کے لیے روانہ کر دیا تھا اس نے تمام حالات کا جائزہ لے کر بادشاہ کو اطمینان دلایا کہ قلعہ تھوڑے وقت میں بہ آسانی فتح ہو جائے گا۔ اس رپورٹ پر شاہی

لشکر 7 ماہ رمضان کو قلعہ کے دروازے پر پہنچا اور اس کا محاصرہ کرلیا۔ مورچے لگادیے گئے اور حملہ کرکے قلعہ والوں کو بُری طرح تنگ کردیا۔ دو ماہ کے عرصہ میں اونچے اونچے پشتے بنا کر توپچی اور بندوقچی اس غضب کی آتش باری کرنے لگے کہ قلعہ والوں میں سے کسی کو اٹھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، بادشاہ نے دوسری جانب ایک تالاب کے کنارے قیام کیا اور مورچے آگے بڑھا کر پانی کا راستہ بند کردیا۔ اب قلعہ والے ہر طرح مجبور ہوگئے۔ ہمزبان اور دوسرے محصور امیروں نے ایک طالب علم مولانا نظام الدین کو جو ایک اچھا مقرر تھا جان کی معافی کے لیے بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ اسے امرا کی سفارش پر باریابی کی اجازت ملی اور بادشاہ نے قلعہ والوں کی درخواست قبول کرلی اور اسے معافی دیے جانے کے لیے ''قلعے والوں کو تسلی اور دلاسہ دے کر حضور میں لے آئے۔ دیانت دار محرر بھی مقرر کیے گئے تاکہ وہ لوگوں کے نام لکھ لیں اور قلعہ کے مال و اسباب کو ضبط کرلیں۔ ہمزبان اور اس کے ساتھی جب حاضر کیے گئے تو بادشاہ نے ہمزبان کی اور اس کے چند ساتھیوں کو جنھوں نے محاصرے کے دوران نہایت گستاخانہ کلمے کہے تھے تنبیہ کی اور ان کو سرکاری کارندوں کے حوالہ کردیا۔ بقیہ دوسرے اسیروں کو معاف کردیا۔ یہ فتح 23 ماہ شوال 980ھ/1572ء کو حاصل ہوئی۔

دوسرے دن بادشاہ قلعہ کو دیکھنے کے لیے تشریف لے گئے اور اس کی مرمت کا حکم دیا۔ اس معائنہ کے دوران چند بڑی، بڑی دیگیں اور توپیں نظر سے گزریں، جس وقت سلیمان سلطان خواندکار روم نے گجرات کی بندرگاہوں کو فتح کرنے کے لیے ایک بڑی فوج کے ساتھ حملہ کیا تھا تو اس نے یہ سامان سمندر کے راستہ روانہ کیا تھا۔ چند وجوہ کی بنا پر اس کی فوج واپس چلی گئی تھی اور اس وقت سے وہ دیگیں سمندر کے کنارے پڑی ہوئی تھیں۔ جب خداوند خان نے سورت کا قلعہ بنوایا تو وہ ان سے چند دیگوں کو قلعہ میں اٹھوالایا تھا جو باہر رہ گئی تھیں۔ انھیں بعد میں جوناگڑھ کے حاکم نے قلعہ میں پہنچا دیا تھا۔ بادشاہ نے انھیں دیکھ کر فرمایا کہ اس قلعہ میں جب ان کی کوئی ضرورت نہیں ہے تو آگرہ کے قلعہ میں پہنچا دی جائیں چنانچہ وہ وہاں پہنچادی گئیں۔

سورت کے قلعہ کی تعمیر کا سبب

کہتے ہیں کہ خدوا ند خان نے یہ قلعہ فرنگیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بنایا تھا، کیوں کہ یہ فرنگی مسلمانوں کو بہت ستانے لگے تھے اور مسلمانوں کے شہروں پر لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔جس وقت قلعہ بننے لگا تھا تو انھوں نے جہازوں پر سے آتش باری کر کے تعمیر کے کام میں خلل ڈالنے کی کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے۔ ماہر انجینئروں نے سمندر کے اندر تک قلعہ کی دیواریں پہنچا دیں اور قلعہ کے اطراف میں گہری خندق کھود کر خشکی کے دونوں جانب پتھر، چونااور پکی اینٹوں کی مستحکم دیوار بنادی۔ اس فصیل کے ہر دو پتھروں کے درمیان لوہے کے قلابے لگائے گئے ہیں اور دروازوں میں سیسہ پگھلا کر کنکر پتھر جمادیے ہیں اس دیوار کی بلندی خندق کی چوڑائی کے برابر 20 گز اورطول 35 گز ہے۔ چاروں دیواروں کا عرض 15 گز ہے۔ قلعہ اس قدر بلند اور خوش منظر ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جائے، سمندر کی جانب قلعہ کے جو برج ہیں ان میں فرنگیوں، خاص طور سے پرتگالیوں کے طرز تعمیر کی طرح جھروکے بنائے گئے ہیں۔ فرنگیوں نے اس قلعہ کی تعمیر کے وقت بڑی رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کی تھی اور جنگ پر آمادہ ہوگئے تھے۔ آخر کار وہ مصالحت پر مجبور ہوگئے اور یہ شرط پیش کی کہ سمندر کی جانب جو احاطہ ہے اسے ڈھادیا جائے تو ہم ایک کثیر رقم دینے کو تیار ہیں۔ خداوند خان نے اسلامی حمیت کی بنا پر ان کی پیش کش کو قبول نہ کیا اور ان کی ضد میں اس حصہ کو بہت جلد مکمل کرادیا۔ بادشاہ نے اس قلعہ کی حکومت قلیچ خان کے لڑکے کو سپرد کی اور 14 ذی قعدہ کو وہاں سے احمد آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔

اس محاصرہ کے دوران چند قابل ذکر واقعات پیش آئے تھے، پہلا یہ کہ میرزا شرف الدین حسین جو دس سال سے برابر باغی ہوکر مارامارا پھر رہا تھاولایت بگلانہ کے راجہ بہارجیو کے ہاتھوں گرفتار ہوکر حضور میں پیش کیا گیا۔ حاضر ہونے میں اس نے بے ادبی اور خود سری کا مظاہرہ کیا اس لیے اسے تنبیہ کر کے شاہی کارندوں کے حوالے کر دیا گیا۔ بھڑوچ کی منزل میں چنگیز خان کی والدہ نے جھجار خان حبشی کے خلاف چنگیز خان کو ناحق قتل کرنے کے الزام میں فریاد کی اور خون کے بدلے کا مطالبہ کیا۔ اس معاملہ کی تحقیقات

کرائی گئی۔ چونکہ قاتل نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا تھا، اس لیے اس کو ہاتھی کے پیر کے نیچے ڈال دیا گیا۔

باغیوں کے مشورے

اسی سورت کے محاصرہ کے دنوں میں ابراہیم حسین میرزا شکست کھا کر سرنال سے پٹن گیا اور وہاں محمد حسین میرزا اور شاہ میرزا سے جا کر مل گیا اور سورت کے قلعہ کو بادشاہی فوج سے چھین لینے کے لیے ان مرزاؤں نے مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ ابراہیم حسین مرزا ہندوستان جا کر وہاں فتنہ برپا کرے اور محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا شیر خان فولادی کے ساتھ مل کر پٹن کا محاصرہ کرلیں تا کہ بادشاہ ان کے مقابلہ کے لیے سورت چھوڑ کر احمد آباد آجائیں۔

شیر خان فولادی کی بہادری

حسب قرار دار جب مرزاؤں نے حملہ کیا تو سید احمد خان بارہہ پٹن میں محصور ہوگیا اور بڑی دلیری سے لڑتا رہا۔ اس کی مدد کے لیے قطب الدین محمد خان مالوہ اور چندیری کے جاگیرداروں کو ساتھ لے کر پہنچ گیا۔ رستم خان، عبد المطلب خان، شیخ محمود بخاری دہلوی وغیرہ بھی احمد آباد سے اعظم خان کے ساتھ پٹن پہنچ گئے۔ مدد پر آنے والی فوج سے مقابلہ کے لیے محمد حسین مرزا، شاہ مرزا اور شیر خان فولادی نے محاصرہ اٹھا لیا اور پٹن سے پانچ کوس کے فاصلہ پر آگے بڑھ کر بادشاہی فوج پر حملہ کردیا اور ایسی سخت لڑائی کی کہ تاریخ میں یادگار ہے گی۔ انھوں نے بادشاہی لشکر کی اگلی صف کو اعظم خان کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا اور صف بندی نیز فوج کے بائیں بازو کو بھی منتشر کردیا۔ شاہی امرا نے بھی بڑی ثابت قدمی سے ان کی مدافعت کی، آخر کار میدان بادشاہی لشکر کے ہاتھ رہا اور مخالف فوج منتشر ہوگئی۔ اس وقت لشکری غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہوگئے اور خان اعظم چند ہمراہیوں کے ساتھ میدان میں ٹھہر گیا۔ شیر خان فولادی افیون کھاتا تھا، افیونیوں کو ہمیشہ قبض رہتا ہے

جس وقت جنگ ہورہی تھی وہ طہارت خانہ چلا گیا تھا، اس لیے افیون کی پنک اور قبض کی وجہ سے وہ اپنے دو تین ہزار آدمیوں کولیکراس وقت پہنچا جب کہ اس کے ساتھی بھاگ چکے تھے اورمیدان خالی پڑا تھا اس نے آتے ہی شیخ محمد بخاری کے دستہ پر حملہ کردیا۔ شیخ محمد بخاری نے آخر تک جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اعظم خان نے اپنی جگہ سے حرکت کی، اس کی فوج نے چاروں طرف سے حملہ آوروں کو گھیر لیا۔ شیر خان فولادی بھی مجبور ہوکر بھاگ گیا اور اپنے ساتھیوں سے جا کر مل گیا، جب اس سے پوچھا گیا کہ تم نے اپنے ہی پیرزادہ شیخ محمد بخاری کو کیوں شہید کردیا؟ تو اس نے جواب دیا ''ہم نے یہ سنا تھا کہ تمام مغل سرداروں میں شاہ بداغ خان اور ایک دوسرا سردار نہایت جم کر مقابلہ کر رہے ہیں انہی کے گمان میں ہم نے شیخ محمد پر حملہ کیا اگر ہم کو اس کا یقین ہوتا کہ وہاں شیخ محمد ہے تو ہرگز اس کے قتل کا ارادہ نہ کرتے''۔

اس شکست کے بعد محمد حسین میرزا دکن کی جانب چلا گیا اور شیر خان جونا گڑھ کے حاکم امین خان غوری کی پناہ میں چلا گیا۔ یہ فتح 18 ماہ رمضان 980 ھ/1572ء میں حاصل ہوئی۔ اعظم خان نے سید احمد خان بارہہ کو بدستور سابق قلعہ پٹن پر ہی مقرر رکھا اور خود سورت میں جا کر حاضر ہوا۔

اختیار الملک حبشی سرکاری محافظوں کی قید سے احمد آباد میں بھاگ گیا تھا۔ اس کی گرفتاری کے لیے قطب الدین محمد خان اور دوسرے چند امیر مقرر کیے گئے تھے۔ اختیار الملک بھاگ کر باغیوں سے جا ملا اور لڑبھڑ کر بعض مقامات پر اس نے قبضہ کرلیا۔ امرائے شاہی نے اس پر حملہ کرکے اسے وہاں کے قلعوں اور جنگلوں سے بھگا دیا اور سارے علاقہ میں تھانے قائم کرکے محافظ دستے مقرر کردیے۔ اس انتظام کے بعد یہ لوگ اس وقت جب کہ لشکر سورت سے لوٹ کرمحمود آباد پہنچا تھا دربار میں حاضر ہوگئے۔

گجرات سے واپسی

آخر ماہ ذی قعدہ میں بادشاہ احمد آباد پہنچے، دس دن تک وہاں قیام رہا۔ احمد آباد کی حکومت

بادشاہ نے اعظم خان کے سپرد کی۔ امرائے اتکہ کو گجرات میں جاگیریں عطا کیں۔ مظفر خان کو ڈھائی کروڑ کی جاگیر عطا ہوئی اور اسے مالوہ کا سارا علاقہ اجین اور سارنگ پور کی حکومت بھی عطا ہوئی۔ اس انتظام کے بعد بادشاہ عید قربان کے دن احمد آباد سے روانہ ہوئے اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے محرم 981 ھ/ 1573ء کو اجمیر واپس آئے۔ اس اثنا میں سعید خان کا عریضہ آیا کہ مرزا ابراہیم گرفتار ہوا اور دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اسی سال 2 صفر کو شاہانہ سواری دارالخلافہ پہنچی۔

ابراہیم حسین مرزا کی بغاوت

مرزا ابراہیم حسین گجرات سے ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے لیے سب سے پہلے میرٹھ گیا۔ وہاں ایک قافلہ کو جو آگرہ جارہا تھا لوٹ لیا اور ناگور چلا گیا۔ یہاں خان کلاں کا لڑکا فرخ خاں گھر گیا۔ مرزا نے شہر کے باہر بستیوں کو لوٹ لیا اور ایک دن وہاں ٹھہر کر نارنول چلا گیا ابھی وہ نارنول سے 20 کوس کے فاصلے پر تھا کہ اتفاق سے رام رائے اور رائے سنگھ جو گجرات کے راستہ کی حفاظت کے لیے مقرر کیے گئے تھے، تقریباً ایک ہزار سواروں کے ساتھ جودھ پور سے حملہ کرتے ہوئے ناگور پہنچے اور فرخ خان نے ان کے ساتھ میرزا کا پیچھا کیا اور موضع کھتولی کے علاقے میں جا کر کیمپ لگا دیا، ان کے آنے پر مرزا وہاں سے بھاگ گیا اور شاہی فوج کو پتہ نہ چل سکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا ہے اور کہاں ہے؟ فوج میں جو مسلمان روزہ دار تھے وہ افطار کے ارادہ سے ایک تالاب کے کنارے ٹھہر گئے۔ مرزا کچھ دور تک جانے کے بعد لوٹ آیا اور دوسری ماہ رمضان 980 ھ/1572ء کو ان پر رات میں چھپ کر حملہ کر کے، دوطرف سے ان پر تیر برسانے شروع کردیے۔ ان لوگوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا اور ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مرزا کے ساتھ 700 سے زیادہ آدمی نہ تھے۔ جب بادشاہی دستے نے دلیری سے حملہ کیا تو یہ مقابلہ پر ٹھہر نہ سکے اور منتشر ہوگئے۔ مرزا میدان چھوڑ کر بھاگ گیا، اندھیری رات میں اس کی فوج گاؤں اور دیہاتوں میں منتشر ہوگئی اور اس کے سپاہی جگہ جگہ گرفتار اور قتل ہوگئے۔ ان میں

سے ایک سو سپاہی فرخ خان کے ہاتھوں گرفتار ہوئے اور تہہ تیغ کردیے گئے۔ ان میں سے بعض زخمی ہو کر بہ مشکل مرزا سے جا کر مل گئے۔ مرزا نے تین سو آدمیوں کو لے کر لوٹ مار کرتے ہوئے گنگا اور جمنا کو پار کیا اور اپنی سابقہ جاگیر پرگنہ اعظم پور پہنچ گیا۔ اب اس نے سوچا اگر میں سنبھل کے قلعہ میں جس کے پیچھے کماؤں کا پہاڑ ہے اور آگے گنگا جیسی گہری ندی ہے وہاں چلا جاؤں اور ایک فوج جمع کر لوں تو بہت سے لوگ میرے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں گے لیکن اس کا خیال بس خیال ہی رہا کیوں کہ بادشاہی امیروں نے ہر طرف سے اس کے راستے روک دیے تھے۔

راجہ اودیسر سے لڑائی

مہدی قاسم خان، ابراہیم حسین مرزا کے دہلی آنے سے پہلے حسین خان اپنی جاگیر کانت و کولہ اور پٹیالی کے سرکشوں کی خبر گیری کے لیے گیا ہوا تھا اسی اثنا میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری اور راجہ بھاڑامل نے جو وکیل اور وزیر مطلق تھے۔ فتح پور سے اس کے پاس خط بھیجا کہ ابراہیم حسین مرزا دو جگہوں پر شکست کھا کر دہلی کے علاقے میں آیا ہوا ہے اور پایہ تخت بالکل خالی پڑا ہے اس لیے تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ۔ حسب طلب وہ دار الخلافہ کی طرف روانہ ہو گیا جس وقت وہ موضع اودھ سے کوچ کر رہا تھا پرگنہ جلیسر سے اس کے پاس خبر آئی کہ راجہ اودیسر نے جو بادشاہ کے جلوس سے برابر اب تک آگرہ کے علاقے میں ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کرتا رہا ہے بادشاہی امرا کے خلاف حملہ کر دیا ہے اور مردانہ وار حملہ کر کے بعض بہادر اور تجربہ کار آدمیوں کو ہلاک کر رہا ہے اور اب وہ پرگنہ جلیسر میں موضع نوراہی کے جنگل میں چھپا ہوا ہے۔

خوفناک حملہ

ماہ رمضان کی پندرہویں دوپہر کو جب کہ اکثر لوگ روزہ سے متفرق ہو کر راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک گولی چلنے اور تیر چھوڑنے کی آواز آئی اور معاً لڑائی چھڑ گئی۔ راجہ اودیسر نے

گنواروں کی مدد سے اونچے اونچے درختوں پر تختے رکھوا کر مچانیں بنائی تھیں، وہاں سے اس نے شاہی رسالہ پر بندوقوں اور تیروں سے آتش باری کردی۔ اس اچانک حملہ سے بعض مارے گئے اور بعض زخمی ہوئے۔ ایک گولی حسین خان کے زانو کو زخمی کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زین سے جھک کر گھوڑے کی گردن پر ضعف کے مارے بے ہوش ہوگیا، وہ گر پڑتا لیکن بڑے حوصلہ سے اس نے اپنے آپ کو سنبھالا اور زین پر بیٹھ گیا میں (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) نے اس پر پانی کے چھینٹے مارے جو لوگ آس پاس تھے ان کو گولی لگنے کا علم تک نہیں ہوا وہ یہ سمجھے کہ روزہ کی وجہ سے غشی ہوگئی ہے۔ میں نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر ایک درخت کے نیچے لے جانا چاہا تاکہ تیروں کی بوچھار سے پناہ مل جائے۔ اسی حالت میں اس نے اپنی آنکھ کھولی اور خلاف عادت مجھے غصہ سے گھور کر دیکھا۔ جھٹکے سے اشارہ کرتے ہوئے کہا باگ پکڑنے کا یہ کونسا موقع ہے؟ پھر اس نے فوج کو گھوڑوں سے اتر آنے کا حکم دیا۔ اسے اسی جگہ چھوڑ کر سب لوگ گھوڑوں سے اتر کر پیادہ ہوگئے۔ اس کے بعد ایسی سخت لڑائی ہوئی اور جانبین سے اتنے آدمی قتل ہوئے کہ ان کی گنتی محال تھی۔ آخر کار شاہی فوج کے مٹھی بھر سپاہیوں کو فتح نصیب ہوئی اور مقابل مقابلے سے بھاگ کھڑے ہوئے، لڑتے لڑتے سپاہیوں کے بازو ایسے شل ہوگئے تھے کہ تلوار مارنے اور تیر چھوڑنے کی سکت نہ رہی تھی۔ اس گھنے جنگل میں کچھ اس طرح اژدہام ہوگیا تھا کہ دونوں فریق بھڑ گئے تھے اور دوست دشمن میں فرق کرنا مشکل ہوگیا تھا، کمزوری اور ضعف کے مارے سپاہیوں میں شناخت و تمیز کا فرق نہ رہا تھا۔ بعض خدا کے ایسے بندے بھی تھے کہ اس سخت اور دشوار دن میں بھی اپنے روزہ کی حفاظت کرتے رہے۔ مجھ (ملا عبدالقادر) میں اتنی برداشت نہیں تھی، چنانچہ جب میں بالکل ہی بے طاقت ہوگیا تو میں نے ایک چلو پانی سے اپنے حلق کو تر کرلیا۔ بعض تو پانی نہ ملنے کی سبب پیاس سے مرگئے۔

حسین خان کا حملہ

اس فتح کے بعد حسین خان نے کانت وکولہ کا رخ کیا اور ان مقامات پر جنگی احکامات عمل

میں لائے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا سنبھل سے پندرہ کوس پر لکھنوَ کے پرگنہ میں پہنچا ہوا تھا۔ حسین خان زخمی ہونے کے باوجود پالکی میں سوار ہوکر میرزا کے مقابلہ پر بانس بریلی پہنچ گیا۔ مرزا حسین خان ابراہیم حسین مرزا کی بہادری سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اس سے لڑکر وہ کسی حال میں بھی سرخرو نہیں ہوسکتا اس لیے وہ امروہہ کے راستہ لوٹ گیا۔ لکھنوَ کے علاقے میں ہمارے اور اس کے لشکر کے درمیان سات کوس کا فاصلہ تھا۔ اگر اس وقت مقابلہ ہو جاتا تو اس صورت میں جب کہ حسین خان زخمی تھا نہ معلوم کیا نتیجہ برآمد ہوتا؟ مرزا سے اس موقع پر بڑی فاش غلطی سرزد ہوئی کہ اس نے اس حال میں کہ حسین خان کے لشکر کا نظام درہم برہم تھا اس پر حملہ نہ کیا۔

امرائے سنبھل سے مشورے

سنبھل کے قلعہ میں وہاں کا حاکم معین الدین خان فرنخودی اور دوسرے جاگیردار امرا ایک بڑی فوج کے ساتھ قلعہ میں بند ہوگئے۔ جب آدھی رات کو انھوں نے حسین خان کے نقارہ کی آواز سنی تو یہ سمجھ کر کہ مرزا ابراہیم حسین نے حملہ کردیا، بدحواس ہوگئے۔ جب جب لوگوں نے قلعہ کے نیچے جاکر آواز دی کہ حسین خان مدد کے لیے پہنچا ہے تو اس وقت دم میں دم آیا اور لوگ استقبال کے لیے دوڑے۔ دوسرے دن سب امیر شیخ الاسلام فتح پوری کے خلیفہ شیخ فتح اللہ ترین کے مکان پر جمع ہوئے اور طے پایا کہ سب لوگ گنگا کے کنارے تولک خان، قوچین بیگ، نورین خان، رحمان قلی خان، کاکرعلی خان اور دہلی کے ان تمام امیروں سے جاکر ملیں جو مرزا سے مقابلہ کے لیے گنگا کے کنارے آہار کے پرگنہ میں ٹھہرے ہوئے ہیں ان سے مشورہ کے بعد جو کچھ طے پائے اس پر عمل کیا جائے۔ اس موقع پر حسین خان نے کہا خدا کی شان، یہاں مرزا چند گنتی کے سواروں کے ساتھ پہنچا ہے اور سنبھل کے قلعہ میں تمہاری تعداد اس کے مقابلے میں دو تین گنی ہے پھر تم میں بیس تیس کے قریب قدیم تجربہ کار امیر اور سردار موجود ہیں اور تم لوگ مرزا سے ڈر کر آہار کے قلعہ میں جو ایک چوہے دان کی طرح ہے جاکر چھپنا چاہتے ہو۔ اس طرح تو مرزا دلیر ہوکر

سارے حدود سرکار میں افراتفری پھیلا دے گا۔ اب صرف دو ہی راستے ہیں۔ یا تو تم لوگ گنگا کو پار کر کے ان چند پرانے قلعوں پر جو مرزا کے راستے میں ہیں قبضہ کرلو اور اسے گنگا پار نہ کرنے دو اور میں اس کے پیچھے سے تیزی سے جاتا ہوں، پھر جو بھی ہوگا سامنے آجائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اس سے پہلے گنگا پار کر کے اس کا راستہ روک دیتا ہوں اور تم پیچھے سے حملہ کر دو، بس وفاداری کا یہی تقاضا ہے حسین خان کے اس دلیرانہ مشورے کو کسی نے قبول نہ کیا، مجبوراً حسین خان ان سواروں کو لے کر جو اس کے ساتھ تھے آہار کے امیروں کے پاس چلا گیا اور ان کو بھی اس نے اس چھوٹے سے قلعہ میں آکر بند ہو جانے پر سخت لعنت ملامت کی اور ان کے سامنے بھی اپنی وہی تجویز رکھی اور کہا کہ اس وقت دشمن سرکار کے حدود میں اس طرح آگیا ہے جس طرح کوئی خرگوش لشکر کے درمیان گھر جائے۔ اگر ہم تیزی سے نقل وحرکت کریں تو اس مہم کو سر کر سکتے ہیں اور اس کو زندہ گرفتار کر سکتے ہیں اور اس فتح کا سہرا لازماً ہمارے ہی سر رہے گا۔ لشکریوں نے جواب دیا کہ ہم مخدوم الملک اور راجہ بہاڑمل کے حکم کے مطابق مرزا کو دہلی کے علاقے سے بھگا کر سنبھل تک لے آئے ہیں، اب یہاں سے ساری ذمہ داری سنبھل کے صوبہ دار معین الدین احمد خان اور اس علاقے کے جاگیرداروں کی ہے ہمیں تو صرف دہلی کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے، مرزا سے جنگ کرنے کا نہیں۔

مرزا کا لگاتار تعاقب

اس اثنا میں خبر ملی کہ مرزا نے امروہہ پر حملہ کر کے تاخت و تاراج کر دیا اور اب وہ گنگا پار کر کے لاہور کی طرف حملہ کر رہا ہے۔ حسین خان نے امیروں کو اس طرح ٹال مٹول کرتے دیکھا تو فوراً ہی ان سے الگ ہوگیا اور حملہ کرتے ہوئے گڈھ مکتیشور پہنچ گیا تاکہ مرزا کو بغیر مقابلہ کیے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ بادشاہی امیروں میں سے ترک سبحان قلی اور فرخ دیوانہ ہی ایسے امیر تھے جنھوں نے حسین خان کا ساتھ دیا تھا لیکن جب وہ اس منزل پر پہنچا تو آہار کے امیروں نے خط بھیجا کہ تم جلدی نہ کرو ہم بھی تمہارے ساتھ

آرہے ہیں چنانچہ وہ سب آ کر حسین خان سے مل گئے لیکن ان کے دل اندر ہی اندر پھٹے ہوئے تھے۔ ادھر مرزا بساط خالی پا کر بڑی بے خوفی سے اپنا مہرہ آگے بڑھائے جا رہا تھا اور راستہ میں جو بھی شہر پڑتا تھا اُسے بری طرح لوٹ لیتا تھا۔ چنانچہ سننے میں آیا کہ اس نے پائل کے قصبے میں مسلمان گھرانوں کو بری طرح تاخت وتاراج کر دیا اور اس قصبہ میں بارہ کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ دوسرے شہروں کا بھی یہی حال تھا۔ حسین خان مرزا کے پیچھے لگا ہوا تھا اور اس کے پیچھے دوسرے امیر بھی تعاقب میں شامل تھے یہاں تک کہ سب آگے پیچھے سرہند جا پہنچے۔ یہاں پہنچ کر دوسرے تمام امیروں نے اپنے خیمے لگا دیے اور ٹھہر گئے لیکن حسین خان بھلا کہاں رکنے والا تھا، وہ اپنے آدمیوں کو لے کر جو پورے سو بھی نہیں تھے مذکورہ دو امرا کے ساتھ سرہند سے حملہ کرتے ہوئے لدھیانہ پہنچ گیا۔ وہاں خبر ملی کہ مرزا لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے اور وہاں کے لوگ قلعہ میں بند ہو گئے ہیں

میرزا آگے بڑھ کر شیر گڑھ اور جھنی وال تک جا پہنچا۔ اس وقت حسین قلی خان نگرکوٹ اور قلعہ کانگڑہ کی تسخیر پر لگا ہوا تھا جب اسے مرزا کے متعلق اطلاعات ملیں تو اس نے ہندوؤں سے صلح کر لی اور نگرکوٹ والوں سے پانچ من سونا اور بادشاہی خطبہ پڑھنے کی شرط پر صلح کر لی اور وہاں سے میرزا یوسف خان عدلی کے غلام فتو مسند عالی، اسماعیل قلی خان، راجہ بیربر اور دوسرے امیروں کے ہمراہ مرزا کے تعاقب میں حملہ کرتے ہوئے سنکرہ پہنچ گیا۔

شیخ داؤد علی جھنی وال

حسین خان دیوانہ سہی لیکن وہ ان تمام احمقوں سے زیادہ عقل مند تھا اس کو جب حسین قلی خان کی پیش قدمی کی خبر ملی تو اس نے قسم کھالی کہ جب تک میں حسین قلی خاں سے جا کر نہ ملوں اس وقت تک کھانا نہیں کھاؤں گا، چنانچہ اس نے وہاں سے کوچ کیا، تلونڈی کے راستہ میں دریائے بیاہ (بیاس) کو پار کیا اور حملہ کرتے ہوئے شیر گڑھ میں جھنی کے قریب پہنچا۔ وہاں اس نے حضرت غوث قطب الاقطاب شیخ داؤد قادری جھنی وال کی خدمت میں حاضری دی۔ جب محفل میں دستر خوان بچھایا گیا تو حسین خان نے اپنی قسم کا حوالہ دے کر

کھانے سے معذرت چاہی حضرت نے فرمایا ''قسم کا کفارہ آسان ہے اور دوستوں کا دل دُکھانا بڑی نادانی ہے''۔ خان نے اس وقت ایک غلام کو آزاد کر کے کفارہ ادا کیا اور کھانا تناول کیا نیز حضرت کی دعاؤں سے فیض یاب ہوا۔ وہ رات اس نے اسی جگہ بسر کی اس وقت اس کے سارے لشکر کی مہمانی حضرت کے لنگر کی طرف سے کی گئی۔ گھوڑوں کے لیے حضرت کے خاص مزرعہ سے گھانس اور دانہ مہیا کیا گیا۔ حسین خان نے صبح وہاں سے کوچ کیا۔

میں اس کی روانگی کے تیسرے دن لاہور سے شیر گڑھ پہنچا اور حضرت موصوف کی خدمت میں چار دن تک رہا۔ میں نے وہاں جو انوار و فیوض دیکھے اور سنے ان کا اس سے پہلے میں تصور تک نہیں کرسکتا تھا میں نے اس سلسلے میں فی البدیہہ چند شعر کہے تھے جسے حضرت نے پسند فرمایا وہ شعر یہ ہیں:

ای منزہ نسبت ایجاد تو از ماء و طین — ذات پاک چون پیمبر رحمۃ للعالمین
ہست اسم اعظمت داؤد از تاثیر آن — چون سیمان جن و انس آمد ترا زیر نگین
ثُم وَجہُ اللہ یقین من نمی شد سالھا
روی تو دیدم عیان شد نکتہ عین الیقین

میرا تو ارادہ (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) ہو گیا تھا کہ میں ترک دنیا کر کے حضرت کی خانقاہ کی صفائی کا کام کرنے لگوں لیکن حضرت راضی نہ ہوئے اور فرمایا کہ بس اب تم ہندوستان چلے جاؤ! مجبوراً میں ان سے رخصت ہو کر نہایت غمگین اور پریشان حال روانہ ہوا خانقاہ سے نکلتے وقت غم کے مارے بے اختیار میری چیخیں نکل گئیں جب حضرت کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے باوجود اس معمول کہ ان کی خانقاہ میں تین دن سے زیادہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہیں تھی، چوتھے دن بھی مجھے رہ جانے کی اجازت دے دی اور مزید افادات عطا فرمائے اور جو باتیں بتائیں ان کی لذت سے دل اب تک مسرور ہے:

می روم سوی وطن زین درد دل بی اختیار — نالہ دارم کہ پنداری بغربت می روم

مرزا ابراہیم حسین کا فرار

حسین خان ازبک جب طلنبہ پہنچا تو اس نے حسین قلی خان کے نام خط بھیجا کہ چونکہ میں 400 کوس سے حملہ کرتے ہوئے یہاں پہنچا ہوں اگر آپ مجھے بھی اس فتح میں شامل کرلیں اور ایک دن لڑائی میں توقف کریں تو یہ آپ کی محبت سے بعید نہیں ہے۔ حسین قلی خان نے خوش آمدید کہا اور اس کے جلو دار کو رخصت کردیا، لیکن وہ اسی دن تیزی سے طلنبہ کے قصبے کے باہر ملتان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر پہنچ گیا۔ اس وقت مرزا اس کے حملہ سے بے خبر تھا، اور شکار پر گیا ہوا تھا۔ میرزا کے کچھ آدمی تو کوچ کی تیاری میں لگے ہوئے تھے اور بعض ادھر ادھر منتشر تھے۔ اس حال میں حسین قلی خان نے ان پر حملہ کیا لیکن ناہموار زمین پر اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ گر پڑا۔ اسے اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔ جب مرزا ابراہیم حسین شکار سے لوٹ کر آیا تو سارا معاملہ چوپٹ ہو چکا تھا، پھر بھی اس نے بڑی دوڑ دھوپ کی اور دلیرانہ حملے کیے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ مجبوراً لگام پھیر کر فرار ہوگیا۔ فتح کے دوسرے دن طلنبہ سے حسین خان اپنے 80، 90 سواروں کو لیے ہوئے نقارے بجاتے ہوئے پہنچا۔ حسین قلی خان نے جنگ کی ساری تفصیل اسے بتائی اور جس نے جو کچھ کارنامے انجام دیے، ایک ایک کرکے سنائے۔ حسین خان نے کہا یہ تو سب ٹھیک ہوا لیکن دشمن زندہ بچ کر نکل گیا تم کو اس کا تعاقب کرنا چاہئے تھا۔ جب تک وہ گرفتار نہ ہو مہم ادھوری ہی رہے گی۔ حسین قلی خان نے جواب دیا ہم نگرکوٹ سے مسلسل حملہ کرتے ہوئے آئے ہیں اور پہاڑی علاقہ پر ہمارے لشکریوں نے بڑی دوڑ دھوپ کی ہے اور ساری فوج تھکی ہوئی ہے چونکہ یہ فتح ہر حیثیت سے مکمل فتح تھی اس لیے ہم نے مزید اقدام نہ کیا۔ اب دوسرے حوصلہ آزمائی کریں ان کی باری ہے۔

مرزا ابراہیم کی گرفتاری

حسین خان نے اس امید میں کہ اس کی یہ پانچ سو کوس کی مسلسل دوڑ دھوپ ٹھکانے لگ جائے اور کامیابی کا سہرا سر بندھ جائے۔ حسین قلی خان سے رخصت ہوکر آگے کوچ کردیا۔

جولوگ بہت زیادہ تھک گئے تھے ان کو اس نے ہاتھی اور نقارہ کے ساتھ لاہور واپس بھیج دیا اور اپنے چار سو سواروں کے ساتھ بیاس اور ستلج کے کنارے پر قیام کیا۔

اس وقت چھبّل قوم کے آدمیوں نے جو ملتان کی پس ماندہ رعیت ہیں اس پر شب خون مارا اور پتھر برسانے لگے میرزا نے اپنے مٹھی بھر آدمیوں کے ساتھ جن میں سے بعض زخمی اور اپاہج ہو چکے تھے اور بری طرح تھکے ہوئے تھے قوم سے مقابلہ کیا، لیکن چھبّل اس پر غالب آ گئے۔ اسی دوران ایک تیر مرزا کی گدّی میں لگا اور منہ کو پھاڑ تا ہوا نکل گیا۔ جب معاملہ اُلٹ گیا تو اس کے آدمی میرزا کو چھوڑ کر ادھر اُدھر بھاگ نکلے لیکن وہ جہاں بھی گئے موت سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی رہی۔ میرزا کو دو قدیم غلاموں نے فوراً ہی قلندروں کا لباس پہنا دیا اور ایک طرف لے کر چلے گئے۔ مرزا نہایت کمزور ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ اسے لے کر ایک گوشہ نشین درویش شیخ زکریا کے ٹھکانے پر رات گزارنے کے لیے پہنچے۔ شیخ نے بظاہر بڑی مہربانی کا سلوک کیا لیکن خفیہ طور پر ملتان میں سعید خان کے پاس اس کی اطلاع بھیج دی۔

ہر کجا گوشہ نشینی است درو مکری ہست

(جہاں کہیں گوشہ نشینی ہے اس میں مکر و فریب ہے)

سعید خان نے اپنے غلام دولت خان ثانی کو اسے گرفتار کر کے لانے کے لیے روانہ کر دیا اور بادشاہ کے پاس اس گرفتاری کی اطلاع ایک عریضہ کے ذریعہ بھیجی جو بادشاہ کو گجرات سے اجمیر واپسی کے وقت ملی۔ حسین خان کو جب مرزا کی گرفتاری کی خبر ملی تو وہ ملتان پہنچا اور سعید خان سے ملاقات کی۔ اس نے مرزا سے ملنے کے لیے کہا تو حسین خان نے کہا ''اگر ملاقات کے وقت میں تسلیمات بجالاؤں تو بادشاہ کی وفاداری کے خلاف ہو گا اگر ایسا نہ کروں تو مروت کے خلاف کہ مرزا دل میں کہے گا اس قنچی کو دیکھو کہ ستو اس کے محاصرے میں امان پانے پر تو اس نے جھک جھک کے سلام کیے تھے اور اب جب کہ ہم مصیبت میں گرفتار ہیں یہ بے نیازی دکھا رہا ہے''۔ جب مرزا کو اس کی بے تکلفانہ گفتگو کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا'' وہ آئے اور بغیر تسلیمات کے کلام کرے اس کو سب کچھ معاف

ہے۔'' غرض حسین خان ملنے کے لیے گیا اور باوجود اجازت کے وہ تسلیمات بجالایا۔ مرزا نے اس سے افسوس کرتے ہوئے کہا'' ہم بغاوت نہیں کرنا چاہتے تھے، لیکن جب جان پر بن گئی تو ہم اپنی جان ہتھیلی پر لے کر ایک غیر ملک میں چلے گئے وہاں بھی ہمیں چین سے رہنے نہ دیا گیا، تقدیر میں بہر حال یہ شکست لکھی تھی، لیکن کاش ہم تیرے ہاتھوں شکست کھاتے کہ تو ہر حال میں اپنوں میں سے ہے لیکن یہ ذلت حسین قلی خان کے ہاتھوں اٹھانی پڑی جو دین و مذہب کے اعتبار سے غیر ہے''

حسین خان اس ملاقات کے بعد اپنی جاگیر کانت وکولہ کو واپس چلا گیااور میرزا اسی قید میں کچھ عرصہ بعد زندگی کے بندھنوں سے رہا ہوگیا۔ کانت وکولہ سے حسین خان دربار شاہی میں حاضر ہوا اور پنجاب سے حسین قلی خان، مسحور حسین مرزا کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر دوسرے جنگ بندیوں کے ساتھ فتح پور لایا۔ یہ قیدی لگ بھگ 300 کی تعداد میں تھے، ان کے منہ پر گدھے، سور اور کتوں کی کھال کی پٹیاں باندھ کر حضور میں لایا گیا تھا۔ ان میں سے چند کو طرح طرح کی عقوبتوں کے ساتھ قتل کرادیا گیا اور باقی کو چھوڑ دیا گیا۔ مرزا کے تقریبا 100 سرداروں نے جن کو خان کا خطاب حاصل تھا، شکست کے بعد ملتان کے راستے میں حسین خان کے پاس جان کی معافی کی درخواست کی تھی۔ حسین خان ان سب کو اپنے پرگنوں پر لے کر چلا گیا تھا، پھر اس نے ان کو اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

حسین قلی خان نے ان لوگوں کا بادشاہ کے سامنے ذکر چھیڑ دیا۔ حسین خان نے فوراً کہا چونکہ اسیروں کو قتل کرنے کا حکم نہیں ہے اس لیے میں نے اس جماعت کو بادشاہ پر تصدق کر کے چھوڑ دیا۔ بادشاہ نے اس بات کو درگذر کردیا اور اس سے کوئی پوچھ تاچھ نہ کی۔ انہی دنوں سعید خان ملتان سے میرزا ابراہیم حسین کے سر کو جسے مرنے کے بعد جسم سے جدا کردیا گیا تھا لے کر بارگاہ میں حاضر ہوا۔

راجہ بیربر کی قدر ومنزلت

980ھ/1572ء میں حسین قلی خان نے نگر کوٹ کا قلعہ فتح کرلیا۔ اکبر کو بچپن ہی سے

برہمنوں، مسخروں اور دوسرے ہندوؤں کے ساتھ بڑی موانست اور ربط و ضبط تھا، چنانچہ تخت نشینی کے آغاز میں ایک بھکاری برہمن بر ہم داس نامی جو مسخرہ اور گیت گو تھا اور ہندوؤں کی مداحی کر کے زندگی بسر کیا کرتا تھا، کالپی سے بادشاہ کی خدمت میں آیا، یہ شخص چونکہ کافی چالاک اور ہوشیار تھا اور بادشاہ کا مزاج بھی اس سے ملتا تھا اس لیے بہت جلد اچھے مناصب پر پہنچ گیا اور بادشاہ کا ندیم خاص بن گیا۔ پہلے اسے ''کب رائے'' یعنی ملک الشعراء کا خطاب ملا بعد میں راجہ بیربر[35] یعنی نامور بہادر کا خطاب مرحمت کیا گیا۔

جب اکبر نگر کوٹ کے حاکم راجہ جے چند سے جو شاہی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا ناراض ہوا اور اسے قید کر دیا تو اس نے نگر کوٹ کا قلعہ راجہ بیربر کو جاگیر میں دے دیا اور لاہور کے حاکم حسین قلی خان کو فرمان بھیجا کہ نگر کوٹ پر قبضہ کر کے اسے راجہ بیربر کے حوالے کر دیا جائے۔ حسبِ فرمان حسین قلی خان نے پنجاب کے تمام امیروں مرزا یوسف خان، قزاق خان کے لڑکے جعفر خان اور فتو مسند عالی وغیرہ کو ساتھ لے کر نگر کوٹ کی طرف کوچ کیا اور پہلے وہمیری گوالیار اور کوتلہ کو جو نہایت بلند قلعہ ہے، تلوار کے زور پر فتح کرلیا اور ملحقہ سارے علاقے پر قبضہ کر کے وہاں محافظ مقرر کر دیے۔

نگر کوٹ پر حملہ

ان قلعوں کی فتح کے بعد حسین قلی خان نے ایک دشوار گزار راستہ سے نگر کوٹ پر فوج کشی کی اس راستہ کو میں (مؤلف منتخب التواریخ) 998ھ/1580ء میں دیکھا ہے، جب کہ میں نگر کوٹ کی سیر کے لیے گیا تھا۔ بلاشبہ یہ راستہ اس قدر خراب اور دشوار ہے کہ اگر کہا جائے کہ اس پر چڑھتے ہوئی چیونٹی کے پیر بھی پھسل جاتے ہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ خان نے اس راستہ سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، ساز و سامان، بڑی بڑی توپیں اور دیگیں اوپر چڑھائیں اور قلعہ کانگڑہ کا محاصرہ کرلیا۔

جے چند کا لڑکا بدھی چند یہ سمجھ کر کہ اس کا باپ قید میں مر چکا ہے، قلعہ میں بند ہوگیا۔ نگر کوٹ کا مندر شہر کے باہر واقع ہے۔ یہ ہندوؤں کی بہت بڑی زیارت گاہ ہے،

چنانچہ دور دراز سے لاکھوں بلکہ کروڑوں ہندو تہوار کے دنوں میں وہاں جمع ہو جاتے ہیں اور ڈھیروں سونا، روپیہ پیسہ، کپڑے اور دوسری قیمتی اور نفیس چیزیں وہاں چڑھاوے کے لیے لاتے ہیں۔ حسین قلی خان نے پہلے ہی حملہ میں اس مندر کو فتح کر لیا اور بہت سے پہاڑیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مندر کے گنبد پر سونے کا ایک چتر چڑھا ہوا ہے، اُسے لشکریوں نے تیر مار مار کر چھلنی کر دیا اب تک وہ تیر اس چیز میں لگے ہوئے ہیں۔ تقریباً دو سو کالی گائیں اس بت خانے کے نام پر چھوڑی ہوئی تھیں۔ ہندو گائے کی بڑی تعظیم اور پرستش کرتے ہیں۔ اس بت خانہ کو انھوں نے دارالامان سمجھ کر یہ گائیں وہاں چھوڑ رکھی تھیں مسلمانوں نے ان گایوں کو ذبح کر دیا اور عین تیروں کی بارش میں ان گایوں کے خون کو اپنے موزوں میں بھر بھر کر دینی حمیت اور تعصب کی وجہ سے مندر کی دیواروں پر چھڑک دیا۔ اس معرکہ میں مندر کے برہمن اور مجاور تو اتنے مارے گئے کہ شمار سے باہر تھے، یہی وجہ ہے کہ اپنے یا بیگانے تمام ہندو بیربر کو جو بزعم خود ہندوؤں کا پیر بنا ہوا تھا بڑی لعنت و ملامت کرتے ہیں، کیونکہ یہ آفت اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

شاہی لشکر نے بیرونی شہر پر قبضہ کر لیا اور اونچے اونچے مورچے بنا کر بڑی توپوں سے راجہ بدھی چند کے محل پر گولے برسانے شروع کر دیے۔ گولہ باری سے تقریباً 80 آدمی ہلاک ہوگئے۔ بدھی چند اس ہلاکت سے بمشکل بچ سکا، پھر اس نے صلح کی سلسلہ جنبانی کی، قریب تھا کہ قلعہ فتح ہو جائے کہ میرزا ابراہیم حسین کی بغاوت کی خبر ملی نیز وہ لاہور کے قریب پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ حسین قلی خان کے لشکری بہت تنگدست ہو چکے تھے۔ اِسی وجہ سے خان نے صلح کی پیش کش کو منظور کر لیا اور اکبری وزن کے مطابق پانچ من سونا جو اس مندر کی سال کی آمدنی کے مساوی ہے اور بہت سے قیمتی کپڑے اور ہر جنس کی نفیس چیزیں نذرانہ میں وصول کر کے مسجد کے محراب کو تعمیر کرا دیا تھا۔ اس کے بعد ہی حسین قلی خان میرزاؤں کی سرکوبی کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔

جب وہ چماری کے قصبہ میں پہنچا تو مشہور بزرگ خواجہ عبد الشہید نبیرۂ خواجہ احرار کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خواجہ نے اسے فتح کی بشارت دی اور اپنا خاص کپڑا بھی عنایت فرمایا

یہ اسی دعا کی تاثیر تھی کہ یلغار کرتے ہوئے قصبہ طلنبہ میں پہنچا اور باغی مرزا پر فتح پائی۔

بنگالہ کے حاکم کا انتقال

سلیمان کرانی بنگالہ کا حاکم، جس نے اپنا خطاب ''حضرت اعلیٰ'' رکھا تھا، کافروں کے مرکز کٹک اور بنارس کو فتح کیا تھا، جگناتھ کو دارالاسلام بنا دیا تھا اور کامروپ سے اڑیسہ تک کا علاقہ اس کی عملداری میں تھا، اسی سال فوت ہوگیا۔ اس کا لڑکا بایزید اس کی جگہ تخت پر بیٹھا لیکن پانچ چھ مہینے کے اندر ہی پٹھانوں نے اسے قتل کردیا اور اس کا چھوٹا بھائی داؤد بن سلیمان اس علاقہ پر قابض ہوگیا۔

اسی سال مشہور بزرگ شیخ نظام الدین انیٹھیؒ نے وصال فرمایا۔

گجرات پر دوسرا حملہ

981ھ/1573ء میں بادشاہ نے گجرات کی شورشوں کو دبانے کے لیے دوبارہ سفر کیا۔ یہ سفر بادشاہ نے سانڈنی پر سوار ہوکر کیا۔ نو دن میں وہ یلغار کرتے ہوئے فتح پور سے احمد آباد پہنچ گئے اور اس گروہ سے جس نے اعظم خان کو محصور کر رکھا تھا سخت لڑائی لڑکر فاتح و مظفر جلد ہی دارالخلافہ واپس تشریف لے آئے۔

گجرات جانے کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نے گجرات کو پہلی مرتبہ فتح کیا تو احمد آباد، خان اعظم کے سپرد کردیا تھا۔ بادشاہی لشکر کی واپسی کے بعد وہاں ہر مقام پر سرکشوں نے فتنہ و فساد مچانا شروع کیا یہاں تک کہ اختیار الملک گجراتی نے حبشیوں کی جمعیت فراہم کرکے احمد نگر اور اس کے اطراف کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ محمد حسین مرزا بھی دکن سے لوٹ کر آگیا تھا اور سورت کو فتح کر لینے کے منصوبے باندھ رہا تھا چونکہ قلیچ خان سورت میں قلعہ کے اندر بند ہوگیا تھا اس لیے اس نے کھنبایت پر حملہ کرکے قبضہ کرلیا۔ اعظم خان نے اختیار الملک کے خلاف فوجی کاروائی کی۔ دونوں فریقوں میں احمد نگر اور ایدر کے درمیان کئی ایک لڑائیاں ہوئیں، اعظم خان نے قطب الدین محمد خان کے لڑکے نورنگ

خان کو سید حامد کے ہمراہ محمد حسین مرزا کی سرکوبی کے لیے کھنبایت کی طرف روانہ کیا۔ اس فوج سے محمد حسین مرزا کی متعدد لڑائیاں ہوئیں۔ اس نے پوری بہادری اور مردانگی سے حریف پر حملے کیے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا، آخر وہ شکست کھا کر اختیار خان کے پاس چلا گیا۔ شیر خان فولادی کے لڑکے جھار خان حبشی کا لڑکا بھی اس سے آکر مل گیا تھا اس لیے اختیار خان کی فوجی طاقت بڑھ گئی اور اعظم خان کے مقابلہ میں اس کا پلہ بھاری ہوگیا۔ یہ سب ایک دوسرے راستہ سے حملہ کر کے احمد آباد پہنچنا چاہتے تھے، لیکن اعظم خان تیزی سے کوچ کر کے احمد آباد پہنچ گیا اور بھڑوچ سے قطب الدین احمد خان کو بھی بلالیا۔ چونکہ اس کو اپنے بعض آدمیوں پر پورا بھروسہ نہیں تھا اس لیے وہ احمد آباد میں قلعے کے اندر بند ہوگیا۔ گجرات کے تمام باغی بیس ہزار کا لشکر لے کر جس میں مغل، گجراتی، پٹھان، حبشی اور راجپوت شامل تھے، احمد آباد پہنچے اور اس کا محاصرہ کرلیا ہر روز دونوں طرف سے سخت لڑائی ہورہی تھی، خان کلاں کا لڑکا فاضل محمد خان اسی معرکہ میں مارا گیا۔ خان اعظم ہر روز جنگی صورت حال لکھ کر دربار میں بھیج رہا تھا اور اس نے متعدد عریضے بادشاہ کی تشریف آوری کے لیے لکھے۔

بادشاہ نے دیوانی کے عمال کو حکم دیا کہ ان امیروں کے لیے جو گجرات کی پہلی مہم میں شامل نہیں تھے۔ اس مہم کا سازو سامان فراہم کردیں اور ان جنگجو سپاہیوں کو جنھوں نے گزشتہ پورا سال سفر کی زحمتوں میں گزارا تھا اور خستہ حال ہو رہے تھے، نقد و روپیہ ادا کریں۔ پھر بادشاہ نے حسین قلی کو خان جہان کا خطاب عطا کیا اور اسے پنجاب کے امیروں کے ساتھ اسی صوبہ پر اور سعید خان کو ملتان پر متعین کردیا اور شجاعت خان کو پیش خیمہ کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دیا۔

اونٹنیوں پر بادشاہی حملہ

بادشاہ 24/ربیع الثانی کو تیز رفتار اونٹنیوں پر سوار ہوکر بیاور اور تودہ کے راستہ روانہ ہوئے۔ 100 کوس کی مسافت صرف دو دن میں طے کی۔ اسی مہینہ کی 26 تاریخ کو سواری اجمیر پہنچ

گئی، وہاں مزار کی زیارت کر کے اسی دن شام کو آگے کوچ کر دیا اور قصبہ بالیانہ میں پہنچ کر لشکر کا معائنہ کیا اور مختلف سمتوں پر فوجوں کو نامزد فرمایا۔ خان خاناں بیرم خان مرحوم کے لڑکے میرزا خان کو جو اب خانخاناں بن چکا ہے دکن کی مہم پر مقرر کیا گیا ہے اس کی مدد کے لیے سید محمود خان بارہہ، صادق محمد خان اور امرا کی ایک جماعت کو متعین کیا گیا۔ میمنہ کی سرداری میر محمد خان کلاں کے سپرد ہوئی، میسرہ پر وزیر خان کو مقرر کیا گیا، ہراول پر محمد قلی خان اور ترخان دیوانہ متعین ہوئے۔ بادشاہ کے جلوس میں تجربہ کار سوار تھے جنھیں ہزاروں سواروں میں سے منتخب کیا گیا تھا۔

تیسری جمادی الاول بروز منگل بادشاہی لشکر احمد آباد سے 20 کوس کے فاصلہ پر کری کے قصبہ میں جا کر اترا۔ باغیوں کی ایک فوج قلعہ سے نکل کر راستہ روکنے کے لیے مقابلہ پر آئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ شاہی فوج کی یلغار کی نذر ہوگئی، چونکہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس لیے لشکر وہاں سے پانچ کوس اور آگے بڑھ کر ٹھہر گیا۔ بادشاہ نے اس جگہ ستانے کے لیے قیام فرمایا۔ نویں دن اس منزل سے کوچ ہوا اور احمد آباد سے 3 کوس کے فاصلے تک بغیر باگیں کھینچے لشکر حملہ کرتا رہا۔ اس جگہ بادشاہ نے اسلحہ خانہ خاص سے لوگوں کو ہتھیار تقسیم کیے اور سب لوگ پوری طرح ہتھیاروں سے آراستہ ہوگئے، بادشاہ نے اعظم خان کو بلانے کے لیے پہلے ہی آصف خان کو روانہ کر دیا تھا۔ اس وقت مخالف غافل تھے، جب انھوں نے کرنا بجتا ہوا سنا تو پریشان ہو کر گھوڑوں کی طرف دوڑے اور محمد حسین مرزا دو تین سواروں کے ہمراہ تحقیق کے لیے دریا کے کنارے پہنچا۔ اس طرف سے ترک سبحان قلی بھی دو تین آدمیوں کے ساتھ اس کنارے پر آیا ہوا تھا، مرزا نے پوچھا ''بہادر یہ کس کی فوج ہے؟'' اس نے کہا ''شہنشاہ کی فوج ہے'' میرے قاصدوں نے بادشاہ کو 14 دن پہلے فتح پور میں چھوڑا ہے، اگر یہی بادشاہی فوج ہے تو وہ ہاتھی جو ہمیشہ آگے رہتے ہیں کہاں ہیں؟ اس کو جواب دیا گیا کہ نو دن کے اندر بھلا ہاتھی چار کوس کی یلغار کیسے کر سکتے ہیں۔

باغیوں کا زبردست حملہ

محمد حسین مرزا ایک آراستہ فوج کے ساتھ مقابلہ پر آیا اور اختیار الملک کو پانچ ہزار سوار دے کر اس نے خان اعظم کے مقابلہ پر بھیجا تا کہ وہ اسے قلعہ پر چڑھائی کرنے سے روک دے۔ بادشاہی فوجوں نے دریا کو پار کرلیا۔ محمد حسین مرزا نے بڑھ کر ڈیڑھ ہزار جان نثار مغلوں کے ساتھ جن میں سے ہر ایک کو خان کا خطاب حاصل تھا اور وہ بڑے بڑے مناصب اور جاگیروں کے امیدوار تھے، بادشاہ کے ہراول پر جس کی کمان محمد قلی خان اور تر خان دیوانہ کے ہاتھ میں تھی حملہ کردیا اوراس کے قدم اکھاڑ دیے۔ اسی وقت حبشیوں اور پٹھانوں نے یک لخت وزیر خان کے میسرہ پر حملہ کردیا، جوالانگری کے مقام پر فریقین میں سخت خون ریز معرکہ ہوا۔

محمد حسین مرزا کی گرفتاری

ان دنوں اکبر ہر وقت ''سورن یا معین'' کا وظیفہ پڑھتا رہتا تھا۔ جب اس نے اپنے ہراول کو درہم برہم دیکھا تو وظیفہ چھوڑ کر خود ہراول کی مدد کے لیے آگے بڑھا اور دشمنوں کی صفوں کو زیر و زبر کر کے منتشر کردیا۔ اس حملہ میں بہت سے آدمی مارے گئے سیف خان کوکہ بہادری سے بڑھ کر دشمنوں کی صفوں میں گھس گیا لیکن جس کا نمک کھایا تھا وہ آخر پھوٹ کر نکلا، اس کا گھوڑا زخمی ہوگیا اور مجبوراً اسے میدان کارزار سے منہ موڑنا پڑا۔ جب وہ فرار ہو رہا تھا، تھوہر کی ایک جھاڑی اس کے سامنے آگئی۔ اس نے ایڑ لگا کر پھلانگ جانا چاہا لیکن موت نے اس کی باگیں تھام لی تھیں چنانچہ زین سے پھسل کر زمین پر آرہا۔ ایک ترک سپاہی گدائی علی نامی اس کے تعاقب میں لگا ہوا تھا، اس نے اپنے گھوڑے پر سے اسی وقت جست لگائی اور اس کو دبوچ لیا اور گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں حاضر کردیا۔ بادشاہ نے نرمی اور ملائمت سے فہمایش کی اور اسے رائے سنگھ کے حوالہ کردیا۔

وزیر خاں حبشیوں اور گجراتیوں کے مقابلہ میں بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا، لڑائی کا پلہ اس وقت ڈانواڈول ہی تھا کہ مخالفوں کو محمد حسین مرزا اور شاہ مرزا کی شکست کی خبر ملی۔ اس

خبر کو سنتے ہی ان کے حوصلے پست ہو گئے اور وہ میدان سے پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔ اسی طرح خان کلاں نے شیر خان فولادی کے لڑکے کو شکست دے کر بھگا دیا اور میدان دشمنوں کے وجود سے پاک ہو گیا۔

اختیار الملک کا اکبر پر حملہ

فتح کے بعد میدان کے کنارے ایک ٹیلے پر بادشاہ نے قیام فرمایااور بہادروں کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے لگے، اس موقع پر خلاف توقع اختیار الملک گجراتی 5000 سواروں کو جو خان اعظم کا راستہ روکنے کے لیے متعین کیے گئے تھے شہر سے لے کر نکلا اور جنگل کا راستہ کاٹ کر اچانک سامنے آ گیا۔ بادشاہ کے ساتھ جو لوگ تھے وہ سخت بدحواس ہو گئے اور افراتفری مچ گئی۔ اکبر نے ایک دستہ کو تیر اندازی کا حکم دیا اور ''سورن یا معین'' کے نعرے لگانے لگا۔ بہادروں نے غنیم کی پہلی صف کو جو سب سے آگے تھی تیروں کی زد پر رکھ لیا۔ جو لوگ بہادری کے ساتھ پیش قدمی کر رہے تھے حسین خان ان میں سب میں آگے تھا۔ با دشاہ نے اپنی خاص ہلالی تلوار، جو ایک مشہور تلوار تھی اسے عطا فرمائی۔ اختیار الملک ایک ہی حملہ میں پسپا ہو کر بھاگ نکلا، اس کا گھوڑا بھی تھوہر کی جھاڑیوں میں جا کر پھنس گیا۔ سہراب بیگ ترکمان اس کا پیچھا کر رہا تھا اس نے بڑھ کر اختیار الملک کو گرفتار کر لیا۔ اس موقع پر اختیار الملک نے سہراب بیگ سے کہا'' اے جوان تو ترکمان معلوم ہوتا ہے اور ترکمان حضرت علی مرتضی کے غلام اور ان کے فدائی ہوتے ہیں، میں بخاری سید ہوں اس لیے مجھے چھوڑ دے۔ سہراب بیگ نے جواب دیا میں تجھے کس طرح چھوڑ دوں تو اختیار الملک ہے اور میں نے تجھے پہچان کر ہی تیرے تعاقب میں خون پسینہ ایک کیا ہے، پھر وہ گھوڑے سے اتر آیا اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے گھوڑے کو کوئی دوسرا لے اڑا تھا، اس لیے وہ اس کے سر کو اپنے دامن میں چھپا کر حاضر ہوا اور بادشاہ کے سامنے یہ سوغات رکھ دی۔ بادشاہ نے اسے کافی انعام واکرام عطا کیا۔ اس لڑائی میں تقریباً ایک ہزار سوار مارے گئے بادشاہ نے عبرت کے لیے ان سروں کو جمع کرا کے وہاں مینار لگوا دیا۔

محمد حسین مرزا کا قتل

جس وقت اختیار الملک کا یہ ہنگامہ برپا تھا، رائے سنگھ کے کارندوں نے محمد حسین مرزا کو ہاتھی سے اتار کر دستی نیزوں سے اس کا کام تمام کر دیا اس کا اور اختیار الملک کا سر آگرہ بھیج دیا گیا۔

اعظم خان سے ملاقات

اسی دوران اعظم خان قلعہ سے نکل کر دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ اس سے بغل گیر ہوئے اور اس سے دوسرے امیروں کا حال احوال پوچھتے رہے۔ اعتماد خان کے مکان میں بادشاہ نے پانچ دن قیام فرمایا اور قطب الدین محمد خان کو اس کے لڑکے نورنگ خان کے ساتھ بھڑوچ اور چنپانیر کی طرف شاہ میرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ خان کلاں کو پٹن کی حکومت دی گئی اور وزیر خان کو دولقہ اور دندوقہ کے علاقہ پر نامزد فرمایا۔ شاہ قلی خان محرم راجہ بھگونت داس اور خان بخشی کے لشکر کو ایدر کے راستہ سے آگرہ اور فتح پور جانے کا حکم ملا کہ یہ لوگ اودے سنگھ کے علاقہ کو پامال کرتے ہوئے جائیں۔ اسی حملہ میں بدنگر کا شہر ان لوگوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔

گجرات کا نظم ونسق

بادشاہ نے 16 جمادی الاول کو احمد آباد سے کوچ فرمایا اور محمود آباد میں جا کر سلطان محمود گجراتی کے محل میں قیام فرمایا۔ دولقہ سے خان اعظم اور دوسرے تمام گجرات کے امرا کو اپنے اپنے مقام پر جانے کی اجازت عطا فرمائی۔ مرزا غیاث الدین علی قزوینی بخشی کو آصف خان خطاب عطا کیا۔ گجرات کی دیوانی اور بخشی گری کا عہدہ اس کے سپرد کیا گیا۔ 3/ رجمادی الثانی کو بادشاہ اجمیر پہنچے، سانکا نیر کی جگہ راجہ ٹوڈرمل کو جو آگرہ میں 1000 جہازوں اور کشتیوں کی تیاری کے سلسلہ میں ٹھہرے ہوئے تھے گجرات کے مال غنیمت اور حساب کتاب کے لیے مقرر فرمایا۔ 7/ رجمادی الآخر کو شاہانہ سواری پایہ تخت پہنچی۔ اس ساری

مہم میں ڈیڑھ ماہ سے زیادہ کا عرصہ نہ لگا۔

اس ماہ کی 25 تاریخ کو شاہزادوں کی ختنہ کرائی گئی۔ رجب کی دوسری تاریخ کو شاہزادہ سلطان سلیم کو مولانا میر کلاں محدث ہروی کے پاس بسم اللہ کے لیے بٹھایا گیا۔ مولانا میر کلاں مشہور بہ محدث میرک شاہ بن میر جمال الدین کے شاگرد تھے۔

اسی سال بادشاہ نے مظفر خان کو سارنگ پور کی حکومت سے واپس بلا کر وزیر مطلق کے عہدہ پر مامور فرمایا۔ اس کے القاب میں جملۃ الملک کے خطاب کا بھی اضافہ ہوگیا۔ شیخ محمد بخاری جنگ پٹن میں اور سیف خان احمد آباد کی آخری لڑائی میں مارا گیا تھا۔ ان دونوں کے قرضے تقریباً ایک لاکھ روپیہ کے تھے۔ بادشاہ نے یہ قرض شاہی خزانے سے ادا فرما دیے۔

اکبر کی اجمیر روانگی

اسی سال بادشاہ نے راجہ ٹوڈرمل کو جو گجرات کی مالی رپورٹ تیار کر کے لایا تھا، تلوار عطا فرمائی اور اسے لشکر خان بخشی کے ساتھ جسے ہندوستان میں اکثر لوگ ''شرخان'' کہا کرتے تھے، بنگالہ کی مہم کا ساز وسامان کرنے کے لیے منعم خان خانخاناں کے پاس بھیج دیا۔ شہراللہ کنبوی لاہوری کو شہباز خان کا خطاب عطا فرمایا اور اسے میر بخشی کے عہدے پر مقرر کردیا۔ انہی دنوں میر محسن رضوی جو دکن کی سفارت پر گیا ہوا تھا وہاں کے فرمانرواں کے عمدہ تحائف لے کر دربار حاضر ہوا۔ اکبر نے بنگال کی فتح کی دعا مانگنے کے لیے اجمیر کی زیارت کا ارادہ کیا۔ جب وہ فتح پور سے چار کوس پر موضع دائرہ میں پہنچا تو خواجۂ احرار کے پوتے خواجہ عبدالشہید میرزا شرف الدین کو رہائی دلانے کے لیے پہنچے اور اس کی سفارش کی، بادشاہ نے ان کی سفارش کو قبول نہیں کیا، اگرچہ تعظیم وتکریم میں کوئی کوتاہی نہ برتی، خواجہ نے بھی فاتحہ پڑھ کر بادشاہ کو رخصت کیا، لیکن دل میں رنجش تھی۔ اس لیے آزردہ خاطر واپس ہوئے۔ بادشاہ نے اجمیر سے سات کوس پہلے ہی پیادہ سفرشروع کیا اور 12 ذی القعدہ مزار مقدس کی زیارت فرمائی۔

جشن شاہانہ

اسی مہینہ کی 17 تاریخ کو آفتاب برج حمل میں داخل ہوا۔ جیسا کہ ہر سال اس خاص دن کی تعظیم میں عید منائی جاتی تھی، بادشاہ نے اس بار بھی ایک بڑا جشن منعقد کیا اور حاضرین محفل میں سے ہر گروہ کو ایک ایک لاکھ روپیہ عطا فرمایا۔ 23 ذی قعدہ کو بادشاہ اجمیر سے لوٹ کر پایہ تخت پہنچے اور بنگالہ کے سفر کی تیاری شروع ہوگئی۔ کشتیاں تیار کرنے کا حکم صادر کیا گیا، ان میں سے ایک کشتی، شیر کے سر اور ایک دوسری مگرمچھ کے سر کی وضع کی تھی۔ یہ دونوں سمندری جہاز کی طرح بڑی اور بلند تھیں۔

دربار اکبری میں رسائی

اسی سال ماہ ذی الحجہ کے آخر میں، میں (صاحب تصنیف) حسین خان کی ملازمت ترک کر کے بدایوں سے آگرہ پہنچا اور جمال خان قورچی اور جالینوس مرحوم حکیم عین الملک کے وسیلہ سے دربار شاہی میں باریاب ہوا۔ ان دنوں علم کی بڑی قدر و قیمت تھی، پہلی حاضری میں ہی بادشاہ سے مخاطبت کا اعزاز حاصل ہوا اور ہم نشینوں میں داخل کرلیا گیا۔ بادشاہی محل کے علماء کا یہ حال تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی علمیت کا ڈنکا بجانے کی فکر میں لگے رہتے تھے، کسی دوسرے کو ذرہ برابر بھی اہمیت نہ دیتے تھے اور بحث مباحثہ کر کے اس کو نیچا دکھانے اور خود، سر بلند ہونے کی تدبیریں کرتے رہتے تھے۔ میری جوانی کا عالم تھا، اللہ کی عنایت سے قوت طبع، ذکاوت اور دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے میں (صاحب تصنیف) جلد ہی ان میں سے اکثر علماء پر چھا گیا۔

جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تھا تو بادشاہ نے میری تعریف کرتے ہوئے کہا تھا، بدایوں کا یہ عالم حاجی ابراہیم سرہندی کا مزاج ٹھکانے لگا دے گا۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ حاجی ابراہیم کو نیچا دکھایا جائے۔ میں نے اس پر بڑے چست الزامات لگائے جو بادشاہ کو پسند آئے۔ شیخ عبدالنبی صدر الصدور کے پاس میرا وسیلہ اور رسائی نہیں تھی، اس لیے وہ مجھ سے کچھ ناخوش ہی تھا۔ وہ اس مناظرہ کے وقت میرے فریق کی ہی طرف داری کر رہا

تھا اور وہی مثل سامنے آگئی: سانپ کا کاٹا افیون کھانے لگا

بعد میں عبدالنبی کے ساتھ یہ پرخاش ختم ہوگئی اور ہماری آپس میں خوب نبھنے لگی۔

ان دنوں شیخ مبارک ناگوری کا لڑکا شیخ ابوالفضل کہ اس کے علم وعقل کا ستارہ اوج پر تھا، باریاب ہوااور بڑے اعزاز واکرام سے نوازا گیا۔

ہرن مینار

اسی سال اجمیر کے راستہ میں بڑی عمدہ اور بلند عمارتوں کی تعمیرانجام کو پہنچی۔ چونکہ اکبر درگاہ کا نہایت معتقد تھا اور ہر سال لازماً اجمیر جاتا تھا، اس لیے اس نے آگرہ سے اجمیر تک ہر منزل پر ایک محل بنانے کا حکم دیا تھا اور ہر کوس پر ایک ایک منارہ اور کنواں بھی بنوایا۔ بادشاہ نے اپنی زندگی میں جتنے ہرنوں کا شکار کیا تھا ان سب کے ہزاروں سینگ رکھے ہوئے تھے۔ یہ سینگ ہرن منار پر بطور یادگار لگوا دیے۔ ان میناروں کی تاریخ ''میل شاخ'' ہوتی ہے۔ کاش اس کے بجائے باغ یا سرا بنوائی جاتی!

اسی سال شہباز خان کنبو کی رائے پر ''داغ'' اور ''محلّہ'' کی رسم کا آغاز ہوا۔ تمام ممالک محروسہ میں تحصیل کے ''کروڑیوں'' کا تقرر کیا گیا اور بادشاہ نے تمام ملک کے خالصہ ہونے کا حکم صادر فرمادیا۔

بنگال پر فوج کشی

982ھ/1574ء میں صفر کی آخری تاریخ کو اکبر نے بنگالہ کی فتح کے ارادہ سے کوچ کیا اور ''نہتک سر'' نامی کشتی میں سوار ہوا۔ بنگال میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے وہ اس سفر کا سبب بنے۔ وہاں سلیمان افغان کرانی جس نے سلیم شاہ کے عہد سے بنگالہ کے سارے علاقہ پر قبضہ کر کے خود مختار حکومت قائم کر رکھی تھی، فوت ہو چکا تھا۔ اس کا لڑکا بابر جو چند دن تک اس کا جانشین رہا، لیکن اپنی بدسلوکی کی وجہ سے اپنے بہنوئی ہنسو اور دوسرے امیروں کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بعد سلیمان کا چھوٹا لڑکا داؤد جو اس کا ولی عہد تھا، بادشاہ بن گیا۔

اس نے بادشاہ بننے کے بعد اطاعت کی وہ روش ترک کردی جس پر سلیمان کاربند تھا۔ دربار میں عریضے بھیجنے بھی بند کر دیے۔

بادشاہ کو سلیمان کے انتقال کی خبر سورت کے قلعہ میں ملی تھی۔ بادشاہ نے اس وقت خان خاناں منعم خان کو جو اس زمانہ میں جونپور میں تھا فرمان بھیجا تھا کہ وہ داؤد کی خبر لے اور بہار کے علاقے کو فتح کر لے۔ خانخاناں نے ایک بھاری لشکر لے کر حملہ کردیا اور دو لاکھ روپیہ نقد اور قسم قسم کے نفیس تحفے پیش کش میں وصول کر کے مصالحت کر لی اور واپس آ گیا۔

امیر الامراء لودھی کا قتل

اس وقت داؤد حاجی پور میں تھا۔ اس کا ایک سردار لودھی جو امیر الامراء کے منصب پر فائز تھا اور اڑیسہ کی حکومت پر اسے مقرر کیا گیا تھا، باغی ہوگیا تھا اور قلعہ رہتاس پر قبضہ کر کے خود مختاری کا دعوی کر رہا تھا۔

جگناتھ کے حاکم قتلو خان کی مدد سے داؤد نے دو ہاتھی عطا کرنے کا اسے لالچ دیا اور بڑی تدبیر سے اس پر قابو پا کر قید کردیا۔ اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ داؤد چند ساتھیوں کے ساتھ شکار پر گیا تھا۔ اس وقت لودھی نے سلیمان کے ملازمین میں سے دس ہزار سوار اپنے ساتھ لیے اور داؤد کو ختم کر دینے کا ارادہ کرلیا۔ داؤد اسی وقت شہر میں لوٹ آیا اور فوج کے آدمیوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان میں تفرقہ پیدا کر دیا اور لودھی کو حسن تدبیر سے گرفتار کر کے سارے مال و اسباب کو ضبط کر لیا۔ لودھی کو اپنے قتل کا کامل یقین ہوگیا تھا لیکن اس آخر وقت میں بھی اس نے داؤد کو خیر خواہی کے طور پر نصیحت کی اور کہا " میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم کو میرے قتل کے بعد بڑی پشیمانی ہوگی اور اس وقت پشیمان ہونے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس کے باوجود میں ایک تدبیر سمجھاتا ہوں اگر تم اس پر عمل کرو گے تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ اس سے پہلے دو لاکھ روپیہ دے کر مغلوں سے میں نے صلح کرادی ہے اور اس صلح کے بھروسے پر اطمینان سے بیٹھے نہ رہو کیوں کہ مغل اس

تھوڑی سی رقم پر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے اس لیے خود پہل کر کے مغلوں کے خلاف دلیرانہ فوج کشی کر دو، یاد رکھو جو بھی پہل کر جائے گا وہی کامیاب رہے گا''۔

داؤد نے اس کی باتوں کو غرض آمیز سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی اور خان خاناں کی اس گرگ آشتی پر جو فقط دکھاوا تھی، بھروسہ کر کے اس نے اپنے خیرخواہ لودھی کو قتل کرادیا اس کو قتل کر کے اس نے اپنے پیر پر کلہاڑی چلادی تھی۔ اس کی حکمرانی پر بس اسی وقت سے زوال آگیا۔ خان خاناں کو جیسے ہی یہ خبر ملی اس نے پٹنہ اور حاجی پور کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وقت داؤد کو لودھی کی قدر معلوم ہوئی اور وہ اس کے قتل پر بڑا نادم ہوا، لیکن اب اس سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔

بادشاہی فوجوں کے مقابلہ پر داؤد نے پٹنہ کے قلعہ کی مرمت کرائی اور لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ قلعہ میں بند ہو گیا لیکن اس کی بدمستی اور بے تدبیری کی وجہ سے اس کے اکثر امیر اس سے علیحدہ ہو کر منتشر ہو گئے۔

دلچسپ دریائی سفر

بادشاہ نے مذکورہ تاریخ پر میرزا یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کر کے خشکی کے راستہ روانگی کا حکم دے دیا اور شہاب الدین احمد خان کو آگرہ کی حفاظت پر چھوڑ کر خود دریا کے راستے روانہ ہو گئے۔

اس مہم میں بڑا شاہزادہ بھی بادشاہ کے ہمراہ تھا، اس وقت دربار کی سطح پر اتنی کشتیاں اور ڈونگے تھے کہ دریا کی سطح نظر نہیں آرہی تھی۔ ملاح اپنی مخصوص زبان میں بڑی خوش آوازی کے ساتھ الاپ رہے تھے، ان کے گیت ایسے سریلے تھے کہ مچھلیاں پانی میں اور پرندے ہوا میں رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہ سارا منظر اتنا دلکش تھا کہ اس کے بیان سے زبان قاصر ہے۔ روزانہ کشتیوں سے اُتر کر سیر و شکار کیا جاتا تھا اور رات میں جب لنگر ڈال دیے جاتے تو علمی مباحثے اور شعرگوئی کی محفلیں ہوتیں اور آپس میں بڑی دلچسپ بحثیں ہوتیں۔

الہ آباد میں قیام

23 ماہ صفر کو پریاگ یعنی الہ آباد میں جہاں گنگا اور جمنا کا سنگم ہوتا ہے، قیام ہوا۔ یہاں کے مندر میں ہندو حصول ثواب اور مشاہدۂ تناسخ کے لیے طرح طرح کی سخت ریاضتیں کرتے ہیں۔ بعض تو اپنے سر آرے کے نیچے دے دیتے ہیں۔ بعض اپنی زبان کٹوا لیتے ہیں اور بعض تو کسی اونچے درخت سے دریا میں گر کر جان دے دیتے ہیں۔ یہاں پہنچنے پر بادشاہ نے ایک عالی شان عمارت کی تعمیر کا حکم دیا اور شہر کا نام الہ آباد رکھا۔ بنارس پہنچنے کے بعد شیر بیگ قورچی کو ایک تیز رفتار کشتی میں بٹھا کر خانخاناں کے پاس بھجوا دیا۔

دوسری ماہ ربیع الثانی کو یحییٰ پور کے موضع سے جو جونپور کے مضافات میں ہے اور جہاں کودی ندی گنگا میں آ کر ملتی ہے، شاہزادہ، حرم شاہی، صدر الصدور اور قاضیوں کی کشتیاں کودی کے چڑھاؤ پر جونپور کی طرف روانہ ہوگئیں۔ بادشاہ بھی دو تین منزل تک ان کے ساتھ جا کر لوٹ آئے۔ اسی منزل میں سلطان محمود بھکری کے فوت ہونے اور اس کے علاقہ پر محبّ علی خان کے قابض ہو جانے کی اطلاع ملی، پھر خان خاناں کے حسب التماس بادشاہ نے گنگا میں تیزی سے سفر شروع کیا۔ اسی ماہ کی چھ تاریخ کو لشکر خشکی کے راستہ سے چل کر غازی پور شہر میں شاہی قافلہ سے آ ملا۔ اسی منزل میں خان خاناں کے پاس سے اعتماد خان خواجہ سرا حاضر ہوا اور خان خانان کے لشکر کے تمام حالات تفصیل سے سنے اور عجلت سے روانگی کی استدعا کی۔

سید میر منجم کی پیش گوئی

اس ماہ کی ساتویں تاریخ کو سید میر اصفہانی منجم نے جو خان زمان کی شکست کے بعد سے جونپور ہی میں مقیم تھا، نقیب خان کی فرمائش پر نجوم کی کتاب ''اعظم'' کا مطالعہ کیا اور مرکب و مرتب حروف کا استخراج کر کے اس نے فال نکالی تو یہ شعر برآمد ہوا:

بزودی اکبر از بخت ہمایون　　برد ملک از کف داوَد بیرون

حسن اتفاق کہ جو کچھ پیش آیا اس فال کے مطابق پیش آیا۔ واپسی میں جب جونپور میں

بادشاہی لشکر نے کیمپ لگایا تھا تو سید موصوف دربار میں حاضر ہوا، پھر نجوم سے فال نکالی۔ اس وقت یہ شعر برآمد ہوا:

مژدہَ فتح بناگاہ رسد سر داؤد بدر گاہ رسد

میری (صاحب تصنیف منتخب التواریخ) اس ماہر نجومی سے انہی دنوں شناسائی ہوئی تھی، میں نے اس علم کو سکھانے کی درخواست کی تو اس نے قبول کرلیا اور کہا ''یہ اہل بیت کا خاص علم ہے اور اس کے لیے چند شرائط کی پابجائی لازمی ہے''۔ آخر میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ شرطیں شیعوں کے بعض مسائل کی تقلید سے متعلق ہیں اور یہ فال بھی دوسرے فالوں کی طرح جعلی اور اختراعی ہوتی ہے کہ ہر شخص اپنی قوت ارادی سے کام لے کر ایسے فال برآمد کرسکتا ہے۔ اس کا مجھے (صاحب تصنیف) مشاہدہ بھی ہوا، بلکہ میں نے خود بھی تجربہ کرکے دیکھ لیا اور انہی دنوں سید کی تعلیم کا احسان اٹھائے بغیر ہی میں نے فال کے اس طریقہ کو سیکھ لیا۔

شاہی بیڑہ چوسہ میں

20 ماہ ربیع الثانی کو چوسہ میں قیام کیا گیا، یہاں خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ پٹھانوں کے سربرآوردہ امیر عیسیٰ خاں نیازی نے جو بہادری اور شجاعت میں کافی مشہور ہے، پٹنہ کے قلعہ سے جنگی ہاتھی اور ایک بھاری جمعیت لے کر شاہی فوج پر حملہ کر دیا تھا، لیکن بادشاہ کے ایک غلام کے ہاتھوں مارا گیا۔ ان دنوں شہاب الدین احمد خان کا بھائی معصوم بن ہاشم خان خان خاناں کے لشکر میں تھا اور اس کا لڑکا بادشاہ کی خدمت میں کشتی پر رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے پاس روزانہ لشکر کے حالات معلوم کراکے بادشاہ کو سنایا کرتا تھا۔ اس طرح اس نے بادشاہ کی خدمت میں بڑا تقرب حاصل کرلیا تھا یہاں تک کہ اس کو نیابت خان کا خطاب مل گیا، لیکن بعد میں چل کر کون سی ایسی بغاوت تھی جو اس نے نہیں کی اور بغاوت کا کون سا ایسا پھل تھا جو اسے چکھنا نہ پڑا۔

حاجی پور کے قلعہ کی فتح

اس مہینہ کی 16 تاریخ کو پنج پہاڑی کے مقام پر جو کہ پٹنہ سے دو تین کوس پر واقع ہے، قافلہ پہنچا۔ یہاں پانچ بلند گنبد ہیں جن کو پہلے زمانہ میں غیر مسلمانوں نے پکی اینٹوں سے بنوایا تھا۔ بادشاہ نے اس جگہ خان خاناں کے مکان میں قیام فرمایا۔ خان خاناں نے اس موقع پر مروارید سے بھرے ہوئے تھال نچھاور کیے اور بے شمار نفیس تحائف قیمتی کپڑے نذر میں گزارے۔ یہاں سے بادشاہ نے تین ہزار بہادر سوار عین طغیانی کے وقت کشتیوں میں بٹھا کر حاجی پور کے قلعہ پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیے۔ اسی قلعہ سے پٹنہ والوں کو مدد پہنچائی جاتی تھی۔ یہ جنگی کشتیاں تمام جنگی سامانوں سے لیس تھیں اور قلعہ شکنی کے سارے آلات ان میں رکھے گئے تھے۔ دیکھنے میں اتنی پرشکوہ اور شاندار تھیں کہ بس آدمی دیکھتا ہی رہ جائے۔ یہ جمعیت خان عالم کی سرکردگی میں روانہ ہوئی، راجہ گجپتی کو خان عالم کی مدد کے لیے مقرر کیا گیا۔ راجہ گجپتی اسی علاقہ کا بڑا با اثر آدمی تھا، اس کی قوت اور جمعیت ایسی تھی کہ اس نے خان زماں جیسے بہادر سردار کو دو سال تک ان جنگلوں میں سرگرداں رکھا تھا، ابھی تک وہاں کے جنگل جیسا کہ چاہیے پاک و صاف نہیں ہوئے ہیں۔ ان جنگلوں میں بکثرت حشرات الارض پائے جاتے ہیں۔ان دونوں نے حملہ کر کے خشکی اور تری دونوں طرف سے حاجی پور کو گھیر لیا۔ بادشاہ بھی محاذ پر پہنچے اور دریا کے اس طرف ایک بلند مقام پر ٹھہر کر جنگ کا نقشہ دیکھنے لگے دوری اور دھند لکے کی وجہ سے جنگ کی صورت حال واضح طور پر معلوم نہیں ہو رہی تھی، اس لیے تجربہ کار جوانوں کو ایک کشتی میں بٹھا کر عصر کے وقت حاجی پور کی طرف روانہ کیا گیا تا کہ صحیح خبر لے کر آئیں۔ قلعہ والوں نے جب ان کو آتے دیکھا تو اٹھارہ کشتیوں میں سپاہی بھر کر ان کے مقابلہ کے لیے روانہ کیے۔ جب مقابلہ ہوا تو اس مختصر سی جماعت نے اس بڑے گروہ پر نمایاں کامیابی حاصل کی اور انکو راستہ سے ہٹا کر خان عالم کے بیڑے سے جا ملے۔ دشمن کی طرف سے فتح خان بارہہ بہت سارے پٹھانوں کے ساتھ بڑی سخت لڑائی کے بعد مارا گیا اور قلعہ تلوار کی زد پر

فتح ہوگیا۔ مقتول سرداروں کے سر ایک کشتی میں رکھ کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لیے روانہ کیے گئے۔ اس کشتی کو بادشاہ نے حفاظت سے داؤد کے پاس بھجوادیا تاکہ وہ اس سے عبرت حاصل کرے۔ دوسرے دن بادشاہ پنج پہاڑی کے اوپر تشریف لے گئے اور قلعہ پٹنہ کا سرسری معائنہ کرکے اس کے اطراف واکناف کے علاقہ کو ملاحظہ فرمایا۔ اس وقت پٹھان بڑی بڑی توپوں سے گولہ باری کر رہے تھے کہ ان کے گولے تین کوس کے فاصلے سے لشکر میں آکر پھٹتے تھے۔ میں بیانہ اور بجوانہ کے حاکم سید عبد اللہ خان جوکان بیگی کے خیمے میں رہتا تھا ایک گولہ میرے سر پر سے دندناتا ہوا گزرا۔ اللہ نے بچالیا اور زندگی کی یہ مہلت مل گئی ورنہ نہ معلوم میں کہاں پہنچ گیا ہوتا۔

داؤد کا فرار ہونا اور پٹنہ کی فتح

حاجی پور کے فتح ہوجانے سے مخالفین کی کمر ٹوٹ گئی۔ داؤد کے پاس بیس ہزار سوار اور بے شمار جنگی ہاتھی تھے اور ایک بہت بڑا توپ خانہ بھی تھا لیکن اس سارے خدم وحشم کے باوجود شاہی حملہ سے ڈر کر اس مہینہ کی 21 تاریخ کو ایک کشتی میں بیٹھ کر قلعہ سے بھاگ گیا۔ سرہر ہندی بنگالی جس کا خطاب بکر ماجیت تھا اور جس نے لودھی کے قتل پر داؤد کو آمادہ کیا تھا۔ ایک کشتی میں خزانہ رکھ کر اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ گوجر خان کرانی جس کا خطاب رکن الدولہ تھا، ہاتھیوں کو لے کر جنگل میں نکل گیا۔ بہت سارے لوگ تو مارے خوف کے دریا میں غرق ہوکر مرگئے۔ بعض سراسیمہ ہوکر قلعہ کے برج اور فصیل پر سے نیچے کود پڑے اور خندق ان کی لاشوں سے پٹ گئی۔ کچھ لوگ گلی کوچوں میں ہاتھیوں کی لپیٹ میں آکر ہلاک ہوگئے۔ قلعے کی بھاگی ہوئی فوج جب پُن پُن ندی پر پہنچی تو گوجر خان ہاتھیوں کو اس پل پر سے جسے ندی پر باندھا گیا تھا گزار کر نکل گیا اور اس کے پیچھے لوگوں کا پل پر اس قدر ہجوم ہوا کہ پل بوجھ برداشت نہ کرسکا اور ٹوٹ گیا۔ اس موقع پر بہت سے پٹھان سردار مال اسباب چھوڑ کر ندی میں کود پڑے اور اس میں غرق ہوکر رہ گئے۔ بادشاہ کو رات کے آخری حصے میں داؤد کے فرار ہوجانے کی خبر ملی اور وہ شہر پٹنہ میں داخل ہوئے۔ شہر میں

56 ہاتھی لشکر کے ہاتھ آئے اور فتح نصیب ہوئی۔

بادشاہ نے پٹنہ کی حفاظت اور انتظام پر خان خاناں کو مقرر کیا اور خود گوجر خان کے تعاقب میں جو داؤد کے تمام ہاتھیوں کو لے جارہا تھا روانہ ہوگیا اور گھوڑے پر سوار ہوکر پُن پُن ندی کو پار کرکے دریاپور تک جو پٹنہ سے 36 کوس پر دریائے گنگا کے کنارے واقع ہے حملہ کرکے تقریباً چار سو مشہور ہاتھیوں کو پکڑلیا۔ گوجر خان البتہ اپنی جان سلامت لے کر نکل گیا۔ شہباز خان، میر بخشی اور مجنون خان نے دریاپور سے آگے بڑھ کر سات کوس تک اس کا پیچھا کیا اور وہاں سے لوٹ آئے۔ انھوں نے آکر بادشاہ کو اطلاع دی کہ گوجر خان بلبھو ندی پار کرکے نکل گیا ہے، لیکن اس کے بہت سے آدمی پانی میں غرق ہوکر ہلاک ہوچکے ہیں۔

اسی مہینہ کی 21 تاریخ کو خان خاناں بھی دریا کے راستہ سے دریاپور میں آیا، وہ اپنے ساتھ کشتیاں بھی لے کر آیا تھا۔ بادشاہ نے 6 دن وہاں قیام کیا اور خان خاناں کی مدد کے لیے اپنے ساتھ کے امراء کو دس ہزار سواروں کے ساتھ مقرر کیا اور اس پورے لشکر کی تنخواہ اور مراتب میں دس سے تیس تک اور دس سے چالیس تک کا اضافہ فرمادیا اور خان خاناں کو بنگالہ کا پورا ملک اور کشتیوں کا سارا بیڑا عطا کرکے وہاں سے غیاث پور کی طرف جو گنگا کے کنارے ہے بادشاہ واپس ہوا۔

اسی سال دوسری جمادی الاول کو یوسف خان کو لشکر کی سرداری پر مقرر کرکے مظفر خان کو فرحت خان کے ہمراہ رہتاس کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ فرمایا تاکہ وہ فتح کے بعد رہتاس کی حکومت فرحت خاں کے کے سپرد کرکے دربار میں چلا آئے۔

اسی مہینہ کی تیسری تاریخ کو بادشاہ کی سواری پٹنہ میں داخل ہوئی۔ وہاں بادشاہ نے سارے معاملات کا مناسب انتظام کیا اور داؤد کی عمارتوں کا سرسری طور پر معائنہ کیا۔ پٹنہ میں عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں بعض چھپر کے مکان تیس تیس، چالیس چالیس ہزار میں تیار ہوتے ہیں حالانکہ وہ تمام کے تمام لکڑی سے ہی بنائے جاتے ہیں۔

بنگال سے واپسی

چھٹی تاریخ کو بادشاہ جونپور پہنچے اور ایک مہینہ تک وہاں قیام فرمایا۔جونپور اور بنارس کو خالصہ میں شامل کرلیا اور اس کا نظم ونسق میرزا میرک رضوی اور شیخ ابراہیم سیکری وال کے سپرد کر کے نویں جمادی الثانی کو جونپور سے دہلی کے لیے کوچ فرمایا۔ جب موضع خان پور میں کیمپ لگایا گیا تو قاضی نظام بدخشی فیروزہ کابلی کے ساتھ خدمت شاہی میں پہنچے۔ یہ صاحب بدخشاں اور ماوراء النہر کے بہت بڑے عالم تھے، تصوف وطریقت میں ان کا بڑا مرتبہ تھا، فیروزہ کابلی مرزا محمد حکیم کے گھرانہ کا لڑکا تھا یہ نہایت ذہین طالب علم تھا۔ خطاطی اور موسیقی کے فن میں بھی اس کو بڑا کمال حاصل تھا۔

بادشاہ نے قاضی نظام کو ایک مرصع شمشیر اور پانچ ہزار روپیہ نقد عطا فرمایا، انھوں نے بتدریج اپنی استعداد و عالی ظرفی کی وجہ سے قاضی خان کا خطاب اور بعد میں ''غازی خان'' کا خطاب حاصل کرلیا اور سہ ہزاری کے عہدے تک ترقی کی،البتہ فیروزہ کا معاملہ کچھ اس کے برعکس ہی ہوا، وہ اپنے مقام سے برابر تنزل ہی کرتا رہا۔ اسی جگہ خان خاناں کا عریضہ پہنچا کہ داؤد پٹنہ سے نکل کر کرہی چلا گیا تھا وہاں اس نے قلعہ کو مستحکم کر کے اپنے معتمد سرداروں کے سپرد کردیا اور وہاں سے ٹانڈہ کی طرف چلا گیا۔ جب شاہی فوجوں نے کرہی کی طرف پیش قدمی کی تو قلعہ والے مرعوب ہوکر جنگ کیے بغیر ہی قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔

سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ

جمادی الآخر میں جب شیر گڑھ عرف قنوج میں قیام ہوا تو بادشاہ نے مجھے (صاحب تصنیف) مخاطبت سے نوازا اور مہربانی کے باعث حکم دیا کہ میں طوطی نامہ[36] کی طرح سنگھاسن بتیسی[37] کا ترجمہ کر کے اس کی نظم ونثر کو مرتب کروں اس کتاب میں بتیس حکایتیں ہیں جو مالوہ کے حاکم راجا بکر ماجیت کے حالات سے متعلق ہیں۔بادشاہ کا ارشاد تھا کہ میں آج ہی اس کام کو شروع کردوں اور اس کا ایک ورق لکھ کر دکھادوں۔ ایک صاحب علم برہمن کو اس کی ترجمانی کے لیے مقرر فرمایا، اسی دن میں نے جب ایک کہانی

کا پہلا صفحہ لکھ کر پیش کیا تو بادشاہ نے بڑی تحسین اور تعریف کی جب اس کتاب کا ترجمہ ہوگیا تو اس کا نام ''خردافزا'' تجویز ہوا۔ اس میں اس کا تصنیفی پس منظر اور تاریخ بھی شامل کردی گئی۔ بادشاہ نے اس کو پسند فرمایا اور تعریف کر کے اسے شاہی کتب خانہ میں داخل کرادیا۔

خواجہ عبد الشہید کی بددعا

اسی دوران جب کراؤلی کے مقام پر شاہی قافلہ پہنچا تو خواجہ عبد الشہید، سمرقند واپس جانے کا ارادہ کر کے رخصت ہونے کے لیے آئے اور اکبر سے کہا ''میں اپنی ہڈیوں کو اسی سرزمین (سمرقند) میں پہنچانا چاہتا ہوں، پھر انھوں نے بادشاہ کی کمر سے ایک تلوار باندھی اور دوبارہ میرزا اشرف الدین حسین کی رہائی کے لیے درخواست کی''۔ اس بار بھی جب بادشاہ نے قبول نہ کیا تو انھوں نے نہایت رنجیدہ ہوکر فرمایا ''اب میں مزید کیا کہوں، یہ بات امن و امان کے لیے بہرحال مضر ہے، بس اپنے خدا سے یہی چاہتا ہوں کہ وہ تمہارے ایمان کو قائم کرے''۔ جیسا کہ انھوں نے کہا تھا وہ سمرقند پہنچتے ہی اپنے بزرگوں سے جا ملے''۔

20 جمادی الثانی کو اسکندر پور کے قصبہ میں قیام ہوا تو یہ خبر پہنچی کہ داؤد نے ٹانڈہ کو بھی جو گنگا کے اس طرف گوڑ کے مقابل واقع ہے بغیر جنگ کیے چھوڑ دیا ہے اور صحرا نوردی کرتے ہوئے اڑیسہ کو چلا گیا ہے اور ٹانڈہ پر خانخاناں کا قبضہ ہو چکا ہے۔

اکبر کی دہلی آمد

اگرچہ وہ تین منزل پر تھا، لیکن بادشاہ نے آگرہ کے بجائے دار الملک دہلی کا رخ کیا اور پہلی ماہ رجب کو دہلی میں شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ داخل ہوا۔ چند دنوں تک مقدس مزاروں کی زیارت کی۔ انہی دنوں حسین خان پٹیالی بھون گاؤں کے قریب حاضری کے لیے آیا، لیکن اسے باریابی کی اجازت نہ ملی بلکہ بادشاہ نے شہباز خان میر بخشی کو حکم دیا کہ

اُسے دولت خانہ کے احاطہ سے باہر نکال دیا جائے۔ حسین خان کو اس توہین کا بڑا صدمہ ہوا اور اس نے ہاتھی اونٹ، گھوڑے اور جنگی ساز و سامان ہمایوں بادشاہ کے مقبرے کے طالب علموں، مستحقوں اور مجاوروں، مدرسوں اور خانقاہوں کو عطا فرمائے اور سب کچھ ترک کر کے ''الف وار'' قلندری اختیار کر لی:

این ہمہ طمطراق کن فیکون
شمۂ نیست پیش اہل جنون

جب اس کی اطلاع بادشاہ کو ملی تو اس پر عنایت مبذول کی اور اپنی شال اتار کر اسے اوڑھائی۔ اپنے ترکش میں سے ایک تیر نکال کر بطور پروانگی عطا فرمایا اور حکم دیا کہ کانت، کولہ اور پٹیالی اور دوسرے علاقے جو ایک کروڑ بیس لاکھ کی جاگیر تھی، حسب سابق ایک فصل تک اس کے سپرد کی جائے اور سرکار کا کروڑی اس جاگیر میں مداخلت نہ کرے۔ جب وہ سواروں کا'' داغ و محلّہ'' کرالے تو اسے مناسب تنخواہ پر جاگیر عطا کر دی جائے گی۔ حسین خان اپنی فیاضی اور کشادہ دستی کی وجہ سے اس قدر قلاش ہو چکا تھا کہ دس سوار رکھنے کی بھی اس میں طاقت نہیں تھی۔ اس قصہ کو رفع دفع کرنے کے لیے وہ مجبوراً اپنی جاگیر پر چلا گیا اور شمالی کوہستان کو فتح کرنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اس مرتبہ وہ دربار سے ایسا گیا کہ پھر اسے لوٹ کر آنا نصیب نہ ہوا:

زر بدہ مرد سپاہی را تا سر بدہد
وگرش زر ندہی سر بنہد در عالم

اجمیر کی زیارت کے لیے روانگی

اوایل شعبان میں بادشاہ نے دہلی سے اجمیر کا قصد کیا۔ نارنول کی منزل میں حسین قلی خان جہان مبارکباد کے لیے حاضر ہوا اور خان اعظم یلغار کرتے ہوئے احمد آباد سے حاضر خدمت ہوا۔ رمضان المبارک کے آغاز میں حسب سابق اجمیر سے 7 کوس کے فاصلہ پر بادشاہ پیدل زیارت کے لیے چلے اور درگاہ پر پہنچ کر داؤد کے لشکر کے نقاروں کی ایک

جوڑی جس کو درگاہ پر پیش کرنے کی بادشاہ نے منت مانی تھی، نذرانہ میں دی۔حسب معمول ہر روز درگاہ میں راتوں کے وقت اہل اللہ اور صالحین کی محفل جمتی اور سماع کی مجلسیں منعقد ہوتیں، جن میں بادشاہ برابر حاضر رہتے۔موسیقاراور قوال جو اپنے فن میں ایک سے ایک بڑھ کر تھے، دل سوز نغمے گا گا کر سناتے تھے اور چاروں طرف سے ان پر روپے پیسے کی بارش ہونے لگتی۔

دارالخلافہ کی جانب واپسی

اجمیر سے بادشاہ نے مالدیو کے لڑکے چندرسین کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ایک تجربہ کار فوج کو مقرر کیااس فوج کی سرداری محمد طاہر خان میر فراعت حاکم دہلی کے لڑکے طیب خان کے سپرد کی گئی۔ اس فوجی حملہ کا سبب یہ تھا کہ چندرسین کے بارے میں بادشاہ کو مسلسل یہ اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہ جودھپور اور سیوانہ کے علاقہ میں سرکشی اختیار کر کے مسلمانوں کو پریشان کر رہا ہے۔ جب یہ فوج اس پر حملہ کرنے کے لیے پہنچی تو وہ گھنے جنگلوں میں بھاگ کر چھپ گیا اور فوج کی روانگی کے بعد ماہ رمضان کے وسط میں خان اعظم کو گجرات پر جانے کی اجازت عطافرمائی گئی اور بادشاہ مسلسل کوچ کر کے رمضان کی آخری تاریخ تک فتح پور واپس تشریف لے آئے۔

سیوانہ کے قلعہ کی فتح

بادشانے اسی سال شاہ قلی خان محرم، سلال خاں قورچی اور چند دوسرے امیروں کو سیوانہ کے قلعہ کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ یہ قلعہ مالدیو کے پوتوں کے قبضے میں تھا۔ جلال خان قورچی بادشاہ کا خاص ندیم اور مصاحب تھا۔ نہایت ظریف اور خوش طبع آدمی تھا۔ مصاحبوں اور ندیموں میں بادشاہ کے مزاج میں کسی کو اتنی دسترس نہ تھی، جتنی جلال خان کو حاصل تھی۔ اس معرکہ میں اس نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور لڑتے ہوئے شہید ہوگیا۔ اس طرح اسے دنیا بھی ملی اور عاقبت بھی ہاتھ سے نہیں گئی۔ اس کے بعد اس مہم پر شہباز

خان کنبوہ کو روانہ کیا گیا۔ اس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس قلعہ پر قبضہ کرلیا۔

اسی سال بادشاہ نے میر گیسو بکاول کو سلطان محمود بھکری کے مال و دولت کی تحقیقات اور قلعہ بھکر کے انتظامات کے لیے مقرر فرمایا۔

اسی سال گجرات میں بڑی سخت وبا پھیلی اور غلہ اس قدر مہنگا ہوگیا کہ ایک من جوار کے دام ایک سو بیس تنکہ سیاہ تک چڑھ گیا، وبا اور قحط سے بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔

خواجہ امینا خواجہ جہاں کی وفات

اسی سال خواجہ امینا[38] خواجہ جہاں کا لکھنؤ میں اس وقت انتقال ہوگیا جبکہ بادشاہی لشکر پٹنہ سے لوٹ کر وہاں پہنچا تھا۔خواجہ امینا کی کنجوسی ضرب المثل بنی ہوئی تھی، چنانچہ وہ رات کا بچا ہوا کھانا کھاتا تھا، لیکن یہ کفایت اس کی اپنی ذات تک محدود تھی، کیوں کہ وہ حاجت مندوں کی بہت امداد و اعانت کیا کرتا تھا، بلکہ اس معاملہ میں شاید ہی کوئی دوسرا اس کے مقابل آسکے۔

اس کا معمول تھا کہ ملازمت دلانے کے لیے ایک مقررہ رقم بطور رشوت لیا کرتا تھا اور بادشاہ کے پاس سفارش کر کے، جاگیر، نقارہ، خان یا سلطان کا خطاب دلایا کرتا تھا۔ جو لوگ ماوراء النہر، خراسان اور عراق سے ہندوستان آتے تھے وہ ان کو شاہی خزانہ سے معقول رقمیں دلایا کرتا تھا اور کوشش کر کے دوسرے امیروں سے بھی خاصا روپیہ فراہم کردیتا تھا اور دوسروں کی طرح خود بھی اپنے شایان شان انکی مدد کرتا رہتا تھا۔

ملا حسام الدین ابراہیم اسفر کے ایک شاگرد حافظ تاشکندی تھے جو عربی کے مشہور عالم ہیں انھوں نے سورۂ محمدؐ پر ایک تفسیر لکھی ہے ان کے علمی مرتبہ کا اندازہ اس تفسیر سے بخوبی ہوسکتا ہے۔ وہ جب ہندوستان آئے تو خواجہ امینا نے بادشاہ سے اور دوسرے امیروں سے تقریباً تیس چالیس ہزار روپیہ اکٹھا کر کے انکو دلایا وہ پورے ساز وسامان کے ساتھ منعم خان خاناں کے پاس گئے اور وہاں سے بھی مالا مال ہوکر مکہ معظمہ کے ارادے سے روانہ ہوئے۔ انھوں نے 977ھ/1569ء میں اپنے وطن پہنچ کر انتقال فرمایا۔

ایک دلچسپ لطیفہ

انہی دنوں بادشاہ کی محفل میں ایک دلچسپ لطیفہ پیش آیا۔ اکبری مجلس میں حاجی ابراہیم سرہندی بھی تھا جو ہمیشہ علماء سے الجھتا رہتا اوراپنی بڑائی جتانے کے لیے مباحثے کرتا رہتا تھا اور بحث میں طرح طرح کے مغالطے پیدا کر کے مخالف کو پریشان کر دیتا تھا۔جس وقت تاشکندی نے اپنی تفسیر پیش کی تو حاجی نے مرزا مفلس کو چھیڑنے کے لیے پوچھ لیا کہ ''موسیٰ'' کون سا صیغہ ہے اور کس مادہ سے مشتق ہے؟ مرزا مفلس علوم عقلیہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ اتفاق کی بات اس کا جواب جیسا کہ دینا چاہیے تھا، نہ دے سکے اور عوام نے یقین کرلیا تھا کہ حاجی ابراہیم علم کے لحاظ سے سب پر فوقیت رکھتا ہے اور یہ بڑی ناانصافی کی بات تھی، کچھ لوگوں نے قاضی زادہ لشکر سے جسے بادشاہ نے متھرا کا قاضی بنایا تھا کہا تم بحث میں کیوں حصہ نہیں لیتے ہو؟ اس نے بے ساختہ جواب دیا''اگر حاجی ابراہیم مجھ سے ''عیسیٰ'' کا صیغہ پوچھ بیٹھے تو اس وقت بھلا میں کیا جواب دے سکوں گا؟ بلا شبہ یہ اس نے بڑی عمدہ بات کہی تھی۔

یاد رفتگان

اس تاریخ سے اب تک[39] کہ دس سال کی مدت گزر چکی ہے ان مباحثہ کرنے والوں کی جماعت میں سے جو 100 سے زیادہ آدمیوں پر مشتمل تھی محقق و مقلد کوئی بھی تو نظر نہیں آتا ہے۔ سب کے چہروں پر موت اپنا سیاہ نقاب اُڑھا چکی ہے، بے شک **"کل نفس ذائقة الموت"**

زخیل درد کشان غیر مانماند کسی بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسی

وہ محفلیں اجڑ گئیں اور ایک میں[40] سوگوار رہ گیا ہوں کہ جب بھی ان کی یاد آتی ہے تو میری غمزدہ آنکھیں حسرت کے ساتھ خون کے آنسو روتی ہیں اور دل نالہ وفریاد کرنے لگتا ہے۔ کاش وہ لوگ کچھ دن اور جی جاتے کہ بہرحال اس قحط الرجال میں ان کی ہستیاں بڑی غنیمت تھیں۔ اب کس سے بات کریں؟ تبادلہ خیالات کی لذت تو بس ان کے ساتھ

ہی چلی گئی۔ اب مجھ ناکارہ[41] کے لیے بجز اس کے کوئی چارہ نہیں رہا کہ انکی جدائی سے جلتا اور چپکے چپکے آہ وفریاد کرتا رہوں:

افسوس کہ یاران ہمہ از دست شدند   دریای اجل یگان یگان پست شدند
بودند تنک شراب در مجلس عمر   یک لحظہ زما پیشتر مست شدند

پیائش اور کروڑیوں کا تقرر

اس سال اکبر نے ملک کی خوشحالی اور زرعی ترقی کی طرف توجہ فرمائی اور ملک کے سارے زرخیز وبنجر پرگنوں کی پیائش کرائی[42] شہری، پہاڑی علاقوں، دریاؤں، میدانوں، جنگلوں، تالابوں اور کنوؤں کی تفصیلات جمع و مرتب کی گئیں اور جگہ جگہ کروڑیوں کو مقرر کرکے ہر ایک کروڑی کی تحویل میں اتنی اراضی دے دی کہ زراعت کے بعد اس سے ایک کروڑ تنکہ کا محصول وصول ہو سکے۔ وہی ملازم کروڑی بنائے گئے جن پر پورا بھروسہ تھا اور جو محنتی تھے، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ تین سال کے عرصہ میں غیر مزروعہ خطوں کو قابل کاشت بنادیں تاکہ سرکاری خزانہ کی آمدنی میں اضافہ ہو جائے۔ ہر کروڑی سے اس رقم پر ضامن لیے گئے۔

اس پیائش کی ابتدا فتح پور سے کی گئی۔ اس کے پہلے کروڑ کو آدم پور، دوسرے کو شیث پور اور اسی طرح ایوب پور وغیرہ کے نام دیے گئے اور ہر خطے پر سرکاری عامل تعینات کیے گئے، لیکن بندو بست کا یہ طریقہ کامیاب نہ ہوا اور ممالک محروسہ کے اکثر علاقے ان کروڑیوں کے مظالم کی وجہ سے بجائے آباد ہونے کے ویران ہوگئے، یہاں تک کے لوگ اپنے بال بچوں کو بیچ بیچ کر ادھر ادھر منتشر ہوگئے اور آمدنی کا تناسب بہت زیادہ گر گیا۔ ان کروڑیوں کے احتساب کے لیے راجہ ٹوڈرمل کو مقرر کیا گیا، اس نے ان سب کو اس طرح شکنجہ میں کسا کہ اکثر سخت سزاؤں کی وجہ سے مر گئے اور بیشتر کچہری کے قید خانہ میں کسی سزا کے بغیر ہی ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دنیا سے بے گور وکفن رخصت ہوئے۔ ان گرفتارانِ بلا کا حال بعینہٖ ان ہندو فدائیوں کی طرح ہوگیا تھا جو کامروپ کے علاقہ میں خود کو ایک بت کے لیے وقف کر دیتے ہیں اور ایک سال تک جو من میں آتا ہے، کرتے رہتے ہیں۔ وہ

چاہے کتنا ہی بڑا گناہ اور جرم کریں انکے لیے سب کچھ معاف ہوتا ہے۔ لیکن سال گزرتے ہی ان میں سے ہر ایک کو پکڑ کر اس بت خانہ میں اکٹھا کرلیا جاتا ہے اور اس بت کے آستانہ پر ان کے سر قلم کردیے جاتے ہیں۔

داغ ومحلّہ کا ضابطہ

کروڑیوں کی یہ حالت تھی اور امرائے شاہی کے یہ ٹھاٹھ تھے کہ خالصہ کے علاقوں کو چھوڑ کر تقریباً سارا ملک ان کی جاگیروں میں تقسیم تھا اور یہ لوگ رات دن عیش وعشرت میں مبتلا رہتے تھے ان کے گھرانوں کے خرچ اتنے تھے کہ ان کو روپے بٹورنے کے سوا اور کام نہ تھا۔ عیش پسندی سے اتنی فرصت ہی نہیں ملتی تھی کہ وہ سپاہیوں کی نگہداشت اور رعایا کی طرف توجہ کرسکیں۔ جب کسی لڑائی پر جانا پڑتا تو بجائے مقررہ فوج کے چند غلاموں اور اپنے شاگرد پیشہ مغل سپاہیوں کے ساتھ میدان میں حاضر ہوجاتے تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی کوئی کارآمد مضبوط فوج تیار نہ تھی۔

شہباز خان میر بخشی نے ''داغ ومحلّہ''[43] کا طریقہ جو سلطان علاؤالدین خلجی اور بعد میں شیر شاہ کے ضابطوں میں شامل تھا، از سرنو مرتب کرکے پیش کیا۔ اس قاعدہ کی رو سے طے پایا کہ پہلے امیروں کو بیسی کا عہدہ دیا جائے اور جب وہ اپنے عہدہ کے شایان شان بیس سوار بھرتی کرکے ان کا معائنہ کرادے اور اس کے حسب استعداد بادشاہ مزید ترقی دینا پسند فرمائیں تو اسے ''صدی'' کا عہدہ دیا جائے۔ اس صورت میں اس کے لیے لازم ہوگا کہ سپاہیوں کے علاوہ گھوڑے، اونٹ، ہاتھی اور دوسرے لوازمات فراہم کرکے حاضر خدمت کرے۔ اس تیاری کے بعد وہ ہزاری پھر دوہزاری اور پانچ ہزاری تک اس طرح ترقی کرتا چلا جائے۔ پنج ہزاری سے اونچا کوئی عہدہ نہیں تھا اور اگر کوئی امیر اس ضابطہ پر پورا نہ اترے تو اس کا زوال ہوجاتا تھا۔

فوج کے امراء کی چالبازیاں

داغ ومحلّہ کا یہ ضابطہ اسی لیے نافذ کیا گیا تھا کہ امیر مقررہ تعداد میں فوج رکھنے کے پابند

ہو جائیں، لیکن امیروں نے اس ذمہ داری سے بچنے کی تدبیر نکال لی، چنانچہ وہ حاضری اور معائنہ کے وقت اپنے آدمیوں اور بارگیروں کی بھیڑ اکٹھی کر لیتے تھے اور اپنے عہدہ کی مقررہ تعداد پوری کر لیتے تھے۔ جب ترقی مل جاتی تو ان کرایہ کے سپاہیوں کو رخصت کر دیتے تھے۔لڑائی کے موقع پر حسب ضرورت نئی فوج بھرتی کر کے پہنچ جاتے تھے اور جنگ کے ختم ہونے پر خدا کی پناہ مانگتے ہوئے اپنی رنگ رلیوں میں مصروف ہو جاتے تھے۔ ان کا خزانہ، روپیہ، پیسہ بہرحال محفوظ ہی رہتا تھا اور ساری خاک بے چارے سپاہیوں کے سر پر پڑتی تھی کہ انھیں دوبارہ کمر باندھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

چنانچہ ان امیروں کے پاس پیشہ ور لوگ جولاہے، دھنیے، بڑھئی، بقال، ھندو اور مسلمان گھوڑا اور ساز کرائے پر لے کر اوچھی بنے داغ کے لیے پہنچ جاتے تھے اور ملازمت حاصل کر کے ان میں سے کوئی، احدی، کوئی ''داخلی'' بن جاتا تھا، خدمت ملنے کے چند دن بعد ہی ان کے پاس نہ وہ گھوڑا نظر آتا تھا اور نہ سامان سپاہ گیری، مہم آن پڑی تو انھیں پیادہ ہی گھسیٹنا پڑتا تھا۔

معائنہ کے وقت اکثر ایسا ہوا کہ بادشاہ نے سپاہیوں کو دیوان خانہ میں بلاکر اسی طرح وردیوں اور ہتھیاروں سے لیس ہاتھ پاؤں بندھوا کر ترازو میں تلوایا تو ان کا وزن کم وبیش ڈھائی من اور تین من تک نکلا۔ جب پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ سارا ساز و سامان اور ہتھیار رعاریتاً لیے ہوتے تھے۔

بادشاہ اس صورت حال سے بخوبی واقف تھے، لیکن کہا کرتے تھے کہ ہم لوگوں کو دیدہ و دانستہ یہ رعائتیں دیتے ہیں تاکہ وہ اپنی گزر بسر کرتے رہیں۔

کچھ عرصہ بعد دو اسپہ، یک اسپہ، نیم احدیوں کا تقرر کیا گیا۔ نیم اسپہ کا مطلب یہ تھا کہ دو سوار مل کر ایک گھوڑے کی پرورش کریں اور فی گھوڑا جو چھ روپیہ ماہوار ملتا تھا اس میں دونوں تین تین روپے لے لیں:

ایبک در روزگار من بین و مپرس

یہ رنگ ڈھنگ کچھ اچھے نہیں تھے۔باوجود اس بدانتظامی کے یہ اکبر کی اقبال مندی ہی تھی

کہ اس کے تمام دشمنوں کا صفایا ہو گیا۔ بعد میں اتنے سپاہیوں کی بھی ضرورت نہ رہی اور امیروں کو بھی شاہی کارندوں کی ناز برداریوں سے چھٹکارا مل گیا۔

داؤد کا تعاقب

اسی سال بادشاہ سلامت نے داؤد کے تعاقب کے لیے منعم خان خانخاناں اور راجہ ٹوڈرمل کو اڑیسہ کی طرف روانہ کیا اور مجنون خاں قاقشال کا وہاں کے جاگیردار سلیمان منگلی سے مقابلہ ہوا۔ سلیمان کے پاس بڑا لاؤ لشکر جمع تھا اور وہ شان و شوکت اور بہادری میں بھی کافی مشہور تھا۔ اس مقابلہ میں سلیمان منگلی ہلاک ہو گیا اور قاقشال کی فوج کے ہاتھ اتنا مال غنیمت آیا کہ وہ اسے اٹھانے سے عاجز تھی۔ اس حملہ میں بہت سے پٹھان قیدی بن کر آئے۔ مجنون خان نے سلیمان کی لڑکی کا نکاح اپنے لڑکے حباری سے کر دیا۔ حباری ان دنوں بادشاہی امیروں میں شامل ہے! سلیمان کی شکست کے بعد مجنون خاں قاقشال کی لڑائی جلال الدین سور کے لڑکے سے ہوئی۔ جلال الدین کسی زمانہ میں اس علاقہ کا خود مختار حکمران تھا۔ یہ لڑائی گھوڑا گھاٹ کی حدود میں ہوئی۔ قاقشال نے اس علاقہ کے زمینداروں کی مدد سے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور ٹانڈہ تک اس کا تعاقب کیا، اسی حملہ میں اس نے گوڑ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ مجنون خان اور معین الدین فرنخودی نے ٹانڈہ کی ناکے بندی کر دی اور خان خاناں کی کامیابی کی خبر کا انتظار کرنے لگے۔

جب داؤد کو شکست ہوئی اور خان خاناں کی واپسی کی خبر اڑی تو سارے پٹھان جو جنگلوں میں چھپے ہوئے تھے اکٹھا ہو کر موقع کا انتظار کرنے لگے۔ راجہ ٹوڈرمل، داؤد کے تعاقب پر لگا ہوا تھا وہ محمد قلی خاں برلاس، محمد قلی خان توقیائی اور مظفر مغل کو ساتھ لے کر متواتر کوچ کرتے ہوئے بنگال کے علاقہ کوالیاڑ تک پہنچ گیا۔ داؤد خاں وہاں سے دس کوس کے فاصلہ پر رین کساری نامی مقام پر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہاں ایک بھاری فوج جمع کر کے وہ ہرپور میں قلعہ کے اندر چھپ گیا۔ داؤد کا ایک چچیرا بھائی جنید بہادری اور دلیری میں مشہور تھا، وہ پہلے شہنشاہ کی ملازمت میں تھا، ملازمت چھوڑ کر وہ آگرہ سے گجرات پھر وہاں سے

بنگالہ چلا گیا، اسی دوران وہ داؤد سے ملنے کے لیے رین کساری کے علاقے میں پہنچا۔ راجہ ٹوڈرمل نے میرزا ابو القاسم گو سالہ کو جس کا لقب نمکین ہے، نظر بہادر کیساتھ اس کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ یہ دونوں جنید سے شکست کھا کر راجہ کے پاس لوٹ آئے۔ اب راجہ خود اس کے مقابلہ پر گیا۔ جنید مقابلہ پر ٹھہر نہ سکا اور جنگل میں جا کر پناہ لے لی۔ یہاں سے راجہ کی فوج مدن پور جا کر کچھ وقت کے لیے ٹھہر گئی اسی جگہ محمد قلی خان بر لاس بیمار ہوکر انتقال کر گیا۔

بادشاہی فوج میں اس کی وفات سے بڑا انتشار پھیل گیا اس لیے لشکر میدنی پور سے پیچھے ہٹ کر مدارن میں آ گیا۔ اس جگہ قبا حان گنگ امرائے لشکر سے ناراض ہوکر کسی جنگل میں چلا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے یہ ساری صورت حال خانخاناں کو لکھ بھیجی۔ خان خاناں نے راجہ کی مدد کے لیے شاہم خاں جلائر اور لشکر خاں بخشی کو جسے عسکر خان اور استر خان بھی کہا جاتا تھا کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ لوگ بردوان میں راجہ سے جا کر ملے۔ راجہ نے اس جگہ تمام امرا کو چھوڑا اور خود قباخاں کے پاس تنہا جا کر اسے منا کر واپس لے آیا، پھر وہاں سے کوچ کر کے مدارن کے راستہ سے جھورہ پہنچا۔ جب لشکر برچین میں پہنچا تو خبر آئی کہ داؤد نے اپنے اہل وعیال کو تو گنگ بنارس میں چھوڑ دیا ہے اور لڑائی کی پوری تیاریاں کر لی ہیں۔ جب خانخاناں کو یہ خبر ملی تو اس نے تیز رفتاری سے کوچ کیا اور راجہ سے جا کر مل گیا۔

پٹھانوں سے خونریز لڑائی

پٹھانوں نے اپنی لشکر گاہ کے اطراف خندق کھود کر اچھی خاصی قلعہ بندی کر لی تھی۔ 20 ذی قعدہ 982ھ/1574ء کو بھتجورہ کے علاقے میں دونوں فوجوں کے درمیان بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ دونوں طرف منگلوسی ہاتھی پر باندھے کھڑے تھے۔ داؤد کے ہاتھی چارہ گھاس کھا کر تروتازہ اور مست تھے۔ اس نے ہاتھیوں کو بادشاہی لشکر پر دوڑا دیا۔ خان خاناں نے اپنے لشکر کو حکم دیا کہ بندوقیں اور توپیں جو گاڑیوں پر رکھی ہوئی تھیں وہ ہاتھیوں کی صف پر چھوڑی

جائیں۔ توپوں کے چلتے ہی ہاتھی گھبراہٹ کے مارے پلٹ پڑے۔ اس موقع پر بندوقوں کی ضرب سے بہت سے پٹھان ہلاک ہوئے۔ داؤد کے مقدمۃ الجیش پر گوجر خان کماں دار تھا۔ اس نے بادشاہی ہراول پر حملہ کردیا۔ ہراول کی کمان خان عالم، خواجہ عبد اللہ، کجنک خواجہ، سید عبد اللہ چوگان بیگی اور میرزا علی عالم شاہی کر رہے تھے۔ گوجر خان کا یہ حملہ اس غضب کا تھا کہ ان امیروں کے قدم اکھڑ گئے اور دشمن نے انھیں دھکیل کر التمش کی فوج تک جس کی سرداری قبا خان کنگ کر رہا تھا، پہنچا دیا۔ ہراول کے کمان دار خان عالم نے جم کر مقابلہ کیا اور لڑتے ہوئے مارا گیا۔ التمش کی فوج منتشر ہوگئی اور اس نے خان خاناں کی جمعیت میں آکر پناہ لی۔ اسی بھگدڑ کی وجہ سے خانخاناں کی جمعیت کا شیرازہ بھی بکھر گیا۔ خان خاناں نے نظم قائم رکھنے کی بڑی کوشش کی، لیکن ایک مرتبہ منتشر ہونے کے بعد اس کی فوج جم نہ سکی۔ عین اسی حالت میں گوجر خان سر پر آپہنچا۔ خان خاناں کے مقابل آکر اس نے پے در پے تلوار کے کئی وار کیے۔ خان خاناں نے بڑے حوصلہ سے کام لیا اور گوجر خان کے ہر حملہ کو اس نے اپنے تازیانہ پر روک لیا۔ اس نازک موقع پر ہاتھیوں سے گھبرا کر خانخاناں کا گھوڑا بھڑک گیا اور سنبھالے نہ سنبھلا۔ مجبور ہوکر خان خانان نے حملہ سے باگ پھیر لی اور بھاگی ہوئی فوج کو جمع کرنے کے بہانے سے تین چار کوس تک پیچھے ہوتا چلا گیا۔ پٹھانوں نے کافی دور تک اس کا پیچھا کیا۔ اس موقع پر قبا خاں کنگ اور دوسرے چند سرداروں نے پٹھانوں کے لشکر پر دونوں جانب سے تیر چلانے شروع کیے اور تیر بازی سے اس کے لشکر کو چھلنی چھلنی کردیا۔ یہ مقابلہ اتنا سخت اور بھاری تھا کہ دونوں فریق لڑتے ہوئے تھک گئے۔ دونوں میں مزید نقل وحرکت کی طاقت نہ رہی۔ حسن اتفاق سے اسی وقت ایک تیر گوجر خاں کو ایسا لگا کہ وہ اسی وقت گھوڑے سے گر کر مر گیا۔ اس کے گرتے ہی پٹھان میدان چھوڑ کر بدحواسی کے ساتھ بھاگ نکلے جن میں بہت سے مارے گئے۔ اسی وقت خان اعظم کا علم دار اس کا جھنڈا لے کر جیسے ہی خان خاناں کے پاس پہنچا اسے گوجر خان کے قتل کی خبر بھی مل گئی۔ اس اطلاع پر خان خاناں نے اپنی باگیں پھیر لیں اور چند ساتھیوں کے ساتھ خیمہ میں لوٹ کر آگیا۔ ان لوگوں نے آتے ہی پٹھانوں پر تیر

چلانے شروع کر دیے۔

راجہ ٹوڈرمل اور لشکر خاں شاہی میمنہ پر متعین تھے۔ انھوں نے بھی پیش قدمی سے دشمن کے منتشرہ پر جس کا سردار اسماعیل خاں آبدار تھااور اسے داؤد نے خان خاناں کا خطاب دے رکھا تھا، حملہ کردیا۔ اسی طرح شاہم خاں جلائر اور پائندہ محمد خان مغل اور دوسرے سرداروں نے جو شاہی میسرہ پر تھے پٹھانوں کے میمنہ پر جس کا سردار حاکم اڑیسہ خان جہاں تھا، حملہ کردیا۔ دونوں پہلوؤں سے غنیم کی فوج کو دباتے ہوئے یہ لوگ داؤد کی خاص جمعیت تک جا پہنچے اور اس کے نامی گرامی ہاتھیوں پر تیروں کی بوچھار کر کے انھیں منتشر کردیا۔ اس حملہ سے داؤد کی جمعیت میں افراتفری مچ گئی۔ اس وقت خان خاناں فتح کے پھریرے لہراتا ہوا دور سے نمودار ہوا۔ گوجر خان کے مارے جانے کی خبر داؤد کو ملی۔ اس غیر متوقع صورت حال سے داؤد کے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور وہ میدان چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اس کے وہ سارے ہاتھی برباد ہوگئے۔

صلح کی بات چیت

فتح کے بعد خانخاناں نے اسی جگہ پر زخمیوں کی مرہم پٹی اور علاج کے لیے کچھ دن تک قیام کیا۔ اسے بھی کافی زخم آئے تھے، جن کا علاج کیا گیا۔ لشکر خان بری طرح زخمی ہو چکا تھا اس لیے وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس اثنا میں داؤد بھاگ کر کٹک بنارس جا پہنچا تھا۔ خانخاناں نے اسی منزل سے راجہ کو شاہم خان جلائر، قیاخاں، سید عبد اللہ، محمد قلی خان توقبائی اور سعید خان بدخشی کے ہمراہ اس کے تعاقب میں روانہ کیا اور طے پایا کہ وہ خود بھی زخموں کے ٹھیک ہوجانے کے بعد ان کے ساتھ آکر شامل ہوجائے گا۔ یہ فوج وہاں سے رخصت ہوکر کل کل گھاٹی پہنچ گئی اور ادھر داؤد اور تمام پٹھانوں نے کٹک بنارس کے قلعہ کو مقابلہ کے لیے مستحکم کرلیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگے۔ غنیم کی تیاریوں کا حال سن کر خان خاناں بھی کٹک بنارس آپہنچا اور دریائے مہندری کے کنارے کیمپ لگا دیا۔ خان خانان کے پہنچے کے بعد صلح کی کہا سنی شروع ہوئی اور بڑی ردو کد کے بعد امرا کے مشورے سے طے پایا کہ

داؤد خانخاناں سے آکر ملے اور حلف اٹھا کر مصالحت کا عہد کرلے۔ بنگال کا ایک وسیع علاقہ اسے عطا کردیا جائے گا۔

داؤد اور خان خانان کی ملاقات

مقررہ دن شاہانہ انداز میں مجلس کو سجایا گیا۔ تمام امرا بہ لحاظ مراتب اپنے اپنے مقام پر بیٹھے۔ سراپردہ اور بارگاہ کے سامنے فوج کے دستے داؤد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوئے تھے، بنگالہ کا حکمران نہایت شان وشوکت کے ساتھ افغان سرداروں کے ساتھ بنارس کے قلعہ سے باہر نکلا اور خان خاناں انتہائی تواضع کے ساتھ اس کی تعظیم بجالایا اور ادب کے ساتھ پیشوائی کرتے ہوئے اسے سراپردہ میں لے کر آیا۔ ملاقات کے وقت داؤد نے اپنی تلوار میان سے باہر نکال کر خان خ نان کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ "جب سے تم جیسا عزیز دوست زخمی ہوا ہے میں ایسی سپاہ گری سے ہی بیزار ہوگیا ہوں"۔ خان خانان نے وہ تلوار لے کر ایک محافظ کے سپرد کردی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے قریب مسند پر بٹھالیا۔ باپ کی طرح مشفقانہ انداز میں مزاج پرسی کی۔ اس موقع پر طرح طرح کے کھانے،حلوے اورشربت تیار کیے گئے تھے۔ خان خانان نے اپنے معزز مہمان کو نہایت اصرار کرکے کھانا کھلایا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اہم امور پر گفتگو شروع ہوئی اور عہد نامہ کی تکمیل کی گئی۔اس سے فارغ ہونے پر خان خانان نے ایک تلوار اپنے خاص اسلحہ خانہ سے منگائی۔اس تلوار کا دستہ اور بندھن قیمتی جواہرات سے مرصع تھا۔ یہ تلوار اس نے داؤد کی کمر سے باندھتے ہوئے کہا کہ اب جب کہ آپ بادشاہ کے دولت خواہ بن چکے ہیں، یہ تلوار شہنشاہ کی طرف سے باندھ لیجئے، بنگال کے علاقہ کے متعلق میں بادشاہ سے درخواست کرونگا، حسب منشاء اس سلسلہ میں فرمان پہنچ جائے گا۔ غرض طرح طرح کے تکلّفات کے بعد قیمتی تحائف دے کر خان خانان نے داؤد کو رخصت کیا اور یہ شگفتہ اور بارونق محفل برخاست ہوگئی۔ خان خاناں اس مہم سے 10 صفر 983ھ/1575ء کو ٹانڈہ کے صدر مقام پر لوٹ آیا اور وہاں سے اس نے سارے حالات کے متعلق عریضہ لکھ کر

بادشاہ کے پاس روانہ کیا۔ بادشاہ نے اس کی تجویز کے مطابق فرمان، بھاری خلعتیں، جڑاؤ تلوار اور مع ساز و سامان اور ایک عربی گھوڑا روانہ کردیا۔ بنگالہ کے معاملات خان خانان کو عطا کر کے اسے وہاں کا مطلق العنان حاکم بنادیا۔ 982ھ/1574ء میں بتاریخ 16 جمادی الثانی میاں شیخ داؤد جھنی وال نے وصال فرمایا۔ان کی تاریخ وفات ''یا شیخ داؤد ولی'' ہے۔

جب بادشاہ اجمیر سے لوٹ کرآئے تو ماہ ذی قعدہ 982ھ/1574ء میں فتح پور کے پاس ایک عبادت خانہ کی بنیاد رکھی جو چار ایوانوں پر مشتمل تھا۔

شیخ ابوالفضل کا دربار میں داخل ہونا

انہی دنوں شیخ ابوالفضل ولد شیخ مبارک ناگوری جسے علامی بھی لکھا جاتا ہے اور اسی نے بے دینی کا یہ سارا ہنگامہ برپا کیا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ باریابی کے وقت اس نے ''آیۃ الکرسی'' کی تفسیر پیش کی، جس میں بہت سے قرآنی رموز و نکات درج تھے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ تفسیر دراصل اس کے والد کی لکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اس تفسیر کو پسندفرمایا، اس کی تاریخ ''تفسیر اکبری'' نکالی گئی۔ بادشاہ نے مغرور اور متکبر ملاؤں کے خاتمہ کی توقع مجھ[44] سے لگا رکھی تھی۔ اس کام کے لیے اب انھیں موزوں آدمی مل گیا۔ ابوالفضل کو پہلے ہی سے علما کے ساتھ بڑی نا اتفاقی تھی جس کا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں اہل بدعت کی گرفتاریاں ہو رہی تھیں اور میر حبش جیسے لوگ قتل کیے گئے تھے۔شیخ عبد النبی مخدوم الملک اور دوسرے تمام علماء نے متفقہ طور پر عرض کیا تھا کہ شیخ مبارک مہدی بھی بدعتی اور سخت گمراہ ہے۔ان لوگوں نے کسی نہ کسی طرح اجازت لے کر شیخ کو حاضر کرنے کے لیے حاکم کو روانہ کردیا تھا۔شیخ مبارک اپنے بیٹوں کو لے کر کہیں چھپ گیا اور لوگوں نے اس کی مسجد کے منبر کو توڑ ڈالا۔شیخ سلیم کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ اسی لیے شیخ مبارک نے ان کے ذریعہ سفارش کرانی چاہی۔شیخ سلیم نے اپنے ایک مرید کے ہاتھ کچھ رقم سفر کے خرچ کے لیے اس کے پاس بھیج دی اور کہلوایا تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم یہاں سے

بھاگ کر گجرات چلے جاؤ۔ جب شیخ مبارک کو ان کی طرف سے نا امیدی ہوئی تو انھوں نے میرزا عزیز کوکہ کو وسیلہ بنایا۔ اس نے بادشاہ سے شیخ مبارک کی علمیت اور درویشی کی بڑی تعریف کی اور اس کے لڑکوں کے علم و فضیلت کو بھی سراہا اور کہا کہ اس کے پاس سرکاری انعام کی زمین نہیں ہے اور وہ ایک بھروسہ کرنے والا شخص ہے۔ ایسے درویش صفت آدمی کو آزار پہنچانا کچھ مناسب نہیں۔ کوکہ کی سفارش پر بادشاہ نے ان باپ بیٹوں کو سزا دینے کا خیال ترک کر دیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ان کے دن ایسے پھرے کہ شیخ ابوالفضل نے جلد ہی اپنی خدمات زمانہ سازی، بددیانتی، مزاج شناسی اور خوشامد کے ذریعہ بادشاہ کا بہت زیادہ تقرب حاصل کرلیا اور جیسے ہی موقع ملا اس نے بادشاہ کی پشت پناہی سے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے اس کے خاندان کے خلاف چغلیاں کھائی تھیں اور ایذا رسانی کی ناکام کوشش کی تھی طرح طرح سے رسوا کیا اور مدتوں پہلے گزری ہوئی باتوں کا ایک ایک کر کے انتقام لیا۔ اس کے انتقام کی لپیٹ میں صرف ان کے مخالف ہی نہ آئے بلکہ وہ عام و خاص ہر ایک کی ایذا رسانی پر اتر آیا، چنانچہ اس کی وجہ سے کتنے ہی مشائخین، صالحین اور صاحب احتیاج اشخاص کی معاش اور وظیفے بند ہوگئے ان لوگوں کو وہ طرح طرح سے ایذائیں دیتا تھا اور زبان حال وقال سے مزے لے لے کر کہا کرتا تھا:

یا رب بہ جہانیان دلیلی بفرست　　نمرودان راچو پشہ فیلی بفرست
فرعون و شان دست برادر دستند　　موسیٰ و عصا درود نیلی بفرست

ان کی ان کارگزاریوں سے جب لوگ ہائے ہائے کرنے لگے تو وہ ان پر طنز کرتے ہوئے اکثر یہ رباعی پڑھا کرتا تھا:

آتش بدودست خویش درخرمن خویش
چون خودزدہ ام چہ نالم از دشمن خویش
کس دشمن من نیست منم دشمن خویش
ای وائی من دوست من و دامن خویش

بحث و مباحثہ کے وقت اگر کوئی کسی مجتہد کا قول پیش کرتا تو وہ نہایت جسارت سے کہا کرتا

تھا فلاں حلوائی، فلاں موچی اور فلاں چرم فروش کا قول ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔ غرض علماء کا انکار اور ان کی توہین اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

بادشاہی عبادت خانہ

983 ھ/1575 ء میں تین عبادت خانوں کی تعمیر مکمل ہوئی۔ ان کی تعمیر کا پس منظر یہ تھا کہ جب گزشتہ چند سالوں میں اکبر کو بڑی بڑی فتوحات نصیب ہوئیں اور روز بہ روز مملکت کی حدود میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ملک کا سارا نظم ونسق حسب منشا قائم ہوگیا اور ملک میں کوئی مخالف اور دشمن نہ رہا تو اس کا رجحان زیادہ تر عبادت اور ریاضت کی طرف مائل ہوا، چنانچہ اجمیر کی درگاہ معینیہ کے مجاوروں اور درویشوں کے ساتھ صحبتیں رہنے لگیں اور اس کے زیادہ تر اوقات اللہ و رسولؐ کے تذکرے میں گزرنے لگے۔ ان محفلوں میں وہ اکثر تصوف کی باتوں، فقہی مسئلوں اور علمی مباحثوں میں مصروف نظر آنے لگا۔ راتیں بھی اللہ کی عبادت میں گزرنے لگیں۔ کسی نے ''یاہو'' اور ''یا ہادی'' کا وظیفہ بتادیا تھا۔ وہ عموماً راتوں میں یہ وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ان دنوں اس کے دل پر اللہ کی عظمت کا بڑا اثر تھا چنانچہ ان نعمتوں کے شکرانے میں جو خدا تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا کی تھیں تقریباً ہر روز ایک پرانے حجرہ میں جو آبادی سے دور شاہی محلات کے قریب واقع تھا، پتھر کے فرش پر مراقبہ میں بیٹھا رہتا تھا۔ حاکم بنگالہ سلیمان کرانی کے متعلق اس نے سن رکھا تھا کہ وہ پچھلی رات کو اٹھ کر 150 مشائخین اور علماء کے ساتھ تہجد کی نماز با جماعت ادا کرتا تھا اور فجر کی نماز تک ان عالموں کی مجلس میں تفسیر و تذکیر میں مصروف رہتا تھا، فجر پڑھنے کے بعد ملکی معاملات، فوج اور لشکر کے حساب کتاب میں وقت گزارتا تھا۔ اس کے اس معمول میں کبھی فرق نہ آتا تھا، اکبر نے بھی اسی طرح اپنے اوقات تقسیم کر رکھے تھے۔ ان دنوں مرزا سلیمان کے آنے کی بھی خبر تھی۔ مرزا سلیمان صوفی منش، صاحب حال بادشاہ تھا۔ صاحب بیعت بھی تھا، لوگ اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت کیا کرتے تھے، لہٰذا اکبر نے کچھ تو شوق عبادت میں اور کچھ آنے والے اس معزز مہمان کی خاطر شیخ عبد اللہ نیازی کے حجرہ پر ایک بڑی

عبادت گاہ تعمیر کرائی۔ عبد اللہ نیازی کے حالات ہم بیان کر آئے ہیں کہ وہ پہلے شیخ الاسلام چشتی کے مرید تھے بعد میں مہدوی سلسلہ سے وابستہ ہوگئے تھے۔ اس عبادت گاہ کے چاروں طرف ایک وسیع ایوان اور انوپ تلاؤ نامی حوض تیار کرایا گیا اور اس حجرہ کو ''عبادت خانہ'' نام دیا گیا جو بعد میں ''عبادت خانہ'' ہوگیا۔ ملا شیری نے اسی کے بارے میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر ہے:

درین ایام دیدم جمع با موال قارونی
عبادت ہای فرعونی عمارت ہای شدادی

عبادت خانہ کی محفلیں

اکبر کا معمول تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد شیخ الاسلام کی جدید خانقاہ سے اس عبادت خانہ میں آکر مجلس منعقد کرتا تھا اس محفل میں نامی گرامی علماء، مشائخین اور چند خاص مصاحب اور ندیم ہی شریک ہوا کرتے تھے۔ دوسرے کو آنے کی اجازت نہ تھی۔ اس محفل میں عموماً علمی مباحث اور مذاکرے ہوا کرتے تھے۔

اسی محفل میں ایک دن جلال خان قورچی نے جو میر المحسن اور کرم فرما تھا، اثنائے گفتگو میں کہا کہ میں شیخ ضیاء اللہ ولد شیخ محمد غوث سے ملنے آگرہ گیا تھا، ان کا مفلسی کے مارے ایسا برا حال ہے کہ ایک دن انھوں نے چند سیر چنے منگائے جس میں سے کچھ تو خود کھائے کچھ مجھے دے دیے اور ایک حصہ اپنے گھر والوں کے لیے بھیج دیا۔ یہ سن کر اکبر بہت متاثر ہوا اور شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ سے بلوا کر اسی عبادت خانہ میں ان کے قیام کا انتظام کرا دیا۔

مذکورہ عبادت خانہ میں ہر جمعہ کی رات کو بھی محفل منعقد ہوتی تھی جس میں سادات، مشائخ، علماء اور امراء سبھی حاضر رہتے تھے۔ بادشاہ کے قریب نشستیں لینے کے لیے اکثر تقدیم و تاخیر کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور لوگ آپس میں بڑی بد تہذیبی کا مظاہرہ کرنے لگتے تھے۔ اس لیے اکبر نے باقاعدہ نشستوں کا تعین کر دیا کہ امرا تو مشرقی جانب بیٹھیں،

سادات مغربی جانب، علما کی نشست جنوبی حصے میں اور مشائخین شمال میں بیٹھا کریں۔ اکبر باری باری ہر ایک کی نشست گاہ میں جاکر ان کے مباحثوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ اس موقع پر طرح طرح کی خوشبوؤں سے پوری مجلس مہک اٹھتی تھی اور بادشاہ مستحق لوگوں کی جو مقربان دربار کے وسیلہ سے وہاں پہنچ جاتے تھے، حسب مدارج مالی امداد بھی کرتا تھا۔ گجرات کی فتح کے موقع پر اعتماد خان گجراتی کی جمع کی ہوئی بہت ساری نفیس اور قیمتی کتابیں غنیمت میں آئی تھیں۔ ان کتابوں کو اکبر نے خود اپنے ہاتھ سے اس محفل میں آنے والے علماء میں تقسیم کیا۔ مجھے[45] بادشاہ نے جو کتابیں دی تھیں ان میں ایک ''انوار المشکوٰۃ'' تھی، جس میں ''مشکوٰۃ الانوار'' کے عنوان سے ایک فصل کا اضافہ بھی شامل تھا جو کتابیں بچ گئیں وہ امراء کو دوسرے تحفوں اور اشیاء کے عوض عطا کیں۔ مال غنیمت کو اکبر ''ارباس''یعنی زوال دشمن کہا کرتا تھا۔

ایک رات اسی محفل میں علما کی مجلس میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا اور وہ چیخ چیخ کر بحث کرنے لگے۔ ان کے شور وغل سے بادشاہ نے برہم ہوکر مجھ[46] سے کہا ''اس کے بعد جو شخص بھی ناشائستہ بات کرے اس کی اطلاع مجھے دینا، میں اس کو مجلس سے اٹھا دونگا''۔ میں نے اس وقت چپکے سے آصف خاں کو کہا'' اس طرح تو تقریباً سبھی کو اٹھوانا پڑے گا''۔ اکبر نے مجھے یہ کہتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس لیے پوچھا کیا کہہ رہے ہو؟ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ دھرا دیا۔ وہ سن کر بہت خوش ہوا اور اپنے مصاحبوں کو بھی یہ بات بتائی۔

مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری

اس محفل میں مخدوم الملک مولانا عبداللہ سلطان پوری کو چھیڑنے اور تنگ کرنے کے لیے اکثر بلایا جاتا تھا۔ اس بزرگ عالم کو شیخ ابوالفضل جو اب ایک نئے دین کا مجتہد بنا بیٹھا ہے اور اس جیسے دوسرے نئے نئے باریافتہ لوگ بحث و مباحثہ میں الجھا کر کھلونا بنالیتے اور اس کی ہر بات کو غلط ملط کر دیا کرتے تھے۔ ان مباحثوں کے دوران اکبر کا اشارہ پاکر بعض مصاحب اور امیر بھی الٹی سیدھی فرضی باتیں بنا بنا کر اس پر فقرے کستے تھے اس کا

بڑھاپا ان سب کے ہاتھوں میں اچھا خاصہ کھیل بن گیا تھا۔ ایک مرتبہ اسی شام کی محفل میں خان جہاں نے کہا مخدوم الملک نے فتویٰ دیا ہے کہ ان دنوں حج پر جانا فرض نہیں، بلکہ ایک طرح سے گناہ ہے۔ جب لوگوں نے وجہ دریافت کی تو اس نے یہ دلیل دی کہ حج کے لیے خشکی کا راستہ تو گجرات اور عراق کا ہے جو قزلباشوں کی لوٹ مار کی زد میں ہے اور اگر سمندر کے راستہ جائیں تو فرنگیوں سے پروانہ راہداری لینے کی ذلت اٹھانی پڑتی ہے ان کے پروانہ راہداری پر حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کی تصویر چھپی رہتی ہے جو بت پرستی کی ایک شکل ہے، اس لیے یہ دونوں حج کے راستے بند ہو گئے ہیں۔

اس کے متعلق خان زمان نے ایک بات یہ بھی بتائی کہ وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے یہ بہانہ کرتا ہے کہ ہر سال کے اختتام پر سارا مال متاع اپنی بیوی کے نام کر دیتا ہے اور دوسرے سال کے ختم ہونے سے پہلے اپنے نام پر واپس لے لیتا ہے۔ غرض خان زمان نے مخدوم الملک کی کنجوسی، رذالت، خباثت، مکاری اور دنیاداری کے بہت سے قصے سنائے اور اس نے علما و مشائخین، خاص طور سے پنجاب کے مستحق لوگوں پر جو زیادتیاں کی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے بتائیں۔ بس پھر کیا تھا بہت سے لوگوں کی زبانیں کھل گئیں اور لوگ اس کی اہانت اور مذمت کے لیے ایک سے ایک بڑھ کر قصے سنانے لگے آخر میں یہ طے پایا کہ اسے حج کے لیے زبردستی مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے۔ جب بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ ''تم پر حج فرض ہے تو اس نے جواب دیا نہیں''۔

شیخ عبدالنبی

ان دنوں مخدوم الملک کا ستارہ زوال میں آ چکا تھا اور دربار میں شیخ عبدالنبی کا سورج چمکنے لگا تھا۔ چنانچہ بادشاہ تعظیم و احترام کی وجہ سے کبھی کبھی حدیث سننے کے لیے خود اُن کے گھر پر چلا جاتا تھا۔ ایک دو مرتبہ تو اکبر نے اُن کی جوتیاں بھی سیدھی کیں۔ بڑے شہزادے کو بھی تعظیم کے لیے انہی کے حجرہ میں بٹھایا گیا تھا۔ وہ عموماً مولانا عبدالرحمٰن جامی کی ''چہل حدیث'' کا درس دیا کرتے تھے۔

شیخ عبد النبی کو محدثی، حافظی اور امامی کا بڑا دعویٰ تھا، لیکن علمیت کا یہ حال تھا کہ ''الحزسوءِ ظن'' کی حدیث جب بھی سناتا تو ہمیشہ ''الحرم'' کو ''الحزم'' ح کے بجائے ''خ'' اور ''ز'' کے بجائے ''ر'' پڑھا کرتا تھا۔ مدتوں تک اس کو اپنی اس غلطی کا احساس نہ ہوا۔ جس وقت بادشاہ اس سے برداشتہ خاطر ہوگئے تھے اور ملاؤں کا گروہ دربار سے نکل گیا تھا، مرزا عزیز کوکہ نے بادشاہ کو بتایا تھا کہ علم حدیث میں اس کی یہ قابلیت ہے جس پر وہ ناز کیا کرتا ہے، آپ نے اس کو سر چڑھا رکھا تھا۔ اس لیے اس کا مزاج عرش پر جا پہنچا۔

شیخ عبدالنبی کا غرور وتکبر

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ جب تک کہ ممالک محروسہ کے تمام ائمہ اپنے وظائف اوقات اور معاش کے فرامین پر صدر (شیخ عبد النبی) کی مہر نہ لگوائیں'' کروڑی ان کی رقمیں اجرا نہ کریں''۔ اس فرمان کی وجہ سے ہندوستان کے مشرقی کنارے سے لے کر بھکّر تک کے اہل غرض شیخ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ان میں سے جن کی سفارش کسی امیر اور مقرب نے کردی تو اس کا کام حسب منشا تکمیل پا گیا اور جن کو کسی کا وسیلہ نہیں ملا وہ بچارے سید عبد الرسول اور شیخ کے دوسرے کارندوں کے پاس دھکے کھاتے رہے۔ نہ صرف ان کو بلکہ شیخ کے فراشوں، دربانوں، سائیسوں اور حلال خوروں تک کو بھاری بھاری رشوتیں دے کر ان غریبوں نے اپنا کام بنایا اور جو یہ بھی نہ کر سکے وہ دربانوں کے ڈنڈے کھاتے رہے۔ بہت سے بدنصیب اس ہجوم میں گرمی کی تاب نہ لا کر وہیں جاں بحق ہوگئے۔ اس کی بادشاہ کو بھی خبر ہو چکی تھی۔ لیکن وہ اس صدر عالی قدر کی تعظیم کے منافی کچھ سوچ نہیں سکتا تھا، اس لیے بادشاہ نے اس کے منہ پر کوئی بات نہ کہی۔

جس وقت وہ اپنی مسند جاہ وجلال پر نشین ہوتا تھا اور عالی مرتبہ امیر اہل علم کو ساتھ لے کر سفارش کے لیے اس کے پاس جاتے تھے تو اس کے تیور بس دیکھنے کے لائق ہوتے تھے۔ تعظیم وتکریم کا کیا سوال وہ ہر ایک کو بُرا بھلا کہنے اور ڈانٹنے ڈپٹنے پر اتر آتا تھا اور جب بچارا بڑی عاجزی اور خوشامد کرتا تو ان عالموں کے لیے جو ہدایہ اور دوسری منتہی

کتابیں پڑھا سکتے تھے سو بیگھے کے لگ بھگ کی آراضی منظور کر کے باقی زمین کو جس پر وہ ایک مدت سے قابض تھے قلمزد کر دیتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں جاہلوں، کمینوں بلکہ غیر مسلمان کو اچھی اچھی زمینیں خود عطا کر دیتا تھا۔ اس طرح اسکے ہاتھوں علم کی بھی اور عالموں کی بھی قدر و قیمت روز بروز گھٹتی چلی گئی۔

اپنے اجلاس پر دو پہر کے بعد جب وہ نہایت غرور و تکبر سے کرسی پر بیٹھا ہوا وضو بنا رہا تھا تو اس کے استعمال کیے ہوئے پانی کے قطرے بڑے بڑے امیروں اور خاص خاص مصاحبوں کے سروں اور کپڑوں پر گر رہے تھے اور اس کو اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ وہ لوگ بھی اہل علم اور فقراء کا کام نکالنے کے لیے سب کچھ برداشت کر رہے تھے اور خوشامد، چاپلوسی اور اس کی دلجوئی کی خاطر طرح طرح کی ذلتیں اٹھا رہے تھے۔ پورے شاہی عہد میں کسی صدر الصدور کا یہ اثر اور دبدبہ نہیں رہا جتنا کہ شیخ عبد النبی کو حاصل ہو گیا تھا:

روستائی اگر شود قاضی حکمہای کند کہ بکشندش

منصب امامت پر تقرر

انہی دنوں بادشاہ نے مجھے(46) امامت کی خدمت سپرد کی اور کچھ خرچ دے کر فرمایا بیستی عہدہ کے مطابق تم بھی بیس گھوڑوں کو داغ کرالو۔ اسی زمانہ میں شیخ ابو الفضل بھی دربار میں نیا نیا پہنچا تھا اور جیسا کے شبلیؒ نے جنیدؒ کے متعلق کہا تھا کہ ''ہم دونوں ایک ہی تنور سے نکلے ہیں'' میرا اور ابو الفضل کا معاملہ یکساں ہی تھا، لیکن وہ نہایت ہوشیار اور زمانہ ساز آدمی تھا۔ اس کو بھی جب بادشاہ نے بیستی کے عہدہ کے لیے گھوڑے داغ کرانے کے متعلق فرمایا تو اس نے فوراً ہی داغ اور محلہ، کرا کے اپنی ملازمت مضبوط کر لی اور ترقی کرتے کرتے دو ہزار کے عہدہ اور وزارت کے منصب تک پہنچ گیا۔ اس کے برعکس میں نے ناتجربہ کاری اور سادہ لوحی کی وجہ سے ملازمت کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا، اس وقت مجھے مزاحیہ شعر یاد آ گیا تھا جو کسی سید نے اپنے بارے میں کہا تھا:

مرا داخلی سازی و ہستی

میناد مادر بایں نیستی

میں بس اس خام خیالی میں رہا کہ بجائے ملازمت کے مجھے مدد معاش کے لیے اگر بادشاہ کوئی آراضی وغیرہ عنایت فرمادیں تو ایک گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر آزادی کے ساتھ علمی خدمات میں مصروف رہوں گا کیونکہ قناعت اور توکل سے بڑھ کر دنیا میں کوئی اور پونجی نہیں ہوسکتی:

جاہ دنیا مطلب دولت فانی بگذار

جاہ دین بس بود و دولت اسلام ترا

لیکن میری بدنصیبی دیکھو، مجھے وہ بھی میسر نہ ہوا، آخر ماہ شوال 983ھ/ 1575ء میں میں نے دربار سے رخصت کی درخواست دے دی۔ بادشاہ نے اسے منظور نہ فرمایا اور مجھے ایک گھوڑا اور ہزار بیگھہ آراضی عطافرمائی جو اس زمانہ میں بیس گھوڑوں کے مقررہ رتبے کے لیے کافی ہوجاتی تھی۔ اس سلسلہ میں جو فرمان لکھا گیا تھا اس میں یہ عطیہ مدد معاش کے ضمن میں رکھا گیا تھا میں نے بہت کچھ عرض کیا کہ اس مختصر آراضی پر ہمیشہ خدمت سے وابستہ رہنا میرے لیے مشکل ہوگا، لیکن کوئی توجہ نہ کی گئی بادشاہ نے صرف یہ فرمایا، لشکروں میں قیام کے موقع پر امداد اور انعام تمھیں دیا جاتا رہے گا اس مختصر معاش پر بھی شیخ عبدالنبی نے کہا ہم نے تمہارے گروہ کے آدمیوں میں کسی کو اتنی امداد نہیں دی۔ جس امداد اور انعام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ اس وقت تک اس وعدے کو 22 سال ہو چکے ہیں بجز ایک دوبار کے پورا نہیں کیا گیا۔ وہ وعدہ تو بس ایک سراب سے زیادہ نہ تھا جس کے عوض خواہ مخواہ ان بیہودہ بندشوں اورلاحاصل خدمتوں میں پھنس کر رہ گیا۔ اب خدا ہی چاہے تو ان سے نجات ملے:

یا وفا یا خبر وصال تو یا مرگ رقیب

بازی چرخ ازین یک دو سہ کاری بکند

بہرحال جس طرح گزری اور گزر رہی ہے اس پر خدا کا شکر ہی ادا کرنا چاہئے:

به همه حال شکر باید کرد
که مبادا ازین بتر گردد

جن فضول مشغلوں میں یہ عمر کٹی ان کے حسب حال فضولی بغدادی کا یہ قطعہ ہے جو اس نے حیرتی سمرقندی پر شاہ طہماسپ کے التفات وتوجہ کے بارے میں کہا تھا:

من زخاک عرب و حیرتی از ملک عجم — ہردو گشتیم با ظہار سخن کام طلب
یافتم از دو کرم پیشہ مراد دل خویش — اوز شاہ عجم ومن نظر از شاہ عرب

شادی کا مسئلہ

اس زمانہ میں اکبر نے علما سے یہ مسئلہ پوچھا تھا کہ کتنی آزاد عورتوں کا نکاح میں رکھنا درست ہے۔ علماء نے کہا چار سے زائد آزاد عورتوں کو بہ یک وقت نکاح میں رکھنا منع ہے۔ اکبر نے کہا ''ہم تو جوانی میں اس کے پابند نہیں رہے جتنی عورتوں کو چاہتے تھے نکاح میں لے لیتے تھے خواہ وآزاد ہوں یا غلام، اب اس کی تلافی کیسے ہوسکتی ہے؟'' اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے مختلف باتیں بتائیں۔ اکبر نے پھر کہا'' ہم نے شیخ عبد النبی سے سنا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک تو نو عورتوں سے بھی نکاح کیا جاسکتا ہے'' علما نے کہا ''ہاں ایک مجتہد ابن لیلیٰ کا یہ رجحان ہے۔ بعض نے تو آیت پاک۔ ''**فانکحوا ما طالب لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و ربع**'' کے ظاہری مفہوم پر تو اٹھارہ عورتوں تک کو جائز ٹھہرا دیا ہے۔ لیکن یہ ساری روایتیں مرجوح ہیں ان پر عمل درست نہیں ہوگا بادشاہ نے شیخ عبدالنبی سے بھی دریافت کرایا، اس نے جواب دیا ''میں نے جو کچھ کہا تھا اس سے ان اختلافات کا ظاہر کرنا مقصود تھا، اس کے جواز کا میں نے فتویٰ نہیں دیا تھا''۔ عبد النبی کا یہ جواب بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے کہا ''اس طرح تو شیخ نے ہمارے ساتھ منافقت برتی کہ اس وقت تو کچھ کہا تھا اور اب وہ کچھ اور کہہ رہا ہے۔ بس اسی وقت سے شیخ عبدالنبی کی طرف سے اکبر کا دل کھٹک گیا۔

بادشاہ کے اصرار کو دیکھ کر علماء نے بڑے ردّ و بدل اور اختلافی روایتوں کو جمع کر کے آخر یہ فتویٰ دے دیا کہ ''متعہ'' کے طریقے پر جتنی عورتیں چاہیں نکاح میں رکھنا حلال ہے۔ یہ امام مالک کے مسلک میں جائز ہے۔شیعہ تو اس لڑکے کو جو متعہ میں پیدا ہوا ہو دوسرے بچوں سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں، حالانکہ اہل سنت کا یہ رویہ نہیں ہے۔غرض اس معاملہ میں بڑی بحثیں اٹھیں، ان کا خلاصہ ''نجات الرشید'' میں بیان کیا گیا ہے۔نقیب خان نے امام مالک کی ''مؤطا'' دکھائی کہ اس میں تو ایک حدیث سے صراحتاً متعہ کی ممانعت نکلتی ہے۔

ایک رات ''انوپ تلاؤ'' کے حجرہ میں بادشاہ کے پاس قاضی یعقوب، شیخ ابو الفضل، حاجی ابراہیم اور ایک دو اور عالم بیٹھے ہوئے تھے، اس وقت شیخ ابو الفضل نے علما کی مخالفت کرتے ہوئے ان روایتوں کو جو اس کے والد نے جمع کر کے دی تھیں بیان کیا۔ بادشاہ نے مجھے بھی وہاں بلا کر پوچھا، تم کیا کہتے ہو؟ میں نے عرض کیا'' ان تمام مختلف روایتوں اور طرح طرح کے مسلکوں کا جھگڑا بس ایک بات پر ختم ہو جاتا ہے۔ متعہ امام مالک اور شیعہ علماء کے نزدیک باتفاق مباح ہے اور امام شافعی اور امام اعظمؒ کے نزدیک حرام ہے اور جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کردے تو اسی وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی بلا اتفاق حلال ہو جاتا ہے بس یہی ایک کانٹے کی بات ہے، اس کے علاوہ قیل و قال اور جنگ و جدال کے سوا کچھ نہیں''۔ بادشاہ کو میری یہ بات بہت پسند آئی۔ قاضی یعقوب نے اس وقت مجھ سے بحث کی۔ میں نے اس سے جواب دیا کہ ''جو مسئلہ مختلف فیہ ہو وہ قاضی کے حکم کے بعد متفقہ ہو جاتا ہے''۔ اپنے اس دعویٰ پر امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے مسئلہ کو اور دوسری مثالوں کو میں نے بطور دلیل پیش کیا، نیز میں نے شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی کا قصہ بھی بیان کیا کہ جب وہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں بغداد پہنچے، تو انھوں نے شافعی مذہب کے طریقہ پر سورۂ فاتحہ پڑھی تھی۔ ان کے اس عمل پر علما نے بڑے طعنے دیے تھے لیکن دہلی کے قاضیوں نے نہ صرف اس کے جواز بلکہ مستحسن ہونے تک کا فتویٰ دے دیا تھا۔ جب میں نے یہ باتیں نہایت وضاحت کے ساتھ کیں تو قاضی یعقوب کو قائل ہونا پڑااور اس نے عاجز ہوکر کہا'' میں کیا کہوں متعہ

کا مباح ہونا مبارک ہو"۔ بادشاہ نے فرمایا" اس مسئلہ میں ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں"۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے اپنے مذہب کے موافق متعہ کے جواز کا حکم دے دیا۔ تمام بوڑھے عالموں میں صدر سے لے کر مخدوم الملک اور قاضی وغیرہ تک کے لیے یہ ایک عجیب صورت حال پیدا ہوگئی، اور اسی روز سے ان سب کا زوال شروع ہوگیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد اکبر نے مولانا جلال الدین ملتانی کو جو بہت بڑے عالم تھے ان کی معاش روک دی گئی تھی، آگرہ سے بلا کر سارے ملک کا قاضی بنا دیا اور قاضی یعقوب کو گوڑ (بنگال) کی قضاوت پر بھیج دیا۔ اسی دن اختلافات کا دروازہ کھل گیا، یہاں تک کہ دین میں اجتہاد کی نوبت آگئی۔

جزیہ اور اللہ اکبر

اسی سال شیخ عبد النبی اور مخدوم الملک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ پوری طرح تحقیق کر کے ہندوؤں پر جزیہ[47] لگائیں۔ اس سلسلہ میں سب جگہ فرامین بھی جاری کردیے گئے لیکن جلد ہی یہ حکم اٹھا لیا گیا اسی زمانہ میں بادشاہ نے دریافت کیا کہ اگر ہم اپنے سکہ اور مہر میں "اللہ اکبر" درج کروائیں تو کوئی حرج تو نہیں؟ اکثر نے تو جواب دیا کہ یہ بہت بہتر اور اچھا ہے لیکن حاجی ابراہیم نے مخالفت کی کہ اس سے تو کچھ اور باتوں کا احتمال ہوتا ہے اگر آیت **ولذکر اللہ اکبر** کو نقش کرالیا جائے تو یہ احتمال رفع ہو جائے گا۔ اکبر کو اس کی یہ بات پسند نہ آئی اور کہا" یہ تو قطعی بات ہے کہ بندہ سے اس عاجزی کے باوجود خدائی کا دعویٰ سرزد نہیں ہوسکتا، ہمارا مقصد تو صرف لفظی مناسبت ہے اس بات کو دوسری طرف لے جانے کا آخر کیا مطلب ہے؟"

اسی سال بادشاہ نے مسئلہ متعہ کی تحقیق سے پہلے ہی سید محمد میر عدل کو جس کا بادشاہ بڑا لحاظ کیا کرتے تھے۔ بھکر کی طرف نامزد کردیا تھا۔ ان کو شمشیر خاصہ، گھوڑا اور پوشاک عطا کی گئی۔ ان کا وہاں جانے کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد" میر عدلی" کے اہم

منصب پر ان جیسا کوئی نامور شخص نہیں ہو سکا۔ کہتے ہیں ایک دن حاجی ابراہیم سرہندی نے سرخ اور زعفرانی لباس کے جواز کا فتویٰ دے دیا تھا اور ایک حدیث بھی پیش کی۔ میر عدل مرحوم نے بھرے دربار میں اسے بدبخت اور ملعون کہا اور گالیاں دیتے ہوئے اس کو مارنے کے لیے ڈنڈا اٹھا لیا۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا سکا۔

حکیم ابوالفتح گیلانی اور مُلّا محمد یزدی

اسی سال حکیم ابوالفتح گیلانی اور حکیم ہمایوں جس کا نام بدل کر پہلے ہمایوں قلی پھر حکیم ہمام رکھا گیا تھا اور نورالدین قرارؔی، تینوں بھائی گیلان سے دربار میں حاضر ہوئے۔ بڑے بھائی نے آتے ہی ہاتھ پیر نکالے اور خوشامد اور جی حضوری کر کے وہ بادشاہ کے مزاج پر حاوی ہوگیا۔ دین و مذہب میں اختراعات کر کے بہت جلد اس نے بڑا تقرب حاصل کرلیا۔

کچھ عرصہ بعد ملا محمد یزدی جسے عام طور پر ''یزیدی'' کہا جاتا تھا، ایران سے آیا اور گیلان کے ان بھائیوں کے ساتھ مل کر بادشاہ کو شیعیت کی طرف مائل کرنے لگا، چنانچہ وہ صحابہ پر نیزے کی طرح زبان دراز کرتا تھا اور بادشاہ سے مہمل اور جھوٹے قصے بیان کرتا رہتا تھا۔

بیربر حرام زادہ، شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح تو اس یزیدی سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے بادشاہ کو سرے سے دین ہی سے منحرف کردیا اور وحی، نبوت، معجزہ، کرامت اور شریعت کے مطلق انکار پر لے آئے۔ میں اِن لوگوں کا ساتھ نہیں دے سکا ان بدبختوں کا جو انجام ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔

بے دینی کے یہ سارے اسباب جب جمع ہوگئے تو اکبر نماز، روزہ اور دوسرے مسائل سے منحرف ہوگیا اور ان کا نام اس نے ''تقلیدیات'' رکھ دیا۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ ساری باتیں غیر معقول ہیں۔ پھر ''نقل'' کے بجائے ''عقل'' پر دین کو منحصر سمجھ لیا گیا۔ اسی زمانہ میں فرنگیوں[48] کی آمد و رفت بھی ہونے لگی اور بادشاہ نے ان کے بعض عقلی اعتقادات کو بھی قبول کرلیا:

ہر خیالی کہ عقل شان بندد
چرخ بر عقل اہل آن خندد

شیخ بدر الدین کی عظمت

اسی سال شیخ الاسلام چشتی کے صاحبزادہ شیخ بدرالدین نے جو صاحب سجادہ تھے، شاہی ملازمت سے توبہ کی اور اپنے باپ کی طرح گوشہ نشین ہوکر عبادت و ریاضت، ذکر وفکر اور تلاوت وتلقین کا مشغلہ اختیار کرلیا۔ ایک رات بادشاہ نے ان کو عبادت خانے میں بلایا وہ آئے تو پہلے کی طرح آداب بجا نہ لائے بادشاہ کو بڑا ناگوار گزرا اور اس نے نشست و برخاست کے انداز اور گفتگو سے ان کو بڑی اذیت پہنچائی۔ کچھ تو یہ قصہ اور کچھ اور اسباب ایسے ہوئے کہ وہ تین چار سال بعد ہی غیرت کے مارے بلا اطلاع اجمیر اور وہاں سے گجرات چلے گئے، پھر تنہا ایک کشتی میں بیٹھ کر حج کے لیے روانہ ہوگئے۔ بیت اللہ میں وہ اکثر وصال روزہ رکھا کرتے تھے اور تپتی دھوپ میں ننگے پیر طواف کرتے رہتے تھے اسی حال میں وہ اپنے رب سے جاملے:

کمال از کعبہ رفتی بر درِ یار
ہزاران آفرین مردانہ رفتی

چوتھے وید کا ترجمہ

اسی سال شیخ بھاون جو دکن کا ایک عقلمند برہمن تھا دربار میں پہنچا اور اپنی مرضی سے مسلمان ہوکر بادشاہ کے مصاحبوں میں شامل ہوگیا۔بادشاہ نے حکم دیا کہ''بیداتھربن'' کا جو ہندوؤں کا چوتھا مشہور وید ہے اوراس کے بعض احکام اسلام کے مطابق ہیں،ترجمہ کیا جائے۔ ہندی سے فارسی میں ترجمہ کے لیے مجھے نامزد کیا گیا۔اس کتاب کی بعض عبارتیں نہایت پیچیدہ تھیں اور جو پنڈت مقرر تھا وہ اس کی صحیح تعبیر نہیں کر پاتا تھا، اس لیے اس کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا تھا۔میں نے جب مشکل بادشاہ کے سامنے پیش کی تو بادشاہ نے یہ

کام پہلے تو شیخ فیضی کے اور بعد میں حاجی ابراہیم سرہندی کے سپرد کردیا۔ وہ بھی خاطر خواہ اس کا ترجمہ نہ کرسکا۔ اس بید کے احکام میں ایک حکم یہ ہے کہ جب تک کہ ایسی عبارت جس میں ''لام'' بہت آتے ہیں جیسے کلمہ طیبہ ''لا الہ الا اللہ'' نہ پڑھی جائے کیوں کہ نجات نہیں ہوگی۔ ایک اور حکم ہے چند شرائط پر گائے کا گوشت کھانا مباح ہے، دوسرے یہ کہ میت کو دفن کیا جائے۔ جلایا نہ جائے۔ اسی بید کے احکام کو پیش کرکے شیخ بہاون نے ہندوستان کے اکثر برہمنوں کو بحث میں لا جواب کر دیا اوراس کی وجہ سے اس نے اسلام بھی قبول کرلیا تھا۔

گلبدن بیگم کی حج پر روانگی

اسی سال ماہ شعبان میں بابر بادشاہ کی صاحبزادی گلبدن بیگم جو بادشاہ کی پھوپھی ہوتی ہیں، نورالدین محمد مرزا کی بیٹی سلیمہ سلطان بیگم کے ساتھ جو پہلے بیرم خان خانخاناں کے عقد میں تھیں، بعد بادشاہ کے نکاح میں آگئی تھیں، حج کے لیے روانہ ہوئیں انھیں ایک سال تک گجرات میں ٹھہرنا پڑا۔ پھر انھوں نے حجاز پہنچ کر چار حج کیے۔ واپسی کے وقت ان کا جہاز ٹوٹ گیا اس لیے عدن میں ایک سال تک قیام کرنا پڑا۔ یہ دونوں ہندوستان کو 990ھ/ 1582ء میں لوٹ کر آئیں۔ اس وقت سے پانچ چھ سال تک بادشاہ کا یہ معمول رہا کہ وہ دربار کے کسی امیر کو ''امیر الحاج'' بنا کر لوگوں کو حج پر جانے کی عام اجازت دیتے تھے اور حاجیوں کو سفر کے خرچ، نقد روپیہ اور بھاری تحائف دے کر مکہ معظمہ روانہ کیا کرتے تھے۔ بعد میں یہ طریقہ برخواست کردیا گیا۔

مرزا سلیمان کی ہندوستان میں آمد

مرزا سلیمان بابر کے زمانہ سے بدخشان کا مستقل حاکم تھا۔ اس نے اپنے دور حکمرانی میں بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا، آخر میں جب اس کا مقابلہ پیر محمد خاں اوزبک اور اس کی بیوی ولی نعمت بیگم کی فوجوں سے ہوا تو اس کا لڑکا ابراہیم مرزا مارا گیا اور مرزا سلیمان

سخت مشکلات میں پھنس گیا۔ اسی اثنا میں ابراہیم مرزا کا لڑکا شاہرخ مرزا باغی بن بیٹھا اور اس نے سارے بدخشان پر قبضہ کرلیا۔ مرزا سلیمان کے لیے بدخشان میں ٹھہرنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ وہ وہاں سے نکل کر پہلے تو کابل میں مرزا محمد حکیم کے پاس مدد لینے آیا، لیکن جب دیکھا کہ مرزا حکیم مدد دینے پر راضی نہیں تو اس نے درخواست کی کہ اس کے ہمراہ ایک رہنما فوج کردی جائے تاکہ وہ اسے نیلاب (اٹک) کے کنارے تک خطرناک مقامات سے بہ حفاظت پہنچادے۔ مرزا نے بڑے نازنخروں کے بعد اس کے ساتھ ایسے آدمیوں کو کردیا جو پہلی ہی منزل پر اسے تنہا چھوڑ کر کابل کو بھاگ گئے۔

مرزا سلیمان تن تنہا بے سروسامان اپنی ایک لڑکی کو لیے ہوئے ہندوستان کے راستہ پر سفر کرتا رہا۔ بعض مقامات پر پٹھانوں نے اس کا راستہ بھی روکا، مرزا سلیمان بہادری کے ساتھ لڑتا بھڑتا ان سے بچ کر نکل آیا۔ اسی مقابلہ میں اسے ایک تیر کا زخم بھی لگا غرض وہ نہایت پریشانی کی حالت میں نیلاب (اٹک) کے کنارے پر پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اپنے دوتین ذاتی گھوڑے عرضی کے ساتھ اکبر کے دربار میں روانہ کیے۔ بادشاہ نے آغا خاں خزانچی کے ذریعہ پچاس ہزار روپیہ، قیمتی تحفے اور چند عراقی گھوڑے مرزا کے استقبال کے لیے روانہ فرمائے۔ اس سے پہلے ہی راجہ بھگوان داس حاکم لاہور حسب فرمان پیشوائی کے لیے پہنچ چکا تھا اور ہر روز شاہی مہمانوں کی ضیافت و خاطر داری کررہا تھا، راستہ میں بھی جتنے حکام اور امراء تھے وہ بھی مہمانداری کے فرائض انجام دیتے رہے تھے، غرض مرزا سلیمان کو پورے، اعزاز واحترام کے ساتھ دارالخلافہ لایا گیا۔

اسی دوران اکبر نے گجرات سے خان اعظم کو بھی بلالیا اس جشن میں شرکت کے لیے وہ نہایت تیزی سے حملہ کرتے ہوئے، 4 رجب 983ھ کو فتح سے باریاب ہوا۔ ایک دن خان اعظم نے موقع پاکر داغ کے قانون اور کروڑیوں کے مظالم، فوج کے مالی معاملات، رعایا کی عام بدحالی اور بادشاہ کی بدعتوں کے متعلق کھری کھری باتیں سنائیں اور ان امور کے متعلق بڑی جرات کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اکبر کو اس کی باتیں بڑی تلخ معلوم ہوئیں اور وہ اس سے ناراض ہوگیا۔ اپنی عادت کے مطابق وہ اس حق بات کو

برداشت نہ کر سکا اور اسے حکما کورنش سے روک دیا اور اس پر بادشاہی محافظ بھی مقرر کردیے نیز دوسرے امیر بھی اس سے ملنے نہ پائیں۔ چند دن بعد اکبر نے خان اعظم کو آگرہ بھیج دیا، وہاں اسے اس کے باغ میں نظر بند کردیا گیا۔

مرزا سلیمان کا شاہانہ استقبال

مرزا سلیمان جب متواتر کوچ کرتے ہوئے لاہور سے متھرا پہنچا تو بڑے بڑے امراء اور قاضی نظام بدخشی جس کو مرزا سلیمان نے قاضی کا خطاب دیا تھا اور اکبر کے دربار سے اسے غازی کا خطاب عطا ہوا تھا، استقبال کے لیے لے گئے۔ مرزا سلیمان اسی سال 15 رجب کو فتح پور کے قریب پہنچا۔ اس کی پیشوائی کے لیے دربار کے مصاحبین اور معزز افراد بھیجے گئے پھرخود بادشاہ تمام امرا کے ساتھ پانچ کوس تک اس کو لانے کے لیے تشریف لے گئے۔

مرزا سلیمان کا استقبال بڑی دھوم دھام کے ساتھ کیا گیا چنانچہ اس دن راستہ کے دونوں طرف پانچ ہزار ہاتھی کھڑے تھے جن میں سے بعض پر تو فرنگی مخمل کی اور بعض پر رومی زربفت کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں اور وہ سونے اور چاندی کی زنجیروں سے آراستہ تھے۔ ان کے سروں پر اور ان کی گردنوں میں سیاہ اورسفید جھالریں لٹک رہی تھیں، ہاتھیوں کے ساتھ ساتھ سنہری زین والے عربی گھوڑے بھی صف بستہ تھے۔ ان گاڑیوں کے جو بیل تھے ان میں سے ہر ایک کے سر پر زردوزی کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اس سازو سامان کی سنہری رو پہلی جھلمل سے جنگل میں بس آگ لگ گئی اور دشت وکہسار لالہ زار بن گئے۔ جب مرزا سلیمان کی نظر دور سے بادشاہ کی سواری پر پڑی تو وہ بے تکلف ہو کر گھوڑے سے اتر کردوڑنے لگا اور قریب پہنچ کرتسلیمات بجا لایا۔شہنشاہ بھی ادباً گھوڑے سے اتر آئے اور اسے ان رسمی تکلفات، کو ادا کرنے سے روک دیا، تپاک سے بغل گیر ہوگئے۔ ملاقات کے بعد دونوں سوار ہو کر باتیں کرتے ہوتے چلے۔ مرزا سلیمان کی مہمانی کا انتظام انوپ تلاؤ کے دولت کدہ میں کیا گیا تھا۔ اس وقت انوپ تلاؤ کے درو دیوار اور

صحن کو منقش اور زرین سائبانوں سے سجایا گیا تھا۔ زرکار فرش بچھا ہوا تھا اور ہر قسم کا شاہانہ سازو سامان سلیقہ سے جمایا گیا تھا۔ تخت سلطنت پر اکبر نے مرزا سلیمان کو اپنے پاس بیٹھا لیا اور شاہزادہ کو بلا کر مرزا سے ملایا۔ کھانے پینے سے فارغ ہونے کے بعد بادشاہ نے بدخشان کی تسخیر کے لیے روپیہ اور فوج سے مدد دینے کا وعدہ کیا مرزا نے ٹھہرنے کے لیے ہتیاپول کے بُرج میں جہاں نقار خانہ تھا ایک مکان کا انتظام کرادیا تھا۔

فاتحہ خوانی کی بحث

مرزا سلیمان کبھی کبھی راتوں میں عبادت خانہ میں آتا تھا اور علما و مشائخین کی محفل میں بیٹھا کرتا تھا۔ اس پر وجد وحال طاری رہتا تھا اور بڑی اونچی باتیں کیا کرتا تھا۔ کبھی اس کی نماز باجماعت فوت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن میں نے نماز کی امامت کے بعد صرف دعا پڑھی، میرزا نے اعتراض کیا کہ تم نے فاتحہ کیوں نہیں پڑھی؟ میں نے کہا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نماز کے بعد فاتحہ پڑھنے کا طریقہ نہیں تھا۔ بعض روایات میں تو اس کو مکروہ بھی کہا گیا ہے۔ اس نے کہا: ولایت (ایران) میں علم نہیں ہے علماء نہیں ہیں، وہاں تو فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ میں نے کہا، ہمارا تعلق تو اللہ کی کتاب سے ہے، تقلید سے ہم کو کیا سروکار، بادشاہ نے فرمایا ''بحث چھوڑو آئندہ پڑھ لیا کرو''۔ میں نے بادشاہ کے ارشادکو قبول کرلیا، لیکن میں نے فاتحہ پڑھنے کے مکروہ ہونے کے بارے میں جو روایت تھی وہ ان کے سامنے بیان ضرور کردی۔

تورۂ چغتائی

انہی دنوں اکبر نے تورۂ ''چغتائی'' کی قدیم رسم کو جو متروک ہوچکی تھی۔ محض مرزا سلیمان کو دکھانے کے لیے دوبارہ رواج دیا۔ دیوان خانہ میں ایک بڑا دسترخوان بچھایا جاتا تھا اور لشکریوں کو رسماً اس دسترخوان پر کھانے کے لیے بلایا جاتا تھا۔ جب مرزا چلا گیا تو یہ رسم بھی بند ہوگئی۔ اکبر نے مرزا سلیمان کی مدد کے لیے حاکم پنجاب خان جہان کو فرمان لکھ دیا

کہ وہ پانچ ہزار مسلح سوار لے کر میرزا کے ساتھ بدخشان کو جائے اور میرزا شاہرخ سے بدخشان چھین کر میرزا سلیمان کے سپرد کردے پھر لاہور لوٹ آئے، لیکن تقدیر میں کچھ اور ہی لکھا تھا، چنانچہ معاملات نے ایک دوسری ہی صورت اختیار کرلی۔

منعم خان خانخاناں کی وفات

منعم خان خان خانان بنگال پر مقرر تھا۔ جب داؤد سے صلح ہوگئی تو وہ ٹانڈہ سے جہاں کی آب و ہوا معتدل تھی کوچ کرکے لشکر کو گنگا کے اس پار گوڑ کے علاقہ میں لے گیا۔ گوڑ پہلے بنگالہ کا دار السلطنت تھا، وہاں کی آب و ہوا نہایت خراب اور متعفن تھی۔ منعم خاں نے وہاں پہنچ کر شہر کی تعمیر کا حکم دیا۔ امرا نے اس کو اس ارادہ سے روکنا بھی چاہا لیکن موت ہی اس کا ہاتھ پکڑ کر یہاں تک لے آئی تھی اس لیے وہ باز نہ آیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کی خراب آب وہوا سے لشکر میں طرح طرح کی بیماریاں جن کا نام بھی کسی نے نہ سنا تھا پھیل گئیں۔ روزانہ بے شمار آدمی ان بیماریوں کا شکار ہوکر مرنے لگے۔ اس علاقہ میں ہزار ہا آدمی مقرر تھے ان میں سے بہ مشکل چند سو اپنے اپنے وطن کو لوٹ کر آسکے باقی سب وہیں پیوند خاک ہوگئے۔

کثرت اموات کا یہ حال تھا کہ مردوں کو دفن کرنا ممکن نہ رہا تھا۔ مجبوراً ان کو پانی میں بہادیا جاتا تھا اور ہر گھڑی کسی نہ کسی امیر کے فوت ہوجانے کی خبر خان خانان کو مل رہی تھی، لیکن نہ معلوم اس کے کانوں میں کس غفلت کی روئی بھری تھی کہ وہ اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہ آیا اور اُس کی نازک مزاجی سے ڈر کر امرا کو بھی ہمت نہ ہوتی تھی کہ وہ اس سے سختی کے ساتھ واپسی کا مطالبہ کریں۔ آخر موت نے آکر اسے چونکایا، لیکن اب مہلت کہاں رہی تھی؟ خانخاناں بھی ان وباؤں کا شکار ہوکر بستر مرگ پر اس طرح گرا کہ پھر اسے اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کا انتقال 10/رجب 983ھ/1555ء میں ہوا۔

خان خانان نے اپنے پیچھے کوئی وارث نہ چھوڑا تھا اس لیے اس کا برسوں سے جمع کیا ہوا مال ومتاع اور سرمایہ بحق سرکار ضبط کرلیا گیا:

چہ خوش گفت این نکتہ را نکتہ سنج
کہ زر زر کشد عاقبت گنج گنج

اس کے مرنے پر بنگال میں متعینہ امرا نے شاہم خاں جلائر کو اپنا سردار بنا لیا۔ جب خان خانان کی موت کی خبر پہنچی تو دربار سے خان جہاں کو خانخاناں کا قائم مقام بنایا گیا۔ بادشاہ نے اسے زردوزی کی قبا اور چار سنہری تھال، مرصع شمشیر، سنہری زین والا گھوڑا عطا فرما کر بنگالہ کی حکومت پر مقرر کردیا۔

خان خانان کی وفات سے جو نئی صورت حال پیدا ہوگئی اسکے سبب میرزا سلیمان کی مدد کا ارادہ پیدا ہوا اور اکبر نے یا تو خود سلیمان کی درخواست پر یا سیاسی مصالحت کی بنا پر مرزا کو سمندر کے راستہ حجاز روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اسے سرکار کے خزانہ سے پچاس ہزار روپیہ اور گجرات کے خالصہ سے مزید بیس ہزار روپیہ دلوا کر قلیچ خان کے آذوقہ میں حج کے لیے رخصت کردیا کہ وہ اُسے سورت کی بندرگاہ سے جہاز پر چڑھا کر لوٹ آئے۔ مرزا سلیمان نے اسی سال حج کی سعادت حاصل کی، پھر وہ وہاں سے عراق کے راستہ واپس ہوا اور دوبارہ بدخشاں کی حکومت حاصل کرلی:

تو راہ نرفتہ ازان نمودند ورنہ کہ زداین در کہ برونکشودند

مرزا سلیمان نے ہندوستان سے لوٹتے وقت اپنی لڑکی کا نکاح قندھار کے حاکم مظفر حسین مرزا سے جو اسی زمانہ میں لاہور آیا ہوا تھا، کردیا۔ دوسری لڑکی کو کسی اور شخص سے بیاہ دیا تھا۔

حسین خاں کا پہاڑی علاقہ پر حملہ

حسین خان مرحوم جس سے میرے قدیم مراسم بلکہ دلی لگاؤ تھا۔ داغ محلّہ کے قانون سے سخت عاجز ہوگیا تھا اس سلسلہ میں اسے بڑی پریشانیاں لاحق رہیں۔ جب وہ بہت تنگ آگیا تو اس نے اپنے خاص ساتھیوں کی جمعیت لے کر کانت وکولہ سے کوچ کیا اور بدایوں اور سنبھل سے گزر کر گنگا کا عبور کیا اور دوآبہ پہنچ گیا۔ اس علاقے کے باغی زمیندار عرصے

سے مالگزاری ادا نہیں کر رہے تھے کروڑی بے چارہ کا کیا ذکر؟ وہ سرکاری مطالبوں پر جاگیردار تک کو جواب نہیں دیتے تھے۔ حسین خان نے ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے ہی یہ فوجی حملہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ ان باغیوں کے خلاف فوجی کارروائی کرتے ہوئے شمالی پہاڑی کے دامن تک پہنچ گیا۔

حسین خان پر ایک مدت سے اس پہاڑی کو فتح کرنے کی دھن سوار تھی۔ اس کے تصور میں ہمیشہ یہاں کے بت خانوں میں سونے چاندی کی اینٹیں ہی جمی رہتی تھیں۔ چنانچہ اس مرتبہ بھی اس مفروضہ دولت کی لالچ میں کسی بھاری لشکر کو لئے بغیر ہی اس نے بسنت پور کا محاصرہ کر لیا۔ بسنت پور پہاڑی میں نہایت دشوار گزار بلندی پر واقع ہے۔ اسے اس مہم میں مصروف دیکھ کر کروڑیوں کو اُس سے نپٹنے کا موقع مل گیا چنانچہ تھانیسر کے کروڑی ملک الشرق گجراتی اور دوسرے کروڑی اپنے اپنے قلعوں کے دروازے بند کر کے بیٹھ گئے اور حسین خاں کے متعلق یہ جھوٹی خبر اڑادی کہ وہ باغی ہو چکا ہے۔ دربار شاہی میں بھی عریضے بھیج کر اس کی اطلاع کرادی۔

سعید خاں مغل کی حسین خاں کے ساتھ بڑی گہری اور دیرینہ دوستی تھی، وہ انہی دنوں ملتان سے دربار میں آیا ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس سے حسین خاں کے حالات اور اس کی بغاوت کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے اس کی تردید کردی۔ بادشاہ نے اس سے رعایا کی تلف شدہ مویشیوں اور مالی نقصانات کے سلسلہ میں حسین خاں کی طرف سے ضمانتی تحریر بھی مانگی تھی اور اس نے حسین خاں کی طرف سے ضمانت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس انکار کی وجہ سے ان کی آپس میں جو دوستی تھی وہ جاتی رہی:

این دغل دوستان گرمی بینی   مگسانند گرد شیرینی
پیش تو از موافق تراند   در عقب از سایہ سناق تراند

حسین خاں کو قابو میں لانے کے لیے بادشاہ نے سید ہاشم ولد محمود بارہہ اور میر سید محمد عدل کے لڑکوں کو امرا کی ایک جمعیت کے ساتھ بھکّر کی جانب رخصت کیا اور روانگی سے پہلے ہی حسین خاں کے لڑکے کو ان کی نگرانی میں دیا۔

حسین خاں کا انتقال

حسین خاں بسنت پور کی پہاڑی میں لڑتے ہوئے زخمی ہوگیا۔ ایک گولی اس کے شانہ کو توڑتی ہوئی نکل گئی اور اس مہم میں اس کے بہت سے تجربہ کار آدمی بھی ضائع ہوئے۔ جب وہ ہر طرف سے مجبور ہوگیا تو ناکام اور نامراد پہاڑی علاقہ سے لوٹ آیا اور کشتی میں سوار ہوکر دریائے گنگا کے راستہ پٹیالی کی طرف جہاں اس کے اہل وعیال مقیم تھے روانہ ہوا، لیکن جب گڑھ مکتیشور پہنچا تو سرکاری آدمیوں نے اس زخمی حالت میں اسے گرفتار کرلیا اور آگرہ لے جاکر حسب الحکم صادق محمد خاں کی حویلی میں نظر بند کردیا۔ صادق محمد خاں سے ہندوستان کی فتح بلکہ قندھار کے زمانے سے ہی دینی تعصب کے سبب اس کی ان بن رہتی تھی اور آج اسی کے گھر رہنے کی ذلت اسے برداشت کرنی پڑی۔ بادشاہ کے حکم سے شیخ بینا طبیب اس کے علاج کے لیے فتح پور سے آگرہ آیا، اس نے معائنہ کرنے کے بعد اطلاع دی کہ حسین خان کا زخم نہایت خطرناک ہے۔ بادشاہ نے معالجہ کے لیے حکیم عین الملک کو جانے کا حکم دیا۔ قدیم روابط کی بنا پر میں بھی حضور سے اجازت لے کر عین الملک کے ساتھ گیا۔ عرصہ بعد اس سے میری ملاقات ہوئی اور دو بچھڑے ہوئے دوست گزرے ہوئے زمانہ کی یادوں کو سنبھالے نہایت رقت وحسرت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے:

ہر جا من و معشوق بہم باز رسیدیم　　از بیم بداندیش لب خویش گزیدیم
بی واسطۂ گوش ولب از راہ دل وچشم　　بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

ابھی میں اسے اور وہ مجھے دیکھ ہی رہے تھے کہ بادشاہی جراح آگئے اور انھوں نے ایک بالشت لمبا نشتر زخم میں ڈال کر اسے چیر دیا۔ مجھے دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ اس بہادر نے اس نشتر زنی پر اُف نہ کی، نہ اس کی پیشانی پر کوئی بل آیا بلکہ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ مسکراتا ہی رہا۔ وہ منظر قیامت کے نظارے سے کچھ کم نہ تھا۔ جب میں اس سے مل کر رخصت ہوا تو مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ہماری بس آخری ملاقات ہے۔ چنانچہ فتح پور پہنچے کے تین چار دن بعد اطلاع ملی کہ حسین خاں سخت اسہال میں مبتلا ہے۔ اسی عارضہ میں آخر

کار وہ گھل گھل کر مر گیا۔ بلا شبہ وہ شہید تھا کیوں کہ کافروں کے لگائے ہوئے زخم ہی کے باعث وہ فوت ہوا:

نیامد کسی در جہان کو بماند
مگر آن کزو نام نیکو بماند

حسین خاں نہایت فیاض تھا۔ مستحقوں اور محتاجوں کے لیے مٹھی بھر بھر کر روپیہ صرف کرتا تھا۔ اس کی یہ سخاوت اور دردمندی آخر اس کے کام آئی اور اس کا کفن دفن خواجہ محمد یحییٰ نقشبندی جیسے پایہ کے بزرگ کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ وہاں سے اس کی میت کو پٹیالی کے گورستان میں جو اس کا خاندانی مقبرہ تھا، لے جا کر سپرد خاک کیا گیا۔

جس وقت میں بھکر کے سفر میں میر عدل مرحوم کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس تونگر دل درویش کی وفات کی داستان میر عدل کو سنائی۔ وہ اس خبر کو سن کر زار زار رونے لگا اور اس کی پاک دلی، دلیری اور چستی کی بڑی تعریف کرتے رہے اور فرمایا جو شخص دنیا سے بے نیاز رہنا چاہے تو اسے اسی طرح زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہونا چاہیے جیسا کہ حسین خان نے کیا اور جس طرح وہ دنیا سے رخصت ہوا اتفاق دیکھو کہ میر عدل سے میری یہ ملاقات بھی بس آخری ہی تھی۔ انھوں نے بھی اس موقع پر خود فرمایا تھا کہ ''ہمارے سارے دوست رخصت ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں اب تم سے بھی دوبارہ ملنا نصیب ہوتا ہے یا نہیں''۔ ان کی بات سچ نکلی اور وہ بھی جلدی اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حسین خان کے اوصاف

میں تقریباً نو سال تک اس پیارے دوست حسین خان کی خدمت میں رہا، سپاہ گری اور دنیا داری کی ظاہری وضع کے باوجود میں نے جو وصف اس میں پائے اس زمانہ کے بیشتر پیشواؤں اور مرشدوں میں ان کا عشر عشیر بھی دکھائی نہیں دیتا، وہ نہایت درست عقیدہ کا سنی تھا، ہمت اور شجاعت میں بھی اس کی کوئی مثال نہیں تھی۔ منکسر مزاج ایسا کہ چھوٹے بڑے ہر ایک کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتا تھا۔ دنیا سے بے نیازی میں اس جیسا کسی کو نہ پایا۔

لوگوں کی خدمت میں ہر دم کوشاں رہتا تھا، توکل اور زہد میں اس کے پایہ کا کوئی دوسرا نہیں تھا، اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو دین اور مذہب کی یہ بے قدری دیکھنی نہ پڑتی جیسی دیکھنے پر زمانہ نے مجبور کردیا ہے۔

سادگی اور انکساری

جس زمانہ میں وہ لاہور کی حکومت پر فائز تھا، میں نے معتبر آدمیوں کی زبانی سنا کہ اس کی غذا حضور اکرمؐ کی متابعت میں صرف جو کی روٹی تھی۔ اس زمانہ میں اس نے وہاں کی ہزارہا پرانی مسجدوں اور مقبروں کی مرمت اور تعمیر کرائی تھی۔ ایک مرتبہ کوئی ہندو مسلمانوں کے بھیس میں اس کی مجلس میں آکر بیٹھ گیا وہ اسے مسلمان سمجھ کر بڑی تواضع اور انکساری کے ساتھ ملاقات کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جب اسے حقیقت حال کا علم ہوا تو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس نے عام حکم دے دیا کہ آج سے تمام ہندو اپنی آستینوں کے کنارے پر کسی نہ کسی رنگ کی پٹی سی لیا کریں تاکہ ہندو مسلمان میں تمیز ہوسکے۔ اسی حکم کی وجہ سے لوگوں میں اس کا نام 'تکریہ' پڑ گیا۔ تکری پیوند کو کہتے ہیں جیسے عربی میں غیار، بروزن دیار، کہا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد اس نے یہ حکم بھی کیا تھا کہ حکم شرعی کے مطابق غیر مسلمان زین کی سواری نہ کریں بلکہ جانوروں پر پالان باندھا کریں۔

اس کی ہمراہی میں ہمیشہ سید اور اہل علم رہا کرتے تھے، ان کا ادب و لحاظ اس کو اس قدر تھا کہ محض اسی خیال سے کوئی بے ادبی نہ ہوجائے، سفر میں وہ کبھی سواری کی حالت میں نہیں سویا۔ تہجد کی نماز اس کی کبھی فوت نہ ہوئی۔ لاکھوں کروڑوں کے باوجود اس کے طویلہ میں ایک گھوڑے سے زیادہ کبھی نہ رہا۔ وہ بھی بعض اوقات چاہے سفر میں ہو یا حضر میں کسی نہ کسی مستحق کو بخش دیتا تھا اور خود پیدل ہو جاتا تھا۔ اس کے آدمیوں اور غلاموں کا یہ حال تھا کہ ان کے پاس دو دو گھوڑے کوتل میں لگے رہتے تھے:

''خان مفلس غلام باسامان''

دنیا سے بے نیازی

اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ کبھی مال جمع نہیں کرے گا۔ جب بھی اس کے سامنے سونا روپیہ لایا جاتا تو کہتا تھا کہ یہ تیر یا نیزہ ہے جو میرے پہلو میں چبھا جا رہا ہے۔ جب تک وہ مال بخش نہیں دیتا اس کو چین نہیں پڑتا تھا۔ اکثر یہ دیکھا گیا کہ پندرہ ہزار سے تیس چالیس ہزار روپیہ تک لوگوں نے پرگنوں کے حساب میں دبا لیا اور اس نے کوئی دھیان دیے بغیر فوج کے مصارف اور دوسرے اخراجات کی عرضی پر دستخط کر دیے اور اس کے پاس صرف رسد کا حصہ رہ گیا۔ اس نے منت مانی ہوئی تھی کہ جو بھی غلام اس کے ہاتھ آئے گا وہ بس اسی دن سے آزاد ہو جائے گا کبھی تین سے زیادہ عورتوں کو نکاح میں نہیں رکھا۔

ایک دن شیخ الہدیہ نے جو اس وقت کے بڑے عالی مرتبہ بزرگ تھے۔ حسین خاں کے اس بے ھنگام اخراجات اور آڑے وقتوں کے لیے پونجی نہ رکھنے پر اعتراض کیا اور اس کو اس عادت کو چھوڑنے کی نصیحت کی۔ ان کی یہ بات بڑی ناگوار گزری اور طیش میں آکر کہا کہ اگر مال کو جمع کرنا جس کا ماتم کر رہے ہو سنت رسول ہے تو سرتابی کی مجال نہیں اور اگر ایسا نہیں تو ہم لوگ تم جیسے رہبران دین سے اس بات کی امید رکھتے ہیں کہ اگر ہم میں دنیا کی حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی رہ گیا ہے تو اسے تم دور کرنے کی کوشش کرو، نہ یہ کہ تم اس جہان فانی کی متاع حقیر و بے مایہ کو ہماری نگاہوں میں بڑھا چڑھا کر پیش کرو اور اس طرح ہم کو اس کا لالچی بنا دو کہ ہم بخل و خست کی لعنت میں گرفتار ہو جائیں

قرار بر کف آزادگان نگیرد مال
نہ صبر در دل عاشق نہ آب در غزل

بہادری اور سخاوت

میں اس کے ساتھ کسی میدانی حملہ میں شریک نہیں رہا، لیکن اکثر جنگل کی لڑائیوں میں اس کے ہمراہ رہنے کا موقع ملا ہے۔ ان لڑائیوں میں میں نے ایسی ثابت قدمی اور دلیری خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے جس کا ذکر بس داستانوں کے حملوں کے متعلق ہی سننے میں آتا

ہے وہ نہایت قوی ہیکل اور انتہائی دلیر تھا۔ جنگ کے دن بس ایک ہی کلمہ زبان پر رہتا تھا، ''یا شہادت یا فتح ''لوگ بہت کہتے تھے کہ حضور دعا میں فتح کو مقدم رکھیے لیکن وہ یہ جواب دیتا کہ مجھے زندہ لوگوں کی نسبت گزرے ہوئے لوگوں کے دیدار کا زیادہ اشتیاق ہے۔ اس کی دریا دلی اور سخاوت ایسی تھی کہ اگر روئے زمین کے خزانے اور سلطنت بھی اس کو مل جاتی تو وہ پہلے ہی دن سب کچھ لٹا کر قرض دار ہوجاتا، کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ چالیس پچاس عراقی اور ترکی گھوڑے کسی سوداگر کو اس کی بتائی مجموعی رقم پر یہ کہہ کر اکٹھے خرید لیے کہ تو جانے اور تیرا خدا! پھر وہ سب ایک ہی نشست میں اپنے رفیقوں کو بخش بھی دیئے، جن کو نہیں ملے ان سے غدر خواہی کرتا رہا۔

میں اس سے پہلی بار اس وقت ملا تھا جب کہ کڑھ کتنگر پر لشکر کو مقرر کیا گیا تھا۔ اس نے آگرہ میں ایک عراقی گھوڑا 500 روپے میں خریدا اور اسی وقت مجھے عطا کر دیا۔ کہتے ہیں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ رقم اس کے ذمہ قرض تھی۔ قرض خواہوں کے ساتھ اس کی ایسی خوش معاملگی تھی کہ اس کے انتقال پر تمام قرض خواہوں نے قرضہ کے دستاویز پھاڑ دیے اور اس کے لیے مغفرت کی دعا کی اور اس کے ورثا سے قرضوں کا کوئی مطالبہ اور جھگڑا نہ کیا۔

میں اپنی اس چھوٹی زبان سے حسین خاں کی تعریف و توصیف کا حق ادا کرنے سے قاصر ہوں، اب جب کہ میں پیری کی ذلتوں سے دوچار ہوں اس بات کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میری زندگی کا بہترین حصہ یعنی جوانی کے شروع کا زمانہ اس کی خدمت میں گزرا اور یہ اس کی ہی توجہات کا طفیل ہے کہ میری نشو ونما نہایت عمدہ طریقہ پر ہوئی کہ آج میں دنیا میں مشہور و معروف شخصیت کا مالک ہوں۔

اسی سال بادشاہ نے میری خوش آوازی کی وجہ سے چہار شنبہ کے دن کی امامت میرے سپرد فرمائی اور مجھے سات اماموں میں داخل کردیا اور خواجہ دولت ناظر کو مقرر فرمایا کہ وہ اس دن اور رات میں پانچوں نمازوں کے وقت حاضری کی یاد دہانی کرادے۔

تخت نشینی کا بائیسواں سال

انہی دنوں خواجہ امین الدین محمود کا جو خواجہ امینا کے نام سے مشہور ہے، انتقال ہوگیا اور اس کا چھوڑا ہوا کافی بڑا سرمایہ خزانہ عامرہ میں داخل کرلیا گیا۔ اسی سال کی 17 ذی قعدہ کو بادشاہ نے اجمیر کا سفر کیا۔ بدستور سابق ایک منزل سے پیادہ جا کر مرزا مبارک کی زیارت کی۔ اس مہینہ کی نویں تاریخ کو سورج برج حمل میں داخل ہوا اور جلوس شاہی کے بائیسویں سال کا آغاز ہوا۔

خان جہان کے نام فرمان

اس موقع پر یہ خبر ملی کہ منعم خاں خان خانان کے انتقال کے بعد بادشاہ میر داؤد کے مقابلہ پر ٹھہر نہیں سکے، گوڑ اور مانڈو سے پسپا ہوکر حاجی پور اور پٹنہ آگئے ہیں اور خان جہان کا لشکر چونکہ ابھی تک لاہور میں رکا ہوا ہے اس لیے وہ تیزی سے کوچ نہیں کر رہا ہے۔ اکبر نے ترک سجان قلی کے ہاتھ خان جہان کو تیزی سے روانہ ہونے کے لیے فرمان روانہ کیا۔ چنانچہ خان جہان نے بائیس دن میں ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کیا۔ ابھی بادشاہ اجمیر ہی میں تھے کہ دوسری اطلاع ملی کہ خان جہان نے کرہی پہنچ کر داؤد کی پٹھان فوج سے ایک سخت جنگ کی اور ان پر فتح پائی۔ تقریباً ڈیڑھ ہزار پٹھانوں کو قتل اور زخمی کر کے اب وہ آگے بڑھ چکا ہے۔

رانا کیکا کی مہم پر مان سنگھ کا تقرر

اوایل محرم 984ھ/ 1576ء میں اکبر مان سنگھ ولد بھگوان داس کو حضرت معین الدین چشتیؒ کے روضہ میں ساتھ لے کر گیا اور وہاں خلوت میں حضرت سے مدد کی دعا کر کے مان سنگھ کو خلعت، گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات عطا فرمائے اور اسے کو کندہ اور کونبھل میر کے دارالحرب پر جو رانا کیکا کی عملداری میں تھا، فوج کشی کے لیے مقرر کیا۔ اس کی مدد کے لیے خاصہ کے اور دوسرے صیغوں کے پانچ ہزار سواروں کو امراء کی سرکردگی میں متعین فرمایا۔ اس مہم پر مان سنگھ کے ساتھ آصف خاں میر بخشی، غازی خان بدخشی، شاہ غازی خان تبریزی، مجاہد خاں، سید احمد خاں، سید ہاشم بارہہ، خاصہ خیل اور دوسرے امرا بھی مقرر کیے گئے تھے۔

جہاد کا شوق

لشکر کے کوچ کے وقت میں بھی قاضی خاں اور آصف خاں کو رخصت کرنے کے لیے ان کے ہمراہ دو تین کوس تک جہاں ان امیروں کی چھاؤنی تھی، گیا تھا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جہاد کا شوق چٹکیاں لینے لگا اور میں وہاں سے اسی وقت لوٹ کر شیخ الاسلام شیخ عبد النبی صدر کی خدمت میں آیا اور ان کو بادشاہ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کیا۔ انھوں نے حامی تو بھرلی لیکن میرے معروضے کو اپنے وکیل سید عبدالرسول کے ذمے کردیا۔ یہ صورت بالکل بے کار تھی اور معاملہ میں تاخیر کا اندیشہ تھا۔ نقیب خاں کے ساتھ میرا اچھا خاصا یارانہ تھا، میں نے اس کو وسیلہ بنایا، پہلے تو اس نے مجھے روکنا چاہا اور کہا اگر ہندو اس لشکر کا سردار نہ ہوتا تو سب سے پہلے تم کو اجازت دلوادیتا۔ میں نے خان کو بخوبی سمجھایا کہ ہم تو بادشاہ سلامت کو اپنا سردار مانتے ہیں، مان سنگھ وغیرہ سے ہم کو کیا غرض؟ اور یہ معاملہ تو نیت کی درستی پر منحصر ہے۔ غرض نقیب خاں نے اس وقت جبکہ بادشاہ مزار شریف کے اونچے چبوترے کی سیڑھیاں چڑھ رہے تھے، میرا معروضہ پیش کیا۔ پہلے تو انھوں نے فرمایا اسکے ذمہ تو امامت کے فرائض ہیں، وہ کس طرح جا سکتا ہے؟ نقیب خاں نے عرض کیا اس نے جہاد کی نیت کرلی ہے۔ بادشاہ نے مجھے بلاکر پوچھا ''مصمم ارادہ ہے؟'' میں نے عرض کیا، ہاں۔ فرمایا، ''کیوں؟'' میں نے کہا، میں اپنے اعمال کی سیاہی کو جاں نثاری کے ذریعہ دور کرنا چاہتا ہوں'۔ اس پر فرمایا''انشا اللہ تعالیٰ تم فتح کی بشارت لے کر آؤ گے۔ اتنا کہہ کر بادشاہ مراقبہ میں چلے گئے اور بڑی توجہ سے فاتحہ پڑھتے رہے اور جب میں نے چبوترہ پر ہاتھ بڑھا کر پا بوسی کا ارادہ کیا تو انھوں نے اپنے پیر کھینچ لیے۔ جس وقت میں دیوان خانہ سے رخصت ہوا تو مجھے دوبارہ بلوایااور دونوں ہاتھوں سے بھر کر 56 اشرفیاں عطا کیں اور مجھے رخصت کیا۔ اس زمانہ میں شیخ عبد النبی سے سابقہ رنجشیں دور ہوگئی تھیں اور وہ مجھ پر مہربان ہوگیا تھا اس لیے میں اس سے بھی رخصت لینے کے لیے گیا، اس نے مجھ سے کہا ''یاد رکھنا جس وقت دشمن سے مڈبھیڑ ہوتو چونکہ حدیث نبوی کے بموجب یہ وقت دعا کی قبولیت کا ہوتا ہے تم مجھے دعائے خیر میں یاد کرنا اور بھولنا نہیں'۔

میں نے وعدہ کیا اور فاتحہ پڑھنے کی درخواست کی۔ پھر میں گھوڑا تیار کر کے اس لشکر میں اپنے ہم خیال دوستوں کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ یہ سفر اول سے آخر تک نہایت خوشگوار اور مبارک ثابت ہوا۔ آخر کار ہم فتح نامہ اور اس ہاتھی کو لے کر جو راناکیکا سے اس جنگ و جدال کا باعث ہوا تھا، فتح پور لوٹ آئے۔

داؤد کی دوبارہ بغاوت

اسی سال 20 محرم کو کوکندہ کے لشکر کا انتظار کرنے کے بعد بادشاہ فتح پور واپس ہوئے اور وہاں پہلی ماہ صفر کو پہنچ گئے۔ انہی دنوں مخبروں نے خبر پہنچائی کہ کرہی سے خانجہاں کے آگے بڑھنے کے بعد داؤد ٹانڈہ سے نکل کر آک محل کے موضع میں جس کے ایک طرف تو دریائے گنگا اور دوسری طرف پہاڑ ہے، آگیا ہے اور وہاں قلعہ اور خندق بنا کر شاہی لشکر کا مقابلہ کر رہا ہے۔ خواجہ احرار کے پوتے خواجہ عبد اللہ اس خندق کی لڑائی میں مردانگی سے لڑتے ہوئے شہید ہوگئے ہیں۔ دوسری طرف پٹھانوں کا سردار خانخاناں بھی قتل ہوگیا ہے۔ اس اطلاع پر بادشاہ نے پٹنہ و بہار کے حاکم ظفر خاں کو لکھا کہ ساری فوجیں اکٹھی کر کے خان جہاں کی مدد پر چلا جائے۔

چوگان بازی

ربیع الاول کے مہینہ میں بادشاہ میرزا محمد شریف کے ساتھ فتح پور میں چوگان کھیل رہے تھے۔ مرزا شریف نہایت ذہین، خوش مزاج اور خوش آواز نوجوان تھا اچانک وہ کھیل کے دوران گھوڑے سے گر پڑا اور اسی وقت مر گیا۔ شہنشاہ اس ناگہانی حادثہ پر دنگ رہ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کیا کریں؟ قطب الدین محمد اتکہ نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی باگ پکڑلی اور کہا خداوند آپ کھڑے کیا کر رہے ہیں؟ یہاں سے تشریف لے چلیں، تب وہ چونکے اور محل کو واپس آگئے۔ اس حادثہ کے متعلق شہر بلکہ سارے ملک میں کچھ اور افواہ اڑگئی، اس لیے بادشاہ نے اپنی صحت و عافیت کے متعلق فرامین ہر جگہ

روانہ کیے اور اس خبر سے جو شورش سی اٹھنے لگی تھی دب گئی۔ یہ فرمان کوکندہ میں مان سنگھ اور آصف خاں کے نام بھی گیا اور لشکر میں جو رنج و ملال پھیل گیا تھا مسرت و خوشی میں تبدیل ہو گیا۔

کوکندہ پر فوجی حملہ

کوکندہ ماہ ربیع الاول 984ھ/1576ء کے شروع میں فتح ہوا۔ مان سنگھ اور آصف خاں اجمیر کی فوج کے ساتھ ماندل گڑھ کے راستے متواتر کوچ کرتے ہوئے بلدہ تک جا پہنچے۔ یہ مقام رانا کیکا کے صدر مقام کوکندہ سے سات کوس پر واقع ہے۔ رانا بھی مقابلے کے لیے نکل کر آیا۔ مان سنگھ ہاتھی پر سوار تھا اور اس کے ساتھ بادشاہی امرا جیسے محمد رفیع بدخشی، شہاب الدین کرو، پائندہ قزاق، علی مراد اوزبک، راجہ لون کرن حاکم سانبھر اور دوسرے راجپوت قول (قلب لشکر) پر مقرر تھے اور بہادر نوجوانوں کی ایک جمعیت ہراول پر لگائی گئی تھی، انہی میں سے 80 سے زائد لشکریوں کو سید ہاشم بارہہ کی کمان میں ہراول سے آگے روانہ کیا گیا۔ اس قسم کے دستے کو ''جوزہ ہراول'' کہتے ہیں۔ میمنہ پر سید احمد خاں بارہہ اور دوسرے امیر تھے اور میسرہ پر قاضی خاں اور اس کے ساتھ سیکری کے شیخ زادے جو شیخ ابراہیم چشتی کے عزیز اور رشتے دار ہوتے ہیں، مقرر تھے۔ چنداول پر متھر خاں سردار تھا۔

رانا کیکا کا زبردست حملہ

جب رانا کیکا درہ کے پیچھے سے نکل کر آیا تو اس کا لشکر دو حصوں میں بٹ گیا۔ اس کی ایک فوج جس پر حکیم سور افغان سردار تھا ہراول کے مقابلے میں پہاڑ کی مغربی سمت سے آگے بڑھی۔ اس وقت پیچ دار راستے کے کٹاؤ، ناہمواری اور جھاڑ جھنکار کی وجہ سے ''جوزہ ہراول'' اور ''ہراول'' ایک ہی راستے میں خلط ملط ہو گئے اور دشمن کے مقابلے میں مدافعانہ جنگ کرتے ہوئے پسپا ہوئے۔ لشکر میں جو راجپوت تھے اور ان کی کمان راجہ لون کرن سانبھری

کرر ہا تھا وہ بھیڑوں کی طرح بائیں جانب بھاگ نکلے اور ہراول سے گزر کر انھوں نے میمنہ میں جا کر پناہ لی۔ اس وقت میں بھی ہراول کے سربرآوردہ سرداروں کے ساتھ تھا۔ میں نے آصف خاں سے کہا ''اس وقت ہم راجپوتوں میں اپنوں اور غیروں کی بھلا کس طرح تمیز کر سکتے ہیں؟'' اس نے حکم دیا برابر تیراندازی کرتے رہو یہ مت سوچو کہ کون زد میں آتا ہے چنانچہ ہم برابر تیروں کی بوچھار کرتے رہے اور اس پہاڑ جیسے انبوہ اور ہجوم میں ہمارا کوئی نشانہ خطا نہ ہوا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تیر صحیح نشانے پر لگ رہے ہیں اور مجھے یقین سا آ گیا کہ مقصود حاصل ہو گیا اور جہاد کا ثواب لازماً مل گیا۔ سادات بارہہ اور غیور نے اس موقعے پر ایسی داد شجاعت دی جو رستم کے کارناموں کی یاد دلا دے۔ دونوں طرف سے بہت سے آدمی اس محاذ پر کام آ گئے۔ دشمن کی دوسری فوج جس کی کمان خود رانا کیکا کرر ہا تھا، گھاٹی میں سے نکل کر آئی اور قاضی خاں کو جو گھاٹی کے دہانے پر لڑ رہا تھا، آگے سے ہٹا کر اسے پسپا کرتی ہوئی سیدھی قلب لشکر پر حملہ آور ہوئی۔ سیکری کے شیخ زادے ایک ہی حملے میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ فرار کے وقت شیخ ابراہیم کے داماد شیخ منصور کے سرین پر، جو اس دستے کی کمان کرر ہا تھا ایک تیر آ کر لگا۔ اس زخم سے وہ کافی عرصہ تک تکلیف اٹھاتا رہا۔ اس کے مقابلے میں قاضی خاں باوجود ملا گیری کے دشمن کے سامنے دلیری سے جما رہا۔ اس کے سیدھے ہاتھ پر ایک تلوار لگی جس سے اس کا انگوٹھا زخمی ہو گیا۔ جب مقابلے کی تاب نہ رہی تو وہ بھاگ کر قول میں آ گیا۔ وہ جمعیت جو دشمن کے پہلے حملے ہی میں لشکر سے نکل بھاگی تھی دریا پار کر کے پانچ چھ کوس تک برابر بھاگتی چلی گئی اور انھوں نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا۔

مہتر خاں کی ہوشیاری

اس نازک صورت حال میں مہتر خان نے بروقت کام کیا۔ وہ اپنے چنداول کو یکبارگی لے کر نقارہ بجاتے ہوئے آگے بڑھا اور اعلان کر دیا کہ خود بادشاہ سلامت حملہ کرتے ہوئے آ پہنچے ہیں، اس کی یہ چال کام کر گئی اور بھاگتی فوج کے قدم میدان میں جم گئے۔ مشہور

راجہ مان کا پوتا راجہ رام گوالیاری جو رانا کیکا کے آگے بڑھا چلا آرہا تھا اس نے راجا مان سنگھ کے راجپوت دستے کے مقابلے میں ایسی بہادری دکھائی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ مان سنگھ ہی وہ راجپوت تھے جو ہراول کے بائیں بازو سے بھاگ کر آصف خاں کی پسپائی کا باعث بنے تھے اور میمنہ کے سید زادوں کے پاس جاکر پناہ لے لی تھی۔ اگر اس وقت سادات ثابت قدمی سے جمے نہ رہتے تو سب کو رسوائی اٹھانی پڑتی۔

ہاتھیوں کی خوف ناک لڑائی

رانا نے بادشاہی ہاتھیوں کے مقابلے پر اپنے ہاتھیوں کو آگے بڑھایااور دومشہور مست ہاتھی ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ ہاتھیوں کا فوجدار حسین خاں جو مان سنگھ کے پیچھے ایک دوسرے ہاتھی پر سوار تھا، اس ریل پیل میں گر پڑا اور مان سنگھ اپنے ہاتھی پر مہاوت کی جگہ پر آگیا۔ اس نے حیرت انگیز ثابت قدمی کا ثبوت دیا۔ جو دو ہاتھی لڑ رہے تھے ان میں سے ایک تو بادشاہ کے خاصے کا ہاتھی تھا اور دوسرا رانا کا ہاتھی ''رام پرشاد'' نامی تھا جو نہایت قوی ہیکل تھا، دونوں میں بڑے غضب کا مقابلہ اور دونوں پوری قوت سے ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ اتفاق سے رانا کے ہاتھی کے مہاوت کو ایک تیر لگا اور وہ ہاتھیوں کی ٹکر کے صدمے سے زمین پر گر پڑا۔ عین اس وقت بادشاہی ہاتھی کا مہاوت نہایت تیزی کے ساتھ کود کر رانا کے ہاتھی کے سر پر بیٹھ گیا۔ اس نے یہ ایسا حیرت انگیز کارنامہ دکھایا تھا کہ کوئی دوسرا اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

رانا کیکا کا فرار ہونا

جب رانا نے میدان کا اس طرح رنگ بدلا ہوا دیکھا تو مقابلہ چھوڑ کر نکل گیااور رانا کے لشکر میں بڑی افراتفری سی مچ گئی۔ شاہی محافظ دستے کے جوانوں نے جو مان سنگھ کی محافظت کررہے تھے، اس موقعے پر آگے بڑھ کر ایسی لڑائی کی جو یادگار رہے گی۔ مان سنگھ نے بھی اس دن جس بہادری اور خوبی سے سرداری کے فرائض انجام دیے۔ اس سے ملا

شیری کے اس مصرعے کی تصدیق ہوگئی

''کہ ہندومی زند شمشیر اسلام''

اس معرکے میں جے مل چتوڑی کا لڑکا اور گوالیار کا راجہ رام ساہ اپنے بیٹے سالباہن کے ساتھ جو نہایت بہادری سے لڑ رہا تھا، مارا گیا۔ گوالیار کے راجاؤں کے خاندان میں کوئی دوسرا قابل جانشین نہ رہا ''خس کم جہان پاک''۔ رانا کیکا بھی جو مادھو سنگھ کے مقابل تھا، تیر کھا کر زخمی ہوگیا۔ حکیم سور سادات کے مقابلے سے بھاگ کر رانا کے پاس آ گیا اور دونوں کی فوجیں یکجا ہوگئیں۔ رانا میدان میں ٹھہر نہ سکا اور مقابلہ ترک کر کے اونچے پہاڑوں پر جہاں وہ چتوڑ کی فتح کے بعد سے ٹھہرا ہوا تھا، محصور ہو گیا۔

یہ لڑائی سخت گرمی کے موسم میں ہوئی تھی، گرمی کے مارے دماغ پگھلا جا رہا تھا۔ ہم صبح سے دو پہر تک برابر لڑتے رہے اور تقریباً 500 آدمی اس حملے میں ہلاک ہوئے۔ ان میں سے 120 مسلمان اور باقی مرنے والے ہندو تھے۔ زخمیوں کی تعداد 300 سے زائد تھی۔ تیز دھوپ کی وجہ سے میدان جنگ تنور کی طرح دھک رہا تھا اور گرمی کی وجہ سے سپاہیوں میں نقل و حرکت کی قوت نہ رہی تھی۔ غالب گمان یہی تھا کہ رانا پہاڑ کے پیچھے کھات میں چھپا ہوگا اسی لیے لشکر نے اس کا تعاقب نہ کیا اور اپنے کیمپ کو لوٹ گیا، جہاں زخمیوں کی مرہم پٹی کی گئی۔

شاہی فوج کوکندہ میں

دوسرے دن وہاں سے کوچ کر کے ہم میدان کارزار میں گئے۔ لاشوں کی دیکھ بھال اور سب کی کارگزاریوں کا جائزہ لینے کے بعد درّے میں داخل ہوئے اور کوکندہ پہنچ گئے وہاں رانا کے چند فدا کار رہ گئے تھے جو اس کے محل کی حفاظت کر رہے تھے۔ چند معذور اور ضعیف لوگ بھی تھے اور یہ سب مل کر کل بیس آدمی تھے۔ ہندوؤں کی پرانی رسم کے مطابق کہ وہ شہر خالی کرتے وقت اپنی آبرو اور ناموس کی خاطر خودکشی کر لیتے ہیں یہ بھی گھروں اور بت خانوں میں جمع ہوئے اور عجیب عجیب حرکتیں کرنے کے بعد انھوں نے تلواروں سے

اپنے آپ کو ہلاک کرلیا اور سیدھے دوزخ میں چلے گئے۔

اندیشہ تھا کہ رانا شب خون مارے گا، اس لیے امرائے شاہی نے شہر کی کوچہ بندی کردی اور خندق کھدوا کر اتنی اونچی دیوار بنوادی کہ سوار بھی اس پر چڑھ نہ سکے۔ جب لشکر شہر میں ٹھہر گیا تو مقتولین جنگ کی اور ہلاک ہونے والے گھوڑوں کی تفصیلی فہرست تیار کی گئی تاکہ وہ عریضے کے ساتھ منسلک کردی جائے۔ اس وقت سید احمد خاں بارہہ نے کہا ہمارا نہ تو کوئی آدمی مارا گیا نہ کوئی گھوڑا ضائع ہوا۔ ان کے نام بادشاہی دفتر میں پہنچانے سے کیا حاصل یہ لکھت پڑھت چھوڑو اور سب سے پہلے غلّے کی فکر کرو، وہ پہاڑی نہایت بنجر تھی چنانچہ لشکر میں اناج کی قلت ہوگئی۔ کوئی بنجارہ غلہ بھی لے کر نہ آیا اور فوج بڑی تنگی میں مبتلا ہوگئی۔ امراء نے مجلس مشاورت منعقد کی اور امراء میں سے باری باری ایک ایک کو سردار بنا کر غلہ لانے کے لیے مواضعات کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان لوگوں نے بلند ٹیکروں اور چوٹیوں پر پہنچ کر جہاں جہاں شکست کھائی ہوئی فوجوں کی ٹکڑیاں جمع تھیں سب کو قیدی بنا لیا اور ان کے مویشی پکڑ کر لے آئے، انہی مویشیوں کے گوشت پر گزر اوقات ہوتی رہی، البتہ پہاڑیوں میں آم اتنی کثرت سے تھے کہ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہاں کے غریب لوگ عموماً صبح کے وقت کھانے کے بجائے یہی آم کھایا کرتے تھے اور رطوبت کی وجہ سے اکثر بیمار ہوجاتے تھے، وہاں کے آم کا وزن تقریباً اکبری سیر کے برابر تھا اس کو چھلکا بھی پتلا ہوتا تھا لیکن میٹھا اور مزے دار نہیں تھا۔

اسی اثنا میں دربار سے محمود خاں خواص حسب الحکم حملہ کرتے ہوئے کوکندہ آیا اور جنگ کی روداد معلوم کرکے دوسرے ہی دن واپس چلا گیا۔ ہر ایک کی کارگزاری بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ نے فوج کی کارکردگی کی تعریف کی لیکن یہ بات کہ رانا کا تعاقب نہیں کیا گیا اور اسے زندہ بچ کر جانے دیا بادشاہ کو پسند نہ آئی۔

رام پرشاد ہاتھی

امراء فتح نامے کے ساتھ "رام پرشاد" ہاتھی کو جو غنیمت میں ہاتھ آیا تھا بادشاہ کے پاس بھیجنا

چاہتے تھے۔ اس ہاتھی کو بادشاہ نے متعدد بار رانا سے مانگا تھا اور وہ اپنی بدبختی سے اسے دینے پر کبھی راضی نہ ہوا تھا۔ آصف خان نے میرا نام لے کر کہا کہ "یہ محض دوستی اور ہمراہی کی خاطر اس لشکر کے ساتھ آیا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ فتح نامہ اور ہاتھی اس کے ذریعہ بھیج دیا جائے۔" مان سنگھ نے جواب دیا ابھی بہت سے کام کرنے ہیں، ان کو لشکر میں رہ کر ہر معرکے کے وقت صفوں کی امامت کرنا چاہیے۔ میں نے کہا "یہاں امامت کا اب کیا کام ہے؟" اس وقت تو مجھے جا کر خود بادشاہ کی امامت کرنی ہے۔ میری بات پر وہ مسکرایا اور میرے ساتھ 300 سواروں کی حفاظت میں مذکورہ ہاتھی کو روانہ کردیا۔ خود مان سنگھ بھی سیر وشکار اور تھانے قائم کرنے کے ارادے سے ہمارے ساتھ قصبہ موہن تک جو کہ گوکندہ سے 20 کوس کے فاصلے پر ہے آیا اور سفارش نامہ لکھ کر مجھے وہاں سے رخصت کیا۔

میں باکھور اور ماندل گڑھ کے راستے سے مان سنگھ کے وطن قصبہ انبیر پہنچا۔ ہمارا جہاں بھی گزر ہوتا تھا لوگ مان سنگھ کی جنگ اور کامیابی کا حال سننے کے لیے جمع ہوجاتے تھے اور لوگوں کو اس کا یقین نہیں آتا تھا۔ انبیر سے پانچ کوس کے فاصلے پر ہم پہنچے تھے کہ ہاتھی دلدل میں پھنس گیا جس قدر وہ آگے بڑھتا تھا اسی قدر اندر دھنستا جارہا تھا۔ میرے ذمے اس قسم کی یہ پہلی ہی خدمت تھی۔ اس لیے میں سخت پریشان ہوا۔ آخر وہاں کے رہنے والے پہنچے انھوں نے بتایا کہ گزشتہ سال بھی اس جگہ سرکاری ہاتھی پھنس گیا تھا۔ اب ہاتھی کے نکلنے کی یہی صورت ہے کہ یہاں کنجال اور پتلا کیچڑ کافی مقدار میں پھیلا دو تاکہ دلدل کچھ نرم ہوجائے اور ہاتھی آسانی سے نکل آئے۔ سقّوں نے اسی طرح کیا، جب انھوں نے بہت سا پانی لاکر ڈالا تو ہاتھی آسانی سے نکل آیا اور ہم انبیر میں داخل ہوئے۔ انبیر والے تو اس فتح کی وجہ سے بڑا فخر کرنے لگے۔

بارگاہ شاہی میں حاضری

ہم انبیر میں تین چار دن رہے اور قصبہ تودہ کے راستے سے جو میری جائے پیدائش ہے وہاں سے بیساور جہاں میرا خاندان مقیم ہے، گئے اور وہاں سے اوائل ماہ ربیع الآخر میں فتح

پور پہنچ گئے۔ میں مان سنگھ کے والد راجہ بھگوان داس کے وسیلے سے فتح پور کے بادشاہی دیوان خانے میں باریاب ہوا اور کورنش بجالا کر امراء کے عریضے اور ہاتھی کو پیش کیا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کا نام کیا ہے؟ میں نے عرض کیا ''رام پرشاد'' فرمایا چونکہ یہ سب پیر کے طفیل میں حاصل ہوا ہے اس لیے اس کا نام اب ''پیر پرشاد'' ہوگا۔ پھر مخاطب کیا کہ ''امراء نے تیری تو بہت تعریف لکھی ہے سچ بتانا کہ تو کون سی فوج میں تھا اور کیا کارنامہ تو نے انجام دیا؟'' میں نے کہا ''یہ ناچیز بادشاہوں کے سامنے لرزاں و ترساں سچ ہی بیان کرنے کا عادی ہے، بھلا جھوٹ کس طرح کہہ سکتا ہے اور جو کچھ واقعہ تھا میں نے ٹھیک ٹھیک بتا دیا۔ بادشاہ نے پوچھا تم نہتھے تھے یا مسلح؟ میں نے کہا، ایک زرہ اور تلوار میرے پاس تھی۔ فرمایا یہ سامان تم کو کہاں سے مل گیا؟ عرض کیا، سید عبد اللہ خاں سے میں نے لیا تھا۔ بادشاہ نے بڑی تحسین و تعریف کی۔ ان دنوں ہمیشہ بادشاہ کے سامنے اشرفیوں کا ایک ڈھیر لگا رہتا تھا، چنانچہ مٹھی بھر اشرفیاں اٹھا کر جو کل 96 تھیں مجھے انعام دیا۔ پھر پوچھا ''شیخ عبدالنبی سے ملاقات کی ہے؟'' میں نے کہا راستے کی گرد جھاڑتے ہوئے سیدھے خدمت میں حاضر ہوا ہوں اُن سے کیسے مل سکتا تھا؟ پھر بادشاہ نے ایک اعلیٰ قسم کا نخودی دوشالہ اٹھا کر مجھے دیا کہ یہ لے جاؤ اور شیخ سے ملاقات کرو اور اُن سے کہنا کہ یہ دوشالہ ہم نے تمہارے لیے اپنے خاص کارخانے میں تیار کرایا ہے، اسے اوڑھ لو''۔ میں وہ دوشالہ لے کر شیخ عبدالنبی کے پاس گیا ور اسے بادشاہ کا پیغام دیا۔ شیخ بہت خوش ہوا اور مجھ سے پوچھا کہ رخصت کرتے وقت میں نے تم سے کہا تھا مقابلہ کے وقت مجھے دعا میں یاد رکھنا۔ میں نے کہا اس وقت تو میں نے یہ دعا " اللهم اغفر اللمومنين واللمومنات وانصر من نصر دين محمد و اخذَ من خذل دين محمد عليه الصلوٰة و السلام" پڑھی تھی۔ شیخ نے کہا یہ بھی کافی ہے۔ سبحان اللہ! کس قدر جائے عبرت ہے کہ یہی وہ شیخ عبدالنبی ہے کہ وہ جب دنیا سے رخصت ہوا تو ایسے بُرے حال میں کہ خدا کسی کو نہ دکھائے نہ سنوائے اور سب کو اس سے عبرت ہو:

ہرکرا پرورد گیتی عاقبت خوش بریخت
حال آن فرزند چون باشد کہ خصمش مادر است

اسی سال بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کے ذریعہ خان جہاں کے پاس فرمان بھیجا اور اسے بہ نفس نفیس وہاں پہنچنے کی خوشخبری دی۔ اس وقت خاں جہاں کہل گاؤں کے قریب داؤد کے مقابلے میں مورچے جمائے مظفر خاں اور بہادر حاجی پور کے لشکر کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کے لشکر کی مدد کے لیے ڈاک چوکی کے ذریعے پانچ لاکھ روپیہ بھیجا اور غلّے سے بھری ہوئی بہت ساری کشتیاں آگرہ سے روانہ کرنے کا حکم دیا۔

بادشاہ کا ارادہ بنگال

اسی دوران خبر پہنچی کہ حاجی پور کے علاقے کے زمیندار کھیتی نے جو باغی ہوگیا تھا، فوج اکٹھی کر کے تھانہ آرہ پر جہاں فرحت خاں اور اس لڑکا میرک ردائی مامور تھے، حملہ کر دیا اور دونوں کو شہید کر دیا ہے اور اس کی فوج کشی کی وجہ سے تمام راستے بند ہوگئے ہیں۔ اس اطلاع پر بادشاہ سن مذکور میں 25 ربیع الآخر کو فتح پور سے مشرقی ہندوستان کی طرف روانہ ہوئے اور پانچ کوس طے کر کے منزل کی اور اس منزل پر سید عبداللہ خاں داؤد کا سر لے کر حاضر ہوا اور سید میر کی فال جفر کا وہ شعر جو اس نے پٹنہ سے واپسی کے وقت جونپور میں نکالا تھا سچ ثابت ہوا۔ وہ شعر تھا:

مژدہ فتح بہ ناگاہ رسد
سر داؤد بدرگاہ رسد

داؤد کی شکست اور قتل

جس دن سید عبداللہ خاں کہل گاؤں کے قریب خاں جہاں کے لشکر میں پہنچا تو حملے کی تیاری کی گئی اور دوسرے دن کہ جب ربیع الآخر کی 15 تاریخ تھی خان جہاں اور مظفر خاں نے صف آرائی کی اور تمام امراء کو ان کی ذمے داریاں سپرد کیں۔ اس وقت داؤد بڑے نخوت و غرور کے ساتھ اپنے چچا جنید کرّانی اور دوسرے سرداروں کو لے کر قلعے سے باہر آیا اور جنگ چھیڑ دی۔ پہلے ہی حملے میں توپ کا ایک گولہ جنید کو آ کر لگا اور اس کے چیتھڑے

اڑ گئے۔ جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی تو پٹھان شکست کھا کر بھاگ نکلے، اور داؤد کا گھوڑا ایک دلدل میں پھنس گیا۔ حسین بیگ اس کے پیچھے لگا ہوا تھا، وہ داؤد کی مشکیں کس کر اسے خان جہاں کے پاس لے آیا۔ داؤد سخت پیاسا ہو رہا تھا، اس نے پانی مانگا۔ لوگوں نے اسی کے جوتے میں پانی بھر کر اس کو پیش کیا۔ جب اس نے نہ پیا اور منہ پھیر لیا تو خانجہاں نے اپنے خاص پیالے سے اسے پانی پلایا۔ داؤد نہایت خوبصورت اور حسین تھا اس لیے خان جہاں اسے قتل کرنا نہیں چاہتا تھا، آخر امراء نے کہا کہ اس کو زندہ چھوڑنے میں فتنہ وفساد کا اندیشہ ہے۔ خان جہاں نے مجبور ہو کر اس کی موت کا حکم دے دیا اور اس کے سر کو کاٹ کر گھاس سے بھر کر خوشبو میں بسایا گیا اور عبد اللہ خاں کے حوالے کر کے روانہ کر دیا۔ اس فتح میں شاہی لشکر کو بہت سے ہاتھی اور مال غنیمت حاصل ہوا۔

اکبر کی اجمیر روانگی

بادشاہ اس فتح کے شکرانے میں اسی سال 23 جمادی الثانی کو دوبارہ اجمیر تشریف لے گئے اور ماہ رجب کی 6 تاریخ کو جس دن کہ خواجہ صاحب کا عرس تھا، وہاں پہنچے۔ خواجہ خاوند محمود کے لڑکے سلطان خواجہ کو ''امیر الحاج'' بنا کر چھ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرا سامان حرمین شریفین کے مستحق لوگوں کے لیے اور حرم مبارک میں ایک عمارت بنوانے کے لیے روانہ کیا۔ جس وقت سلطان خواجہ رخصت ہونے لگا، بادشاہ بھی زائروں کی طرح ننگے سر ننگے پیر احرام باندھے حاجیوں کا لباس پہن کر اور تھوڑے تھوڑے بال ترشوا کر کچھ دور تک اس قافلے کے ہمراہ گئے۔ بادشاہ کو اس حال میں دیکھ کر لوگوں کو بڑی رقت ہوئی اور لوگ چیخیں مار کر نالہ وفریاد کرنے لگے۔ سلطان خواجہ کے بدرقے کے لیے قطب الدین محمد خاں، قلیچ خاں اور آصف خاں کو مقرر کر کے حکم دیا گیا کہ امراء اس قافلے کو کوکندہ سے بخیر وخوبی آگے پہنچا کر رانا کے سارے علاقے کو پامال کر دیں اور اس کا جہاں بھی پتہ چلے گھیر کر زندہ نہ چھوڑیں۔

شاہ طہماسپ کا انتقال

اس موقعے پر خبر آئی کہ ایران میں شاہ طہماسپ فوت ہوگیا ہے اور شاہ اسماعیل ثانی اس کا جانشین ہوا ہے۔ اس قافلے کی روانگی پر تاریخ نکالی گئی:

"اول دولت و فتح وظفر است"

اس وقت بادشاہ نے عام منادی کرادی کہ جو شخص چاہے قافلے کے ساتھ حج پر جا سکتا ہے، اس کا سفر سرکار سے ادا کیا جائے گا۔ چنانچہ بے شمار لوگ اس سال حج کی سعادت سے فیض یاب ہوئے۔ ایک زمانہ وہ تھا اور ایک زمانہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کا نام بھی نہیں لے سکتا اور حج کی اجازت کی درخواست پر ہی لوگ واجب القتل مجرم بن جاتے ہیں۔ "تلک الایام نداولھا بین الناس"۔

ان دنوں جب کوکندہ کے لشکر کی عسرت وتنگی کی شکایتیں پہنچے لگیں تو بادشاہ نے مان سنگھ، آصف خاں اور قاضی خاں کو وہاں سے طلب کرلیا۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ان کو بعض قصوروں پر چند دن کے لیے کورنش سے محروم کردیا اور غازی خاں بدخشی، مہتر خاں، علی مراد اوزبک، خنجری ترک اور دوسرے ایک دو افسروں کو جن میں میں بھی شامل تھا، ان سے مستثنیٰ کرکے شاہانہ عنایت سے نوازا گیا اور ان کے مناصب میں ترقی ہوگئی۔ باقی تمام لوگوں کا تنزل ہوگیا، اگرچہ بعد میں ان کو بھی بادشاہ نے معاف کردیا۔

خواجہ شاہ منصور کی حاضری

رانا کیکا شکست کھانے کے بعد اودے پور اور خان پور وغیرہ کے پہاڑوں میں قزاقی کرتا پھر رہا تھا۔ بادشاہ نے اس کی سرکشی کے لیے اسی مہینے کی 19 تاریخ رانا کے علاقے کی جانب کوچ فرمایا۔

اس زمانے میں خواجہ شاہ منصور شیرازی خدمت میں آیا بہت پہلے وہ کچھ عرصے بادشاہی خوشبو خانے کا مہتمم رہا تھا لیکن مظفر خاں سے دشمنی ہو جانے کی وجہ سے شاہی خدمت سے بھاگ کر جون پور میں منعم خاں کے پاس چلا گیا تھا۔ منعم خاں نے اس کی

بڑی قدر و منزلت کی اور خواجہ منصور ترقی کر کے دیوانی کے عہدے پر مامور ہوا۔ جب منعم خاں کا انتقال ہوگیا تو بادشاہ نے فرمان بھیج کر اسے دربار میں بلالیا۔ خواجہ منصور چونکہ نہایت تجربہ کار کاردان اور سنجیدہ آدمی تھا، اس لیے بادشاہ نے اسے تمام ممالک محروسہ کا دیوان بنادیا اور وہ امور ملکی میں راجہ ٹوڈرمل کا با اختیار شریک ہوگیا۔

مشہور ہے، اول حق بعد میں ظلم، آدمی اقتدار پانے کے بعد ظلم وستم پر اتر آتا ہے اور خواجہ کے ساتھ تو یہ بھی اتفاق پیش آیا کہ اسی سال دُمدار ستارہ مغرب کی جانب سے طلوع ہوا۔ چونکہ خواجہ منصور دنبالہ دار پگڑی باندھا کرتا تھا۔ اس لیے لوگوں نے اس کا نام ستارۂ دنبالہ دار یعنی'' جھاڑو تارا'' رکھ دیا خواجہ فوج کا حساب کتاب نہایت سختی کے ساتھ کرنے لگا اور اس کی جابے جا پکڑ دھکڑ سے لوگ ایسے تنگ آئے کہ وہ راجہ اور مظفر خاں کی سختیاں بھول گئے اور اس پر لعنتیں بھیجنے لگے۔

شاہ اسماعیل کا قتل

اسی سال خبر پہنچی کہ عراق کے بادشاہ شاہ اسماعیل ولد شاہ طہماسپ کو اس کی بہن پری خانم نے امراء کے ساتھ ساز باز کر کے قتل کرادیا ہے۔ میر حیدر معمائی نے اس کی تاریخ جلوس ''شہنشاہ روی زمین'' اور اس کی تاریخ وفات ''شہنشاہ زیر زمین'' نکالی۔ جو دمدار ستارہ طلوع ہوا تھا اس کا اثر عراق میں ظاہر ہوا اور وہاں اس واقعے سے بڑا انتشار پھیل گیا۔ تبریز، شروان اور مازنداران پر رومیوں نے زبردستی قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد سلطان محمد خدابندہ جو شاہ طہماسپ کی دوسری بیوی سے تھا، تخت پر بیٹھا۔ اس لیے بادشاہ کے دور میں وہاں ایک بڑی اچھی تبدیلی ہوئی۔ مدت سے وہاں کی حکومت کے زیر سایہ جو صحابہ کے خلاف تبرا ہوتا تھا اور خلفائے بنو امیہ پر لعنت کی جاتی تھی وہ ختم ہوگئی۔ لیکن وہاں کی بے دینی ہمارے ملک ہندوستان میں سرایت کرگئی:

نفاق آمدہ در ہند از بلاد عراق
عراق قافیہ میدان بہ رہگذار نفاق

قلعہ ایدر پر حملہ

جس وقت قصبہ موھنی میں سرا پردۂ شاہی نصب ہوا تو قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کے نام فرمان جاری کیا گیا کہ دونوں سردار کوکندہ میں ٹھہرے رہیں اور قلیج خان دوسرے امرا کے ساتھ حاجیوں کے قافلے کو لے کر ایدر تک جو احمد آباد سے چالیس کوس پر ہے، جائے اور وہاں کے زائرین کو بھی قافلے کے ساتھ احمد آباد روانہ کرنے کا انتظام کرے۔ قافلے کو رخصت کر کے ایدر کے قلعے کا محاصرہ کرے اور راجہ نرائن داس کی بغاوت کو پوری طرح کچلنے کے لیے قلیج خان نے حکم کی تعمیل کی اور حاجیوں کے قافلے کو تیمور خاں بدخشی کے ہمراہ 500 سواروں کی حفاظت میں منزل تک پہنچا دیا۔ اس کے فوجی حملے سے ایدر کا راجہ بھی رانا کیکا کی طرح پہاڑوں اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔

بادشاہ کی مالوہ روانگی

اسی جگہ شہاب خاں اور شاہ بداغ خاں اپنے لڑکے عبد المطلب خاں کے ساتھ اور شاہ فخرالدین خاں اور مالوہ کے دوسرے جاگیر دار دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے غازی خاں بدخشی کو ہزاری کا منصب عطا کر کے شریف محمد خاں اتکہ، مجاہد خاں اور ترک سبحان قلی اور تین ہزار سواروں کی جمعیت کے ساتھ قصبہ موھنی میں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ مداریہ کی پہاڑیوں میں عبدالرحمٰن ولد مؤید بیگ کو پانچ سو آدمیوں کی چوکی پر مقرر فرمایا۔ قطب الدین خاں اور راجہ بھگوان داس کو بھی کوکندہ سے لشکر میں طلب کیا گیا اور اودے پور پر شاہ فخرالدین اور جگناتھ کو مامور کیا۔ سید عبداللہ خان اور راجہ بھگوان داس کو اودے پور کے درہ پر مقرر فرمایا۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ کوچ کر کے بانس والہ اور ڈونگر پور پہنچے۔

اسی مقام پر بنگالہ سے راجہ ٹوڈرمل وہاں کا مال غنیمت اور 500 ہاتھی لا کر حاضر ہوا۔ اسی جگہ پر قلیج خاں کو ایدر سے بلا کر اس کی جگہ آصف خاں کو لشکر کا سردار بنا دیا اور قلیج خاں کو کھنبایت کے کلیان رائے بقال کے ساتھ سورت کی بندرگاہ پر بھیج دیا تا کہ وہ فرنگیوں سے پروانہ راہداری لے کر سلطان خواجہ کے جہاز کو اس پروانے کے نہ ملنے کی وجہ سے جو

وہاں لنگر ڈالے پڑا تھا روانہ کرادے اور مالوہ میں شاہی لشکر سے آکر مل جائے۔

جلوس کا تیئسواں سال

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں نو روز کا انعقاد ہوا اور جلوس کا تیئسواں سال شروع ہوا۔ اس مرتبہ نوروز کا جشن مالوہ کے قریب دیپالپور کے قصبے میں منایا گیا۔ میں ان دنوں بری طرح بیمار ہوگیا تھا اور پیاور ہی میں ٹھہر گیا تھا۔ میں نے جشن میں شرکت کے لیے بانس والہ کے راستے سے لشکر میں پہنچنے کا ارادہ کیا۔ ھنڈون میں سید عبد اللہ خاں سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے اس راستے کو خطرناک بتایا اور مجھے لوٹا کر بجونہ لے آیا۔ چند دن شاہی امامت کی ذمے داریوں کا خیال کرکے رضوی خاں کے ساتھ گوالیار، سارنگ پور اور اجین ہوتے ہوئے 12 ذی الحج کو میں دیپال پور مالوہ پہنچا اور دربار میں حاضری دی۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک نفیس حمائل شریف اور خطبوں کی ایک بیاض جس میں صنائع بدائع سے مرصع نہایت عمدہ خطبے درج تھے، پیش کیے۔ یہ دونوں چیزیں حافظ محمد امین قندھاری کی تھیں۔ حافظ جیسا خوش الحان شخص اس زمانے میں میں نے کسی اور کو نہیں پایا۔ جس وقت پیاور کے محل کروھہ میں منزل کی گئی تھی حافظ کے پاس سے یہ دونوں چیزیں چور اڑا لے گئے تھے۔ بعد میں عبد اللہ خاں نے تفتیش کرکے ان کو حاصل کیا تھا اور انھیں میرے سپرد کردیا تھا۔ جب میں نے بادشاہ کو یہ نذرانے میں پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے اور حافظ محمد امین کو بلا کر مذاقاً فرمایا ایک حمائل شریف کسی جگہ سے ہمارے پاس تحفے میں آئی ہے میں وہ تمھیں عطا کرتا ہوں۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا اور ایسے خوش ہوا جیسے اُسے نئی زندگی مل گئی ہو، جھک جھک کر تسلیمات بجا لایا اور شکرانے کا سجدہ ادا کرکے عرض کیا۔ حضرت نے اسی دن عبد اللہ خاں کو فرمایا تھا کہ اسے انشاء اللہ تو ہی تلاش کرکے لائے گا، آپ کی وہ بات پوری ہو کر رہی۔ بادشاہ نے مجھ سے ان نسخوں کے ملنے کا حال دریافت کیا تو میں نے عرض کیا کہ مزدوروں کی ایک جماعت پیاور کے قصبوں میں حوض اور کنوؤں کے کھودنے کا کام کرتی ہے اور اسی بہانے چوری ڈکیتی کرتی ہے۔ انھی

مزدوروں نے یہ چیزیں چرائی تھیں۔ ان میں سے ایک شخص نے اپنے ساتھیوں سے جھگڑ کر سید عبد اللہ خاں کے پاس مخبری کردی۔ خاں نے سب کو پکڑ لیا اور انھوں نے اپنی چوریوں کا اقرار کرلیا۔ بادشاہ نے حافظ کو مخاطب کر کے کہا مطمئن رہو انشاء اللہ تمہارا دوسرا سامان بھی نکل آئے گا۔ اس نے عرض کیا میں تو صرف اس مصحف اور بیاض کے لیے فکرمند تھا، یہ آبا و اجداد سے ورثے میں ملی ہیں اور ان کے بغیر میں خطبے مرتب کرنے سے معذور ہوگیا تھا۔ بقیہ سامان کی تو مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔ اس سفر سے واپسی میں جیسا کہ بادشاہ نے فرمایا تھا اس کا وہ سارا سامان جوں کا توں انہی بیلداروں کے پاس سے برآمد ہوگیا۔ عبداللہ خاں نے یہ سامان فتح پور میں لاکر بادشاہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

اسی جگہ بادشاہ نے از سرنو مجھے امامت کرنے کا حکم دیا اور حسب سابق خواجہ دولت ناظر کو مقرر کیا گیا کہ ہفتے میں ایک دن اور ایک رات مجھے چوکی پر حاضر کردیا کرے معاملہ اسی قسم کا تھا کہ: ''نہا مکتب میں نہیں جاتا بلکہ اسے تو لے جایا جاتا ہے۔'' اس علاقہ کے انتظامات کے لیے چند دن تک دیپالپور میں قیام کیا گیا اور بعض بڑے امراء کو جیسے شہاب الدین احمد خاں وغیرہ کو مالوہ کے جاگیرداروں کے ساتھ راجہ علی خاں پر حملہ کرنے اور اس کے ملک فتح کرنے کے لیے برہانپور کی طرف روانہ کیا اور اس لشکر کے داغ و محلّہ کا کام شہباز خاں بخشی کے سپرد کیا گیا۔ اسی منزل سے راجہ ٹوڈرمل کو اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ گجرات کی جمع بندی کی تحقیقات اور وہاں کے انتظامات کے لیے مامور کیا گیا تھا۔

راجا نارائن داس کی شکست

اسی اثنا میں خبر آئی کہ آصف خاں نے ایدر کو فتح کرلیا ہے اور راجہ نرائن داس کو شکست ہوئی ہے۔ جب قلیج خاں کو علی مراد اوزبک کے ساتھ ایدر سے دربار میں بلا لیا گیا تھا اور آصف خان کو لشکر کی سرداری پر نامزد کیا گیا تھا تو راجہ ایدر، رانا کیکا اور دوسرے زمینداروں کی مدد سے فوج اکٹھی کر کے ایدر سے دس کوس کے فاصلے پر تھانہ پر حملہ آور ہوا اور رات کو حملہ کرنے کا ارادہ کیا۔ جب لشکر کو یہ خبر ملی تو آصف خاں، میرزا محمد مقیم تیمور بدخشی، میر ابو

الغیث بخاری اور میر محمد معصوم بھکری وغیرہ نے مشورہ کیا کہ تقریباً 500 سواروں کو تھانہ کی حفاظت پر چھوڑ کر پیش قدمی کی جائے اور راجہ پر حملہ کر دیا جائے، چنانچہ چار ذی الحج 984ھ/ 1588ء کی صبح کو یہ لوگ سات کوس کا فاصلہ طے کر چکے تھے کہ دوسری طرف سے راجہ نارائن داس پوری تیاریوں کے ساتھ بڑھ آیا اور دونوں فوجوں میں لڑائی چھڑ گئی۔ میرزا محمد مقیم نے جو ہراول پر مقرر تھا سب سے آگے بڑھ کر حملہ کیا اور شہید ہو گیا لیکن اس کے زبردست حملے نے غیر مسلموں کے پیر بھی میدان سے اکھاڑ دیے اور وہ بُری طرح شکست کھا کر بھاگے اور پناہ گاہوں میں چھپ گئے۔ جب آصف خاں کا عریضہ بارگاہ میں پہنچا تو اس لشکر کے سرداروں کے نام عنایت آمیز فرمان روانہ کیے گئے۔

اسی سال میر سید محمد میر عدل نے جو بھکر کی حکومت پر مقرر ہوئے تھے میر سید ابو الفضل اور اپنے دوسرے بیٹوں کو سیوستان پر حملہ کرنے بھیجا۔ ان لوگوں نے تھوڑی سی مدت میں اس قلعے کو فتح کر لیا۔ میر سید ابو القاسم ولد میر سید صفائی جو بھکر کے سر برآوردہ آدمی ہیں۔ دربار میں حاضر ہوئے ان کو احدیہ کا منصب عطا کیا گیا۔

شریف آملی کی آمد

انہی دنوں شریف آملی دیپال پور کے علاقے میں آ کر باریاب ہوا۔ یہ مردود اور نابکار پاگل کتے کی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں گھومتا پھرتا تھا اور ہمیشہ ایک مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیتا تھا۔ بڑے مباحثے اور مجادلے کرتا رہتا تھا، انجام کار اس نے سارے اعتقادات ترک کر کے الحاد و بے دینی کو اپنا شعار بنا لیا۔ کچھ عرصے تک صوفیوں کے بھیس میں بلخ میں مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے پوتے مولانا محمد زاہد کی خانقاہ میں درویشوں کے ساتھ گزر بسر کرتا رہا۔ اس کو درویشی سے کوئی تعلق خاطر نہ تھا اس لیے وہ وہاں ہمیشہ درویشوں کو اپنی ہرزہ سرائی اور نوک جھونک سے پریشان کرتا رہتا تھا تنگ آ کر ان لوگوں نے اسے خانقاہ سے نکال دیا۔

بلخ سے نکلنے کے بعد وہ سیر و سفر کرتے ہوئے دکن جا پہنچا، وہاں کے لوگ بھی جب

اس کی خباثتوں سے واقف ہوئے تو انھوں نے اس کا قصہ ہی پاک کردینے کا فیصلہ کرلیا لیکن ترس کھا کر اسے بس اتنی سزا دی کے گدھے پر سوار کرکے بڑی رسوائی کے ساتھ اس کی تشہیر کرادی۔ ہندوستان ایک وسیع ملک ہے اور یہاں کسی کو کسی سے کوئی واسطہ نہیں، ہر شخص جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتا ہے اس لیے وہ بھی دکن سے نکل کر آزادی کے ساتھ گھومتا پھرتا اسی زمانے میں مالوہ پہنچ گیا اور لشکر سے پانچ کوس کے فاصلے پر اپنا ٹھکانا بنایا اور طرح طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے لگا اور نہایت زہریلے خیالات پھیلانے لگا۔ اس کی مجلس میں جاہل عوام حاضر ہونے لگے، خاص طور سے عراقیوں کا اس کے پاس مجمع لگا رہتا تھا۔ یہ عراقی تو ایمان سے ایسے نکلے ہوئے ہیں جیسے مکھن سے بال نکل آتا ہے، دجال نکلے گا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرنے والے بس یہی عراقی ہونگے۔ اس بد بخت نے ان عراقیوں کے ذریعے یہ شہرت کی کہ وہ دسویں صدی کا مجدد ہے۔ اس پر بڑا ہنگامہ برپا ہوا اس کی خبر جب اکبر کو ہوئی تو اس نے ایک رات اسے اپنی مجلس میں بلا بھیجا اور قالوں کی بنی ہوئی اس طویل مسجد میں جس میں پانچ وقت نماز ادا کی جاتی تھی اکبر نے اس سے خلوت میں باتیں کیں۔ جب وہ آیا تو اپنی مضحکہ خیز شکل، ناگوار ہیئت کذائی اور ٹیڑھی گردن کے ساتھ جھک کر کورنش[49] ادا کی اور کافی دیر تک ہاتھ باندھے ہوئے اپنی کنجی آنکھوں کو جھپکاتے ہوئے جو حضور اکرمؐ کی دشمنی کی نشانی ہے کھڑا رہا۔ اس کے سراپا سے جھوٹ، ریاکاری اور منافقت نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔ کافی دیر کے بعد جب بادشاہ نے اسے بیٹھ جانے کا حکم دیا تو سجدہ کرکے اونٹ کی طرح دوزانو بیٹھ گیا۔ اکبر اس کے سامنے جا بیٹھا اور تنہائی میں باتیں کرنے لگا۔ سوائے حکیم الملک کے اس جگہ کسی اور کو کھڑے ہونے کی اجازت نہ تھی۔ دور سے کبھی کبھی اس کی آواز بلند ہوتی تھی۔ میں نے بس ''علم'' کا لفظ سنا۔ غرض اس نے بڑی خرافات بکیں اور انھیں حقائق اور اصل الاصول بتاتا رہا:

قومی نہ زظاہر نہ زباطن آگاہ   آنکہ زجہالت بہ لطافت آگاہ
مستغرق کفرند و حقیقت گویند   لا حول ولا قوۃ الا باللہ

شریف آملی کا مسلک محمود بسی خوانی کے مسلک کی نقل تھا۔ اس محمود نے امیر

تیمور صاحبقران کے زمانے میں گیلان کے ایک گانو پسی خوان میں ظہور کیا تھا۔ اس نے 13 منحوس رسالے لکھے تھے جو ہر طرح کے زندقے سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک رسالہ کا نام ''نیتال'' تھا، جسے اس نے ''علم لفظ و حال'' کا نام دیا ہوا تھا۔ اس بد بخت کی تمام تصانیف کا خلاصہ ''بحرو کوزہ'' نامی ایک کتاب تھی۔ جو غلاظت اس کتاب میں اس نے جمع کی ہے اس کو سن کر ہی قے ہونے لگتی ہے۔ اگر شیطان اس کو سن لے تو مارے خوشی کے ناچ اٹھے۔ اس شریف کثیف نے بھی کمالات کا ایک مجموعہ بنا رکھا تھا جسے ''ترشح ظہور'' کا نام دیے ہوئے تھا۔ اس کتاب کی ترتیب اس نے میر عبد الاول کے مجموعے کی طرح رکھی تھی کہ اسکے ہرنا مربوط عام فریب فقرے کا عنوان اس لفظ کو رکھا گیا ہے جس سے وہ فقرہ شروع ہوتا ہے۔ غرض یہ کتاب نہایت مضحکہ خیز تھی۔

خدا کی شان دیکھیں کہ باوجود اس جہالت کے اس مکار نے اس طرح لوگوں پر اپنی فضیلت کا سکہ جمایا کہ اب وہ ہزاری منصب دار بنا بیٹھا ہے اور بنگالہ میں ''مذہب حق'' کا داعی مقرر ہوا ہے۔ بادشاہ کے چار مخلص یاروں میں شامل ہے، مریدوں اور معتقدوں کے سامنے شاہی مراتب کی نیابت کرتا ہے۔ ان مراتب کا ذکر آگے آئے گا:

یار بودم قطبک امسال قطب الدین شدم
گر بمانم سال دیگر قطب دین حیدر شدم

فتح پور واپسی

جب اس علاقے کے سارے انتظامات حسب منشا تکمیل پا گئے تو بادشاہ وہاں سے مسلسل کوچ کر کے سیر و شکار کرتے ہوئے رنتھنبور کے راستے سے 23 صفر 985ھ/1576ء کو فتح پور پہنچے۔ اس موقعے پر شیخ فیضی نے جس کو اب ملک الشعراء کا خطاب مل چکا ہے، ایک غزل کہی تھی جس کا مطلع ہے:

نسیم خوش دلی از فتح پور می آید
کہ پادشاہ من از راہ دور می آید

مرزا مظفر حسین کا گجرات پر حملہ

دو تین ماہ بعد گجرات میں غدر کی اطلاع ملی۔ اس مرتبہ جب راجہ ٹوڈرمل گجرات کے لیے مقرر ہوکر گیا تو مظفر حسین ولد ابراہیم حسین مرزا جو مرزا کامران کا نواسا تھا اور اس کو اسکی ماں گلرخ بیگم سورت کے محاصرے کے وقت دکن لے کر چلی گئی تھی۔ چند اوباشوں کی جمعیت لے کر گجرات میں فتنہ و فساد مچانے پہنچ گیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ سولہ سال تھی، اسے بہکانے والا اصل میں مہر علی نامی ایک شخص تھا جس نے میرزا ابراہیم کے پاس پرورش پائی تھی۔

مرزا مظفر حسین نے گجرات پہنچ کر بڑا ہنگامہ برپا کیا۔ اس کے مقابلے پر شریف محمد خاں اتکہ کا لڑکا باز بہادر اور گجرات کا دیوان بابا بیگ پرگنہ پتلاد میں پہنچے۔ مرزا نے ان کو شکست دی اور کھمبایت تک جا پہنچا۔ اب اس کے پاس دو تین ہزار سوار تھے وزیر خان حاکم گجرات کے پاس بھی تین ہزار سوار تھے لیکن اسے اپنے سپاہیوں پر پورا بھروسہ نہ تھا، اس لیے میدان میں مقابلہ کرنے کے بجائے وہ قلعے میں بند ہوگیا اور راجہ نے احمد آباد کی طرف کوچ کردیا۔ اس کی آمد پر میرزا احمد آباد سے ہٹ کر دولقیہ کی طرف چلا گیا۔ وزیر خاں اور راجہ نے اس کا پیچھا کیا۔ اس مقام پر فریقین میں بڑی سخت لڑائی ہوئی۔ باغی شکست کھا کر جو ناگڈھ کی طرف نکل گئے۔ اسی زمانے میں راجہ فتح پور واپس چلا آیا۔ اس کی واپسی کی خبر سن کر مرزا مظفر حسین نے دوبارہ جو ناگڑھ سے نکل کر احمد آباد پر حملہ کیا اور وزیر خاں پہلے کی طرح قلعے میں محصور ہوگیا۔ میرزا نے قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ اس کی فوج قلعے کی دیوار پر سیڑھیاں لگا کر چڑھنے لگی۔ قریب تھا کہ وہ لوگ قلعے کو فتح کرلیتے لیکن عین اس وقت ایک گولی مہر علی کے سینے میں آکر لگی۔ مہر علی، مرزا کا وکیل مطلق اور روح رواں تھا۔ اس کے ہلاک ہوتے ہی میرزا بدحواس ہوکر میدان سے بھاگ نکلا اور سلطان پور اور ندر آباد کی طرف چلا گیا۔

راجہ علی خاں سے مصالحت

بادشاہی فوج کے ان امیروں نے جو شہاب الدین احمد خاں کی سرداری میں برہان پور پر

فوج کشی کے لیے بھیجے گئے تھے حملہ کر کے راجہ علی خاں کو قلعے میں محصور کر دیا تھا اور اس کی ساری مملکت کو تاراج کر دیا تھا۔ قلعے کے فتح ہو جانے میں کوئی کسر نہ رہی تھی لیکن محاصرے کے دوران قطب الدین محمد خاں کا امراء سے اختلاف ہو گیا اور وہ ناراض ہو کر اپنی جاگیر بھڑوچ اور بڑودہ کی طرف چلا گیا، جہاں مرزا مظفر نے غارت گری کر کے بڑا انتشار پھیلا دیا تھا۔ اس کے اس طرح محاذ سے چلے جانے کی وجہ سے برہان پور کی مہم میں بڑی دقتیں پیدا ہو گئیں۔ امرائے شاہی نے مصلحت یہی سمجھی کہ راجہ علی خاں سے معقول نذرانے وصول کر کے دربار میں بھیج دیں اور اپنی اپنی جاگیروں کو لوٹ جائیں۔

حکیم عین الملک کی دکن سے واپسی

انہی دنوں حکیم عین الملک شیرازی جو 983ھ/1575ء میں حاکم دکن عادل خاں کے وکیل کے ہمراہ سفارت پر گیا تھا، واپس آ گیا اور عادل خاں کے دیے ہوئے عمدہ ہاتھی اور قیمتی تحائف نذر میں پیش کیے۔ جب بانس بریلی کی فوجداری سے دیپ چند راجہ منجھولہ کو ہٹا دیا گیا تو وہاں کا فوجدار حکیم عین الملک کو بنا دیا گیا، اس نے وہاں سے ایک طویل عریضہ لکھا اور باتوں کے علاوہ اس میں یہ جملہ بھی تھا کہ: ''جب سے میں دربار سے علیحدہ ہوا ہوں اس جنگل بیابان میں میرے ساتھ کوئی ہم خیال دوست نہیں ہے، اگر جناب والا فلاں شخص کو (یہاں اُس نے میرا نام لکھا تھا، یعنی مؤلف منتخب التواریخ) جو اس علاقے کے حالات سے بخوبی واقف ہے اور یہاں کے لوگوں کو اس پر بھروسہ و اعتماد بھی ہے اور دربار میں بھی اس کے ذمے کوئی اہم خدمت نہیں ہے، میرے پاس بھیج دیں تو اس کے حق میں بھی بڑی عنایت ہوگی اور اس بندہ درگاہ پر بھی احسان ہوگا''۔ بادشاہ کے حکم سے خواجہ شاہ منصور اس خط کے ایک ایک فقرے کو پڑھتا جاتا تھا اور حسب تجویز اس کا جواب لکھتا جاتا تھا۔ جب وہ مذکورہ فقرے پر پہنچا تو بادشاہ نے ''ہاں'' کہا یا ''نہ'' پتہ نہیں۔

حج کے لیے قافلے کی روانگی

985ھ/1577ء رجب ماہ میں خواجہ صاحب کے عرس کا زمانہ ہے، بادشاہ نے اجمیر کا عزم

کیا۔ جب سواری تودہ پر پہنچی تو شاہ ابوتراب جو شیراز کے بڑے بزرگ اور سلاطین گجرات کے پیر تھے، ملنے کے لیے آئے اور راجہ ٹوڈرمل بھی جو مرزا مظفر حسین کو شکست دینے کے بعد واپس ہو رہا تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ میرٹھ کے قریب بادشاہ نے شاہ ابوتراب کو حاجیوں کا امیر بنا کر اعتماد خاں گجراتی کے ساتھ کافی رقم دے کر مکہ معظمہ کے لیے رخصت کیا اور عام منادی کرادی کہ جو بھی چاہے اس قافلے کے ساتھ حج کے لیے جا سکتا ہے۔ میں نے بھی شیخ عبدالنبی صدر سے درخواست کی کہ میرے لیے بھی آپ بادشاہ سے اجازت لے لیجئے تو اس نے پوچھا ''کیا تمہاری والدہ زندہ ہیں؟'' میں نے کہا ہاں۔ اس نے کہا تمہارا کوئی بھائی بند ایسا ہے جو ان کی خدمت کرتا رہے، میں نے کہا: ''نہیں'' صرف میں ہی ان کا سہارا ہوں۔ شیخ نے فرمایا اگر تم اپنی والدہ سے اجازت لے لو تو بہتر ہوگا۔ غرض مجھے حج کی سعادت نصیب نہ ہوئی اور اب میں اس محرومی پر حسرت و افسوس کرتا رہتا ہوں:

نکرد لطف تو کاری ووقت کار گزشت
نشد وصال تو روزی و روزگار گزشت

منوہر پور کی تعمیر

انبیر کے موضع مولتان میں جو ایک قدیم شہر ہے اور اس وقت بالکل کھنڈر بنا ہوا تھا، بادشاہ کی سواری پہنچی تو اس نے وہاں شہر کی اور ایک بلند قلعے کی تعمیر کا حکم دیا قلعے کے دروازے اور باغ کی تعمیر کی ذمہ داریاں امرا کے سپرد کی گئیں۔ بادشاہ نے اس کی تعمیر میں اس توجہ سے اہتمام کیا کہ سانبھر کے حاکم رائے منوہر ولد رائے لونکرن کے نام پر اس کا نام منوہر پور تجویز کیا گیا۔ رائے منوہر کو مرزا منوہر بھی کہا جاتا ہے۔ وہ بڑے شاہزادوں کے ساتھ تربیت پاتا رہا تھا، ایسا ہنرمند اور باکمال نکلا کہ اب بڑے اچھے شعر کہہ لیتا ہے اس کا تخلص توسنی ہے۔

یہاں سے بادشاہ سلامت نے نارنول کے راستے دہلی کا ارادہ کیا اور شیخ نظام نارنولی

سے جو مشائخین عظام میں سے ہیں، ملاقات کی۔ دہلی میں پہلے تو بادشاہ نے بزرگوں کے مزارات کی زیارت کی پھر پالم میں شکار کھیلتے رہے۔

پیاور کو روانگی

اسی سال ماہ رمضان المبارک کے آخری عشرے میں میرے پاس پیاور سے خبر آئی کہ میری ایک خادمہ کو کافی مدت اور آرزوؤں کے بعد ایک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ میں نے بادشاہ کے پاس اشرفی کا نذرانہ پیش کر کے نام رکھنے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے فاتحہ پڑھ کر پوچھا تیرے باپ اور دادا کا نام کیا ہے؟ عرض کیا ملوک شاہ ولد حامد، بادشاہ نے فرمایا: ''اپنے اس بچے کا نام عبد الہادی رکھو''ہادی'' کا کلمہ اس زمانے میں رات دن بادشاہ کے ورد زبان رہتا تھا''۔ سات بادشاہی اماموں میں ایک محمد امین خطیب بھی تھے۔ انھوں نے بڑے اصرار سے کہا تھا کہ یہ فضول خیال چھوڑ دو اور حافظوں کو اپنے گھر پر جمع کر کے بچے کی د رازی عمر کے لیے قرآن کا ختم کراؤ۔ میں نے اس کی بات پر دھیان نہ دیا۔ آخر کار وہ بچہ چھ ماہ کا ہو کر انتقال کر گیا۔ میں نے اس جگہ سے پانچ مہینے کی رخصت لی اور پیاور چلا گیا۔ بعض مصروفیتوں بلکہ بے کار مشغلوں میں پھنس کر حسب وعدہ خدمت پر واپس نہ جا سکا اور پیاور میں ایک سال تک رہ گیا۔ ان کوتاہیوں اور لوگوں کی مخالفتوں کی وجہ سے رفتہ رفتہ بادشاہ میری طرف سے بے توجہ ہوتے چلے گئے اور اب جب کہ اس واقعے کو اٹھارہ سال گزر چکے ہیں اسی معمولی خدمت سے چمٹا ہوا ہوں کہ نہ رہتے بنے نہ بھاگتے:

صبری نہ کہ   از عشق پر ہیزم من
بختی نہ کہ   بادوست در آمیزم من
دستی نہ کہ   باقضا در آمیزم من
پائی نہ کہ   از میانہ بگر یزم من

جس وقت بادشاہ پنجاب کی طرف متوجہ تھے، ہانسی کے علاقہ میں شیر بیگ تواچی کا عریضہ پہنچا کہ مظفر حسین مرزا گجرات سے بھاگ کر دکن چلا گیا ہے، وہاں اسے راجہ علی خاں نے

گرفتار کر کے قید کر دیا ہے۔ بادشاہ نے یکم ذی الحج 985ھ/1577ء کو مقصود جوہری کے ہاتھ راجہ علی خاں کے نام ایک فرمان بھیجا کہ وہ میرزا کو دربار میں روانہ کر دے۔

چوبیسواں سال جلوس

پہلی محرم 986ھ/1578ء کو نوروز ہوا اور جلوس اکبری کا چوبیسواں سال شروع ہو گیا۔

اکبر پر ایک خاص کیفیت کا ظہور

بادشاہ نے پٹن میں حضرت گنج شکر کے مزار پر حاضری دی اور تندنہ کے نواح میں قمر غہ کے شکار کا ارادہ کیا۔ چار دن تک برابر جانوروں کو ہانکا گیا، جس وقت دونوں طرف سے ہانکے کے جانور شکار گاہ میں آ کر جمع ہو گئے اور بادشاہ شکار کے لیے چلے تو اچانک بادشاہ پر ایک عجیب غیر معمولی حالت طاری ہو گئی اور ان کی ظاہری حالت کچھ اس طرح متغیر ہو گئی کہ اس کی تعبیر کسی طرح ممکن نہیں لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ اسی وقت بادشاہ نے شکار بند کر دینے کا حکم دے دیا:

ہشدار کہ فیض حق بنا گاہ رسد
ناگاہ رسد بر دل آگاہ رسد

بادشاہ نے اس درخت کے نیچے جہاں یہ کیفیت وارد ہوئی تھی فقیروں اور مسکینوں کو دل کھول کر خیرات دی اور وہاں ایک عمدہ عمارت اور وسیع باغ کی بنیاد رکھنے کا حکم دیا۔ سر کے بال ترشوائے، بہت سے مصاحبین اس کیفیت و حالت کی بڑھ چڑھ کر تصدیق و تائید کرنے لگے۔ جب یہ خبر مشرقی ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں میں طرح طرح کی افواہیں پھیل گئیں اور رعایا میں بڑی ہلچل سی پیدا ہو گئی لیکن کچھ عرصے بعد حالات اعتدال پر آ گئے۔

مدد معاش کا نیا قانون

بیہرہ کی اقامت میں دارالخلافہ سے بیگم بادشاہ لشکر میں تشریف لائیں۔ بادشاہ نے پنجاب

کی حکومت سعید خاں مغول کو تفویض کی۔ میر قاضی حسین میبدی کے پوتے علی بغدادی کو پنجاب کے اماموں کی مدد معاش سے متعلقہ آراضیات کے عمل دخل اور اس سلسلے کے دوسرے کاموں پر مقرر کیا گیا، نیز قدیم محالات کو منسوخ کر کے باقاعدہ پیائش کی جائے اور تمام اماموں کو ایک ہی گاؤں کی آراضیات میں حصہ دار بنا دیا جائے۔ اس نئے انتظام سے تمام ممالک محروسہ کے اماموں میں بڑی بے چینی پھیل گئی۔ یہ سب شیخ عبد النبی کی ضد میں ہوا اور اس میں اس کے کارندوں کی بد دیانتی کا بھی بڑا دخل ہے۔

بادشاہ کی فتح پور کو واپسی

یہاں سے بادشاہ نے فتح پور کو واپسی کے لیے کوچ کیا اور 3 جمادی الثانی کو خصر آباد سادھورہ کے قریب بادشاہ کشتی پر سوار ہو گئے۔ امرا اور عہدے دار بھی ان کے ساتھ کشتیوں پر ہی روانہ ہوئے۔ لشکر نے خشکی کے راستے کوچ کیا۔ اسی مہینے کی 29 تاریخ کو سواری شاہانہ دہلی میں داخل ہوئی اور یکم ماہ رجب کو کشتی سے اتر کر بادشاہ اونٹ پر سوار ہوئے۔ اسی مہینے کی چھ تاریخ کو اجمیر پہنچ کر عرس میں شرکت فرمائی اور دوسرے ہی دن دارالخلافہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ اس تیزی سے سفر کیا کہ روزانہ پچاس کوس کا دھاوا مارتے ہوئے نویں رجب کو بروز جمعہ صبح کے وقت تودہ کی منزل پر آ کر قیام فرمایا۔ میں بساور سے لوٹ کر بادشاہ کے استقبال کے لیے اسی منزل میں حاضر ہوا اور ایک کتاب ''چہل حدیث''۔[50] جس میں جہاد کی فضیلت اور تیر اندازی کے ثواب پر حدیثیں ہیں اور اس کا نام تاریخی ہے، خدمت عالی میں پیش کی۔ بادشاہ نے یہ کتاب کتب خانے میں داخل کرادی اور میری وعدہ خلافی کا کوئی تذکرہ نہ کیا۔ اسی دن شام کو بادشاہ فتح پور پہنچ گئے۔

عبادت خانے میں علماء کے ہنگامے

فتح پور آنے کے بعد بادشاہ کے اکثر اوقات عبادت خانے میں علما کی محفل میں گزرتے تھے، خاص طور سے جمعہ کی راتیں شب بیداری میں گزرتی تھیں اور دینی مسائل کی تحقیق

اور اصول و فروع کی بحثیں گرم رہتی تھیں۔ان مجلسوں میں علما کی زبانیں ایک دوسرے کے مقابلے میں تلواروں کی طرف خوب اپنے جو ہر دکھاتی تھیں۔مذہب و مسلک کے اختلافات اتنے شدید ہوگئے کہ ایک دوسرے کی تکفیر دھڑلے سے کی جانے لگی سُنی، شیعہ، حنفی، شافعی، فقیہہ وحکیم کے موازنے و مقابلے سے گزر کر اصول و مہمات دین پر بھی زبانوں کی چھریاں بے باکی سے چلنے لگیں۔

علما کے جھگڑے اور اکبر کی بے دینی

انھی دنوں مخدوم الملک نے شیخ عبد النبی کی مخالفت میں ایک رسالہ لکھ دیا تھا جس میں خضر خاں شروانی کو جس پر حضور اکرمؐ کے خلاف بد زبانی کا الزام لگایا گیا تھا اور میر حبش کو جس پر رفض کا الزام تھا، ناحق قتل کرادیا۔لہٰذا اس کے پیچھے نماز نہیں ہو سکتی، اس لیے بھی کہ اس کے باپ نے عاق کردیا تھا اور وہ خود خونی بواسیر کے عارضے میں مبتلا ہے۔ شیخ عبدالنبی نے بھی اس کی جہالت اور گمراہی ثابت کرنے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔ درباری ملاؤں میں سے کچھ اِس طرف اور کچھ اُس طرف ہوگئے اور ایک دوسرے کو گمراہ اور خبطی بتانے لگے۔ علما کے ان اختلافات اور جھگڑوں کی وجہ سے اہل بدعت کو خوب کھیل کھیلنے کا موقع ملا۔انھوں نے حقائق کو مسخ کرکے بادشاہ کو، جو خلوص کے ساتھ طالب حق تھا، لیکن ان پڑھ ہونے کی وجہ سے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر تھا اور علماء کے ان مباحث کی وجہ سے عالم حیرت میں مبتلا تھا، اصل دین ہی سے پھیر دیا اور دین وشریعت کی بنیادوں پر ایسی ضرب لگائی کہ ان پانچ چھ سالوں میں اسلام کا نام تک نہیں رہا اور وہ ساری بساط چوپٹ ہوکر رہ گئی۔

اکبر کی بے دینی کا آغاز

جیسا کہ بیان ہوچکا ہے علما کے باہمی اختلافات اور ملحدوں کی مداخلت کی وجہ سے بادشاہ کی نظر میں اسلام اور علمائے اسلام کی وقعت گھٹتی چلی گئی۔ کچھ تو اکبر کی طبیعت اور کچھ

حالات کا تقاضا، بہرحال نتیجہ یہی نکلا کہ بادشاہ نے بہت جلد سارے مسلمہ اعتقادات سے منکر ہوکر الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کرلی۔ بچپن سے عہد جوانی اور جوانی سے اس پختہ عمری تک اکبر کی کچھ ایسی ہی ڈانواڈول روش تھی وہ کبھی ایک نظریہ اور اعتقاد کا پابند نہیں رہا۔ طبیعت میں تحقیق و تجسّس کا جذبہ تھا جسے بدعقیدہ مصاحبوں نے غلط رخ پر پھیر دیا۔ ابتدا میں تو صرف طلب حق کا سچا جذبہ تھا، چنانچہ اسی جذبے کے تحت اکبر ہر دین اور مذہب کے معتقدات اور ان کی تاریخ کو سمجھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اس موقعے پر علما نے ایسی ناسمجھی کا ثبوت دیا کہ بجائے یہ کہ وہ بادشاہ کو صراط مستقیم پر لے جانے کے لیے حق پسندی کا رویہ اختیار کرتے اپنے اعزاز و مرتبے کو بڑھانے کی خاطر ایک دوسرے کی تکفیر و تذلیل کرنے لگے۔ ایک ہی مسئلے کو جب علماء کا ایک گروہ حرام اور دوسرا حلال کہنے لگا تو بادشاہ نہایت حیران اور اُن کی بحثوں سے دل برداشتہ ہوگیا۔ دربار میں مختلف مذاہب و مسالک کے جو گمراہ کن عناصر جمع ہوگئے تھے انھوں نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور دین کے معتقدات کو خلاف عقل ثابت کرکے اس کے ذہن کو انکار و انحراف کی طرف مائل کردیا۔ یہ سب کس طرح ظہور میں آیا اس کی بڑی تفصیلات ہیں۔

بے دینی کے محرکات اور اسباب

اس زمانہ میں دربار شاہی میں تقریباً ہر ملک کے اہل علم اور مفکر موجود تھے اور مختلف مذاہب کے عالم اور رہنما بھی جمع ہوگئے تھے۔ یہ لوگ رات دن مختلف علوم و نظریات پر تبادلہ خیال اور طرح طرح کی نکتہ چینی میں مصروف رہتے تھے۔ بادشاہ کو بھی فتوحات و مہمات کی طرف سے پوری فرصت تھی، اس لیے وہ بھی مشغلوں میں اپنے اوقات صرف کیا کرتا تھا اور جو اصول و کلیات اسے پسند آجاتے خواہ وہ مسلمانوں کے معتقدات کے موافق ہوتے یا مخالف، انھیں وہ دل و جان سے قبول کرلیتا تھا اور جو باتیں اس کی نگاہ میں نہیں بھاتی تھیں، ان کو وہ ترک کردیتا تھا۔ اس طرح اس نے ترک و اختیار اور ردّ و قبول کے ایک خاص شعور اور جداگانہ معرفت کو اپنا معیار بنالیا اور عجیب طرح کے ہیولائی اعتقادات نے اس کے ذہن پر غلبہ پالیا۔

وحدت ادیان کا تصور

مجموعی طور پر ایک خیال اسکے ذہن پر پتھر کی لکیر بن گیا تھا کہ اصحاب علم و دانش تمام مذاہب میں موجود ہیں اور ہر قوم و ملت میں عبادت گزار صاحبان کشف و کرامت کی کمی نہیں رہی ہے اس لیے حق ہر مذہب اور قوم میں یکساں طور پر موجود ہے۔ اس لیے حق کو ایک ایسے دین اور ایک ایسی ملت میں محدود و منحصر کردینا ضروری نہیں ہے جو نسبتاً نیا اور نو پیدا ہو اور اس کے نزول پر ابھی ایک ہزار سال بھی نہیں گزرے ہیں۔ اس صورت میں ایک دین کا انکار اور دوسرے کا اقرار اور بغیر کسی سبب کے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا کسی طرح بھی معقول و مناسب نہیں ہو سکتا۔

بادشاہ کے اس خیال کو وہ ملحد اور برہمن حسب موقع پختہ اور اٹل بنانے کی کوشش کرتے رہتے تھے جو ان دنوں شاہی محفلوں اور خلوتوں میں پیش پیش نظر آتے تھے اور بہ لحاظ علم و دانش علوم رسمی اور انسانی احوال و نفسیات پر ان کی گہری نظر تھی، وہ بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ اپنے مذاہب اور نظریات پر عقلی اور نقلی استدلال کرکے دوسروں کی تکذیب کرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں نے بادشاہ کی خام خیالیوں کو راسخ اعتقادات کی شکل دے دی اور نظریات کو اس طرح بدیہیات بنا کر پیش کیا کہ ان سے پھر جانا اکبر کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس نقطۂ نظر کا لازمی نتیجہ یہی تھا کہ حشر و نشر اور دوسرے دینی اصول و معتقدات جن کا ماخذ حکمت نبوی ہے، معتبر اور قابل قبول نہ رہیں۔ دینی مباحث اور نظریات کے متعلق متکلمین میں شدید اختلافات ہیں علم کلام کی کتابوں میں ان کے معارضے اور مجادلے درج ہیں۔ حریفوں نے چن چن کر ان کو ایک خاص زاویے سے بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور اپنے اپنے مسلک و مذہب کی طرف اسے کھینچ لے جانے کی کوشش کی:

میداد رقیب آن سہی قد را پند   کاندر رخ ہر کس چو گل از باد مخند
از حد چو بشد نصیحت آن شوخ گرہ   بر گوشہ ابرو ز دو سر پیش افگند

عقیدۂ تناسخ کا قرار

سب سے پہلے اکبر نے پرکھوتم[51] نامی برہمن کو جو "نامہ خرد و افزا" کی ترجمانی پر مقرر تھا، تنہائی میں بلا کر موجودات اور اشیاء کے ہندی اسماء معلوم کیے۔ اس کے بعد دیوی برہمن خلوت شاہی میں حاضر ہوا۔ دیوی برہمن سے مذاکرات کے لیے ایک خاص انتظام کیا گیا تھا۔ ایک چارپائی کو رسیوں سے اوپر کھینچ کر بادشاہ کی خواب گاہ کے جھروکے کے برابر لگا دیا جاتا تھا اور وہ راتوں میں اس معلق حالت میں بیٹھا ہوا اپنی دیو مالا کے قصے سنایا کرتا تھا۔ دیوی برہمن ان مترجمین میں ملازم تھا جو "مہابھارت" پر کام کر رہے تھے۔ ان نشستوں میں اس نے بادشاہ کو ہندو مذہب کے اسرار بت پرستی کے طریقے، آگ اور آفتاب کی پوجا اور ستاروں کی تعظیم کے رموز بتائے اور مشرک بادشاہوں اور خیالی دیوتاؤں جیسے برہما، مہادیو، بشن، کشن، رام اور مہامائی (جن میں سے بعض کو ہندو خدا اور بعض کو فرشتہ کہتے ہیں) کی عظمت و احترام پر دلیلیں پیش کیں۔ اس کے اپدیش بادشاہ کے دل پر اثر کر گئے اور وہ عقیدہ تناسخ پر عقیدہ لے آیا۔ خوشامدی درباری کہاں پیچھے رہتے وہ بھی تناسخ کے اثبات و صحت پر رسائل لکھ لکھ کر بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنے میں دوڑ لگانے لگے۔ بادشاہ ہندوؤں کے مذاہب کی تحقیق کی طرف جن کے ہندوستان میں بے شمار فرقے ہیں اور ہر ایک فرقہ بے شمار کتابوں پر عقیدہ رکھتا ہے اور اس کے باوجود بدبخت اہل کتاب نہیں ہیں بہت زیادہ قائل ہوگیا۔ ہندو مذہب کی طرف میلان کے جو نتائج تھے وہ روز بروز منظر عام پر آنے لگے۔

وحدت الوجود کا اثر

انہی دنوں شیخ تاج الدین ولد شیخ زکریا اجودھنی دہلوی بھی جن کو اکثر صوفیا "تاج العارفین" کہتے ہیں۔ خلوت گاہ میں باریاب ہوئے، وہ شیخ زمان[52] پانی پتی کے شاگرد تھے جو بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں "شرح لوائح" کافی مشہور ہے۔ کتاب "نزہۃ الارواح" پر بھی انھوں نے ایک مبسوط شرح لکھی ہے۔ علم تصوف اور علم توحید میں وہ ثانی

شیخ ابن عربی سمجھے جاتے تھے۔ تاج الدین بھی راتوں میں معلق چارپائی پر اوپر جاکر رات رات بھر اہل تصوف کے شطحیات اور مزعومات سنایا کرتا، وہ چونکہ شرعی پابندیوں کا قائل نہیں تھا اور گمراہ صوفیوں کی طرح وحدت الوجود کا پکا معتقد تھا جس کا نتیجہ سوائے الحاد اور اباحت کے کچھ اور نہیں نکلتا۔ اس نے وحدت الوجود کے اس خطرناک نظریے اور ''فصوص الحکم'' کے دوسرے مسائل مثلا ترجیح رجا برخوف اور ''ایمان فرعون'' وغیرہ بخوبی بادشاہ کے ذہن نشین کرادیے۔ تصوف کے ان نظریات کا بھی اکبر کے ذہنی فتور اور احکام شریعت سے اس کی بیزاری میں بہت بڑا دخل ہے، چنانچہ اس کا یہ عقیدہ ہوگیا تھا کہ کافر دوزخ کی آگ میں ڈالے تو ضرور جائیں گے لیکن یہ عذاب ان کے لیے دائمی نہیں بلکہ عارضی ہوگا۔ شیخ تاج الدین نے اس مسئلہ کو آیات قرآنی اور احادیث نبوی سے خوب تاویلیں کرکے بخوبی باور کرادیا تھا اور جب اس نے بادشاہ کو تصوف کو ان بھول بھلیوں میں اچھی طرح سرگشتہ کرادیا تو اس نے اپنی تعلیم وتلقین کا آخری اور اہم نکتہ جو سب سے زیادہ خطرناک تھا نکال کر سامنے رکھا۔

انسان کامل کا تصور

شیخ نے اکبر کے سامنے ''انسان کامل'' کا ایک تصور پیش کیا اور پھر اس انسان کامل کو خلیفہ وقت سے تعبیر کرکے خود اکبر کو اس کا مصداق قرار دے دیا۔ انسان کامل کے درجہ تو صرف عین واجب یعنی ذات خداوندی کا ہی ہے، اس لیے شیخ کی کمند انسان کامل سے گزر کر عین واجب تک جا پہنچی۔ حوالی موالی ناچتے کو نچانے والے تھے۔ انھوں نے باتوں کے طوطا مینا بنائے اور خوب شگوفے چھوڑے۔ بس کیا تھا طرح طرح کی خرافات اور اختراعات شروع ہوگئیں چنانچہ بادشاہ کے لیے سجدہ تجویز کیا گیا اور اس کا نام ''زمین بوس'' رکھا گیا۔ بادشاہ کے ادب و احترام کو اتنا بڑھایا کہ اسے فرض عین اور چہرہ شاہی کو ''کعبہ مرادات'' اور قبلۂ حاجات قرار دیا گیا۔ کسی نے زبان ہلائی بھی تو ہندوستان کے بعض مشائخین کے ساتھ ان کے مریدوں کے عمل کو پیش کرکے اس کا منھ بند کردیا گیا۔

خیر و شر کی وضاحت

ایک اور بزرگ شیخ یعقوب کشمیری اور ان کے ہمنوا بھی اس تگ و تاز میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ شیخ یعقوب بھی بہت سی کتابوں کے مصنف اور اپنے عہد کے مقتدا اور پیشوا سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے قاضی ہمدانی کی ''تمہیدات'' سے بعض باتیں لے کر ان سے یہ فلسفہ ترتیب دیا کہ محمد ﷺ، اللہ کے اسم ''الہادی'' کا مظہر ہیں اور ابلیس دوسرے اسم ''المضل'' کا مظہر ہے۔ اس لیے دنیا کا یہ سارا جلوہ انہی دو اسماء کا جلوہ ہے اور خدا کے یہ دونوں مظہر اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ (مفہوم یہ تھا کہ چونکہ خیر و شر من جانب خدا ہیں اس لیے دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق اور امتیاز نہیں ہے)

شیعیت کی چھاپ

مذکورہ بالا ''خلوت معلق'' کے بلند پروازوں میں ملا محمد یزدی بھی تھا وہ اپنے اعتقاد کے مطابق خلفائے ثلاثہ کے خلاف طنز و طعن کر کے اور عموم صحابہ، تابعین، تبع تابعین، صلحائے سلف و علمائے خلف سب کو کافر بتاتا اور بادشاہ کی نظر میں اہل سنت والجماعت کا درجہ گھٹانے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ بجز شیعہ کے، سب کو اس نے گمراہ کر کے دکھادیا اور اکبر کے خیالات پر شیعیت کی بھی اچھی خاصی چھاپ پڑ گئی۔

اس صورت حال سے پہلے اکبر کے دل پر علما کا بڑا اثر تھا، یہاں تک کہ وہ ان کو بلحاظ رتبہ و عظمت امام غزالیؒ اور رازیؒ سے کہیں زیادہ بڑھ چڑھ کر سمجھتا تھا لیکن جب ان عالموں کی رکیک حرکتیں اس کی نظر میں آئیں اور ان کے تحریم و تکفیر کے مناقشوں سے وہ سخت متنفر ہوا تو اس کے دل سے نہ صرف یہ کہ ان جھگڑالو عالموں اور قاضیوں کی عظمت ہی گر گئی بلکہ ان پر قیاس کر کے وہ بزرگان سلف کا بھی منکر ہو گیا۔

عقیدۂ تثلیث کا اثبات

اسی زمانے میں دربار میں عیسائیوں کی بھی آمد و رفت ہونے لگی تھی۔ یورپ کے اہل علم کو

پادری کہا جاتا ہے اور ان کے مجتہد کامل کو "پاپا" کہتے ہیں، جسے مصلحت اور وقت کے لحاظ سے امور دین میں تغیر و تبدل کا اختیار حاصل رہتا ہے اور بادشاہ وقت بھی اس سے روگردانی نہیں کر سکتا۔ جب عیسائی پادری بھی بادشاہ کی عنایت کی نظر سے نوازے گئے تو انھوں نے انجیل پیش کی اور عقیدہ ثالث ثلاثہ (عقیدۂ تثلیث) کے حق ہونے پر مباحثے کرتے رہے۔ اکبر نے جو اپنے زعم حق پرستی میں دنیا بھر کی گمراہیوں کا خریدار بنا ہوا تھا، نصرانیوں کو بھی خالی ہاتھ جانے نہیں دیا۔ ان کی عیسائیت کی تصدیق کی اور عیسوی مذہب کو پھیلانے کی ہمت افزائی کی۔ حسب الحکم شاہزادہ مراد نے عیسائی پادری سے انجیل کے چند سبق پڑھے۔ شیخ ابو الفضل کو انجیل کے ترجمے کے لیے حکم دیا گیا، اس نے ترجمہ شروع کیا تو اس پر بسم اللہ کے بجائے یہ فقرہ لکھا!

"ای نامی وی ژژو کرستو"

شیخ فیضی نے قافیہ پر ردیف چڑھائی اور دوسرا مصرع کہا:

"سبحانک لا سواک یا ھو"

ان ملعون عیسائیوں کی جسارت اتنی بڑھ گئی کہ انھوں نے دجال ملعون کے اوصاف اور حضور اکرم ﷺ کے اوصاف میں مشابہت پیدا کرنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ (اے اللہ معاف کر، یا اللہ پناہ دے)

آفتاب پرستی کا آغاز

بیر بر ملعون بھی ایک بس کی گانٹھ تھا، اس نے آفتاب پرستی سے اکبر کی آنکھوں کو اس طرح خیرہ کیا کہ آفتاب ہی مظہر کامل او رسر چشمہ سعادت ہے اس کی تاثیر سے غلہ پکتا ہے، کھیتیاں لہلہاتی ہیں، پھلوں میں رس اور سبزہ میں تراوت پیدا ہوتی ہے۔ دنیا کی روشنی اور دنیا والوں کی زندگی آفتاب ہی سے وابستہ اور متعلق ہے۔ اس لیے وہی ایک ایسا وجود ہے جس کی عبادت اور تعظیم ہونی چاہئے۔ پرستش کے لیے اس کے طلوع کی طرف رخ کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ غروب کی طرف جو زوال کی نشانی ہے۔ آفتاب پرستی کے ذیل میں

اس نے آگ، پانی، پتھر، درخت اور تمام مظاہر عالم یہاں تک کہ گائے، اس کے گوبر، قشقہ اور زنار کے تقدس کو بھی خوب بڑھا چڑھا کر بتایا۔ بادشاہ جب ان باتوں کی طرف مائل نظر آئے تو دربار کے بدبخت حکما اور فضلا بھی چراغ دکھانے لگے کہ آفتاب ''نیر اعظم'' ہے۔ ''عطیہ بخش ہمہ عالم ہے، مُربی بادشاہان ہے''۔ غرض آفتاب پرستی کا بھی دربار میں خوب فروغ ہوا اور نو روز جلالی کی تعظیم بڑے اہتمام سے کی جانے لگی چنانچہ ہر سال اس دن اکبر ایک بڑا جشن منعقد کرتا تھا اور سات سیاروں میں سے ہر سیارے کے رنگ کے مطابق روزانہ ایک رنگ کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ برہمنوں نے تسخیر آفتاب کا ایک عمل بتادیا تھا وہ اس کا وظیفہ نصف شب کو اور طلوع آفتاب کے وقت پڑھا کرتا تھا۔ اس نے گائے کا ذبیحہ بند کرادیا۔ اس کے گوبر کو پاک سمجھنے لگا اور گائے کا گوشت کھانا حرام ہوگیا۔ گاؤکشی کی سزا میں اچھے اچھے آدمیوں کو قتل کرادیا گیا۔ طبیبوں نے بھی گاؤکشی کے خلاف نسخہ آرائی کے جوہر دکھائے اور گاؤزبانی کی کہ علم طب کی رو سے گائے کا گوشت طرح طرح کی بیماریوں کا باعث ہے اور ہاضمے کو خراب کرتا ہے۔

آتش کدے کا قیام

دربار میں گجرات کے شہر نوساری سے آتش پرستوں کا بھی ایک گروہ دینی خراج لینے کے لیے پہنچ چکا تھا۔ انھوں نے زردشت کے دین کو حق بنا کر پیش کیا اور آگ کی تعظیم کو سب سے بڑی عبادت بتلایا۔ کیانی بادشاہوں کی راہ و روش کے قصے بیان کرکے اکبر کو اپنے معتقدات کی طرف جھکا لیا۔ چنانچہ اکبر نے حکم دیا کہ سلاطین عجم کی طرح جو اپنے آتش کدے کو ہمیشہ دہکتا ہوا رکھتا تھے، ہمارے محل میں بھی شب و روز آگ جلتی رہنی چاہیے۔ ۔کیونکہ آگ بھی خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی اور اس کے انوار کا پرتو ہے۔ اس آتش کدے کا انتظام شیخ ابوالفضل کے سپرد کیا گیا۔

اکبر اپنی جوانی کے زمانے ہی سے ہندوستانی راجاؤں کی لڑکیوں کی صحبت میں ہوم (ہَوَن) کیا کرتا تھا جو ہندوؤں کی آتش پرستی کی ایک پوجا ہے۔

آفتاب اور آگ کی پرستش

حکومت کے پچیسویں سال کے نوروز کے دنوں میں اکبر نے آفتاب اور آگ کے سجدہ کا اعلان کیا۔ مصاحبین بھی چراغ جلنے کے وقت قیام کا اہتمام کرنے لگے۔ سنبلہ کی آٹھویں عید کے دن اکبر ہندوؤں کی طرح پیشانی پر قشقہ (تلک) لگا کر دولت خانے میں آیا اور جواہرات پروئی ہوئی ایک ڈوری برہمنوں سے اپنے ہاتھ پر تبرک کی خاطر بندھوئی اور امراء نے حسب مدارج مروارید اور جواہرات اس دن نذر گزارے اور اس توہم پرستی کی عملاً و قولاً تائید و حمایت کی۔ بادشاہ نے راکھی بندھوانی بھی شروع کردی۔ عرض اسلام کے خلاف دوسرے مذاہب والے جو حکم اور رسم بھی بیان کرتے تھے اکبر اس کو نص قاطع سمجھتا تھا اور امت مسلمہ کے تمام احکام خلاف عقل تھے جن کو عرب کے سر پھروں اور رہزنوں نے وضع کیا تھا اور ان احکام کو ماننے والے سارے مسلمان بادشاہ کی نظر میں حقیر و ذلیل ہوگئے تھے۔ کیا کہا جائے مختصر یہ کہ "**یریدون یسطفوو بافواھھم و اللہ متم نورہ و لو کرہ الکافرون**" (وہ اللہ کے نور کو اپنی پھونکوں سے بجھانا چاہتے ہیں، اللہ نے اپنے نور کی تکمیل کردی ہے اگرچہ کافروں کو یہ بات بڑی ناگوار ہے)

بتدریج یہ بے دینی اور بد اعتقادی اس انتہا پر پہنچ گئی کہ احکام شریعت اور اسلام کی تردید و تنسیخ کے لیے کسی دلیل اور تاویل کی بھی ضرورت نہیں رہی، جب جی چاہتا کسی بھی حکم کو اعلانیہ ترک کردیا جاتا۔

ابوالفضل کی بے دینی

مجھے یاد ہے کہ ان مباحث کے آغاز میں ایک بار فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں شیخ ابو الفضل سے میری[53] گفتگو ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ''مجھے تمام مصنفوں سے ایک شکایت ہے کہ انھوں نے اپنے پیغمبر ﷺ کے واقعات تو نہایت تفصیل سے سن وار لکھے ہیں اور پچھلے پیغمبروں کا حال اس تفصیل سے نہیں لکھا۔ میں نے جواب دیا ''نبیوں کے تذکرے میں متعدد ''قصص الانبیاء'' لکھی گئی ہیں۔ اس نے کہا ''نہیں وہ بہت مختصر ہیں

تفصیل سے لکھنے کی ضرورت تھی"۔ میں[54] نے کہا اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ انبیا کے زمانے کو کافی طویل عرصہ گزر گیا تھا اس لیے مفسرین ارباب تاریخ و سیر نے وہی باتیں لکھیں جو ان کے نزدیک تحقیق شدہ تھیں، جن کا ثبوت ان کو نہیں ملا اسے چھوڑ دیا ہوگا۔ اس نے کہا "یہ کوئی جواب نہیں ہوا"۔ پھر اس نے ایک بات چھیڑ دی کہ "تذکرۃ الاولیا" اور "نفحات الانس" اور ان جیسی دوسری کتابوں میں ہر پیشہ اور گروہ کے لوگوں کا ذکر ہے لیکن معلوم نہیں اہل بیت سے کیا قصور ہوا تھا کہ ان کتابوں میں ان کا ہی تذکرہ نہیں ہے۔ کیا یہ بات کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے"۔ میں نے اس کے جواب میں جو کچھ مناسب تھا کہا لیکن سمجھتا کون ہے؟ آخر میں نے اس سے پوچھا کہ ان مشہور مذہبوں میں سے تمہارا میلان کس مذہب کی طرف ہے؟ اس نے کہا "میں تو ابھی چند دن الحاد کی وادی میں سیر و سیاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں"۔ میں نے مذاقاً چھیڑتے ہوئے کہا: "نیک ارادے ہیں، بشرطیکہ تم اپنی بیوی کو طلاق دے دو"۔ جیسا کہ مشہور ہے:

برداشت غل شرع بتائید ایزدی
از گردن زمانہ علیٰ ذکرہ السلام

میری بات پر وہ ہنس پڑا اور بات آئی گئی ہوگئی۔

ابوالفضل کی گستاخی

ابوالفضل کو شاہی حمایت حاصل تھی۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے "یک عنایت قاضی بہ از ہزار گواہ" جسے پیا چاہے وہ سہاگن" والا معاملہ تھا۔ اس لیے وہ ان بد اعتقادیوں کے بارے میں شیخ صدر، قاضی، حکیم الملک اور مخدوم الملک جیسے بوڑھوں کو بڑی جسارت سے چھیڑ چھیڑ کر بحثیں کیا کرتا تھا اور ان کی بے عزتی کرنے میں ذرہ برابر بھی نہیں جھجکتا تھا۔ بادشاہ اس کی لن ترانیوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔

بوڑھے علما نے عاجز آکر ایک مرتبہ آصف خاں میر بخشی کے ذریعے خفیہ طور پر ابوالفضل کو کہلوایا کہ "تم آخر کس وجہ سے ہمارے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑے رہتے ہو؟" اس

نے جواب دیا، بس یہ مثل سمجھو ''میں بیگن کا نہیں بادشاہ کا نوکر ہوں''۔ غرض اس نے تھوڑے ہی عرصے میں ان عالموں کو اپنی ذہانت، باپ کی معاونت اور بادشاہ کی پشت پناہی اور بخت کی یاوری سے ایک ایک کرکے ذلیل وخوار کردیا اور کوئی مسلمان عالم سوائے حکیم ابو الفتح اور ملا محمد یزدی کے جو بعض مسائل میں اس سے متفق نہیں تھے، اس کے سامنے فروغ نہ پاسکا اور اہل علم کی ساری بساط الٹ کر رہ گئی۔

دربار سے کنارہ کشی

جب دربار کا یہ رنگ ہوا تو میں نے گوشۂ عزلت اختیار کرلیا اور درباداری سے بڑی حد تک دور ہی رہنے لگا۔ بادشاہ کی نظریں بھی مجھ سے پھر گئی تھیں اور غیریت کا پردہ درمیان میں آگیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ میں اپنے اس حال ہی میں خوش رہا ہوں:

دل در تگ و پو نشد نیکو شد کہ نشد　　　جز در تو فرو نشد نیکو شد کہ نشد
گفتی کہ برنجم از نیکو شد کارت　　　دیدی کہ نیکو نشد نیکو شد کہ نشد

میں اپنے آپ کو کسی رعایت کے قابل سمجھتا تھا نہ ان کی خدمت کے لائق:

بیا تا تکلف بہ یک سو نہیم
نہ از تو قیام نہ از ما سلام

کبھی دور ہی سے آستانے پر کورنش بجالاتا تھا اور اہل محفل کا تماشا دیکھتا رہتا تھا:

دیدم کہ دیدن رخت از دور خوشتر است
صحبت گذاشتم زتماشائیان شدم

میں نے اوپر جتنے حالات بیان کیے ہیں ان کی جزئیات اور تفصیلات سن وار ترتیب سے بیان کرنا ممکن نہیں، اس لیے اتنے ہی پر یہ قصہ ختم کرتا ہوں۔ بہرحال اللہ تعالٰی ہر حالت میں بندہ کا نگہبان اور محافظ ہے حزم واحتیاط کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں ان حالات کو قلمبند نہ کرتا، لیکن خدائے برتر گواہ ہے کہ دین کے درد اور ملت مرحومہ اسلام کی دلسوزی میں میرا قلم رک نہ سکا اور یہ باتیں زبان قلم پر آگئیں۔ اس میں نہ تو مقصود کسی قسم کا طعن وطنز کرنا

ہے نہ اس کے پیچھے حسد و تعصب کا کوئی جذبہ کام کر رہا ہے۔

صرف ہوائی کا عمل

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ مبارک سے ''صرف ہوائی'' کا عمل سیکھنا شروع کیا۔ شیخ مبارک سے ملاقات سے پہلے ایک دن شیخ فیضی نے اکبر سے کہا'' ہمارے شیخ کسی قسم کا تکلف نہیں برتتے'' بادشاہ نے فوراً جواب دیا''ہاں انھوں نے اپنے سارے تکلفات تمہارے سپرد کر دیے ہیں''۔

اکبر نے شیخ بنجھو، میاں تان سین[55] اور دوسرے تمام موسیقاروں کو شیخ مبارک کے پاس بھیجا تاکہ وہ ان میں سے ایک دوسرے پر ترجیح دیں۔ شیخ مبارک نے میاں تان سین سے اس موقع پر کہا تھا۔ ہم نے سنا ہے تم بھی کچھ گا لیتے ہو اور جب اس نے گا کر سنایا تو شیخ نے اس کے گانے کو جانوروں کے چلانے سے تشبیہ دی اور اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔

آبی محل کی تعمیر

اسی سال فتح پور میں ایک حکیم آیا تھا اس نے ایک ایسے گھر کی تجویز پیش کی جس کے چاروں طرف پانی ہو اور غوطہ لگائے بغیر گھر میں داخل ہونا ممکن نہ ہو، خوبی یہ کہ پانی گھر میں کسی طرح سے بھی سرایت نہ کر سکے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو منظور کرلیا اور دولت خانے کے صحن میں بیس گز چوڑا، بیس گز لمبا اور تین گز گہرا ایک حوض بنایا گیا۔اس کے اندر ایک سنگین کمرہ تعمیر ہوا جس کی چھت پر ایک بلند مینارہ تھا۔ اس کمرے کے چاروں طرف پل بنائے گئے لیکن حکیم کا دعویٰ قرابا دین کی طرح غلط ہی ثابت ہوا اور وہ چھپ کر کہیں بھاگ گیا۔ ایسا ہی ایک حوض سترہ سال کے بعد حکیم علی گیلانی نے لاہور میں بنایا تھا اس حوض کی تاریخ ''حوض حکیم علی گیلانی'' نکالی گئی تھی۔

بادشاہ نے اس نامکمل حوض کو زر سیاہ سے جس کی قیمت بیس کروڑ روپیہ ہوتی تھی بھروایا۔ اور وہاں پر موسیقی کی ایک محفل منعقد کی۔ شیخ بنجھو ایک خوش آواز قوال تھا، صوفیانہ

وضع قطع میں رہتا تھا اور شیخ ادھن جون پوری کا مرید تھا۔ اس کی تاریخ وفات اس کے نام ہی سے نکلتی ہے۔ اس محفل میں شیخ بنجھو نے اپنے فن کا کمال دکھایا۔ بادشاہ نے اس کو بہت داد دی اور بڑے خوش ہوئے۔ محفل میں میاں تان سین اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے دن سرے گویے بھی بلائے گئے تھے بادشاہ نے شیخ بنجھو کو ان سب پر ترجیح دی اور حکم دیا کہ اس حوض کا سارا سونا شیخ اٹھالے جائے وہ بیچارا اس کو بھلا کس طرح اٹھا سکتا تھا اس لیے اس نے تھوڑے سے سونے کی درخواست کی۔ بادشاہ نے اس کے عوض ایک ہزار روپیہ اسے عطا فرمادیا اور وہ باقی سونا تین سال کی مدت میں جا، بے جا اخراجات میں صرف ہوتا رہا۔

معصوم خان کی آمد

اسی سال میرزا محمد حکیم کا کوکہ معصوم خاں نہایت بہادر نوجوان تھا اور بڑے بڑے کارنامے انجام دے چکا تھا میرزا سے ناراض ہوکر بادشاہ کے پاس آ گیا تھا۔ اکبر نے اسے پانصدی کا عہدہ دے کر بہار کی حکومت پر روانہ کردیا۔ معصوم خاں نے وہاں کے مشہور پٹھان سردار کالا پہاڑ سے جنگ کرکے فتح حاصل کی۔ بادشاہ نے اس کارنامے پر فتح پور سے ہزاری کا فرمان اور خاصہ کا گھوڑا اس کے لیے روانہ کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے خواب میں حضرت علیؓ کو دیکھا تھا کہ انھوں نے اس کی پیٹھ پر اپنا پنجہ مبارک رکھا تھا، اسی برکت سے اس نے کسی جنگ میں بھی پیٹھ نہیں دکھائی اور اس پنجے کا نشان اس کی پیٹھ پر نظر آتا ہے

''چہ باک از موج بحر آن را کہ باشد نوح کشتیبان''

اسی سال ماہ شوال میں ایک نہایت کمینہ اور ذلیل آدمی ملا طیب کو کیتھل سے بلا کر دربار میں نوازا گیا، بادشاہ کی اکثر نوازشیں بس کچھ اسی قسم کی رہتی تھیں۔ ملا طیب کو صوبہ بہار اور حاجی پور کا دیوان مقرر کیا گیا اور رائے پر کوتھم[56] کو جو اسی قبیل کا آدمی تھا بخشی کا عہدہ ملا اور ملا مجدی سرہندی کو جو پہلے سلیم شاہ کے عہد میں پرچہ نویس تھا، امین بنایا گیا اور شمشیر خاں خواجہ سرا کو خالصہ کا مہتم مقرر کیا گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان کمینے لوگوں نے

خوب ہاتھ پیر نکالے۔ ان کو نہ تو خدا کا خوف تھا نہ بادشاہ کا لحاظ تھا وہ من مانی حکومت کرنے لگے اور اس وقت اور موقعے کو غنیمت جان کر ایسی ایسی کاروائیاں کیں کہ سارے لشکری ان کے ہاتھوں تنگ آ گئے اور زبردستی معصوم خاں کو باغی بنادیا جس کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

اسی مہینے مرزا مظفر حسین، راجہ علی خاں کے نذرانوں کو خاندیس سے لا کر حاضر خدمت ہوا۔ اکبر نے کچھ عرصہ بعد میرزا کے قصور معاف کر دیے اور انہی دنوں اس کو اپنا داماد بنا کر اسے عزت و مرتبہ عطا فرمایا۔

اسی سال بادشاہ نے شہباز خاں بخشی کو غازی خاں بدخشی اور شریف خاں اتکہ کے ساتھ رانا کیکا پر فوجی حملے کے لیے مقرر فرمایا۔ رانا کیکا کونبھل میر کے مستحکم قلعے میں محصور ہوگیا تھا بادشاہی فوجوں نے حملہ کر کے قلعے کو فتح کرلیا اور اس کے سارے ملک کو تہہ و بالا کر دیا اور رانا راتوں رات قلعے سے بھاگ کر دوسرے پہاڑی علاقے میں چلا گیا۔ اسی سال سلطان خواجہ مکہ معظمہ سے لوٹ کر آیا اور وہاں سے بادشاہ کے لیے عربی نسل کے گھوڑے، حبشی غلام اور دوسرے نفیس تحفے لا کر پیش کیے، اسے صدارت کا عہدہ عطا کیا گیا۔

حاجیوں کے قافلے کی روانگی

986ھ/1578ء میں امیر حجاج کا اعزاز حضرت خواجہ احرار کے پوتے خواجہ محمد یحیٰی کو ملا۔ اکبر نے انکو چار لاکھ روپیہ دیا اور اسی سال شوال کے مہینے میں حاجیوں کے قافلے کو اجمیر سے روانہ کیا گیا۔ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی جن کے آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اکبر اسلاف سے متنفر اور احکام دین سے منحرف ہوگیا تھا، اسی قافلے کے ساتھ حج کے لیے روانہ کر دیا گیا۔ ان لوگوں نے آئندہ سال حج کا فریضہ ادا کیا۔ ان کے سفر کی تاریخ ''ھو غریز قوم ذلو'' نکالی گئی تھی۔

خانِ جہاں کا انتقال

983ھ/1575ء کے آغاز میں حاکم بنگالہ خاں کے انتقال کی خبر ملی، اس کے بھائی اسمٰعیل قلی

خاں کے نام عنایت آمیز فرمان صادر کیا گیا۔ مظفر خاں جو اس وقت دیوان کے عہدے پر فائز تھا بنگالہ کا حاکم مقرر ہوا۔ رضوی خاں بخشی بنایا گیا اور فتح پور سے حکیم ابو الفتح کو صدر اور رائے پتر داس کو میر ادہم کی شرکت میں دیوان بنا کر روانہ کیا گیا۔

19 ماہ صفر کو چالیس سال کی عمر میں اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک لڑکا عنایت فرمایا۔اس کا نام میں نے محی الدین رکھا، یہ لڑکا پشاور میں پیدا ہوا تھا۔

تحائف اور نذرانے

بادشاہ نے ملا عشقی کو جسے خاں کا خطاب حاصل تھا اور شاعری میں اس کا ایک دیوان اورمزاحیہ مثنوی بھی ہے، کشمیر میں وکیل بنا کر بھیجا تھا۔ اسی سال وہ قاضی صدرالدین لاہوری کے ساتھ دربار میں واپس آیا۔ اس کے ہمراہ حاکم کشمیر کا ایلچی محمد قاسم نامی بھی آیا تھا۔ یہ لوگ وہاں سے بہت سا زعفران، مشک، عود، شال اور کشمیر و تبت کے دوسرے تحائف بطور پیش کش لے کر آئے۔

اس زمانے میں حکیم الملک گیلانی کے داماد حکیم علی کو جو حکمت و طب اور دوسرے علوم میں بے مثل مہارت رکھتا تھا، عادل خاں دکنی کے قاصدوں کے ہمراہ بیجانگر روانہ کیا گیا۔

اسی زمانے میں میرزا شاہرخ کا بہنوئی میر نظام بدخشاں سے سفیر بن کر آیا اور بدخشی گھوڑے، قیمتی لعل اور بہت سے اونٹ نذرانے میں پیش کیے۔

اکبر کی خطبہ خوانی

اس زمانے میں اکبر پر دنیاوی اقتدار کے ساتھ دینی سیادت پر بھی قبضہ جمانے کی دھن سوار ہوگئی تھی اور اسے کسی دوسرے کی پیروی و متابعت گراں گزرنے لگی تھی۔ اس نے یہ سن رکھا تھا، حضور اکرم خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم، خلفائے راشدین اور بعض دوسرے سلاطین جیسے امیر تیمور صاحبقران، میرزا الغ بیگ گورکانی وغیرہ خود خطبہ پڑھا کرتے تھے، اکبر نے بھی بظاہر اسلاف کی پیروی میں لیکن درحقیقت اپنے حق اجتہاد کو مضبوط کرنے کی غرض سے

یکم جمادی الاول 987ھ/ 1589ء کو فتح پور کی جامع مسجد میں جو بادشاہی محل کے قریب تھی، جمعہ سے پہلے خطبہ پڑھنا چاہا، لیکن جب وہ منبر پر چڑھا تو گھبرا گیا اور لرزنے لگا بڑی مشکل سے شیخ فیضی کے یہ تین شعر وہ بھی ادھورے پڑھ کر اتر آیا۔ یہ شعر بھی اس صورت میں ادا ہوئے کہ دوسرے برابر سے بتاتے جاتے تھے۔ اس خطبے کے بعد حافظ محمد امین کو امامت کرنے کا حکم دیا۔ بادشاہ نے جو شعر پڑھنا چاہے تھے وہ یہ ہیں:

خداؤندی کہ مارا خسروی داد | دل دانا و بازوی قوی داد
بعدل و داد مارا رہنمون کرد | بجز عدل از خیال ما برون کرد
بود وصفش زحد فہم بر تر | تعالیٰ شانہٗ اللہ اکبر

بادشاہی عقائد پر عوام کی بے چینی

بادشاہ کی بد اعتقادی کو دیکھ کر لوگوں کی جراتیں بڑھ گئیں اور اسلامی عقائد اور فروعی مسائل کا اعلانیہ مضحکہ اڑنے لگا۔ بد بخت ہندو اور ہندو مزاج مسلمان نبوت کے بارے میں زبان درازیاں کرنے لگے۔ علمائے سوء نے اپنی کتابوں میں نعت کی جگہ تبرا شروع کر دیا۔ توحید کے ذکر کے بعد وہ حسب قاعدہ نعت کے بجائے بادشاہی القاب لکھنے لگے۔ انھیں ہمت نہیں پڑتی تھی کہ مقتدر دروغ باتوں کے مقابلے میں حضور اکرمؐ کا نام بھی لیں۔ ان باتوں پر عوام میں بڑی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور لوگوں میں بادشاہ اور بادشاہ پرستوں کی بدنامی اور رسوائی عام ہوگئی۔ ملک میں فتنہ و فساد کا دروازہ کھل گیا۔ عوام و خواص میں جو لوگ سفلہ طبیعت اور پست فطرت تھے وہ ان بے ادبیوں کے باوجود خود کو بادشاہ کا مرید کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور لالچ یا خوف سے بادشاہ کے مرید ہو جاتے تھے۔ کسی کا بس نہ تھا کہ حق بات زبان پر لائے۔

اسی زمانے میں حاکم بنگالہ مظفر خاں نے پانچ لاکھ روپیہ نقد اور دوسرے قیمتی تحائف، ہاتھی اور کپڑے وغیرہ کافی تعداد میں نذرانے کے لیے دربار میں بھیجے۔ محمد معصوم کابلی کے بھیجے ہوئے 39 ہاتھی بھی خدمت شاہی میں پیش کیے گئے۔

خیرات کا مظاہرہ

اسی مہینے کے دوسرے جمعہ کو چوگان بازی کے میدان میں فقیروں اور مستحقوں کو جمع کیا گیا اور بادشاہ خود وہاں تشریف لے گئے۔ اس وقت احاطے میں تقریباً ایک لاکھ مرد اور عورتیں جمع تھیں۔ سلطان خواجہ صدر اور قلیچ خاں نے ایک ایک کو روپیہ تقسیم کیا۔ وہ دن بھی محشر سے کچھ کم نہ تھا۔ ہجوم کی ریل پیل میں 80 عورتیں اور بچے ہلاک ہو گئے۔ بعض عورتوں کے پاس سے جن کے شوہر بنگال میں مر چکے تھے، اشرفیوں اور روپیوں سے بھری ہوئی تھیلیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اس انکشاف سے بادشاہ کا دل فقراء کی طرف سے بھی بیزار ہو گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے بعد تھوڑے سے لوگ حاضر کیے جائیں کچھ عرصے کے بعد خیرات کا یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

شاہزادہ سلیم کی اتالیقی

بڑے شاہزادہ کی اتالیقی پر قطب الدین محمد خان اتکہ کو مقرر کیا گیا۔ اس تقریب کے لیے ایک بڑی محفل منعقد ہوئی اور قطب الدین نے عمدہ ہاتھی اور اپنے عہدے کے شایان شان نذرانے پیش کر کے رسم و قاعدے کے مطابق شاہزادہ کو کاندھے پر بیٹھا کر سونا اور جواہر کے تھال نچھاور کیے۔

اسی سال ماورالنہر سے عبد اللہ خاں اوزبک کا ایلچی چاپلوسی کا خط لے کر آیا۔ اکبر نے میرزا فولاد برلاس کو خواجہ خطیب کے ہمراہ جو بخارا کا باشندہ تھا، تحفے اور ہدیے دے کر اوزبک کے ایلچی کے ساتھ بھیجا۔ بادشاہ کے خط کے آخر میں یہ شعر درج کیا گیا تھا:

چو مادوست باشیم با یکدگر
بود بحر و بر ایمن از شورو شر

اکبر کے حق اجتہاد کے لیے علما کا محضر

بادشاہ کی دینی سیادت کو تسلیم کرانے کے لیے ان دنوں ایک محضر تیار کیا گیا جس میں مجتہد

شرع پر امام عادل کی فضیلت ثابت کی گئی تھی اور امام عادل (حکمرانِ وقت) کو اس بات کا حق دیا گیا تھا کہ وہ اختلافی مسائل میں کسی روایت کو دوسری روایتوں پر ترجیح دے سکتا ہے اور اس کے مطابق تجویز و فیصلہ کر سکتا ہے۔

اس محضر نامے پر مخدوم الملک شیخ عبد النبی صدر الصدور، قاضی جلال الدین ملتانی (قاضی القضاۃ)، صدر جہاں مفتی اعظم، مشہور عالم شیخ مبارک اور غازی خاں بدخشی نے جو معقولات کا بہت بڑا عالم تھا اپنے دستخط کیے تھے اور اس پر ان کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔

اس محضر کا منشا یہ تھا کہ بادشاہ جو بھی تجویز اور حکم دیں خواہ وہ امور مملکت ہوں یا مسائل شرع اس سے انحراف و اختلاف کی کسی شخص کو مجال نہ رہے اور جو ایسا کرے وہ اس محضر کی رو سے خود ہی ملزم بن جائے۔

اس محضر سے متعلق بڑی بحثیں ہونے لگیں۔ ان مباحث کا موضوع یہ تھا کہ اجتہاد اور مجتہد کی اصطلاحوں کا آخر کس پر اطلاق ہوتا ہے؟ اور ایسے امام عادل کو جو امور مملکت میں صاحب تدبر ہو اور بلحاظ مراتب مجتہدین سے بلند مرتبہ ہو اس بات کا اختیار رکھتا ہے یا نہیں کہ وہ مصلحت وقت کے لحاظ سے اختلافی مسائل میں اپنا فیصلہ نافذ کر دے۔

یہ بحث و تمحیص تو ہوتی رہی لیکن عملاً یہی ہوا کہ اس محضر نامے پر بعض نے خوشی سے اور بعض نے جبراً مہریں لگا کر اس کی تصدیق کر دی۔

محضر نامے کا متن

اس تمہید و تشریح کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان جیسا وسیع ملک سلطان جہاں پناہ کے عدل و انصاف تدبر و انتظام سے دارالامن بن چکا ہے اور ہر جگہ کے خواص و عوام خاص طور سے عرب و عجم کے علما و فضلاء یہاں آ کر مقیم ہو چکے ہیں۔ بنا بریں تمام علماء نے بڑے غور و فکر کے بعد اس آیتِ کریمہ کے پیش نظر کہ **"اطیعو الله واطیعو الرسول و اولی الامر منکم"** اور اس حدیث صحیح کی روشنی میں کہ **"ان احب الناس الی الله یوم القیامة امام عادل من یطیع الامیر فقد اطاعنی و من یعصی الامیر فقد عصانی و غیر ذلك** نیز عقلی اور نقلی

دلائل وشواہد کی بنا پر یہ حکم لگایا کہ ''سلطان عادل کا مرتبہ اللہ کے پاس مجتہد کے مرتبہ سے بڑھ کر ہے''۔

لہٰذا حضرت سلطان الاسلام امیر المومنین ظل اللہ ابو الفتح جلال الدین محمد اکبر بادشاہ غازی خلد اللہ ملکہ، عوام کی سہولت اور مملکت کے انتظامی مصالح کی خاطر اگر دین کے وہ مسائل جو مجتہدین کے نزدیک اختلافی ہوں کسی بھی ایک صورت کو تجویز کر کے اس کے مطابق احکام کا اجرا فرمائیں تو ان کی تجویز وحکم متفق علیہ متصور ہوگا اور اس کی اطاعت اور پیروی تمام رعایا پر لازمی اور قطعی ہوگی۔

جب بھی سلطان عالم پناہ کوئی بھی ایسا قانون اور حکم نافذ فرمائیں جو عوام کے لیے باعث سہولت ہوا اور نصوص شرع کے مغائر نہ ہو اس پر عمل درآمد ہر شخص پر لازم وقطعی ہوگا اور اس کی مخالفت عذاب اخروی اور خسران دینی و دنیاوی پر مستلزم ہوگی۔

یہ طور حقوق اسلام کے اجرا کی خاطر علمائے دین اور فقہائے مجتہدین کے محضر سے ماہ رجب 987ھ/ 1589ء میں ضبط تحریر میں لائی گئی۔ اس محضر کا مسودہ شیخ مبارک نے مرتب کیا تھا دوسرے علما نے کراہتاً اس کی نقلیں کیں۔ شیخ مبارک نے بڑے انشراح قلب کے ساتھ محضر کے ذیل میں یہ فقرہ لکھا کہ ''میں اس بات کا دل و جان سے خواہش مند تھا اور سالہا سال سے اس کا منتظر تھا''۔ اس محضر کی صورت میں بادشاہ کو کلی اختیارات مل گئے۔ بس پھر کیا تھا جلد ہی اجتہاد کا دروازہ کھل گیا اور کسی کو کسی قسم کی مخالفت کی مجال نہیں رہی۔ تحلیل وتحریم کا جھگڑا مٹ گیا اور شریعت کے مقابلے میں امام کی رائے کو فوقیت حاصل ہوگئی۔ بادشاہ نے کھلم کھلا اسلام کو تقلید کا نام دے کر پس پشت ڈال دیا۔ شیخ ابوالفضل کا معاملہ سمرقند کے حیرتی شاعر کے مماثل تھا کہ جب اس نے ماوراء النہر کے سرد مزاج لوگوں کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائیں تو ان کی ضد میں عراق کے جگادری مومنوں کے ساتھ اس نے یارانہ کر لیا اور ان کے ساتھ بھٹکتا پھرا۔ ابوالفضل نے بھی اس بے دینی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور منھ دیکھے کی شرم میں آخرت کے انگارے سمیٹ لیے۔

اجمیر کا آخری سفر

اسی سال 16 ماہ رجب کو بادشاہ اجمیر تشریف لے گئے۔ یہ بس اجمیر کا آخری سفر تھا، اس کے بعد سے آج تک کہ چودہ سال گزر گئے۔ عنان شاہی اس طرف پھیری نہیں گئی۔ حسب دستور اجمیر سے پانچ کوس پر پیادہ ہوکر سفر کیا اور مزار مبارک کی زیارت کی۔

ان دنوں لوگ بادشاہ پر پھبتی کستے تھے کہ ''کیا خوب خواجہ اجمیریؒ کے ساتھ تو یہ عقیدت اور اس اصل اصول سے جس کے طفیل دنیا کے ہر گوشے میں خواجہ صاحب جیسے ہزاروں کامل ولی پیدا ہوئے یہ انحراف و سرتابی'':

پری نہفتہ رخ و دیو درکرشمہ ناز
بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است
درین چمن گل بی خار کس نچید آری
چراغ مصطفوی باشرار بولہبی است

بادشاہی کلمہ

مخدوم الملک اور شیخ عبدالنبی ہزار بے وقعت سہی لیکن ان کے ہوتے ہوئے دینی معاملات میں اکبر کی جسارتیں رکی رکی اور سہمی سہمی رہیں۔ ان کے جانے کے بعد گویا پانوں کی بیڑیاں کٹ گئیں اور اس نے دھڑلے سے عقائد و مسائل میں نئی نئی اختراعات شروع کردیں۔ چنانچہ قرآن کو مخلوق قرار دے دیا، وحی کو امر محال کہا، نبوت و امامت کے بارے میں شکوک پیدا کیے، جن فرشتے اور دوسرے تمام امور غیبی، معجزوں اور کرامتوں کا انکار کردیا۔ قرآن کے تواتر اور اس کے کلام الٰہی ہونے پر بھی اعتراضات وارد کیے، مرنے کے بعد بقائی ارواح اور عذاب و ثواب کو صرف تناسخ پر منحصر کردیا اور اپنے ان خیالات کے لیے مندرجہ ذیل اشعار کو سند بنالیا:

از حقیقت بدست کوری چند
مصحفی ماند و کہنہ گوری چند

گور باکس سخن نمی گوید
سرّ قرآن کسی نمی جوید

یا

عید آمد وکارہا نکو خواہد کرد چون روی عروس
ساقی می ناب در سبو خواہد کرد چوں خون خروس
افا و نماز و پوز بند روزہ یک بار دگر
از گردن این خران فرو خواہد کرد افسوس افسوس

بے دینی کی یہ لے یہاں تک بڑھی کہ لوگوں کو حکم دیا گیا کہ وہ بادشاہ کا خاص کلمہ ''لا الٰہ الا اللہ اکبر خلیفۃ اللہ'' اعلانیہ پڑھا کریں، لیکن اسی خیال سے کہ یہ حکم عام ہو تو ملک میں شاید خلل برپا ہو جائے، اس کلمہ کے پڑھنے کا لزوم صرف اپنی حرم سرا تک ہی محدود کر دیا۔

اکبر کی اس بے دینی کی تاریخ ''فقہای امت'' سے نکلتی ہے۔

غیرت مند حق گو امیر

بادشاہ نے جب قطب الدین محمد خاں اور شہباز خاں اور اس پایہ کے دوسرے امیروں کو بھی اسلام کی تقلید چھوڑ کر اس نئے دین کو اختیار کرنے کی ترغیب دی تو ان امیروں نے بڑی جرأت سے اس مطالبے کو رد کر دیا۔ قطب الدین محمد خاں نے کہا ''شاہان ولایت خلیفہ روم وغیرہ اگر ان باتوں کو سنیں گے تو آخر کیا کہیں گے؟ وہ سب بہرحال اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہیں خواہ وہ تقلیدی ہو یا کچھ اور...'' اکبر نے اس پر چڑھ کر کہا۔ ''تو روم کے فرمانروا کی خاطر ہمارے ساتھ اس درشتی سے بات کر رہا ہے تو اس طرح ان کے پاس اپنا ٹھکانا بنانا چاہتا ہے کہ یہاں سے نکلنا پڑے تو وہاں جا کر اعزاز و مرتبہ حاصل کر لے''۔

شہباز خاں نے بھی بڑی سختی سے مخالفت کی اور جہنمی کتے بیربر کو جو اعلانیہ اسلام پر طعنے کرتا رہتا تھا سب کے سامنے گالی دے کر کہا ''اے ملعون کافر، اب تیری بھی زبان نکل آئی کہ ایسی باتیں کرنے لگا، ہم تجھے اس کا مزہ چکھائے بغیر نہیں رہیں گے۔ غرض

دربار میں بڑی بدمزگی پیدا ہوگئی اور اکبر نے غصّے میں آکر شہباز خاں اور دوسرے امراء کو کہا ''چپ رہو ورنہ ہم تمہارے منہ پر نجاست بھری جوتیاں مارنے کا حکم دیں گے''۔

علماء اور ائمہ کی بدحالی

انہی دنوں پٹن کا حاکم ترسون محمد خان گجرات سے آکر حاضر ہوا اور قاضی علی بغدادی کو شیخ عبدالنبی کی جگہ مدد معاش اور آراضیات کی تحقیق و ضبطی کے لیے مقرر کیا گیا۔ وہ ہزاری، پانصدی اور صدی کے مرتبہ رکھنے والے ائمہ کو بادشاہ کے ملاحظے میں پیش کرتا تھا۔ ان کی اکثر زمینیں ضبط کرلی جاتی تھیں۔ کٹ کٹا کر بہت تھوڑی سی زمین ان کے پاس رہ گئی۔ اس طرح بڑے بڑے علماء و ائمہ اور مشاہیر کے خاندانی اعزاز و اعتبار کو گھٹا دیا گیا اور شریفوں کی اولاد مفلسی کی وجہ سے آوارہ ہوگئی، مدرسے اور مسجدیں ویران ہونے لگیں اور اکثر لوگ جلا وطن کردیے گئے۔

مدارس از علما آن چنان بود خالی
کہ ماہ روزہ زمیخوارہ خانۂ خمار
برند تختۂ لوح ادیب از پئی مزد
کنند مصحف قاری گرد بوجہ قمار

ان معاملات میں حکیم الملک اور شیخ ابوالفضل میں بڑی مخالفت رہتی تھی۔ حکیم اس کا نام بگاڑ کر ''فضلہ'' کہا کرتا تھا۔ اکبر ابوالفضل کے کافی قریب تھا۔ اس لیے حکیم الملک پر اس نے بڑی سختی کی، آخرکار مکہ معظمہ کی طرف اس کے اخراج کا حکم صادر کردیا۔

خدمت شاہی پر دوبارہ تقرر

اسی سال ماہ رمضان میں اجمیر کے قیام کے وقت قاضی علی نے مجھے بھی، کہ میں عرصے سے ملازمت سے علیحدہ ہوکر گھر پر بیٹھا تھا، بادشاہ کے سامنے پیش کیا اور بادشاہ کو میری مدد معاش کے سلسلے میں ہزار بیگھ زمین کا وعدہ یاد دلایا۔ بادشاہ نے کہا مجھے بھی خیال ہے کہ ''اس کے فرمان میں ایسی کوئی شرط تھی'' قاضی علی نے کہا ہاں بشرط خدمت ان کو زمین دی

گئی تھی۔ اکبر نے کہا اس سے پوچھو" کیا کوئی ضعف و عارضہ تھا کہ اس نے ملازمت ترک کردی"۔ غازی خاں بدخشی نے فی البدیہہ کہا: "قسمت کا ضعف تھا"۔ اس موقعے پر تمام مقربوں نے سابقہ امامت کا حق سمجھ کر، سابقہ اس لیے کہ ان دنوں نماز باجماعت بالکل ہی ختم کردی گئی تھی، میرے لیے سفارشیں کیں۔ بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم کسی کو ملازم رہنے پر مجبور نہیں کرتے، اگر یہ ملازمت کا ارادہ نہیں رکھتا تو اس کی زمین نصف ہو جائے گی"۔ میں نے فوراً ہی اس بات کو قبول کرلیا۔ یہ بات بادشاہ کو بڑی ناگوار گزری اور میری طرف سے رخ پھیر لیا۔ قاضی علی نے مکرر عرض کیا کہ آخر اس کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے، تو بڑے اصرار کے بعد فرمایا "شیخ عبدالنبی، جو اس وقت تک لشکر میں موجود تھا، سے پوچھا جائے کہ وہ ملازمت کی شرط کے بغیر کس قدر زمین کا حقدار ہو سکتا ہے۔" شیخ نے مولانا الہداد امروہی مرحوم کے ذریعے کہلوایا کہ، ملا عبدالقادر عیال دار آدمی ہے اور اس کے ذمے کافی اخراجات ہیں۔ میں حسب الحکم اس لیے آٹھ سو یا سات سو بیگھ زمین تجویز کرتا ہوں"۔ مصاحبوں کا خیال تھا کہ اب ایسی کوئی عرضداشت مناسب نہ ہوگی اور وہ سب مجھے ملازمت اختیار کرلینے پر مجبور کرنے لگے، مجبوراً میں دوبارہ اس ملازمت کے چکر میں پھنس گیا۔ جس سے بہ مشکل چھٹکارا نصیب ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے بھگتنا پڑا کہ میں نے بادشاہ کے بارہا حکم دینے کے باوجود پہلے ہی داغ کی تجویز قبول نہیں کی تھی اور زبان حال و قال سے یہ شعر پڑھ دیا کرتا تھا:

شادم کہ یک سوار ندارم پیادہ ھم
فارغ زقید شاھم و از شاہزادہ ھم

جزیہ کی معافی

اسی سال بادشاہ نے تمغا اور جزیے کا قانون جس کے ذریعہ کروڑ ہا روپے کی آمدنی ہوتی تھی معاف کردیا اور اس کے لیے تاکیداً فرامین صادر کیے گئے۔

اسی سال محمد معصوم خاں ولد معین الدین احمد خاں فرنخودی جو جونپور کی حکومت پر فائز

تھا دربار میں حاضر ہوا اور جونپور کی رخصت پا کر لوٹ گیا۔ ملا محمد یزدی جونپور کا قاضی القضاۃ بنایا گیا۔ دہلی کی حکومت محب علی خاں ولد میر خلیفہ کو عطا ہوئی۔

ملا محمد یزدی کا فتویٰ

ملا محمد یزدی نے جونپور جانے کے بعد بادشاہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ اس کے فتوے پر محمد معصوم کابلی، محمد معصوم خاں فرنخودی، میر معز الملک نیابت خاں، عرب بہادر اور دوسرے امیر تلواریں کھینچ کر بادشاہ سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔ اکثر مقامات پر انھوں نے بڑی سخت لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانے میں ائمہ کہا کرتے تھے بادشاہ نے ہماری مدد معاش کی، زمینوں پر ہاتھ ڈالا تو اللہ نے اس کے ملک کو تاڑ لیا۔

علماء کا اخراج اور تبادلے

جب مہتر سعادت جسے پہلے خاں کا خطاب حاصل تھا معصوم خاں جونپوری کے پاس جا کر واپس آیا تو اس نے ملا محمد یزدی کے فتوے اور وہاں کی صورتحال سے متعلق تفصیلات بادشاہ کو بتائیں اکبر نے کسی بہانے سے میر معز الملک اور محمد یزدی کو جونپور سے بلا بھیجا۔ جب یہ لوگ فیروز آباد جو آگرے سے دس کوس پر ہے، پہنچے تو حکم بھیجا گیا کہ سواروں کو ان سے علیحدہ کر کے دونوں کو کشتی میں بٹھا کر جمنا کے راستے گوالیار لے جائیں اس کے پیچھے ہی دوسرا حکم آیا کہ دونوں کو ختم کر دیا جائے۔ ''محافظ دوسری کشتی میں سوار ہو جائیں اور ان کو کسی پرانی کشتی میں بٹھا کر عین دریا میں پہنچنے پر ملاحوں کو حکم دیں کہ ان کی کشتی کو غرق کر دیا جائے۔ چند دن بعد ہی قاضی یعقوب بنگال سے وہاں آئے گا اس کو بھی ان کی طرح ختم کر دیا جائے''۔

اس طرح اکبر نے ان تمام علماء کو جن کے بارے میں اسے اندیشے تھے، ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دیا اور لاہور کے علماء کو جلا وطن کر کے جگہ جگہ منتشر کر دیا۔ ان میں قاضی صدرالدین لاہوری کو جن کا علمی مرتبہ مخدوم الملک سے زیادہ تھا بھڑوچ، گجرات کی قضاوت پر، عبدالشکور گول دار کو جونپور کی اور ملا محمد معصوم کو بہار کی حکومت پر مقرر کیا۔ شیخ

منور کو مالوہ کی طرف جلاوطن کر کے اس صوبے کی صدارت اس کو عطا کردی۔ لاہور میں صرف مولانا معین کے پوتے شیخ معین جو مشہور واعظ تھے، رہ گئے۔ بادشاہ نے ان کو کبر سنی کی وجہ سے نظر انداز کردیا۔ یہ بزرگ 995ھ/ 1587ء میں فوت ہوئے۔

صاحب زمان کی پیشین گوئی

حاجی ابراہیم سرہندی کا تقرر گجرات کی صدارت پر کیا گیا تھا۔ اس نے ائمہ سے رشوت لے کر کافی روپیہ اور ذخیرہ جمع کرلیا اگر وہ بچارے رشوت دینے سے انکار کرتے تھے تو وہ ان کی مدد معاش کو روک دیتا تھا۔ اس کی حرکتیں بادشاہ کے علم میں بھی آئیں اور یہ بھی پتہ چلا کہ وہ دکن جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہے۔ چنانچہ اسے بغاوت کے الزام میں معزول کردیا اور واپس بلا کر حکیم عین الملک کے سپرد کردیا۔ شبانہ مجلسوں میں اس کو بھی بلایا جاتا تھا اس نے اسی زمانے میں بزرگان دین کے متعلق جھوٹی سچی باتیں لکھ کر ایک رسالہ بادشاہ کی خدمت میں خوشامد کے طور پر پیش کیا، لیکن اس کی پول بہت جلد کھل گئی۔ اصل میں اس نے ایک کرم خوردہ کتاب جو غیر معروف خط میں شیخ ابن عربی سے منسوب کر کے ایک جعلی عبارت لکھی تھی کہ صاحب زمان بہت سی عورتوں سے نکاح کرے گا، داڑھی منڈا ہوگا اور ایسی ہی چند علامتیں جو اکبر میں پائی جاتی تھیں درج کردی تھیں۔ یہ رسالہ اکبر کو بہت پسند آیا اور مہربان ہو کر اسے مقربوں میں شامل کرلیا۔

حاجی ابراہیم کی مذکورہ تحریر کے مطابق امان پانی پتی کے بھتیجے ملا ابو سعید کی کتابوں میں سے ایک پرانا رسالہ فراہم کیا گیا جس میں ایک موضوع حدیث درج تھی کہ "ایک صحابی کا لڑکا داڑھی منڈا کر جب حضور اکرم ﷺ کے سامنے آیا تو آپ نے فرمایا اہل جنت کی یہی وضع ہوگی" یہ حدیث بھی اکبر کو بڑے اہتمام سے دکھائی گئی۔

حاجی ابراہیم، شاہ فتح اللہ، شیخ ابو الفضل اور حکیم ابو الفتح کے ساتھ بڑی بے باکی کے ساتھ مباحثے کرتا تھا اور ان کو ترکی بہ ترکی جواب دیتا تھا۔ اس لیے اس کو اکبر نے رنتھمبور کے قلعے میں بھیج دیا وہ اسی جگہ فوت ہوا۔ اس کی لاش قلعے کی فصیل سے نیچے پھینک دی

گئی۔ لاش لمبے کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھی، اس لیے یہ مشہور ہوا کہ اس نے خود اپنے آپ کو قلعے سے نیچے گرا دیا۔ یہ حادثہ 994ھ/1586ء میں پیش آیا تھا۔

وضائف و مدد معاش میں کمی

اہل علم کے لیے ان کا علم ہی وبال بن گیا تھا۔ آئے دن ان بچاروں کو طرح طرح کی سرکاری کاروائیوں کا سامنا رہتا تھا۔ بادشاہ نے ممالک محروسہ کے تمام علما اور مشائخین کو فرمان بھیج کر دربار میں بلایا اور خود بہ نفس نفیس انکی مدد معاش، انعام و وظائف کی تحقیق کی۔ سب علما کو درباری آئین کے مطابق تعظیم و تسلیمات بجالانا پڑتا تھا۔ بادشاہ ان عالموں سے خلوت و جلوت میں گفتگو کر کے اپنے حسب مرضی ہر ایک کے لیے مختصر سی زمین مقرر کر دیتا تھا اور جس کسی کے متعلق یہ رپورٹ ہوتی کہ وہ پیری مریدی کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے یا مجلس سماع منعقد کرتا ہے یا کسی نہ کسی طرح کا اعزاز اسے حاصل ہے۔ اس کے مشغلوں کو دکانداری کا نام دے کر اسے یا تو کسی قلعے میں قید کر دیا جاتا تھا یا بنگال اور بھکر کی طرف جلا وطن کر دیا جاتا تھا۔

علماء کے خلاف یہ کاروائیاں برابر ہوتی رہتی تھیں، بوڑھے اور معمر پیروں اور شیوخ کا حال اور بھی بُرا تھا۔ صاحب سماع، اہل ذوق صوفیوں کی معاش کے فرامین کی جانچ پڑتال ہندو کارندوں کے ذمے تھی اور ان کا اجرا اس وقت تک نہیں ہوتا تھا جب تک ان پر ہندو افسران کی مہر نہ لگ جاتی۔ اس معاشی بدحالی کی وجہ سے بچارے صوفی اپنے حال وقال کو فراموش کر بیٹھے اور وطن چھوڑ کر کسی نہ کسی جائے پناہ میں جا چھپے۔ان کا سارا تصوف دھرا کا دھرا رہ گیا

چنان قحط سالی شد اندر دمشق
کہ یاران فراموش کردند عشق
چنان آسمان بر زمین شد بخیل
کہ لب تر نکردند زرع و نخیل

کیوں نہ ہو ان ظاہر پرست صوفیوں کی بے روح مجلسیں ان کی بے حسی اور جمود، شرمناک اعمال اور بے جا تکلیفات کا یہی خمیازہ ہونا تھا۔ ان بے فیض صوفیوں میں اکثر اسی لائق تھے کہ اس برے انجام سے دو چار ہوتے:

آن نہ صوفی گری و آزادیست بلکہ کیدی گری و قوادیست
دزدی و راہزنی بہتر ازین کفن از مردہ کنی بہتر ازین

موضوع کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں تاریخی واقعات کو قلمبند کروں لیکن کیا کروں، قلم بے اختیار دوسری طرف بہک جاتا ہے بیان کا سلسلہ چھوڑ کر زمانے کی اس نئی چال، اس نئے مذہب اور اس نئی ملت کی طرف رخ پھر جاتا ہے۔ کاش میں اس الجھن سے نجات پا جاتا لیکن آہ مجبوری:

خطابی با فلک کردم کہ از تیغ جفا کشتی شہان مجلس آرای و جوان مردان برمک را
زمام حل و عقد نہادی در کف قومی کز روی کرم باشد بر ایشان شرف سگ را
ہمان در گوش جانم گفت فارغ باش خوش منزل
کہ سیلت بر کند ایام ھیودہ روز یک یک را

بنگال میں مظفر خاں کی سختی

اسی سال مظفر خاں بنگال کی وصولی پر گیا۔ اس نے وہاں کے معاملات میں بڑی سختی سے کام لیا اور بنگال میں متعینہ امرا اور دوسرے سرداروں کو سخت ایذائیں دیں۔ اکثر امیروں کی جاگیر ضبط کر کے دربار کے طریقے پر داغ و محلّہ اور محاسبے کے پرانے طریقے نافذ کر دیے۔

بابا خاں قاقشال اور خالدی خاں نے جو مملکت کے با اقتدار امیر اور نفس ناطقہ تھے داغ کے قانون سے معافی اور جاگیروں کی بحالی کے لیے بڑی کوشش کی لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مظفر خاں نے خالدی خاں کو اس الزام میں قید کر دیا کہ اس نے داغ و محلّہ کے بغیر ہی جاگیر کی رقمیں وصول کر لی تھیں اور اسے واپس نہیں کیا تھا۔

اتفاق سے انہی دنوں مظفر خاں کے پاس شاہی فرمان آیا کہ مرزا محمد حکیم کا ایک آدمی

روشن بیگ نامی کابل سے بنگالہ گیا ہوا ہے، اسے گرفتار کر کے سزادی جائے۔ مظفر خاں نے اسے تلاش کرایا تو وہ قاقشالوں کے پاس سے پکڑا گیا اس نے بر سر دربار بابا خاں سے بڑے سخت لہجے میں پوچھ گچھ کی اور شاہی فرمان دکھا کر روشن بیگ کے قتل کا حکم دیا۔

قاقشالوں کی بغاوت

مظفر خاں کے ان سخت احکام سے سپاہی بڑے خوفزدہ ہوگئے اور سب نے مل کر اپنے سر منڈوالیے، مغلوں کا بانا پہن لیا اور بغاوت کا اعلان کردیا۔ شہر گوڑ جسے پہلے لکھنوتی کہا جاتا تھا۔ مظفر خاں کے جمع کیے ہوئے مال و اسباب کو لوٹ لیا۔ اس نے باغی قاقشالوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہت سی کشتیاں تیار کرائیں اور حکیم ابو الفتح اور پتر داس کو گوڑ کی طرف روانہ کیا۔

حکیم ابو الفتح بزم کا یکہ تاز تھا، رزم کا شہسوار نہیں اور پتر داس ایک ہندو دفتری تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ جنگجو قاقشالوں کے مقابلے میں کون سا تیر مار سکتے تھے۔ جب قاقشال ان فوجی کاروائیوں سے دبتے نظر نہ آئے تو مظفر خاں نے ان کے نام ہمدردانہ فرمان بھیج کر پیغام دیا کہ ''تمہاری جاگیریں بحال کردی جائیں گی۔ تمہارے پاس رضوی خاں اور پتر داس کو اس سخت کہا سنی کے لیے بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ معاملات کو اچھے ڈھنگ سے طے کرادیں''۔ اس کے بعد ہی مذکورہ بالا دونوں اشخاص کو میر سید رفیع الدین محدث کے لڑکے میر ابو اسحاق کے ساتھ قاقشالوں کے پاس بھیج دیا گیا۔ قاقشالوں نے کسی قسم کی گفتگو سے انکار کردیا اور ان لوگوں کو قید کر کے لڑنے مرنے پر تیار ہوگئے۔

بہار کے امراء کی بغاوت

اسی دوران ملا طیب اور رائے پرکھوتم بخشی نے معصوم خاں کابلی، عرب بہادر اور بہار کے تمام امیروں کی جاگیروں کو بہ یک قلم ضبط کرلیا۔ اس کاروائی نے ان امیروں کو بغاوت کرنے پر مجبور کردیا۔ پھر ان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے یہ دونوں ندی کو پار کر کے معصوم

خاں کے مقابلے پر پہنچے۔ عرب بہادر نے ان کو غفلت میں رکھ کر اچانک حملہ کر دیا اور رائے پرکھوتم کو قتل کر کے شاہی لشکر کا بہت سا مال لوٹ لیا۔

بہار کے ان باغیوں نے بابا خاں قاقشال سے مراسلت کی اور قاقشالوں کا ساتھ دینے کے لیے کرہی کی طرف پیش قدمی کر دی۔ ان کا راستہ روکنے کے لیے مظفر خاں نے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کو جو اب دیوان کل کے عہدے پر مامور ہے، روانہ کیا۔ معصوم خاں نے اسے شکست دے کر بھگا دیا اور قاقشالوں کو ساتھ لے کر دریائے گنگا پار کی اور مظفر خاں کے مقابلے میں صف آرائی کر لی۔

مظفر خاں کا قتل

باغیوں کی مدافعت کے لیے مظفر خاں ٹانڈہ میں جو اس وقت ایک پرانی چار دیواری سے بڑھ کر نہیں تھا، محصور ہو گیا۔ اس وقت وزیر خاں جمیل بیگ نے جو ایک پرانا امیر تھا۔ جان محمد خاں بہبودی کو ساتھ لے کر مظفر خاں پر حملہ کر دیا نیز حکیم ابو الفتح اور خواجہ شمس الدین اور دوسرے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ یہ دونوں اور پتر داس کسی نہ کسی طرح باغیوں کی قید سے نکل بھاگے اور مظفر خاں کی مدد کے لیے اپنے زمینداروں کو حاجی پور میں بھیج دیا۔ انہی معرکوں میں حکیم نورالدین قراری بھی مارا گیا اور باغی قاقشالوں اور معصوم خاں نے مظفر خاں کو قولنامہ دے کر ٹانڈے کے قلعے سے باہر آنے پر مجبور کر دیا پھر اسے گرفتار کر کے اذیتیں دے کر مروا ڈالا۔

بنگال کی خود مختاری

اب باغیوں کے حوصلے بہت بڑھ گئے تھے مظفر خاں سے چھینا ہوا کافی مال و اسباب ان کے پاس تھا، انھوں نے اچھی خاصی جمیعت فراہم کر لی اور پورے بنگال اور بہار پر قبضہ کر لیا۔ ایک بڑی پیدل اور سوار فوج بنالی۔ میرزا شرف الدین حسین ان دنوں نظر بند تھا۔ اسے بادشاہ نے کالپی کے حاکم قاسم علی خاں بقال کے پاس سے بنگالہ بھجوا دیا تھا۔ باغیوں

نے میرزا کو قید خانے سے نکال کر اپنا سردار بنا لیا۔ بنگال میں ایک خود مختار حکومت قائم ہو جانے سے سارے ملک میں بڑا ہنگامہ برپا ہوگیا۔

راجہ ٹوڈرمل کی فوجی کاروائی

اکبر نے بنگال کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے راجہ ٹوڈرمل، صادق محمد خاں، ترسون محمد خاں اور دوسرے تمام امرا کو فتح پور سے روانہ کیا۔ راجہ کی مدد کے لیے محمد معصوم خاں فرنخودی حاکم جون پور اور اس علاقے کے دوسرے جاگیرداروں کو مقرر کیا۔

ابھی یہ لوگ راستے ہی میں تھے کہ شاھم خالد بدخشی سے جنگ کرکے اسے قتل کردیا۔ محمد معصوم جونپوری نے تین ہزار مسلح اور تیار سواروں کو راجہ کے ملاحظے میں پیش کیا، لیکن اس کی حرکات و سکنات سے راجہ بھانپ گیا کہ وہ بھی بغاوت کی فکر میں ہے اسی لیے بہ ظاہر اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آتا رہا لیکن ساری صورت حال دربار میں لکھ کر بھیج دی۔

شاہی لشکر سے مقابلے کے لیے محمد معصوم خاں کابلی، میرزا اشرف الدین حسین اور قاقشالوں کی فوج تیس ہزار سوار، پانچ سو ہاتھی، بے شمار کشتیاں اور توپ خانہ لے کر مونگیر کے قصبے میں پہنچ گیا۔ راجہ کو اپنے لشکر پر پورا بھروسہ نہ تھا وہ بخوبی سمجھتا تھا کہ یہ سب موقعے کے منتظر ہیں، اس لیے اس نے دشمن سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور مونگیر کے قلعے میں قلعہ بند ہوگیا۔ دشمن کی طرف سے ہر روز سخت لڑائی ہوتی تھی اور شاہی لشکر رسد کے نہ ملنے کی وجہ سے نہایت تنگ ہوگیا۔ اسی اثناء میں شہباز خاں کے داماد زین الدین کنبو نے دریا کے راستہ ڈاک چوکی کے ذریعہ ایک لاکھ روپیہ راجہ کے پاس بھجوا دیا جو کچھ دن تک ضرورت میں استعمال ہوتا رہا۔ بادشاہ اسی طرح وقفے وقفے سے کبھی تو دریا خاں آبدار کے ذریعے کبھی سرمدی کے ہاتھ اور کبھی سیٹھ بھگوان داس خزانچی کے بیٹے کی معرفت رقمیں بھیجتے رہتے تھے۔

ڈاک چوکی پر جو لوگ مقرر تھے ان میں قاضی زادہ عبد الحی خواص ولد قاضی

صدرالدین سنبھلی بھی تھا جو نہایت حسین اور خوبصورت نوجوان تھا، لیکن جتنا خوبصورت تھا اتنا احمق بھی تھا۔ وہ بھی ان خطیبوں میں شامل تھا جو مذہب و ملت کے بارے میں زبان درازیاں کرتے رہتے تھے۔ اس مہم کے دوران وہ بھی عین عالم جوانی میں مارا گیا۔

راجہ کی فوج کے ساتھ شاہ فرملی کا لڑکا ہمایوں فرملی بھی تھا۔ جسے ہمایوں نے قلی خاں کا خطاب دیا تھا۔ وہ نئے بادشاہی دین کے ہنگاموں کو اور اجمیر میں لوگوں کے ابتلا و آزمائش کے ہولناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے خود دیکھ چکا تھا اور سخت متنفر تھا۔ مونگیر کے محاصرے کے وقت موقع پا کر وہ اور ترخان دیوانہ شاہی لشکر سے بھاگ کر باغیوں سے جا کر مل گئے۔

باغیوں کی حوصلہ شکنی

مونگیر کا محاصرہ کافی طویل ہوگیا۔ اسی دوران بابا خان قاقشال سخت بیماری میں قریب مرگ ہوگیا اس کے ضعف و بیماری کو دیکھ کر مجنوں خان قاقشال کا لڑکا جباری جو باغیوں کا سرکردہ تھا اور اب وہ دربار شاہی میں خدمت پر مقرر ہے، محاصرہ اٹھا کر لوٹ گیا۔ باغیوں کا لشکر منتشر ہوگیا۔ معصوم خاں کابلی بھی مجبور ہوکر بہار کی طرف بھاگ گیا اور عرب بہادر نے پٹنہ پر قبضہ کرنے اور بادشاہی خزانہ لوٹ لینے کے ارادے سے پٹنہ پر حملہ کردیا۔ بہادر خاں خاص خیل جو سید عارف کے نام سے مشہور تھا پٹنہ کے قلعے میں بند ہوگیا۔ راجہ ٹوڈرمل نے معصوم خاں فرنخودی کو بہادر خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا۔ عرب بہادر ان سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، اس لیے وہ مشہور زمیندار گجپتی کے پاس چلا گیا۔

راجہ ٹوڈرمل، صادق خاں اور دوسرے شاہی امیروں نے معصوم خاں کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بہار کی طرف کوچ کردیا۔ معصوم خاں نے شاہی لشکر پر اچانک رات میں چھپ کر حملہ کیا اور صادق خاں کے کیمپ پر جا پڑا۔ اس اندھیری رات میں کیمپ کی نگرانی اور قراولی کے لیے ماہ بیگ جو ایک نامی سردار تھا اور الغ خاں حبشی مقرر تھے۔ ماہ بیگ مارا گیا اور الغ خاں جان بچا کر نکل گیا، صادق خاں نے ثابت قدمی کے ساتھ حملہ آوروں

کا مقابلہ کیا۔ معصوم خاں نے بڑی بہادری دکھائی، لیکن کچھ فائدہ نہ ہوا اور پسپا ہو کر بھاگ گیا۔ اس وسیع علاقے میں ڈاکہ ڈالتے ہوئے عرصے تک سرگرداں رہا، آخر کار اڑیسہ کے زمیندار عیسی خاں کے پاس جا کر پناہ لی جس نے اس زمانے میں ڈھائی سو ہاتھی اور چار لاکھ روپے کے نفیس تحفے، سونا، قیمتی آلات، اگر، پوشاکیں اور بے شمار کپڑے سعید خاں مغول کے ذریعے دربار میں روانہ کیے تھے۔ معصوم خاں ابھی تک اڑیسہ ہی میں ہے۔ باغیوں کے شکست کے بعد صوبہ کرہی تک کا علاقہ دوبارہ شاہی قبضے میں آ گیا۔

مالوہ کے حاکم کا قتل

انہی دنوں شجاعت خاں اور اس کے بیٹے قائم خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ قائم خاں بڑا اچھا موسیقار، حسین و ظریف نوجوان تھا۔ بادشاہ نے دونوں باپ بیٹوں کو سارنگ پور سے دربار میں بلایا تھا۔ یہ دونوں حسب طلب فتح پور کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے نوکروں نے ان کی بد معاملگی، بد عہدی، بدسلوکی اور ذلت کی وجہ سے، کہ آج کل کے سرداروں کا بس یہی کچھ وطیرہ ہے۔ دونوں کو راستے میں قتل کر دیا اور بھاگ گئے۔ کہتے ہیں ایک دن ایک سائل نے شجاعت خاں اور دوسرے امرا سے جو دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کچھ طلب کیا۔ اس نے اُن سے کہا" بابا کیا کریں خیرات کی مد ہماری آمدنی میں شامل نہیں کی گئی ہے"۔

شجاعت خاں کی جگہ بادشاہ نے مالوہ پر شریف خاں اتکہ کو مقرر کیا۔ اس کے مکان پر خود بادشاہ کی سواری گئی۔ اتکہ نے زبردست ضیافت و مہمانی کی اور بادشاہ نے اسے مالوہ پر رخصت کیا۔

بنگال پر اعظم خاں کا تقرر

اسی سال خاں اعظم کو جو عرصے سے نظر بند تھا بادشاہ نے آگرہ سے بلا بھیجا اور اس کو نوازش شاہانہ سے سرفراز کر کے پانچ ہزاری کا عہدہ عطا فرمایا، پھر بنگالہ کی حکومت پر مقرر کر دیا۔

شہباز خاں کو رانا کے علاقے سے بلا کر لشکر اور فوج دے کر خاں اعظم کی مدد کے لیے مقرر کیا۔ اس نے حاجی پور کی سرحدوں پر فوجی کارروائی کی اور کچھتی کا جنگل کٹوا کر عرب بہادر کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

اسی سال بادشاہ نے حکیم الملک گیلانی کو اپنے نئے مذہب کا مخالف سمجھ کر مکہ معظمہ روانہ کر دیا۔ اسے بادشاہ نے وہاں کے شریف اور محتاج لوگوں کی امداد کے لیے پانچ لاکھ روپے بطور انعام بھی عطا کیا تھا حکیم آخر عمر تک مکہ ہی میں مقیم رہا:

از سر کوئی تو نمی جنبم
آسمان نیستم زمینم من

اس کو واپس بلانے کے لیے بادشاہ نے متعدد بار فرمان بھیجے تھے، لیکن وہ وہاں سے لوٹ کر نہ آیا اور اپنے رب سے جا ملا۔

مشائخین کی آزمائش

اس سال اکبر نے تمام علاقوں کے بڑے بڑے مشائخین کو بلا کر فتح پور میں جمع کیا اور ہر ایک کے ساتھ مجلس منعقد کر کے مختلف باتوں کی تحقیق کرتا رہا۔ ان مشائخین میں سے اکثر محض خوشامدی اور چند بیگھہ زمین کے لالچی تھے۔ بادشاہ کا اصل مقصد تو یہ تھا کہ ان میں سے کسی کی کوئی خرق عادت کو اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ خرق عادت کے کرتب ان کو کیا آتے وہ تو دشمنوں ہی کے حصے میں لکھے گئے ہیں اور جہاں تک علو اخلاق کا معاملہ تھا کہ اس سے مطلب ترک دنیا، تجرد، توکل، استغنیٰ اور عالیٰ حوصلگی ہے وہ سب ان اوصاف سے نا آشنا تھے۔ بادشاہ نے جب ان میں بجز خوشامد اور چاپلوسی کے کوئی اور جوہر نہیں پایا تو ان سے اور دین حق سے اس کی بدگمانی پہلے سے کہیں زیادہ اور دو چند ہوگئی:

پوشیدہ مرقعتد این خامی چند بگرفتہ بطامات الف لامی چند
نارفتہ رہ صدق و صفا گامی چند بد نام کنندہ نکو نامی چند

ان مشائخین میں شیخ عبد العزیز کے بڑے خلیفہ شیخ جائکیدہ بھی تھے جن کو اکبر نے

عبادت خانے میں ٹھہرایا تھا وہ دکھاوے کے لیے نماز معکوس پڑھا کرتے تھے اور اپنے زہد و عبادت کا بڑا مظاہرہ کرتے تھے۔ اکبر کی کسی حرم کے متعلق یہ کہا کہ اس کو لڑکا ہوگا اس کو بجائے لڑکے کے لڑکی ہوئی۔ ان کی اور بھی قابل اعتراض حرکتیں دیکھنے میں آئیں۔ اسی طرح سید ہاشم فیروز آبادی نے بڑے ٹھاٹھ اپنی مشیخیت کی دکانداری شروع کردی۔ ان لوگوں کی یہ حرکتیں بھی بادشاہ کی بد اعتقادی میں اضافہ کا سبب بن گئیں۔

شیخ مہنی افغان کاسی کو پنجاب سے بلایا گیا تھا وہ حسب الحکم قاصدوں کے ساتھ خانقاہ سے پیدل ہی چلا اور اس کی پالکی اس کے پیچھے خالی ہی لائی گئی وہ فتح پور میں شیخ جمال بختیار کے مکان میں آکر ٹھہرا اور پیغام بھجوایا کہ "میری ملاقات کسی بھی بادشاہ کے لیے مبارک نہیں رہی ہے"۔ اکبر نے اس سے ملاقات نہیں کی اور جلد ہی اسے رخصت کردیا۔

شیخ الہدیہ خیرآبادی بھی جو توکل و فقر میں بڑے نامور تھے، انھوں نے بادشاہ سے کوئی آراضی قبول نہیں کی تھی، دربار میں تشریف لائے۔ ان کا سلسلہ طریقت بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے ساتھ ان کے لڑکے شیخ ابوالفتح بھی آئے تھے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن سے میں نے سلیم شاہ کے آخری عہد میں اپنے استاد علامہ میاں حاتم سنبھلی کے حسب الحکم "ارشاد قاضی" اور حاشیہ پڑھا تھا اور اب وہ اپنے باپ کے قائم مقام ہیں۔ اپنے علم احوال و معاملات میں نہایت کھرے اور بے لاگ ہیں۔

جب شیخ الہدیہ دربار میں آئے تو اکبر ان کی تعظیم کے لیے کھڑا ہوگیا۔ جب بادشاہ نے حال احوال پوچھا تو انھوں نے اپنے کان کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں، بادشاہ نے ان کو مزید زحمت نہیں دی اور جلد ہی رخصت کردیا۔

امامت و نبوت کا دعویٰ

اسی سال دربار کے کمینے اور ذلیل علماء نے جو درحقیقت جاہل محض تھے، من گھڑت دلیلیں دے کر بادشاہ کو یہ باور کرایا کہ اس عہد کے صاحب زماں "خودحضور والا" ہیں۔ آپ کا ظہور مسلمانوں اور ہندوؤں کے بہتر فرقوں کے اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔

شریف نے محمود پسی خانی کے رسالوں سے یہ شہادت بھی نکال دکھائی کہ اس نے صراحتاً کہا ہے کہ ''990 ھ/ 1582ء میں باطل کو ختم کرنے والے ایک شخص کا ظہور ہوگا''۔ پھر اس نے بتایا کہ ''صاحب دین حق'' کے کلمے کے ''جمل'' کے حساب سے 990 عدد ہوتے ہیں اور اس کے مصداق صرف حضور والا ہی ہیں۔

خواجہ مولانا شیرازی ملحد نجومی مکہ معظمہ کے معززین کی طرف سے ایک رسالہ لے کر آیا جس میں درج تھا کہ حدیث صحیح کے بموجب دنیا کی مدت سات ہزار سال پوری ہوچکی ہے اور اب ظہور مہدی موعود کا وقت آگیا ہے۔ اس کی مزید دلیل میں خود اس نے بھی ایک رسالہ مرتب کر کے پیش کیا۔ ایسی ہی خرافات شیعوں نے بھی حضرت امیرالمومنین علیؓ سے منسوب کر کے پیش کیں۔ بعض یہ رباعی پڑھ پڑھ کر سناتے تھے جو حکیم ناصر خسرو سے منسوب ہے

در نہ صد وہشتا دونہ از حکم قضا
آیند کواکب از جوانب یکجا
درسال اسد ماہ اسد روز اسد
از پردہ برون خرامد آن شیر خدا

یہ سب باتیں نبوت کے دعوے کا سبب بنیں اور اکبر نے صراحتاً و لفظاً نہیں مجملاً و معناً نبوت کا دعویٰ کردیا۔

شاہ منصور کی برطرفی

اس زمانے میں راجہ ٹوڈرمل کا عریضہ پہنچا کہ ''میں نے اب تک بڑے تدبر وحسن سلوک سے معصوم خاں فرنخودی کو اپنے ساتھ لگائے رکھا ہے، لیکن خواجہ منصور دیوان اس سے اور ترسون محمد خان سے بقایا کا بڑی سختی سے تقاضا کرتا رہتا ہے اور ان کو بہت ڈراتا دھمکاتا رہتا ہے۔ اس کے رویے سے ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں۔ اس نازک وقت میں ایسی باتیں لشکر میں تفرقے کا باعث ہوجاتی ہیں''۔

شاہ منصور کی سخت گیریوں کی اس سے پہلے بھی بارہا خبریں مل چکی تھیں اس لیے بادشاہ نے اس کو بے دخل کر کے مصلحتاً چند دن کے لیے اسے شاہ قلی خان محرم کی نگرانی میں دے دیا اور اس کی جگہ آصف خاں ہروی کے بھائی وزیر خاں کو دیوان کل بنادیا اس کا مددگار قاضی علی بغدادی جیسے منحوس دل آزار چغد قسم کے آدمی کو مقرر فرمایا کہ یہ دونوں مل کر معاملات کو سرانجام دیں۔ اس تدبیر کے کیا کہنے؟

بغیر کان کا آدمی

اس زمانے میں بادشاہ کے پاس ایک ایسے آدمی کو لایا گیا جس کے کان سرے سے تھے ہی نہیں اور نہ سماعت کے لیے کوئی سوراخ تھا، لیکن وہ جو کچھ کہا جائے بخوبی سن لیتا تھا اس کے کانوں کی جگہ بالکل صاف اور سپاٹ تھی۔

گونگے محل کا تجربہ

اسی سال بادشاہ کو ایک اور خبط ہوا کہ چند شیر خوار بچوں کو آبادی سے دور ایک مکان میں رکھا جائے وہ کسی آواز کو سن نہ سکیں اور ان کی نگہداشت کے لیے تربیت یافتہ دایہ مقرر کی جائیں اور ان کو کوئی بات نہ سکھائی جائے تاکہ اس حدیث ''**کل مولود علی الفطرة**'' (ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا ہوتا ہے) کی تحقیق ہوجائے اور دیکھیں کہ یہ بچے کس دین اور مذہب کی طرف راغب ہوتے ہیں اور ان کی زبان سے پہلے کون سا کلمہ ادا ہوتا ہے۔ اس عجیب وغریب تجربے کے لیے 20 شیرخوار نو مولود بچوں کو روپیہ پیسہ دے کر ان کے والدین سے جدا کیا گیا۔ ایک خالی ویران محل میں ان کو رکھا گیا۔ بادشاہ نے اس محل کا نام ''گنگ محل'' رکھا۔ تین چار سال بعد معلوم ہوا کہ وہ سب بچے گونگے ہوگئے ہیں۔ محل کی وجہ تسمیہ پوری اتری۔ اکثر معصوم بچے تو اسی گنگ محل سے آغوش لحد میں جا بسے:

مادرم خاک است و من طفل رضیع
میل طفلان نیست بر مادر بدیع

زود باشد کا رمیدہ ز اضطراب
درکنار مادر افتم مست خواب

اسی سال بادشاہ نے شاہزادہ دانیال کو اس کے استاد شیخ فیضی، شیخ جمال بختیار اور امراء کی ایک جمعیت کے ساتھ اجمیر روانہ کیا اور وہاں کے فقراء کے لیے پچیس ہزار روپیہ بھی بھیجا۔

معصوم خاں کا تبادلہ

راجہ ٹوڈرمل اور دوسرے تمام بادشاہی امراء نے اس سال حاجی پور میں برسات کا موسم گزارا اور معصوم خاں فرنخودی جولشکر سے سخت ناراض ہوگیا تھا امراء سے اجازت لیے بغیر جونپور چلا گیا اور وہاں جاکر باغی بن بیٹھا۔ بادشاہ نے پیش و خاں عرف مہتر سعادت داروغۂ فراش خانہ کے ہاتھ اس کی تسلی اور دلاسے کے لیے ایک عنایت آمیز فرمان روانہ کیا اور اسے اودھ کا علاقہ دے کر جونپور پر ترسون محمد خاں کو مقرر کردیا۔ معصوم خاں نے اس تبادلے پر الٹی سیدھی باتیں کیں پھر اس خیال سے کہ اودھ ایک سرحدی علاقہ ہے جو اس کے لیے نسبتاً بہتر رہے گا وہاں چلا گیا اور جنگ و بغاوت کے منصوبے باندھتا رہا۔

مہتر سعادت نے دربار میں واپس آکر جونپور وغیرہ کے حالات تفصیل سے سنائے اور اس فتوے کا بھی تذکرہ کیا جو ملا محمد یزدی نے بادشاہ کے خلاف بغاوت کے متعلق دیا تھا۔ دراصل اسی سبب سے ملا محمد یزدی اور میر معزالملک کو دربار میں بلایا گیا تھا۔

نیابت خاں کی بغاوت

اسی زمانے میں ہاشم خاں نیشاپوری کے لڑکے نیابت خاں نے بغاوت کردی جسے بادشاہ نے پٹنہ کے سفر کے وقت جوسی اور پیاک کی جاگیر عطا کی تھی۔ نیابت خاں نے کنڑہ پر حملہ کردیا۔ وہاں اس وقت اسماعیل قلی خاں کی جانب سے الیاس خاں نامی ایک پٹھان حاکم تھا۔ اس جنگ میں الیاس خاں مارا گیا اور نیابت خاں نے کنڑہ کے قلعے کا محاصرہ کرکے

بڑی لوٹ مار مچائی۔ بادشاہ نے اس کے مقابلے پر اسماعیل قلی خاں، وزیر خاں، مطلب خاں، شیخ جمال بختیار اور دوسرے امرا کو نامزد کیا اور مسخرے بیربر کو معصوم خاں فرنخودی کو اطمینان و دلاسا دینے کے لیے روانہ کیا۔ وزیر خاں کے رخصت ہونے کے بعد خواجہ شاہ منصور کو قید سے رہائی دے کر دوبارہ دیوانی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔

جب نیابت خاں کو شاہی امرا کے حملے کا پتہ چلا تو وہ کڑہ کا محاصرہ چھوڑ کر قصبہ ہوتے ہوئے پٹنہ کی طرف چلا گیا۔ شاہی لشکر نے بھی دریا پار کر کے اس کا تعاقب کیا۔ ان کو قریب دیکھ کر نیابت خاں بھی پلٹ پڑا اور اس نے ان تمام امیروں کے ساتھ تنہا ایسی سخت لڑائی لڑی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پے در پے حملوں سے اس نے بادشاہی فوج کو زیر و زبر کر دیا۔ معرکۂ کارزار میں شیخ جمال کو گھوڑے سے نیچے گرا دیا، لیکن اسے جلد ہی رہا بھی کر دیا۔ باوجود اس دلاوری کے اسے امرا نے شکست دے دی اور وہ اودھ میں معصوم خاں کے پاس چلا گیا۔ عرب بہادر بھی اس موقعے پر شہباز خاں کے مقابلے میں شکست کھا کر اودھ چلا گیا۔ شہباز خاں عرب بہادر کا تعاقب کرتے ہوئے جونپور اور اس کے بعد اودھ پہنچا۔

معصوم خاں کی بغاوت

اودھ میں معصوم خاں نے کافی ساز و سامان مہیا کر لیا تھا۔ اس کی تیاریاں اتنی تھیں کہ اگر کچھ مبالغے سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس وقت ایران و توران کے بادشاہوں سے بھی جنگ کر سکتا تھا۔ تیس چالیس جھنڈے، نشان، نقارے اور دوسرا سارا سامان جنگ پوری طرح تیار تھا۔ اس نے اپنی آراستہ و پیراستہ فوج کے ساتھ شہباز خاں پر حملہ کیا اور ایک ہی حملے میں اسے شکست دے کر بھگا دیا۔ شہباز خاں ایک دن میں 40 کوس راستہ طے کر کے جونپور واپس چلا آیا۔ ترسون محمد خاں شہباز خاں کے میمنے پر مقرر تھا وہ لڑائی کے وقت ایک جنگل میں چھپا ہوا تھا۔

جب شہباز خاں میدان چھوڑ کر بھاگ گیا اور معصوم خاں کی فوج مال غنیمت لوٹنے

میں منتشر ہوگئی اور میدان میں معصوم خاں کے ساتھ مختصر سی جمیعت رہ گئی تو ترسون محمد خاں نے اچانک حملہ کرکے اس کو شکست دے دی۔ جب شہباز خاں کو یہ خبر ملی تو وہ الٹے پاؤں لوٹ کر دوسرے دن ترسون محمد خاں سے آکر مل گیا پھر دونوں نے مل کر معصوم خاں پر حملہ کردیا۔

اودھ کے قریب دونوں فوجوں میں سخت لڑائی ہوئی اور معصوم خاں شکست کھا کر بے سروسامانی کی حالت میں بھاگ گیا۔ اس کی ماں، بہن، بیوی، بچے اور سارا مال و اسباب شاہی لشکر کے ہاتھ آگیا۔ معصوم خاں نے سوالک کی پہاڑی تک پلٹ کر نہیں دیکھا اور بادشاہی علاقے سے نکل گیا۔ یہ واقعہ 988ھ/ 1580ء میں پیش آیا۔

ارغنون باجے کی نمائش

ارغنون باجا جو ایک عجیب وغریب چیز ہے، حاجی حبیب اللہ فرنگستان سے لے کر آیا تھا۔ انہی دنوں اسے لوگوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہ باجا ایک قد آدم صندوق میں بنا ہوا ہے۔ ایک فرنگی اس میں بیٹھ کر اس کے تار چھیڑتا ہے، اس کے باہر مور کے پانچ پر اور دوسرے تال سُر لگے ہوئے تھے جن کو دو اور آدمی انگلیوں سے بجاتے تھے۔ دیکھنے والے نہایت لطف اندوز ہو رہے تھے اور بجانے والے فرنگیوں کا چہرہ ہر لحظہ سرخ و سپید ہوتا جاتا تھا اور وہ خوب مست ہو ہو کر اسے بجاتے جاتے تھے۔ اس عجوبے کو دیکھ کر اہل محفل حیران رہ گئے۔ اس کی تعریف وتوصیف حد بیان سے باہر ہے۔

اکبر نے اس محفل میں لوگوں سے پوچھا ''اچھا بتاؤ اس زمانے میں سب سے عقلمند کون ہے؟ بادشاہوں کا نام نہ لیا جائے، کیونکہ وہ اس سے مستثنیٰ ہیں''۔ ہر شخص جس جس پر اعتقاد رکھتا تھا اس کا نام لینے لگا۔ حکیم ہمام نے کہا ''میں تو اپنے آپ ہی کو سب سے زیادہ عقلمند سمجھتا ہوں۔ شیخ ابوالفضل نے اپنے باپ کا نام لیا۔

اخلاص کے چار درجے

ان دنوں بادشاہ کے ساتھ اخلاص کے چار درجے قرار دیے گئے تھے۔ ترک مال، ترک جان، ترک ناموس اور ترک دین۔ جو شخص بھی ان چاروں مدارج کو طے کرلیتا اس کا

چہارگانہ اعزاز ہوتا اور جو کسی ایک درجے تک پہنچتا تھا اس کا اعزاز اسی مناسبت سے مقرر ہوتا، ویسے سب کے سب بادشاہ کے مرید سمجھے جاتے۔

مرزا محمد حکیم کا ہندوستان پر حملہ

989ھ/1581ء میں خبر پہنچی کہ مرزا محمد حکیم نے معصوم خاں فرنخودی کے حسب الطلب اپنے ماموں فریدون خاں کے بہکانے سے ہندوستان پر حملہ کردیا۔ اس کا ایک سردار شادماں نامی دریائے نیلاب[۶۷] (اٹک) کو پار کر آیا لیکن مان سنگھ ولد بھگوان داس نے اس پر فوج کشی کی اور اسے قتل کرادیا۔ جب مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ دریا پار کرکے سید پور کے علاقے میں آگیا۔

مرزا حکیم سے مقابلے کے لیے بادشاہ نے فوج کو آٹھ ماہ کی تنخواہیں ادا کیں۔ شاہزادہ دانیال کو سلطان خواجہ صدر اور شیخ ابراہیم چشتی کے ساتھ اپنی نیابت کے لیے دارالخلافہ میں چھوڑا اور خود فتح پور سے پنجاب روانہ ہوگئے۔ فتح پور سے 15 کوس پر سرائے باد میں شہباز خاں کی فتح کی خبر پہنچی۔

مان سنگھ نے جب شادمان کے اسباب کی تلاشی لی تو اس کے جُزدان سے مرزا محمد حکیم کے تین فرمان برآمد ہوئے جو اس نے حکیم الملک گیلانی، شاہ منصور دیوان اور محمد قاسم خاں میر بحر کے نام لکھے تھے۔ اس کے وہ فرمان بادشاہ کے پاس بھیج دیے گئے۔ بادشاہ نے انھیں پڑھ لیا لیکن ان کا راز افشا نہ کیا۔ دہلی میں خبر ملی کہ مرزا لاہور پہنچ چکا ہے اور وہاں وہ مہدی قاسم خاں کے باغ میں ٹھہر گیا ہے اور لاہور کے قلعے میں راجہ بھگوان داس مان سنگھ اور سعید خاں محصور ہوگئے تھے۔

شاہ منصور کی سازش

جب لشکر پانی پت میں پہنچا تو مرزا محمد حکیم کا وزیر ملک ثانی کابلی جس کا خطاب وزیر خاں تھا اس سے ناراض ہوکر لشکر شاہی میں آگیا اور شاہ منصور کے پاس اس نے قیام کیا اور اس

کے ذریعے خدمت شاہی میں حاضر ہونا چاہا۔ ان دونوں کے درمیان کوئی سابقہ ربط و ضبط نہ تھا، اس لیے اکبر کو خیال ہوا کہ یہ بھی مرزا کی کوئی چال ہے کہ اس کا وزیر اس نازک وقت میں ساتھ چھوڑ کر شاہ منصور کے پاس آ کر ٹھہرا ہے۔ اس واقعے سے شاہ منصور کے متعلق بادشاہ کی بدگمانی اور زیادہ بڑھ گئی۔ چنانچہ اسے قید کرنے کے فرامین جاری کر دیے گئے۔ اس نے بہت کچھ قسمیں کھائیں، لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا کیوں کہ یہ بات طے کر دی گئی تھی کہ معاملات میں قسم کو حجت نہیں سمجھا جائے گا۔

جب سواری شاہ آباد پہنچی تو قاضی علی کے بھائی ملک علی نے جو اب لاہور کا کوتوال ہے، تو اُس نے دو خط پیش کیے، ایک شاہ منصور کے نام تھا جسے شاہ منصور کے ملازم شرف بیگ نے لکھا تھا، دوسرا گمنام تھا۔ ان خطوط میں پہلے فریدون خاں سے بعد میں مرزا سے ملاقات کا ذکر تھا اور یہ کہ میرزا نے پرگنہ کی معافی عطا کر دی ہے، پرگنہ کا نام شاید درج تھا یا نہیں تھا۔ دونوں خط ایک تھیلی میں رکھے ہوئے تھے۔ ان خطوط سے قیاس کیا گیا کہ شاہ منصور کا ملازم شرف بیگ پرگنہ فیروزپور کا جو لاہور سے 30 کوس پر ہے، شقدار تھا اس نے اپنے مالک کو اطلاع دی کہ میں نے فریدون کے توسط سے میرزا سے ملاقات کی۔ میرزا نے ہر جگہ اپنے عاملوں کو مقرر کر دیا ہے لیکن ہمارے پرگنے کو معافی دے دی ہے۔

ان خطوط سے بادشاہ کی بدگمانی یقین میں بدل گئی۔ اس موقعے پر اکثر بلکہ تمام امیروں نے جو شاہ منصور کے ہاتھوں بڑی اذیتیں اٹھا چکے تھے اور اس کی تباہی کے دل و جان سے خواہاں تھے اس کے قتل پر متفقہ طور سے اصرار کیا، چنانچہ بادشاہ نے دوسرے دن صبح خدمت رائے کو حکم دیا کہ اس کو کچھ کوٹ کی منزل میں گلا کاٹ کر سولی پر چڑھا دیا جائے۔ شاہ منصور نے خلق خدا پر جو ستم ڈھائے تھے وہ خالی نہیں گئے، مظلوموں کی فریاد اس کے گلے کا ہار بن کر رہی۔

خوش باش کہ ظالم نبرد رہ بہ سلامت

مرزا عبدالحکیم کا فرار

بادشاہی لشکر سرہند کے راستے سے کلانور اور رہتاس پہنچا اور وہاں سے نیلاب پر جا کر

ڈیرے ڈال دیے۔ مرزا کو یہ خبر ملی تو وہ لاہور کے دریا کو پار کر کے فرار ہوگیا اور کابل تک اپنی باگ نہ کھینچی۔

اسی سال ماہ ربیع الثانی میں بادشاہ نے نیلاب کے کنارے جو سندھ ساگر کے نام سے مشہور ہے، کٹک بنارس، کی طرح ایک قلعہ ''کٹک بنارس'' تعمیر کرادیا۔ وہاں سے شاہزادہ سلطان مراد کو قلیج خاں اور دوسرے امرا کے ساتھ کابل پر حملے کے لیے روانہ کیا۔ ان کے آگے سنگھ کو سرداروں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف بھیجا۔

انہی دنوں مرزا عبدالحکیم نے خواجہ ابوالفضل نقشبندی اور محمد علی دیوانہ کو اپنے قصور معاف کرانے کے لیے ایلچی بنا کر بھیجا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کے ساتھ حاجی حبیب اللہ کو بھیج کر پیغام دیا کہ اسے معافی اس شرط پر مل سکتی ہے کہ اپنے کیے پر ندامت ظاہر کر کے آئندہ منحرف نہ ہونے کی قسم کھائے اور اپنی بہن کو جو خواجہ حسن کے نکاح میں ہے بارگاہ میں روانہ کردے۔ مرزا نے حاجی سے کہا کہ بہن کو بھیجنے کے لیے خواجہ حسن راضی نہیں ہے اور وہ اسے لے کر بدخشاں چلا گیا ہے البتہ میں اپنے قصوروں پر پشیمان ہوں

کردہ ام توبہ و از کردہ پشیمان شدہ ام
کافرم باز نگوئی کہ مسلمان شدہ ام

اکبر کا کابل کے لیے عزم

15 جمادی الثانی کو بادشاہ نے نیلاب کو پار کر کے خواجہ نظام الدین احمد کو حملہ کرتے ہوئے شاہزادۂ مراد کے پاس جلال آباد جانے کا حکم دیا اور امرا کو کہلا بھجوایا کہ وہ اپنے مشورے سے اطلاع کریں۔ انھوں نے جواب بھیجا کہ حضور کا حملہ کرتے ہوئے یہاں آنا ہی مناسب ہے۔ نظام الدین احمد اور حاجی حبیب اللہ ایک ساتھ پشاور پہنچے اور اپنے اپنے پیغام خدمت میں پیش کیے۔

نظام الدین احمد نے کہا اگرچہ امرا کہنے کو تو کہہ رہے ہیں کہ اس مہم کے لیے ہم لوگ کافی ہیں لیکن درحقیقت وہ سب فتح کو حضور کی تشریف لانے پر ہی منحصر سمجھتے ہیں۔

اب بادشاہ نے بھی پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا اور لشکر میں شاہزادہ سلطان سلیم کو راجہ بھگوان داس اور قاضی علی میر بخشی کے ساتھ چھوڑ کر خود اپنی خاص جمعیت کے ساتھ کوچ کیا اور روزانہ 20 کوس کی مسافت طے کرتے ہوئے شاہزادہ مراد کے لشکر سے 15 کوس پر موضع سرخاب میں پہنچ گیا۔

مرزا عبدالحکیم کی شکست

مرزا محمد حکیم نے کابل سے 7 کوس کے فاصلے پر خورد کابل نامی موضع میں اپنے بھتیجے کے ساتھ شاہزادہ مراد کے لشکر پر حملہ کیا اور بڑی بہادری سے جنگ کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گیا۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ عبداللہ خاں اوزبک کے پاس بھاگ جائے کہ شاہزادہ مراد کابل میں داخل ہوگیا۔

اس جنگ سے ایک دن پہلے فریدون خاں نے شاہزادہ کے چند اول پر حملہ کر کے بہت سے آدمیوں کو قتل کردیا تھا۔ جس وقت یہ لوٹ مار ہو رہی تھی، حاجی محمد نام کا ایک احدی بادشاہ کے پاس سے ڈاک چوکی کے سلسلے میں وہاں پہنچا تھا اس نے یہ سارا حال دیکھا اور لوٹ کر سرخاب میں اس واقعے کی بادشاہ کو خبردی۔ اس خبر سے بادشاہ کو بڑی تشویش ہوئی دوسرے دن جب وہاں سے کوچ ہونے لگا تھا کہ فتح کی خبر پہنچ گئی۔

کابل میں شاہانہ شان وشوکت سے داخلہ

10 رجب کو بادشاہ کی سواری کابل میں داخل ہوئی۔ بادشاہ نے اس شہر کے باغوں کی سیر وتفریح میں ایک ہفتہ بسر کیا۔ بادشاہ نے کابل میں مرزا محمد حکیم کے معتمد آدمیوں سے شاہ منصور کے موسومہ خطوط کے بارے میں بڑی تحقیق وتفتیش کی اور پتہ چلا کہ یہ سب اس کے خلاف ایک سازش تھی جو شہباز خاں کے بھائی کرم اللہ نے بعض امیروں کے ساتھ مل کر کی تھی اور وہ آخری خط بھی اس کے سبب بنے امیروں کا لکھا ہوا تھا۔ جب حقیقت حال معلوم ہوئی تو بادشاہ کو شاہ منصور کے قتل پر بڑا رنج وافسوس ہوا۔ لیکن اب اس پشیمانی سے کیا حاصل ہوتا؟

بادشاہ نے میرزا کے پاس لطیف خواجہ میر شکار کو بھیج کر اس کو قصوروں کی معافی کی خوش خبری پہنچائی اور اسے اوزبکوں کی پناہ میں جانے سے منع کر دیا۔ مرزا حکیم نے اطاعت اور وفاداری کا عہد و پیمان کیا اور علی محمد اسپ کے ساتھ وہ خدمت شاہی میں حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے کابل اس کے حوالے کر دیا اور وہاں لشکر کو مقرر کر کے حملہ کرتے ہوئے جلال آباد واپس چلے آئے جہاں لشکر کا بڑا کیمپ تھا۔

اکبر کی واپسی

اس موقعے پر محمد قاسم خاں میر بحر کا بھائی خواجگی محمد حسین جو میرزا کا بڑا معتبر امیر تھا، بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے جلال آباد سے کافروں کے علاقے کوہ فتور پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوج کو مقرر کیا اور منزل بہ منزل کوچ کرتے ہوئے 12 شعبان کو سند ساگر کے کنارے پہنچ گئے۔ وہاں سے ایک ہی دن میں دریا کے پل پر سے سارے لشکر کو پار کرائے مسلسل کوچ کرتے ہوئے رمضان کی آخری تاریخ کو لاہور آ گئے۔ پنجاب کی حکومت دوبارہ سعید خاں، راجہ بھگوانداس اور مان سنگھ کے سپرد کر دی اور دوآبہ پنجاب کے اماموں کے معاملات کی تحقیق و تصفیہ کے لیے ملا الہداد امروہہ، ملا الہداد سلطان پوری اور ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور ملا شیری شاعر کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا۔ ان میں سے پہلے اور چوتھے صدر نے نیکی اور عدل میں شہرت پائی۔ دوسرے اور تیسرے صدر اپنی بدنیتی کی وجہ سے بدنام ہوئے۔ ملا شاہ محمد نے تو شیخ اسحاق کاکول جیسے پاکباز متقی اور پرہیز گار عالم کو پروانہ میں یہ فقرہ لکھ بھیجا تھا۔ **"یا قومنا اجیبوا داعی الله"** دوآبہ ہند میں شیخ فیضی کو صدر مقرر کیا گیا، گنگا پار کے علاقے پر حکیم ابوالفتح کو صدارت ملی اور دارالخلافہ کا صدر میر فتح اللہ کو مقرر کیا گیا۔

جب سواری پانی پت میں پہنچی تو اس جگہ شہباز خاں جس نے بادشاہ کے غائبانے میں کرہی سے لے کر پنجاب تک سارے ممالک محروسہ کو اپنے طور پر لوگوں کی جاگیروں میں تقسیم کر دیا تھا اور جس کو جی چاہے عہدے عطا کر دیے تھے، بڑے تزک و احتشام کے

ساتھ بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا۔ جب بادشاہ نے اس خود اختیاری اور جرات کے متعلق باز پرس کی تو اس نے جواب دیا کہ اگر میں فوج کی اس قدر دل دہی نہ کرتا تو سب کے سب برگشتہ ہو جاتے۔ اب ملک تمہارا ہے، لشکر تمہارا ہے، جسے چاہو دے دو اور جس سے چاہو منصب اور جاگیر واپس لے لو

زر بہ کہ خواہی بستان بہر کہ خواہی بدہ

25 شوال کو بادشاہ سلامت دہلی تشریف لائے، چھوٹے شاہزادوں اور بیگموں نے بادشاہ کا استقبال کیا۔ یہاں سے بادشاہ نے کوچ کیا اور 5 ذی قعدہ کو دارالخلافہ پہنچ گئے۔

چند دن کی مستی

اس سفر میں میں ساتھ نہ جا سکا تھا، مجھے ایک بندہ خدا سے ایسا تعلق ہو گیا کہ میں پورے ایک سال تک پیاور میں ہی رہا اور مجھے اس دوران میں عجیب و غریب اور سخت مصائب برداشت کرنے پڑے۔ پورا سال بادشاہ سے جدا رہنے کے بعد میں فتح پور گیا اور اسی مہینے کی 6 تاریخ کو بارگاہ میں حاضری دی، بادشاہ نے شیخ ابو الفضل سے پوچھا کہ یہ اس سفر میں کیوں ساتھ نہیں تھا؟ اس نے کہا'' یہ بھی تمام مفت خور بدمعاشوں میں شامل ہے'' میری غیر حاضری کا قصہ بس اسی بات پر ختم ہو گیا۔

جب لشکر کابل کے قریب تھا تو بادشاہ نے صدر جہاں کو حکم دیا تھا کہ جو اہل علم ہمارے لشکر کے ساتھ ہیں اور جو ساتھ نہیں آئے ہیں سب کے ناموں کی فہرست پیش کرو۔ جب میرا نام آیا تو خواجہ نظام الدین (58) مرحوم مصنف تاریخ نظامی نے، جن سے میری دوستی ایک سال سے قائم تھی اور بڑا تعلق خاطر ہو گیا تھا، مجھے مریض لکھوا دیا اور فہرست پیش کرادی۔ مرحوم نظام الدین تمام احباب کے ساتھ عام طور سے دل سوزی اور ہمدردی سے پیش آتے تھے، مجھ پر تو ان کی خاص مہربانی تھی۔ اس دوران انھوں نے مجھے پے در پے کئی خط بھی لکھے تھے اور تاکید کی تھی کہ چونکہ تم لشکر کے ساتھ آ نہیں سکے ہو اس لیے اب استقبال کے لیے کم از کم لاہور، دہلی یا متھرا جہاں تک بھی ہو سکے آنے کی کوشش

کرو، کیونکہ یہ دنیاوی معاملات ہیں اور ان میں احتیاط برتنا ضروری ہے''۔ اس بے چارے نے خیرخواہی سے یہ سب کچھ لکھا، لیکن میں اس عالم میں مست تھا کہ مجھے اس کا ایک ایک لمحہ عمر جاودانی سے اعلیٰ و ارفع معلوم ہو رہا تھا، مصلحت اور نفع و نقصان کی فکر کسے تھی:

تو با خدای خود انداز کا رو خوش دل باش
کہ رحم اگر نکند مدعی خدا بکند

اس مستی و کیف کے عالم میں حالت خواب میں کبھی کبھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ ایک رات نیند میں میں نے یہ شعر کہا تھا اور بیدار ہونے کے بعد عرصے تک اس کو یاد کر کے میں مضطرب و بے قرار رہا:

آئینہ ما روی ترا عکس پذیر است
گر تو ننمائی گنہ از جانب ما نیست

رب العزّت کی قسم کہ اس واقعے کو گزرے ہوئے تادم تحریر 17 سال بیت گئے ہیں ابھی تک اس ذوق و سرمستی کی لذت سے میرا دل سرشار ہے۔ جب بھی میں ان دنوں کو یاد کرتا ہوں زار زار رونے لگتا ہوں، کاش کہ میں اسی عالم میں اس دنیا کے جھگڑوں سے پاک ہو جاتا:

خوش آنکہ دید روی ترا و سپرد جان
آگہ نشد کہ ہجر کدام و وصال چیست

ان دنوں مجھے سر رشتہ معرفت ہاتھ آ گیا تھا اور میرا دل ایسے فیض سے سرشار تھا کہ اگر میں ساری عمر اس کا ذکر کرتا ہوں اور شکر بجا لاؤں تو بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا:

در گوش دلم نہ یک زمزمۂ عشق
زان زمزمہ ام زپای تا سر ہمہ عشق
حقا کہ بہ عہدہا نیا یم بیرون
از عہدۂ حق گزاری یک دمہ عشق

ترہت میں بغاوت

بادشاہ جس زمانے میں کابل کی طرف متوجہ تھے، ترہت کے علاقے میں بہادر ولد سعید بدخشی نے اپنے نام کا خطبہ و سکہ جاری کر دیا تھا۔ اپنا خطاب بہادر شاہ رکھا تھا اور اپنی مہر کے لیے یہ سجع تجویز کیا تھا:

بہادر الدین سلطان است بن اسفید شہ سلطان

پدر سلطان وخود سلطان زہی سلطان بن سلطان

آخرکار وہ اعظم خاں کے سپاہیوں کے ہاتھوں قتل ہوا۔

معصوم خاں کا قتل

معصوم خاں فرنخودی کوہ سوالک میں حیران و پریشان گھومتا رہا۔ آخر اس نے اعظم خاں کو وسیلہ بنا کر اپنے قصوروں کی معافی کے لیے لکھا۔ بادشاہ نے اس کی دلجوئی کے لیے فرمان بھیج دیا اور وہ فتح پور میں آ کر کورنش بجا لایا۔ چند دن بعد آدھی رات کے وقت وہ دربار سے اپنے گھر سنگھاسن پر سوار ہو کر جا رہا تھا کہ شہر کے دروازے کے باہر ٹھگوں کے گروہ نے اس کو گھیر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

نیابت خاں کا قتل

جس دن معصوم ملازمت شاہی میں حاضر ہوا تھا اسی دن نیابت خاں بھی بیگم بادشاہ کے توسط سے خدمت میں باریاب ہوا تھا۔ بادشاہ نے اس کے چچا شہاب الدین احمد خاں جو مالوہ کا حاکم تھا کی خاطر اس کی جان بخشی کر دی اور کچھ دن کے لیے رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا۔ وہ اسی قلعے میں قید تھا۔ اسی قید کی حالت میں اس نے ایسی ایسی حرکتیں کیں جو ناقابل بیان ہیں۔ اس نے وہاں بھی دوسرے قیدیوں کو ہموار کر کے فتنہ و فساد مچانے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ اس کی ان حرکتوں سے بادشاہ نے 997ھ میں فرمان بھیج کر اس کا جھگڑا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیا۔

انہی دنوں بادشاہ کی سوتیلی والدہ حاجی بیگم جو بڑی نیک، خدا رسیدہ اور فیاض خاتون تھیں اور دہلی میں جنت آشیانی ہمایوں بادشاہ کے روضے کی مجاورت اختیار کر رکھی تھی فوت ہوگئیں۔ ان کے انتقال سے روضے کے مجاوروں اور وہاں کے باشندوں کے معاملات میں بڑی خرابی اور انتشار پیدا ہوگیا۔

عیسائی سے مناظرہ

بادشاہ نے فرنگی راہبوں سے بحث و مناظرے کے لیے شیخ قطب جلیسری کو جو نہایت بدمست مجذوب تھا۔ شیخ جمالی بختیار کے ذریعے بلوایا اور اس مجلس میں اس عہد کے تقریباً تمام دانشوروں اور صاحب اجتہاد عالموں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ شیخ نے کہا خوب بھڑکتی ہوئی آگ جلائی جائے، اس آگ میں میں اور میرے مقابل حریف داخل ہوں گے، جو صحیح سلامت نکل آئے گا وہی حق پر سمجھا جائے گا۔ چنانچہ آگ جلائی گئی اور اس نے فرنگی راہب کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا ''چلو آؤ بسم اللہ'' فرنگیوں میں اور کسی کو اس آگ میں داخل ہونے کی ہمت نہ پڑی۔ بادشاہ فرنگیوں کو ناکام ہوتا ہوا دیکھنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے مارے غیرت کے شیخ قطب کو چند دوسرے فقراء کے ہمراہ بھکر بھجوا دیا۔ یہ لوگ اپنے آخری وقت تک اسی جگہ رہے۔ اس طرح بہت سے فقراء کو مختلف مقامات پر جلاوطن کردیا۔ اکثر کو تو قندھار بھیج کر ان کے عوض وہاں سے گھوڑے منگوا لیے۔

فقراء کی جلاوطنی

اس زمانے میں فقیروں کی ایک جماعت الٰہیوں کے نام سے مشہور تھی۔ یہ لوگ پیری مریدی کا سلسلہ چلائے ہوئے تھے اور طرح طرح کی بیہودہ اور گمراہ کن باتیں کرتے رہتے تھے۔ ان فقیروں کو بھی گرفتار کر کے لایا گیا۔ بادشاہ نے ان سے کہا کہ تم ان بیہودہ عقائد سے توبہ کرو۔ انھوں نے مہمل باتیں کر کے توبہ کرنے سے انکار کردیا۔ ان فقیروں نے دین اسلام میں روزہ وغیرہ کے نئے نئے نام اختراع کر رکھے تھے۔ بادشاہ نے ان

فقیروں کو بھی بھکر اور قندھار بھیج کر ترکی نسل کے گھوڑے ان کے عوض منگوا لیے۔

شیخ ادھن کے پوتوں کو بھی جو جونپور کے بڑے مشائخ میں سے تھے اہل و عیال کے ساتھ دربار میں بلایا گیا اور ان کو اجمیر بھیج کر وظیفہ مقرر کر دیا۔ ان میں سے دو تین افراد تو انتقال کر گئے اور اس خاندان کے دوسرے لوگ نہایت تنگ دستی کے ساتھ گزر بسر کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ معین الدین کے پوتے شیخ حسین نے حسب دستور تعظیم و تسلیمات بجالانے سے انکار کر دیا تھا اور اخراج کا حکم صادر ہونے کے بعد وہ مکہ معظمہ کو چلے گئے تھے۔ انہی دنوں مکہ سے فتح پور واپس تشریف لائے۔ اس مرتبہ بھی انھوں نے پہلے کی طرح کورنش ادا نہیں کی۔ بادشاہ نے ان کو بھی سرکش جان کر بھکر میں بھجوا دیا۔ 1002ھ میں نظام الدین احمد، شیخ حسین اور شیخ کمال بیابانی وغیرہ کو بھکر سے دربار میں بلایا گیا۔ ان لوگوں نے زمین بوس کی رسم ادا کر دی اس لیے ضمانتیں لے کر ان کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن کمال بیابانی کو رنتھنبور کے قلعے میں بھیج دیا اور شیخ حسین کے لیے بھکر ہی میں مدد معاش کا انتظام کرا کے اس جگہ مقرر کر دیا۔

اعظم خاں کی بنگالہ سے آمد

9 محرم 990ھ کو اعظم خاں بنگالہ سے آ کر حاضر ہوا۔ ایک رات گفتگو کے دوران بادشاہ نے اس سے کہا ہم مضبوط دلیلوں کی بنا پر عقیدۂ تناسخ کو حق سمجھتے ہیں۔ شیخ ابوالفضل تم کو بھی یہ مسئلہ بخوبی سمجھا دے گا، اعظم خاں نے یہ بات قبول کر لی، بادشاہ نے اسے ان امیروں کے ساتھ جو کابل کی مہم پر نہ جا سکے تھے معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

اسی سال 15 صفر کو نوروز ہوا، اور شاہی تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال شروع ہوا۔ جشن نوروز کے لیے دیوان خانۂ خاص اور عام کو بڑے ٹھاٹھ سے سجایا گیا، رنگ برنگے پردے لٹکائے

گئے، طرح طرح کی قیمتی چیزیں سلیقے سے رکھی گئیں۔ فرنگی پردے اور خوبصورت تصویریں آویزاں ہوئیں، اونچے اونچے سراپردے قائم کیے گئے۔ فتح پور اور آگرہ کے بازاروں میں بھی بڑی دھوم دھام سے آرائش کی گئی اور برابر 18 دن تک نو روز کا شاہانہ جشن منعقد کیا گیا۔ جشن کی محفلوں میں بے شمار ہندی اور فارسی گویتے موسیقار اور اہل طرب مرد اور عورتیں اپنے اپنے ہنر اور کمال دکھاتی تھیں اور ایوان میں ہر روز کوئی ایک بڑا امیر حاضر ہوتا اور بادشاہ کے لیے قیمتی نذرانہ اور تحائف پیش کر کے ہم نشینی کا اعزاز حاصل کرتا۔

دین الٰہی کا نفاذ

ہجرت پر ابھی پورے ہزار سال نہیں ہوئے تھے مگر بادشاہ نے اپنے طور پر یہ طے کر دیا کہ ہجرت سے نہ سہی حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے تو پورے ہزار سال ہو چکے ہیں اور اب پیغمبر علیہ السلام کے لائے ہوئے دین کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم ایک نئے دین کے آغاز کا اعلان کر دیں۔ اس وقت ایسے کسی دعوے اور اعلان کے لیے کوئی رکاوٹ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ سب سے بڑی رکاوٹ علما اور مشائخ کی تھی جن کے اثر و اقتدار کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ ان علما کو دربار سے خارج کیا جا چکا تھا، اسی لیے نہایت اطمینان و جسارت کے ساتھ اکبر نے اسلامی احکام کی منسوخی اور ایک نئے دین کے اصول و قواعد کے نفاذ کا فیصلہ کر کے اس سلسلے میں پہلا حکم یہ صادر کیا کہ اب سے سکہ پر ''الفی تاریخ'' یعنی کہ ہزارواں سال ثبت کیا جائے اور یہ ہزار سن ''بعثت'' ہجرت سے نہیں بلکہ بعثت سے موسوم کیا جائے۔

دین الٰہی کی بدعتیں

اسی طرح دوسری اور بہت سی نئی نئی اختراعات مصلحت ملکی کے عنوان سے حکماً عمل میں لائی گئیں اور ایسی ایسی بدعتوں کے احکام دیے گئے کہ انھیں دیکھ کر عقل حیران و سر بہ گریباں ہو جاتی تھی۔

ایک حکم تو یہ تھا کہ زمین بوس کے نام سے بادشاہوں کے لیے سجدہ کرنا جائز و لازم ہے۔ دوسرا یہ کہ اگر شراب جسمانی صحت کی خاطر علاج کے طور پر پی لی جائے اور اس کے پینے سے خلل و فساد نہ پیدا ہو تو وہ جائز ہوگی۔ اس کے برخلاف اگر کوئی اتنی پی لے کہ بدمستی کرنے اور شور و غوغا مچانے لگے تو اسے سزا دی جائے گی۔ حسب الحکم دربار کے دروازے پر شراب فروش کی ایک دکان بھی قائم کی گئی جس کی منتظم دربان کی بیوی تھی۔ یہ عورت کسی شراب فروش کی بیٹی تھی، بادشاہ نے خود شراب کا دام مقرر کیا۔ اس دکان سے ہر شخص علاج کے نام سے منشی کے پاس اپنا اور اپنے باپ دادا کا نام لکھوا کر شراب خرید سکتا تھا۔ لوگ فرضی نام لکھوا لکھوا کر شراب مول لے جاتے تھے ان کی تحقیق کرنے والا کوئی نہ تھا۔ اس طرح شاہی سرپرستی میں نشے کے بازاروں میں متوالوں کے لیے باقاعدہ سرکاری دکانیں کھل گئیں۔ لوگوں کا بیان ہے اس شراب میں سور کے گوشت کا عرق بھی شامل کیا جاتا تھا۔ اس احتیاط و سختی کے باوجود لوگ پی پی کر وہاں شور و غوغا مچانے لگے اور ہر روز جھگڑا و فساد ہونے لگا۔ سپاہی روزانہ بدمستوں کو پکڑ کر سزائیں دیتے تھے، لیکن ان کی مستی اتارے نہیں اترتی تھی۔ بادشاہ سلامت اس دکان کو بند بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اور ان ہنگاموں سے عاجز بھی تھے۔

شیطان پورہ

اس زمانہ میں پایہ تخت فتح پور میں سارے ملک سے کھینچ کھینچ کر بہت سی طوائفیں اور فاحشہ عورتیں جمع ہوگئی تھیں۔ ان کی تعداد حساب و شمار سے باہر تھی۔ شاہی حکم سے ان عورتوں کو شہر سے باہر بسایا گیا اور ان کی بستی کا نام ''شیطان پورہ'' رکھا گیا اور وہاں بھی محافظ داروغہ اور منشی مقرر کیے گئے کہ جو شخص بھی ان عورتوں کے پاس جائے یا ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہے تو وہ باضابطہ اپنا نام و نسب رجسٹر میں درج کرادے۔ اس کارروائی کے بعد ہر شخص کو ان رنڈیوں کے ساتھ زنا کرنے کی اجازت رہتی تھی۔ اس دفتری اندراج کے بغیر کوئی شخص کسی عورت کو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لے جاسکتا تھا۔ ان میں سے کنواری لڑکیوں

کے ساتھ پہلی شب باشی کی اجازت صرف نامی گرامی امراء کو ہی حاصل تھی وہ بھی داروغہ کو باقاعدہ اطلاع کر کے اور دربار سے اجازت حاصل کر کے اس امیر کو اس کا موقع دیتا تھا۔ بدمعاشوں نے یہاں بھی فرضی ناموں سے اپنا دھندا بے روک ٹوک شروع کر دیا۔ لوگ بدمست ہو کر جھگڑے فساد کرنے لگے اور عورتوں کی خاطر ایک دوسرے کا خون بہانے لگے۔ قصاص میں پکڑے بھی جاتے تھے اور سزا بھی پاتے تھے لیکن ان کی جگہ دوسرے بڑے فخر و مباہات کے ساتھ یہ جرائم کرنے کے لیے آجاتے تھے:

حسن بی پایانِ او چندان کہ عاشق می کند
زمرۂ دیگر بہ عشق از غیب سر بر می کند

ان فاحشہ عورتوں میں سے جو مشہور اور نامی گرامی عورتیں تھیں ان کو بادشاہ نے پوشیدہ طور پر اپنے پاس بلایا اور ان سے دریافت کیا کہ سب سے پہلے کس شخص نے ان کے کنوارے پن کو توڑا تھا۔ ان عورتوں نے جن امرا کے نام لیے ان کو سخت سزائیں دیں اور کافی عرصے تک قید میں بھیج دیا۔ انہی میں سے ایک نے راجہ بیربر کا بھی جو ''مراتب چہارگانہ'' میں سب کا پیشرو اور مخلص مرید تھا، نام لیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے اپنی بیٹیوں تک کو نہیں چھوڑا ہے، وہ اس زمانے میں اپنی جاگیر کورہ میں گیا ہوا تھا، جب افشائے راز کی یہ خبر اس کو ملی تو اس نے جوگی بن جانے کا فیصلہ کرلیا، پھر بادشاہ نے عنایت آمیز فرمان لکھ کر اس کو دربار میں بلا لیا۔

گائے کے ذبیحہ پر ممانعت

بادشاہ کو بچپن ہی سے ہندوؤں سے خاصی وابستگی تھی۔ انہی کی صحبت میں گائے کی تعظیم اس کے ذہن نشین ہوگئی تھی، اس لیے گائے کے ذبیحہ کی بھی ممانعت کر دی گئی۔ ہندوستان کے بڑے بڑے راجاؤں کی بہت سی لڑکیاں شاہی حرم میں تھیں، اور وہ بادشاہ کے مزاج پر بہت حاوی تھیں۔ ان کی صحبت کی وجہ سے اکبر گائے کا گوشت، لہسن اور پیاز کھانے اور داڑھی رکھنے سے پرہیز کرتا تھا اور اپنی مجلس میں ہندوؤں کی رسومات کی پابندی کیا کرتا

تھا۔ غرض ان ہندو عورتوں اور اُن کے خاندان والوں کی دلجوئی کی خاطر اکبر نے ان تمام باتوں کو ترک کردیا جس سے ہندوؤں کے مذہب کو آنچ آتی تھی۔

داڑھی ترشوانے کا رواج

جو لوگ داڑھی منڈواتے تھے بادشاہ ان کو زیادہ پسند کرتا تھا اس وجہ سے داڑھی منڈوانے کا عام رواج ہوگیا۔ داڑھی منڈوانے کے متعلق بڑی عجیب و غریب دلیلیں پیدا کی گئیں کہ داڑھی کا تعلق اصل میں مرد کے خصیوں سے ہے۔ چنانچہ خواجہ سراؤں کی داڑھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کے خصیے ناکارہ ہوتے ہیں اس لیے اس کے رکھنے یا نہ رکھنے میں ثواب و عذاب کا کوئی دخل نہیں ہوسکتا۔ پچھلے زمانے میں ملامتی فرقے کے عبادت گزار لوگ داڑھی رکھنے کو ایک طرح کی ریاضت سمجھ کر رکھا کرتے تھے ان کی دیکھا دیکھی داڑھی رکھنے کا رواج ہوگیا۔ اب اس زمانے میں ریاضت اور ملامت داڑھی رکھنے میں نہیں بلکہ منڈوانے میں ہے، کیوں کہ اب اگر داڑھی منڈوائی جائے تو نادان فقیہ اور عالم ناراض ہوں گے اور ملامت کریں گے۔ شاہی مفتی بھی اپنی داڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دور کی کوڑی لائے اور فقہ کی کتابوں میں سے ایک مجہول سی روایت نکال لائے جس میں یہ فقرہ تھا "**کما یفعلم بعض القضاۃ**" اس فقرہ میں ان بے دین مفتیوں نے تحریف سے کام لیا۔ اصل لفظ ''عصات'' تھا اس کو ''قضات'' میں تبدیل کردیا۔ اب بجائے گناہگاروں کے اس کا مطلب نکلا کہ جس طرح عراق کے بعض قاضیوں کا عمل داڑھی منڈانا تھا۔

زمانے کی نیرنگی دیکھیے کہ جب میں نیا نیا شاہی دربار میں گیا تھا تو اس وقت اتفاق سے میری داڑھی حد شرعی سے کسی قدر کم تھی جب حکیم ابوالفتح نے مجھے دیکھا تو میر ابوالغیث بخاری مرحوم کے سامنے لعنت ملامت کرنے لگا کہ تم جیسے آدمیوں کو داڑھی گھٹانا زیب نہیں دیتا۔ میں نے جواب دیا کہ ''یہ حجام کا قصور ہے میرا نہیں''۔ آیندہ ہرگز ایسا نہ کرنا، یہ بات نہایت بدنما اور نازیبا ہے۔ دن ایسے پھرے کہ اس ابوالفتح نے حیدری جولقی فقیروں بلکہ ہندوؤں سے بھی کہیں زیادہ اپنے رخساروں کا بالکل ہی صفایا کرادیا اور نوعمر چھوکر

طرح چھیل چھبیلا بن کر بال تراشی کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔

تثلیث پرستی

ہندوؤں کی ان رسومات کے علاوہ دربار میں نصاریٰ کی ناقوس نوازی بھی ہونے لگی اور ان کے تین خداؤں کی تصویروں کی زیارت بھی کی جانے لگی۔ طرح طرح کے لہو ولعب شروع ہو گئے۔ اس زمانہ کی تاریخ نکالی گئی۔

''کفر شائع شد''

دین الٰہی کے اقرار نامے

دس بارہ سال کے اندر اندر یہ صورت ہوگئی کہ اکثر گمراہ جیسے مرزا جانی حاکم ٹھٹھہ اور دوسرے بڑے مرتبہ والے امراء نے اپنے ہاتھ سے اس مضمون کے اقرار نامے لکھے کہ میں ''فلاں ابن فلاں'' اپنی خوشی اور مرضی سے مجازی اور تقلیدی دین اسلام سے جسے میں اپنے باپ دادا سے دیکھتا اور سنتا چلا آیا ہوں، انکار کرتا ہوں اور اب میں دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوگیا ہوں اور اخلاص کے مراتب چہارگانہ یعنی ترک مال و جان و ناموس و دین کو قبول کرتا ہوں''۔ یہ اقرارنامے اس نئے دین کے مجتہدین کو سپرد کردیے جاتے تھے اور بادشاہ اقرار کرنے والوں کے ساتھ بڑی مہربانی کا سلوک کیا کرتا تھا۔

کتے اور سور کی پاکی

احکام اسلام کی مخالفت میں سور اور کتے کو پاک قرار دے دیا گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ ان ناپاک جانوروں کو شاہی محل کے نیچے رکھا گیا۔ بادشاہ ہر صبح ان کے دیدار کو عبادت سمجھتا تھا، کیونکہ ہندوؤں نے یہ ذہن نشین کرادیا تھا کہ سور ان 10 مظاہر میں سے ایک مظہر ہے جنھیں اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے۔ کتے کے متعلق بعض عارفوں کا یہ قول سند تھا کہ کتے میں ایسی 10 عمدہ صفات ہیں اگر ان میں سے ایک صفت کسی آدمی کو مل جائے تو وہ ولی بن

جائے۔ دربار کے بعض مقرب اور ملک الشعرا فیضی تو اپنے دسترخوان پر چند کتوں کو ساتھ لے کر بیٹھا کرتا تھا اور عراق و ہندستان کے بعض مردود مشاہیر اس کی پیروی کرتے تھے۔ بلکہ بڑے فخر کے ساتھ کتوں کی زبان اپنے منھ میں لے کر پیار کرتے تھے۔

غسل جنابت کی تحریم

نئے دین کی شریعت میں ناپاکی کے غسل کی فرضیت بھی کلی طور پر منسوخ کردی گئی۔ دلیل یہ لائی گئی کہ انسان کی اصل منی کے نطفے سے ہے، جو نیک اور پاک لوگوں کی آفرینش کا سبب ہے۔ اس صورت میں یہ عجیب بات ہے کہ پیشاب اور پاخانے کے اخراج پر تو غسل واجب نہیں ہوتا اور اس پاکیزہ لطیف مادہ کا اخراج غسل کو واجب کردیتا ہے، بلکہ مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے غسل کریں بعد میں جماع۔

آشِ حیات

ایک اور بات پیدا کی گئی کہ موت کے دن مردہ کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوانا نہایت لغو ہے۔ مردہ جمادات میں شامل ہوجاتا ہے، اس کو کس طرح ثواب پہنچ سکتا ہے۔ اس کے بجائے روز ولادت کو جشن کر کے کھانا پکوانا چاہیے۔ اکبر نے ولادت کے کھانے کا نام ''آش حیات'' رکھا۔

شیر اور جنگلی سور کا گوشت اس بنا پر حلال کردیا کہ اس سے آدمی میں بہادری کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

چچا، ماموں، قریبی رشتہ داروں کی لڑکیوں سے نکاح حرام کردیا گیا، کیونکہ ان لڑکیوں کی طرف مرد کی خواہش کمزور رہتی ہے۔ نکاح کے لیے عمر مقرر کی گئی کہ مرد کے لیے 16 سال کی عمر سے اور عورتوں کے لیے 14 سال کی عمر سے پہلے نکاح روا نہیں، کیونکہ چھوٹی عمر کی اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے۔

سونے اور ریشم کا جواز

سونا اور ریشم پہننا فرض عین قرار دیا گیا۔ ایک دن میں نے مفتی ممالک محروسہ کو خالص ریشم کا لباس پہنے ہوئے دیکھا، میں نے یہ پوچھا ریشم پہننے کے لیے کوئی روایت نکل آئی ہے کیا؟ اس نے کہا ہاں! جس شہر میں ریشمی لباس عام ہوجائے وہاں ریشم پہننا جائز ہے''۔ میں نے کہا بظاہر تو یہی روایت معلوم ہوتی ہے کہ بادشاہ نے اس کا حکم دے رکھا ہے۔ اس نے کہا، نہیں اس کے علاوہ بھی روایت موجود ہے، واللہ اعلم!

نماز، روزہ اور حج وغیرہ اس سے پہلے ہی متروک ہو چکا تھا، بعض حرام زادوں نے جیسے ملا مبارک کے بیٹے ابوالفضل نے ان عبادتوں کی مذمت اور تمسخر میں کئی ایک رسالے بڑے دلائل کے ساتھ لکھے، بادشاہ کو یہ رسالے بہت پسند آئے، اور اس پر بڑی نوازش فرمائی۔

سن الٰہی کا اجراء

عربی کے سن ہجری کو اکبر نے موقوف کرادیا اور اس کی جگہ تاریخ کو اپنے جلوس کے سن سے شروع کرایا جو 963ھ میں ہوا تھا۔ مہینوں کا تعین عجمی بادشاہوں کے طریقے پر کیا گیا جو نصابی کتابوں میں درج ہے۔

زردشتیوں کے مذہب کی طرح سال میں چودہ عیدیں مقرر کی گئیں۔ مسلمانوں کی عیدوں کی رونق باقی نہ رہی البتہ جمعہ کا التزام باقی رہا وہ صرف اس خیال سے کہ جمعہ کا خطبہ بادشاہ کے نام سے پڑھا جاتا تھا اور اس میں بھی بس بوڑھے لوگ شریک ہوا کرتے تھے۔

نئی تقویم میں سال اور مہینوں کو سن الٰہی اور ماہ الٰہی کہا جانے لگا۔ تنکہ اور مہر پر تاریخ الفی ثبت کرایا گیا، یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ایک ہزار سال پر دین محمدی کی مدت ختم ہوچکی ہے۔

عربی زبان کی مخالفت

عربی پڑھنا عیب ہوگیا۔ فقہ، حدیث اور تفسیر پڑھنے والے مطعون کیے جانے لگے۔ نجوم، حکمت، طب، ریاضی، شعر، تاریخ اور افسانے کی تحصیل فرض ہوگئی۔ عربی کے خاص حروف جیسے ث، ح، ع، ص، ض، ط، ظ کو لغت سے نکال دیا گیا۔ چنانچہ عبداللہ کو ابداللہ، احدی کو اہدی کہا اور لکھا جاتا تو اکبر بہت خوش ہوتا تھا۔

شاہنامے کے دو شعر جسے فردوسی طوسی نے شاہنامے میں نقل کیا ہے۔ بادشاہ سلامت کو بہت پسند تھے اور ان کو وہ سند بنائے ہوئے تھے شعر یہ ہیں:

زشیر شتر خوردن و سوسمار
عرب را بجائی رسیده است کار
که ملک عجم راکنند آرزو
تفو باد بر چرخ گردون تفو

بادشاہ کو اساتذہ کا جو شعر بھی اپنے مسلک کے مطابق مل جاتا وہ اسے سند بنا لیتا تھا۔

دینی مسائل کا تمسخر

غرض اکبر نے دین کے ہر مسئلے اور ہر عقیدے میں جیسے نبوت، کلام، رویت، تکلیف، تکوین، حشر و نشر خواہ وہ اصول سے متعلق ہو یا فروع سے طرح طرح کے شبہات پیدا کیے اور ہر ایک کا تمسخر و استہزا کیا۔ اگر کوئی شخص جواب دینے یا تنقید کرنے پر آمادہ ہوتا تھا تو اس کو جواب دینے سے روک دیا جاتا تھا اور کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ مناظرے میں عموماً ثابت کرنے والے کے مقابلے میں انکار کرنے والے کا پلہ ہی بھاری رہتا ہے۔ خصوصاً جب کہ مقابل کو کسی بات کے جبراً منوانے کے بھی پورے اختیارات حاصل ہوں۔ بحث میں تو دونوں فریقوں کے مساوی ہونے کی شرط لازمی ہے اور یہاں ذرہ و آفتاب کا معاملہ، کون کس سے بحث کرتا اور بحث کی کس کو ہمت تھی؟ چنانچہ اس

مباحثے کی قربان گاہ پر کتنے ہی خاندان تباہ و برباد ہوگئے۔ یہ تو مباحثہ نہیں بلکہ ''مکابرہ'' ہوتا تھا جس میں دین فروش علماء خوشامد کے لیے طرح طرح کے استدرکات و مشتبہات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر بطور تحفہ پیش کرتے تھے، جیسا کہ لطیف خواجہ نے جو ماوراء النہر کے بزرگ زادوں میں سے تھا، شمائل ترمذی کی اس حدیث "کانه جید رقبته" (حضور کی گردن تصویر کی گردن کی طرح تھی) کے بارے میں جو سیرت کی کتابوں میں مشہور ہے اور ہجرت کے آغاز میں قریش کے قافلے کو لوٹ لینے کے متعلق، حضور ﷺ کے چودہ نکاح کرنے اور آپ ﷺ کی رحلت کے بعد دوسروں پر آپ ﷺ کی بیبیوں کے حرام ہونے کے سلسلے میں بڑے اعتراض اٹھائے گئے اور اس طرح کی لایعنی بحثیں نکالی گئیں، جن کی تفصیل کے لیے کافی وقت درکار ہے۔

چہل گانہ کی مجلس

بادشاہ نے اپنی رات کی محفل میں چالیس مقربوں کو شرکت کے لیے مخصوص کردیا۔ ان 40 عقلمندوں کی محفل میں جس کو جو سمجھ میں آتا پیش کرتا اور سوال و جواب کا سلسلہ جاری رہتا۔ اگر کوئی کسی علمی مسئلہ کے متعلق سوال اٹھاتا تو اس سے کہا جاتا کہ ایسی باتیں ملاؤں سے پوچھی جائیں اور جو مسائل عقل و حکمت پر مبنی ہوں وہ ہمارے سامنے لائے جائیں۔ ان محفلوں میں جب سیرت کی کتابیں پڑھی جاتیں تو یہ لوگ ایسی ایسی بے ادبانہ باتیں کرتے، خاص طور سے خلفائے راشدین کی خلافت، قضیۂ فدک اور جنگ صفین کے سلسلے میں ان کی زبانیں اس بے باکی سے چلتی تھیں کہ انھیں بیان کرنے سے بھی غیرت آتی ہے۔ خدا ایسی باتیں کسی کو نہ سنوائے۔

شیعوں کو بڑا غلبہ اور اقتدار حاصل ہوگیا تھا اور سنی عاجز و مغلوب ہوگئے تھے۔ جتنے خدا کے نیک بندے تھے وہ خوف زدہ رہنے لگے تھے اور شرپسند عناصر کے لیے میدان بالکل صاف ہوگیا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا حکم، ایک نہ ایک نئی ممانعت نکلتی، طرح طرح کے اشکال و اوہام سامنے لائے جاتے۔ بادشاہ اور اس کے حواری اپنے معتقدات و

نظریات کے حق ہونے کے لیے کوئی دلیل اور ثبوت تو کیا لاتے صرف دوسروں کی نفی اور تردید کرتے اور اپنی بات منوانے کی فکر میں رہتے۔ بے دینوں کی بن آئی تھی۔ اچھے لوگ مردود ہوگئے تھے اور مردود مقبول بن گئے تھے۔ جو نزدیک تھے انھیں دھتکار دیا گیا اور جو دور تھے ان کو قریب کرلیا گیا تھا۔

دربار کے اس رنگ کو دیکھ کر سارے ملک میں بڑا شور و غوغا مچا اور بادشاہ کی ان حرکتوں پر لوگ اللہ اکبر کہہ کر کان پکڑنے لگے۔ اس صورتحال کو ملا شیری کے اس قطعہ میں کس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اس نے یہ قطعہ اسی پُر آشوب زمانہ میں کہا تھا:

تا بزاید ہر زمان کشور بر انداز آفتی | فتنہ در کوی حوادث کہ خدا خواہد شدن
باعقاب قرض خواہ تیغ در ارباب شرک | بارسر ازذمۂ گردن ادا خواہد شدن
فیلسوف کذب را خواہد گریبان پارہ شد | خرقہ پوش زہد را تقویٰ روا خواہد شدن
شورش مغز است اگر در خاطر آرد جاہلی | کز خلائق مہر پیغمبر جدا خواہد شدن
خندہ می آید مرا زین بیت بس کز طرفگی | نقل بزم منعم و ورد گدا خواہد شدن

بادشاہ امسال دعویٰ نبوت کردہ است
گر خدا خواہد پس از سال خدا خواہد شدن

جشن نو روز کی محفلیں

جشن نو روز کے موقعے پر اکثر علماء وصلحاء بلکہ قاضی اور مفتی تک جام و مے سے شغل کرنے پر مجبور ہوجاتے تھے:

عشقت خبر ز عالم بی ہوشی آورد
اہل صلاح را بہ قدح نوشی آورد
یاد تو ای نگارچہ معجون حکمت است
کز ہرچہ خواندہ ایم فراموشی آورد

نئے دین الٰہی کے مجتہد، خاص طور سے ملک الشعراء فیضی تو یہ کہہ کہہ کر پیتے کہ ”ہم

یہ پیالہ فقیہوں اور عالموں کے اندھے پن کے نام پر پیتے ہیں"۔

نو روز کے آخری دن کا نام جو برج حمل کے انیسویں درجے میں ہوتا تھا ''شرف الشرف'' رکھا گیا تھا۔ اس روز تمام دنوں سے بڑھ چڑھ کر جشن کا اہتمام ہوتا اور کورنش و تعظیم کے مراسم ادا کیے جاتے۔ امراء کے منصب ، جاگیر میں اضافے ہوتے۔ حسب مدارج گھوڑے اور خلعتیں عطا ہوتیں، شاندار ضیافتیں ہوتیں، نذرانے اور تحفے گزارے جاتے۔

اسی نو روز کے موقعے پر بنگالہ سے شاھم خان جلائر اور لاہور سے راجا بھگوان داس حاضر ہوئے۔ اعظم خاں اور دوسرے تمام امرا حاجی پور سے دارالخلافہ میں پہلے سے آئے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے بہار میں باغیوں نے بغاوت کا پرچم بلند کردیا تھا۔ معصوم خاں کابلی کے ایک ملازم خبیثہ بہادر نے ترخان دیوانہ سرخ بدخشی کو ہمراہ لے کر بادشاہی فوجیوں پر حملہ کردیا۔ محمد صادق خان نے محب علی خان کے ہمراہ اس سے مقابلہ کیا اور باغیوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اس جنگ میں خبیثہ بھی مارا گیا۔

اسی سال گلبدن بیگم اور سلیمہ سلطان بیگم حج سے لوٹ کر آئیں۔ ان کے استقبال کے لیے شاہزادہ سلطان سلیم اجمیر تک گیا اور خواجہ صاحب کے روضے کی زیارت کی، لیکن پہلے کی طرح نذر نیاز کچھ نہیں ہوئی۔

انہی دنوں بہار سے محمد صادق خاں بھی حاضر ہوا۔ بادشاہ نے بہت جلد اسے اعظم خاں کے ہمراہ معصوم کابلی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ صادق خاں کی مدد کے لیے شاہ قلی خاں محرم، شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کو جو کابل کی مہم پر نہیں جاسکے تھے، مقرر کیا گیا۔

نقش قدم کا استقبال

اسی دوران شاہ ابوتراب اور اعتماد خان جو حجاز کے سفر پر گئے ہوئے تھے، واپس آئے اور اپنے ساتھ ایک بہت بڑا بھاری پتھر لے کر آئے۔ اس پتھر پر ایک نقش قدم بنا ہوا تھا۔ شاہ ابوتراب کا کہنا تھا کہ یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پائے مبارک کا نقش ہے۔

بر لوح سر تربت خود نقش تو کندیم

تا روز قیامت سر ما و قدم تست

بادشاہ بھی اس کے لیے چار کوس تک تشریف لے گئے اور حکم دیا کہ امراء باری باری سے پتھر کو اٹھا کر چند قدم تک لے جائیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اس متبرک پتھر کو شہر میں پہنچایا گیا۔

مخدوم الملک کا انتقال

19 شعبان کو بڑے شاہزادے کی سالگرہ منائی گئی اور شہزادے کا وزن کیا گیا۔ اسی سال یا آئندہ سال شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک جنھیں ہمشیہ کے لیے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مرزا محمد حکیم اور دوسرے امراء کی بغاوتوں کی خبر سن کر مکّے سے گجرات واپس آ گئے تھے اور اپنی سابقہ شان و شوکت کی آرزو میں وقت گزاری کر رہے تھے۔ 990ھ میں مخدوم الملک کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مال و اسباب کی تحقیقات کے لیے فتح پور سے قاضی علی کو مقرر کیا گیا۔ اس نے لاہور آ کر چھان بین کی تو مخدوم الملک کے اتنے خزانے اور سونا چاندی برآمد ہوا کہ ان کا شمار ممکن نہ تھا۔ مخدوم الملک کے خاندانی قبرستان سے بھی سونے کی اینٹوں سے بھرے ہوئے کئی ایک صندوق نکلے جو اس نے میت بنا کر دفن کرا رکھے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے جو مال لوگوں کے پاس رکھا تھا۔ اس کی مقدار تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سونے کی ساری اینٹیں اور اس کی تمام کتابیں خزانہ عامرہ میں داخل کر لی گئیں۔ اس کی اولاد مصیبتوں میں گرفتار ہو کر روٹی روٹی کو محتاج ہو گئی۔

شیخ عبدالنبی کا عبرت ناک انجام

شیخ عبدالنبی بہرحال فتح پور پہنچ گیا اور اکبر کے سامنے اس نے سخت باتیں کیں اور اسے خوب بُرا بھلا کہا۔ اکبر کو بھی غصہ آ گیا۔ اس نے شیخ عبدالنبی کے منھ پر پوری قوت سے ایک گھونسہ مارا۔ اس نے چلّا کر کہا ''ایک ہی بار چھری مار کر میرا کام تمام کیوں نہیں

کردیتے؟ اکبر نے اس کو راجہ ٹوڈرمل کے حوالے کر دیا کہ اس سے ستر ہزار روپے کا حساب لیا جائے جو مکہ معظمہ جاتے وقت دیا گیا تھا۔ کروڑیوں نے اس کو کچہری کے حوالات میں طویل عرصے تک قید رکھا۔ آخر ایک رات گلا گھونٹ کر اس کی زندگی کو قید سے رہائی دے دی گئی۔ عبرت کی بات ہے کہ شیخ عبد النبی جیسا بزرگ آدمی اس کا یہ حشر ہوا کہ قتل کے دوسرے دن مناروں والے میدان میں اس کی لاش ظہر کی نماز تک بے گوروکفن پڑی رہی۔ یہ واقعہ 992ھ/1582ء میں رونما ہوا۔ اس کی تاریخ ''شیخ کنبی'' نکالی گئی:

گر چہ الشیخ کالنبی گفتند
کالنبی نیست شیخ است

اسی سال شیخ جلال تھانیسریؒ کا بھی وصال ہوا۔ ان کی تاریخ ''شیخ الاولیاء'' نکالی گئی۔ اسی سال آصف خاں میر بخشی ثانی جس کا اصل نام میرزا غیاث الدین علی تھا، فوت ہوگیا۔ اس کی تاریخ وفات ''خدا یاورش باد'' سے نکلتی ہے۔ اس کا قائم مقام اس کا بھتیجہ میرزا جعفر ہوا جسے بعد میں آصف خاں کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔

حاجی ابراہیم سرہندی کا قتل

حاجی ابراہیم سرہندی کو پہلے ہی معزول کر دیا گیا تھا۔ اس کے متعلق بادشاہ کو یہ رپورٹ ملی تھی کہ اس نے کافی مال و متاع جمع کر لیا ہے اور اس کے حرم میں بھی بہت سی عورتیں جمع ہیں اور وہ سرکش ہو کر دکن[59] کی طرف فرار ہو جانے کی فکر میں ہے۔ اسے گرفتار کر کے اسی سال بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔ اکبر نے کچھ عرصے تک اسے عین الملک کی نگرانی میں دے دیا تھا بعد میں رنتھنبور کے قلعے میں بھیج کر قتل کرا دیا گیا۔

برہان قاطع کا اعلان

اسی سال شیخ مبارک نے خلوت شاہی میں اکبر کے سامنے بیر بر سے کہا کہ ''جس طرح تمہاری مذہبی کتابوں میں تحریفیں ہوئی ہیں ہمارے دین میں بھی بہت سی تحریفات ہو چکی

ہیں، اور اب وہ قابل اعتبار نہیں رہا ہے۔

آخرت فروش گمراہوں نے اسی سال اکبر کو یہ سمجھایا تھا کہ ہجرت کو ہزار سال ہو چکے ہیں، آپ بھی شاہ اسماعیل اول کی طرح برہان قاطع (دین الہیٰ کے اجراء) کا اعلان فرمائیں۔ دربار میں مشورے کے بعد طے پایا کہ اس مقصد کو بتدریج پورا کیا جائے اور بغیر کسی سختی کے اپنے دلی ارادوں کو ظاہر کیا جائے۔ بادشاہ ان دنوں حکیم ناصر خسرو کی یہ رباعی بہت پڑھا کرتا تھا:

درنہ صد و تسعین دو قرآن می بینم   وز مہدی و دجال نشان می بینم
یا ملک بدل گردد یا گردد دین   سرّی کہ نہان است عیان می بینم

جس وقت ایک نئے دین کے اجراء کے متعلق دربار میں مشورے ہو رہے تھے اور اکبر پوری شدت سے اس کو جاری کرنے کا خیال ظاہر کر رہا تھا، راجہ بھگونت داس نے کہا: ''چلو ہم یہ قبول کیے لیتے ہیں کہ ہندو بھی بُرے ہیں اور مسلمان بھی، لیکن بھلا یہ تو بتائیے کہ ان دونوں سے بہتر اور اعلیٰ کون سا فرقہ اور گروہ ہے جس میں ہم شامل ہو جائیں۔'' بھگونت داس کی بات پر اکبر نے قائل ہو کر شدت برتنے کا خیال چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد ہی سے ملت اسلامیہ کے احکام میں تغیر و تبدل کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کی تاریخ ''احداث بدعت'' نکالی گئی۔

قاضی جلال ملتانی پر تہمت

اسی زمانے میں بادشاہ نے قاضی جلال ملتانی پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے جعلی تمسک لکھ کر پانچ لاکھ تنکہ شاہی خزانے سے وصول کر لیا ہے۔ یہ الزام رکھ کر ان کو خواجہ فتح اللہ بخشی کے ساتھ دکن کی طرف جلاوطن کر دیا۔ خیال یہ تھا کہ دکن کے حکام متعصب رافضی ہیں اس لیے وہ قاضی کو سخت اذیتیں دے کر نہایت رسوائی کے ساتھ ہلاک کر دیں گے، مگر معاملہ کچھ برعکس ہی ہوا۔ جب وہ دکن پہنچے تو وہاں ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیونکہ ان سے پہلے ہی یہ خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں کہ قاضی نے اکبر کی بے دینی کا نہایت ثابت قدمی سے

مقابلہ کیا اور کلمۂ حق کہنے میں بزدلی نہیں دکھائی۔

دکن والوں نے ان کی آمد کو باعث برکت جانا اور مدد معاش کی آراضیات کے علاوہ ان کو اور بھی ذمے دارانہ خدمات تفویض کر دیں اور وہ وہاں آخر تک نہایت عزت و احترام سے رہے۔ آخر میں حج پر جانے کی اجازت طلب کی، لیکن دکن کے حکام ان کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اس لیے عرصے تک ان کو اجازت نہ ملی۔ آخر وہ اجازت حاصل کر کے زیارت حرمین کی سعادت سے فیض یاب ہوئے اور وہیں ان کا انتقال بھی ہو گیا۔

قاضی عبد السمیع ماوراء النہری

قاضی جلال کو ہٹانے کے بعد ان کی جگہ قاضی عبد السمیع ماوراء النہری میاں کالی کو قاضی بنایا گیا۔ اس شخص کے متعلق موجی شاعر نے یہ شعر کہا تھا:

پیری ز قبیلہ معزز
ریشی چو گل سفید یک گز

یہ نہایت فاسق و فاجر شخص تھا۔ شطرنج پر جوا کھیلتا تھا۔ اعلانیہ شراب پیتا تھا۔ اس کے مذہب میں رشوت نہ صرف جائز بلکہ فرض تھی۔ قرض کے قبالوں پر حکماً سود وضع کر کے اس کے اندراجات کراتا تھا۔ دین اور مذہب کی بادشاہ کو کوئی پرواہ نہ تھی، محض بدنامی سے بچنے کے لیے قاضی کا تقرر کرنا تھا، اور اس سے بہتر کوئی دوسرا قاضی ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اذان اور نماز کی موقوفی

محل میں پانچ وقت جماعت کے ساتھ نماز بھی ہوتی تھی اور اذان بھی دی جاتی تھی، لیکن انہی دنوں جماعت، نماز اور اذان سب موقوف ہو گئے۔ کافروں اور حرم کی کافر زادیوں کی خاطر اکبر کو اب تو احمدؐ، محمدؐ اور مصطفیٰؐ جیسے نام بھی گراں گزرتے تھے۔ چنانچہ اُس نے کچھ دن بعد اپنے بعض مقربوں کے نام جو اس طرز کے تھے تبدیل کرا دیے، جیسے یار محمد اور محمد خان کو بدل کر رحمت خان وغیرہ کر دیا۔ اچھا ہوا کیونکہ ان خبیثوں پر یہ بابرکت نام جچتے

بھی نہیں تھے، سور کی گردن میں قیمتی موتی کہاں زیب دے سکتے ہیں؟

بے دینی کی یہ ساری آگ آگرہ سے اٹھی اور اس نے چھوٹے بڑے ہر ایک کو جلا کر راکھ کر دیا۔ آخر اس کی لپٹوں سے آگ لگانے والے فسادی بھی نہ بچ سکے۔

میر فتح اللہ شیرازی کی حاضری

ماہ ربیع الثانی 990ھ/1582ء میں بادشاہ نے میر فتح اللہ شیرازی کو عادل خان، جو دکن کا حاکم تھا، کے پاس فرمان بھیج کر بلایا۔ جب وہ فتح پور پہنچا تو بادشاہ کے حکم سے خان خاناں اور حکیم ابو الفتح اس کے استقبال کے لیے گئے۔ میر فتح اللہ الٰہیات، ریاضیات، طبیعات، طلسمات اور دوسرے تمام عقلی اور نقلی علوم میں اپنے عہد کا ماہر فن شخص تھا۔ جب وہ آیا تو بادشاہ نے اسے صدارت کا منصب عطا کیا جو اُن دنوں سیاہ نویسی سے بڑھ کر کچھ نہیں رہا تھا اور صدر کا کام یہ رہ گیا تھا کہ وہ فقراء کو کچھ دینے کے بجائے ان کی زمین ضبط کرتا رہے۔ اس کو بیاور کا پرگنہ داغ ومحلہ سے مستثنیٰ کر کے بطور جاگیر عطا کیا گیا۔ اس کے تقرر کی وجہ یہ تھی کہ اس کے متعلق یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ میر غیاث الدین منصور شیرازی کا شاگرد ہے اور میر غیاث الدین نماز اور عبادت کا پابند اور قائل نہ تھا، اس لیے بادشاہ کو اس کے متعلق بھی یہ خوش گمانی تھی کہ شاید وہ مذہب اور دین کے معاملے میں ان کی تائید کرے گا، لیکن یہ خوش گمانی نہ رہی، کیوں کہ میر فتح اللہ شیرازی نے باوجود اپنی ساری دنیاداری، امرا پرستی کے مذہب کے معاملہ میں بڑی ثابت قدمی دکھائی، چنانچہ وہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کو نماز پڑھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ نہایت اطمینان کے ساتھ امامی مذہب کے مسلک پر نماز پڑھا کرتا تھا۔ بادشاہ کے علم میں اس کی یہ تقلید پرستی تھی لیکن اس کے علم وحکمت، تدبیر ومصلحت کا خیال کر کے بادشاہ نے چشم پوشی سے کام لیا اور اس کی ترقی و خاطر داری میں کوئی کمی نہ کی۔ یہاں تک کہ مظفر خان کی چھوٹی لڑکی سے اس کا نکاح بھی کرادیا اور اسے وزارت کے عہدے پر راجہ ٹوڈرمل کا شریک کار بنا دیا۔ وہ نہایت جرأت کے ساتھ راجہ کے معاملات میں مداخلت کر کے فرائض وزارت بجالاتا تھا۔ وزارت

کے ساتھ ساتھ وہ امراء کے بچوں کو بھی بڑے شوق سے پڑھاتا رہتا تھا اور ہر روز بادشاہی مصاحبوں کے گھر پر اسی غرض سے ضرور جایا کرتا تھا۔ پہلے تو اس نے حکیم ابو الفتح کے لڑکے کو پھر شیخ ابوالفضل کے لڑکے کو پڑھایا، دوسرے امیروں کے بھی سات سات، آٹھ آٹھ سال تک کے بچوں کو الف، ب پڑھنے اور لکھنے کی کوشش کراتا رہتا تھا۔ ہمیشہ کاندھے پر بندوق اور کمر میں بارود کی پٹی بندھی رہتی تھی اور بادشاہ کے ساتھ جنگل میں قاصدوں کی طرح پیدل جایا کرتا تھا۔ اپنی اس وضع قطع اوراوچھی حرکتوں سے اس نے علم کے رہے سہے وقار کو بھی خاک میں ملا دیا۔ لیکن اس کا کمال یہی تھا کہ وہ اس ذلت، رذالت اور خسیسی کے باوجود مذہب کے معاملے میں بڑا سخت تھا اور کسی سے نہیں ڈرتا تھا۔ اس کی آمد کی تاریخ ''شاہ فتح اللہ امام اولیاء'' سے نکلتی ہے۔

معراج نبوی ﷺ سے انکار

ایک رات اکبر نے شاہ فتح اللہ کی موجودگی میں بیر بر سے کہا ''اس بات کی عقل اجازت نہیں دیتی کہ ایک شخص اپنے جسمانی بوجھ کو لیے پلک جھپکنے میں آسمان پر جائے اور اللہ تعالیٰ سے 90 ہزار باتیں کر کے اتنی جلد لوٹ آئے کہ ان کا بستر واپسی تک گرم ہی رہے اور لوگ بھی اس دعوے کی تصدیق کرنے لگ جائیں۔ اسی طرح ''شق القمر'' اور دوسرے معجزے بھی خلاف عقل معلوم ہوتے ہیں''۔ پھر اکبر نے اپنا ایک پاؤں اٹھا کر سب کو دکھایا اور کہا ''دوسرا پاؤں ٹکائے بغیر آخر ہمارا کھڑا رہنا کس طرح ممکن ہے''۔ آخر لوگوں نے یہ کیا داستان بنا رکھی ہے۔ بیربر بدبخت اوردوسرے گمراہوں نے بادشاہ کی خوب ہاں میں ہاں ملائی اور بڑا سراہا۔ اکبر رہ رہ کر شاہ فتح اللہ کو دیکھتا جاتا تھا اور اس ساری گفتگو کی غرض بھی یہ تھی کہ وہ نیا آیا ہوا ہے اس کے خیالات معلوم کریں، لیکن وہ بندۂ خدا سر جھکائے کھڑا رہا، کچھ نہیں بولا۔

ملا احمد ٹھٹھہ کی آمد

انہی دنوں ٹھٹھ کا ملا احمد متعصب رافضی جو بڑی بے حیائی سے خود کو حکیم بھی کہا کرتا تھا

دکن سے آکر حاضر ہوا۔ اس کے آباو اجداد فاروقی سلسلے کے حنفی تھے۔ وہ ناپاک ان بدنصیبوں پر بھی لعنت بھیجتا تھا مگر حضور کا قول ہے کہ جو اپنے باپ کو لعنت کرتا ہے اس کی لعنت اسی پر لوٹ آتی ہے۔ وہ شاہ طہماسپ کے عہد میں عراق میں تبرا کرنے والے شیعہ مومنوں کی صحبت میں پڑ گیا تھا۔ اسی لیے وہ ان کی طرح ہو گیا، لیکن جب شاہ اسماعیل ثانی نے اپنے باپ کے برعکس سنّی مسلک اختیار کر لیا اور رافضیوں کو تنگ کرنے لگا تو وہ میرزا مخدوم کے ساتھ جو پکے سنّی تھے اور انھوں نے "النواقض فی ذم الروافض" کے نام سے رافضیوں کے خلاف ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں کتاب کی تاریخ تصنیف بھی درج ہے، مکے کو چلا گیا وہاں سے بھٹکتا بھٹکتا دکن پہنچا، وہاں سے ہندوستان کا رخ کیا۔ یہاں سارا میدان خالی پڑا تھا چنانچہ اسے مہمل باتوں کو پھیلانے اور اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کا کھلا موقع مل گیا مگر کچھ ہی عرصے بعد اسے اپنے کیے کا اچھا بدلہ بھی مل گیا۔

ان دنوں جب کہ وہ شیخ فیضی کی صحبت میں نہیں پہنچا تھا اور اتنا بے باک نہیں ہوا تھا میری اس سے بازار میں ملاقات ہو گئی۔عراقیوں نے اس کے سامنے میری بڑی تعریف کی تھی۔ پہلی ملاقات میں اس نے مجھے دیکھ کر کہا'' رفض کا نور آپ کی پیشانی سے صاف جھلکتا ہے'' میں نے فی البدیہہ جواب دیا۔''ہاں جس طرح نور تسنن تمہارے چہرے پر جھلک رہا ہے'' جو لوگ وہاں کھڑے تھے بے ساختہ ہنس پڑے اور اس جواب سے بڑے خوش ہوئے۔ اس کا مزید حال آگے بیان کیا جائے گا۔

تاریخ الفی کی تصنیف کا حکم

اسی سال بادشاہ نے حکم دیا کہ چونکہ ہجرت کے ہزار سال ختم ہو چکے ہیں اب تک سب لوگ ہجری تاریخ ہی لکھتے آئے ہیں، اب ایک تاریخ مرتب ہونی چاہیے جس میں آج تک کے تمام بادشاہوں کے واقعات مندرج ہوں، یہ تاریخ دوسری تاریخوں کے غلط واقعات کی تردید و تنسیخ کرے۔ اس کا نام ''تاریخ الفی'' رکھا جائے اس میں سنین کے ساتھ بجائے ہجرت کے رحلت کا لفظ لکھا جائے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ کی وفات سے اس زمانہ تک کے

حالات لکھنے کے لیے 7 اشخاص مقرر کیے گئے۔ پہلے سال کے واقعات کے لیے نقیب خاں کو دوسرے سال کے لیے شاہ فتح اللہ کو اور اسی ترتیب سے دوسروں کو مقرر کیا گیا۔ لکھنے والوں میں حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی جو انہی دنوں گجرات سے آیا ہوا تھا، مرزا نظام الدین احمد اور اس ناچیز[60] کا نام بھی شامل تھا۔ اسی طرح 35 سال کے واقعات کی ترتیب و تقسیم کی گئی۔

میں نے ساتویں سال کے تذکرے میں خلیفہ ثانی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات مرتب کیے تھے۔ ایک رات یہ مسودہ بادشاہ کے ملاحظے میں تھا جب پڑھتے پڑھتے شہر کوفہ کی تعمیر قصر الامارت کے انہدام، حضرت علی کی صاحبزادی ام کلثوم کے نکاح کے قضیے، شہر نصیبین کی فتح اور وہاں سے مرغ کی قد و قامت کے بچھوؤں کے نکلنے کے ذکر پر پہنچے تو اکبر نے ان بیانات پر بڑی رد و کد شروع کردی، مرزا جعفر آصف خاں ثالث نے اس موقعے پر اکبر کی غلط تائید کی اور اس کی طرف سے بحث کرنے لگا البتہ شیخ ابو الفضل اور غازی خاں بدخشی نے ان واقعات کی صحیح توجیہات بیان کیں۔ مجھ سے اکبر نے پوچھا: ''تم نے یہ سب حالات کس طرح لکھ دیے؟'' میں نے عرض کیا ''میں نے اپنی طرف سے بنا کر تو نہیں لکھا، کتابوں میں جو کچھ دیکھا مرتب کردیا''۔ اکبر نے اسی وقت شاہی کتب خانہ سے ''روضۃ الاحباب'' اور سیرتؐ کی دوسری کتابیں منگائیں اور نقیب خاں سے کہا کہ ''وہ تحقیق کرکے بتائے کہ یہ صحیح ہے یا غلط ہے''۔ اس نے تمام واقعات کے صحیح ہونے کی تصدیق کی اور خدا کے فضل سے مجھے اس بے جا گرفت و گیر سے چھٹکارا ملا۔

36 سال تک کے حالات لکھے جاچکے تو اکبر نے حکم دیا کہ اب صرف ملا احمد ٹھٹھہ ''تاریخ الفی'' کے بقیہ حالات لکھے گا۔ یہ تبدیلی حکیم ابو الفتح کی تجویز و سفارش کی وجہ سے عمل میں آئی۔ ملا احمد نہایت متعصب آدمی تھا اس نے اپنے اعتقاد کے مطابق جی میں جو آیا لکھ دیا، جیسا کے اس تاریخ سے بخوبی واضح ہوتا ہے۔ چنگیز خاں کے دور تک اس نے اِس تاریخ کی دو جلدیں پوری کر دیں۔

ملا احمد اپنے مذہب میں نہایت غلو اور تشدد تھا۔ میرزا فولاد برلاس کو بھی اس کی وجہ

سے نقصان پہنچا تھا، چنانچہ مرزا نے ایک رات اس بہانے سے کہ اسے بادشاہ نے طلب کیا ہے گھر سے باہر بلایا اور لاہور کی ایک گلی میں اسے قتل کردیا۔ اس کے قصاص میں میرزا فولاد کو بھی سزائے موت دی گئی۔

''تاریخ الفی'' کے بقیہ حالات لکھنے کی ذمے داری اب آصف خان کے سپرد کی گئی۔ اس نے یہ واقعات 997ھ/ 1589ء تک پورے کردیے۔ 1000ھ/ 1592ء میں بادشاہ نے لاہور میں مجھے حکم دیا کہ میں مسودات کا مقابلہ اور تصحیح کروں اور سنین میں جو تقدیم و تاخیر ہوگئی ہے اُسے درست کردوں۔ ایک سال تک میں[01] یہ خدمت انجام دیتا رہا۔ میں نے پہلی دو جلدوں کو مکمل کردیا۔ تیسری جلد کا کام آصف خاں کے حوالے کردیا۔

مہابھارت کا ترجمہ

اس سال کا اہم واقعہ مہا بھارت کے ترجمے کی تکمیل ہے۔ مہا بھارت ہندستان کی قدیم اور بڑی کتاب ہے جس میں متعدد قصے، نصیحتیں، مصالح ملکی، اخلاق و آداب، علوم و اعتقادیات، ہندو مذہب اور اس کی عبادتوں کی تفصیل ہے۔ یہ تمام موضوعات ہندستان کے قدیم فرمانروا کوروؤں اور پانڈوؤں کی جنگ کے ضمن میں بیان کیے گئے ہیں بعض کی رائے میں یہ واقعات کم از کم چار ہزار سال پہلے پیش آئے تھے۔ بعض کا قول ہے، مہابھارت پر 80 ہزار سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا جو بظاہر آدم علیہ السلام سے بھی پہلے کا دور معلوم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے غیر مسلم اس کتاب کے لکھنے اور پڑھنے کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں اور اسے مسلمانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں۔

مہا بھارت کے ترجمے کا سبب یہ ہوا کہ بادشاہ نے شاہ نامہ اور امیر حمزہ کے قصہ کو 17 جلدوں میں 15 سال کی مدت میں لکھوایا تھا۔ اس کی تصویروں پر کافی روپیہ بھی خرچ ہوا تھا۔ اسی طرح ابو مسلم کا قصہ جامع الحکایات وغیرہ کو بادشاہ نے متعدد بار پڑھوا کر سنا تھا۔ ان کتابوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ یہ سب حقیقی واقعات نہیں ہیں بلکہ فرضی ہیں اور محض شاعری کی گئی ہے یہ کتابیں چونکہ اچھے وقت میں لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی

قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلے میں چونکہ اچھے وقت لکھی گئی تھیں اور لکھنے والوں کی قسمت اچھی تھی کہ ان کو شہرت عام نصیب ہوگئی۔ اکبر کو خیال آیا کہ ان کتابوں کے مقابلہ میں ہندوؤں کی کتابوں کو جنھیں عبادت گزار دنشوروں نے لکھا ہے اور وہ سب کی سب حقیقی اور نص قاطع ہیں، ہندوؤں کی عبادتوں، اعتقاد اور مذہب کا سرچشمہ بھی ہیں، ہندی[62] سے فارسی میں ترجمہ کرا کے کیوں نہ اپنے نام سے منسوب کرایا جائے۔ یہ واقعات فارسی میں اب تک بیان نہیں کیے گئے ہیں، اس لئے دلچسپ اور نئے رہیں گے۔ اس کے علاوہ جس طرح ان کتابوں کے مقدمے میں درج ہے ان کی اشاعت دینی اور دنیاوی سعادت کا موجب اور شان و شوکت کے بقاء، اولاد و اموال کی کثرت کا باعث بھی ہوگی۔

چنانچہ اکبر نے خود بھی ذاتی طور پر وقت دینے کا فیصلہ کیا۔ ہندو اہل علم کو جمع کر کے حکم دیا کہ وہ مہابھارت کی تعبیر و ترجمانی کریں۔ چند راتوں تک اکبر نقیب خاں کی مدد سے اس کے مضامین کو سمجھتا رہا اور اس کے مطالب کو فارسی میں لکھواتا رہا۔ تیسری رات بادشاہ نے مجھے بھی بلایا اور حکم دیا کہ میں نقیب خان کے ساتھ مل کر اس کا ترجمہ کرتا رہوں۔ تین چار مہینے کی مدت میں اس مجموعۂ خرافات کے 18 فنون میں سے جن میں 18 ہزار عالم کا تذکرہ کیا گیا ہے صرف 2 فن لکھے جا سکے۔ نہ معلوم مجھ[63] سے کیا گناہ ہوا تھا کہ اس ترجمے سے پالا پڑا اور طرح طرح کے اعتراضات برداشت کرنے پڑے۔ اس کام میں مجھے سوائے طعن و تعریض کے کچھ نہیں ملا۔ بعد میں اس کے ایک حصے کو ملا شیری اور نقیب خان نے پورا کیا اور ایک حصے کی تنہا سلطان حاجی تھانیسری نے تکمیل کی۔ اس کے بعد شیخ فیضی نے اس کے دو فنون کی نظم و نثر مرتب کی۔ پھر حاجی مذکور نے 2 حصے اور لکھے اور پہلے جو فروگزاشتیں ہوئی تھیں ان کی تصحیح کر دی۔ اس طرح اس کتاب کے سو جز مکمل ہوگئے۔ بادشاہ کو اصل اور نقل کی مطابقت پر کچھ ایسا اصرار تھا کہ مکھی کا داغ بھی چھوٹنے نہ پائے۔

سلطان حاجی تھانیسری کو اس محنت و مشقت کا کیا صلہ ملا؟ کچھ عرصے بعد کسی بہانے سے اس کو بھکر کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ اب وہ اپنے شہر میں مقیم ہے۔ مہا بھارت کی

تعبیر و ترجمانی کرنے والے اکثر لوگ کورو اور پانڈو سے جا ملے ہیں جو باقی رہ گئے ہیں خدا ان کو نجات دے اور توبہ کی توفیق عطا کرے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ اس بارے میں معافی عطا فرمائے۔

اکبر نے اس ترجمے کا نام ''رزم نامہ'' رکھا۔ اس کے دو مصور نسخے تیار کرائے اور جب یہ تیار ہو گئے تو امراء کو حکم دیا گیا کہ وہ اس پر ہاتھ رکھ کر برکت حاصل کریں۔ ابو الفضل جس نے اس سے پہلے ''آیۃ الکرسی'' کی تفسیر لکھی تھی اس کفر نامے پر اس نے دو جز کا خطبہ لکھا۔

اس سال کے واقعات میں نے ایک خاص وجہ سے نہایت اجمال و اختصار کے ساتھ لکھے ہیں، اس لیے اگر واقعات کی ترتیب اور سنین کی تقدیم و تاخیر ہو گئی ہو تو قارئین اسے نظر انداز فرمادیں۔

تخت نشینی کا اٹھائیسواں سال

25 صفر 991ھ/1583ء کو نو روز ہوا اور جلوس اکبری کے اٹھائیسویں سال کا آغاز ہوا۔ حسب دستور سابق نمائشی دکان کی آرایش امراء میں تقسیم کر دی گئی اور جشن کی تقریبات منائی گئیں۔ شاہ فتح اللہ نے اپنی دکان کی بڑی اچھی آرایش کی تھی۔ اس میں وزن اٹھانے اور ایسے دوسرے آلات کی نمایش کی گئی تھی۔

اس سال بھی چند نئے احکام اختراع کیے گئے۔ اتوار کے دن نو روز کے اٹھارہویں دن اور اکبر کی ولادت کے مہینے آبان[64] کے تمام دنوں میں تمام حدود ممالک محروسہ میں جانوروں کے ذبیحے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ حکم بھی محض ہندوؤں کی خاطر نافذ کیا گیا تھا۔ جو شخص بھی ان دنوں ذبیحہ کرتا اسے جرمانے کی سزا دی جاتی تھی اور اس کا گھر بار تباہ کر دیا جاتا تھا۔ خود اکبر نے گوشت خوری سے اتنا پرہیز کیا کہ سال بھر میں چھے مہینے بلکہ اس سے بھی کم گوشت کھایا کرتا تھا۔ اس کا ارادہ یہ ہے کہ مطلقاً گوشت کھانا ترک کر دے۔

اکبر نے ہر روز چار مرتبہ صبح، دوپہر، شام اور نصف شب کو آفتاب کی پرستش شروع

کردی اور آفتاب کے ایک ہزار ایک ہندی ناموں کا وظیفہ پڑھنے لگا۔ یہ وظیفہ بڑے خشو و خضوع سے دو پہر میں پڑھا جاتا تھا۔اس وظیفے کے وقت دونوں کان پکڑ کر گھوما کرتا تھا اور کانوں پر دونوں ہاتھ توبہ کی طرح مارتا تھا۔ اس دوران وہ طرح طرح کی اور بہت سی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔

نوبت اور نقارہ ایک مرتبہ تو نصف رات کو اور ایک بار طلوع کے وقت بجانے کا حکم دیا گیا۔ مسجدیں اور خانقاہیں ہندوؤں کے فراش خانے اور چوکی خانے بن گئے اور وہاں بجائے جماعت کے جماع ہونے لگا اور "**حی علی**" کی جگہ "**یللاّ تللاّ**" ہونے لگی۔ جو قبرستان شہر میں تھے ان کو مسمار کر دینے کا حکم دیا گیا۔

اس جشن کے موقعے پر اکبر نے اپنی والدہ کو ایک لاکھ روپیہ نقد، چند ہاتھی، پوشاکیں، سونے کے برتن اور جڑاؤ زیور وغیرہ دیے۔ اس طرح اپنی پھوپھی گلبدن بیگم اور دوسری تمام بیگمات کو بھی انعامات دیے گئے اور عام حکم دیا گیا کہ ہر خاص و عام نذرانے پیش کرے۔

ٹانڈہ پر قبضہ

اسی سال اعظم خان اور دوسرے امراء نے ٹانڈہ پر قبضہ کر لیا۔ خالدی خان جباری، میرزا بیگ قاقشال، معصوم خاں کا ساتھ چھوڑ کر اعظم خاں کے پاس چلے آئے اور معصوم خاں بعض زمینداروں کی پناہ میں چلا گیا۔ بنگالہ کا سارا علاقہ سرکاری حدود میں آ گیا۔

بادشاہ نے دکن کے حکام کی تالیف قلب کے لیے اس سال گجرات کی حکومت اعتماد خاں کو تفویض کر دی۔ شاہ ابو تراب کو وہاں کا امین، خواجہ نظام الدین احمد کو میر بخشی، بادشاہ کے استاد مولانا عبد القادر کے بھائی ابو القاسم تبریزی کو دیوان کے عہدے پر مامور کیا گیا۔ گجرات کی جاگیروں پر امراء کی بڑی تعداد کو مقرر کیا گیا جن میں محمد حسین، میر ابو المظفر ولد اشرف خان، میر ہاشم، میر صالح داعی اور سید ابو اسحاق وغیرہ شامل تھے۔

شہباز خاں کو بادشاہ نے اس کی چند گستاخیوں کی وجہ سے قید کر دیا تھا۔ اس نے جو

سرکاری رقم موقع بے موقع صرف کی تھی اس کے حساب کتاب کا کام راجہ ٹوڈرمل کے سپرد کردیا تھا۔ اس سال ابو الفضل کی سفارش پر اسے معاف کر کے راجہ کے چنگل سے رہائی عطا کی اور 17 ربیع الثانی کو اسے بنگالہ پر مقرر کر کے رخصت کر دیا کہ وہاں جا کر تمام سرکار بنگالہ کو بادشاہی جاگیرداروں میں تقسیم کر دے اور عیسیٰ کے صوبے سے معصوم کابلی کو باہر کردے۔

شیخ فرید بخاری کی سفارت

اسی اثناء میں خبر ملی کہ خان اعظم نے شیخ فرید بخاری کو مصالحت کے لیے اڑیسہ کے حاکم قتلو افغان لوحانی کے پاس بھیجا تھا، قتلو نے شیخ فرید کی بزرگی کا خیال کر کے ان کا استقبال کیا۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو بہادر کورفرہ نے جو بنگالہ کا زمیندار اور قتلو کا بڑا فوجی افسر تھا، شیخ سے نہایت بے ادبی کے ساتھ ملاقات کی اور برابری سے بات کرنے لگا۔ شیخ نے اسے ایک زمیندار سمجھ کر کوئی اہمیت نہ دی۔ اس کے رویے پر شاہو ولد شیخ راجو بخاری سرہندی نے بھی بگڑ کر سخت طرز عمل اختیار کیا اور دوسرے بخاریوں نے بھی بڑی بے اعتدالی دکھائی۔ جس وقت شیخ فرید وہاں سے لوٹ رہے تھے اور قتلو شیخ کی خدمت میں تھا، بہادر نے لڑنے کا ارادہ کر کے ان کا راستہ روک لیا۔ اس جھڑپ میں شاہو اپنے ساتھیوں سمیت مارا گیا، شیخ فرید سلامتی کے ساتھ بچ کر نکل آئے۔

برہان الملک کی آمد

حاکم دکن مرتضیٰ نظام الملک کا بھائی برہان الملک وہاں سے بھاگ کر مالوہ میں قطب الدین خاں کے پاس آگیا تھا۔ اس سال رجب کے مہینے میں وہ حسب الحکم دارالخلافہ آیا اور باریاب ہوا۔ اس کی آمد سے قبل ایک آوارہ نامعلوم شخص دربار میں آیا تھا اور اس نے خودکو برہان الملک ظاہر کیا تھا۔ اسے بادشاہ نے اودھ میں جاگیر عطا کردی تھی، جب بھید کھل گیا تو وہ بھاگ کر جوگیوں کے پاس چھپ گیا تھا مگر ایک ہفتہ بعد وہ پکڑا گیا۔ اسے

قید خانے بھیج دیا گیا۔ بعد میں معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا؟

جوگیوں سے بادشاہ کی عقیدت

انہی دنوں بادشاہ نے شہر سے باہر ہند و اور مسلمان فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے دو سرائیں تعمیر کرائیں۔ ایک کا نام خیر پورہ، دوسرے کا دھرم پورہ رکھا گیا۔ ان کے انتظام پر شیخ ابو الفضل کے چند آدمی متعین تھے جو بادشاہی خرچ پر فقراء کو کھانا کھلاتے تھے۔ جوگیوں کی ٹولیاں بھی بہت آتی رہتی تھیں ان کے لیے ایک الگ سرائے بنوا کر اس کا نام جوگی پورہ رکھا گیا۔ اکبر راتوں میں اپنے چند خاص آدمیوں کے ساتھ ان جوگیوں کی صحبت میں جایا کرتا تھا اور ان سے مختلف جاہلانہ معلومات، اعتقادات، مراقبے، مشغلے، آسن، کیمیا، ہیمیا اور ایمیا جیسے عجیب وغریب علوم سیکھا کرتا تھا۔ اس نے کیمیا کے ذریعے خود سونا بھی بنایا اور اسے لوگوں کو دکھایا۔ جوگی ہر سال ایک مقررہ رات میں جسے وہ شیورات کہتے تھے ہر طرف آکر جمع ہوتے تھے۔ اس رات اکبر بڑے بڑے جوگیوں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا اور ان سے تگنی چوگنی عمر کی بشارت حاصل کرتا تھا۔ کچھ ان کی دعاؤں اور بعض دوسرے قرینوں سے اکبر کو اپنی طبی عمر کی پورا یقین ہوگیا تھا۔ بعض حکیموں نے بھی اس کی تائید کی اور کہا کہ عمر کی کمی کا تعلق دور قمری سے تھا اب جب کہ دور زحل شروع ہو چکا ہے جس میں ساری باتیں برعکس ہوں گی اور عمریں بھی طویل ہو جائیں گی، چنانچہ پچھلے لوگ ہزار ہزار سال کی عمر کے ہوتے تھے اور ہندی کتابوں میں آدمیوں کی عمر دس دس ہزار لکھی گئی ہے۔ اب بھی تبت کے پہاڑوں میں لاماؤں کی عمر جو چینیوں کے پیشوا اور زاہد وعابد ہوتے ہیں دو سو سال بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے اس لمبی عمر کی خاطر اکبر نے بھی ان جوگیوں کے طرح مباشرت اور کھانے پینے میں کمی کر دی۔ خاص طور سے گوشت ترک کر دیا اور اپنی تالو کے بال منڈوا ڈالے صرف اطراف کے بال رہنے دیے۔ وہم یہ تھا کہ کاملوں کی روح سر کے درمیان جو جسم کا دسواں منفذ ہے، نکلتی ہے اور اس وقت گرج کی طرح کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ آواز سعادت اور نجات کی علامت ہے۔ تاریخ کی رو سے یہ اس

بات کی نشانی ہے کہ روح کسی صاحب شوکت مقتدر بادشاہ کے بدن میں حلول کر گئی ہے۔

مہابلی اکبر کے درشن

بادشاہ نے اپنے مسلک کا نام ''توحید الٰہی'' رکھا اور اپنے خاص گروہ کے مریدوں کو جوگیوں کی اصطلاح میں ''چیلہ'' کا نام دیا۔ عام لوگ جن میں زیادہ تر رذیل اور مکار شامل تھے چونکہ بارگاہ شاہی میں نہیں جا سکتے تھے اس لیے وہ ہر صبح کو سورج پوجا کے وقت جھرو کے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک بادشاہ کا دیدار نہیں کر لیتے ان پر مسواک اور کھانا پینا حرام رہتا تھا۔ بادشاہ کے تقدس کا رفتہ رفتہ یہ رنگ جما کہ ہر رات ہندو، مسلمان، عورتیں اور مرد، تندرست اور بیمار اپنی حاجتیں پوری کرانے نیاز مندانہ حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ اس وقت ہر ایک کو حاضری کو عام اجازت ہوتی تھی۔ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو جاتا تھا اور جیسے ہی بادشاہ آفتاب کے ایک ہزار نام کا ورد کر کے پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتا، یہ لوگ سجدے میں گر پڑتے۔

اکبر پرمیشور کا اوتار

مکار اور چالاک برہمنوں نے خود اکبر کے ایک ہزار ایک نام ترتیب دے دے کر رام اور کشن کی طرح آپ بھی ایک اوتار ہیں اور پرمیشور نے آپ کی صورت میں داخل کیا ہے، اکبر نے یہ بھی باور کر لیا۔ پنڈت ہندستان کے قدیم علما کے ہندی دوہے نقل کر کے پیش کرتے رہتے تھے۔ ان کا مضمون یہ ہوتا تھا کہ ہندستان میں ایک بڑا بادشاہ پیدا ہوگا جو برہمنوں کا محافظ ہوگا، گائے کی حفاظت کرے گا اور ساری دنیا پر عدل و انصاف سے حکومت کرے گا۔ یہ ساری خرافات پرانے کاغذوں پر لکھ لکھ کر پیش کی جاتی تھیں۔ اکبر ان تمام باتوں پر اعتقاد لے آتا تھا۔ مختلف فرقوں میں سے جن کے سچے اعتقاد کا اکبر کو یقین ہو جاتا تھا ان کو وہ ''احدی'' کہا کرتا تھا اور یہ گمان تھا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو وقت پڑنے پر آگ اور خون کے سمندر میں بے جھجک داخل ہو جائیں گے۔

اسی سال اکبر نے فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں حنفیوں کے مسئلے کے مطابق ''دہ دردہ'' اور شافعیوں اور شیعوں کے ''قلتین'' کے مطابق پانی بھرواکر وزن کرایا۔ حوض کا پانی ان دونوں سے زیادہ نکلا۔ بادشاہ نے سنیوں اور شیعوں کے دو علیحدہ گروپ بنانے کا حکم دیا، جتنے ہندستانی تھے وہ سنیوں کے کیمپ میں ہوگئے اور جتنے عراقی تھے وہ شیعوں کی طرف چلے گئے۔ ایسے بہت سے جزوی واقعات پیش آتے رہتے تھے۔ میں ان کو نظر انداز کر کے اصل مضمون کو شروع کرتا ہوں۔

گجرات کی بغاوت

جب اعتماد خاں اپنے حسب مدعا گجرات کی حکومت پر مامور ہوکر سروہی پہنچا تو اس نے اس مقام کو سرتال سے علیحدہ کر کے رانا کے بھائی جگمال کے سپرد کردیا اور متعینہ امرا کو ساتھ لے کر 12 شعبان کو احمد آباد پہنچ گیا۔

شہاب الدین احمد خاں احمد آباد کا مستقل حاکم تھا اور گجرات کے سارے فتنہ وفساد کی اس نے بڑی خوبی سے روک تھام کر رکھی تھی وہ اپنے گھر سے نکل کر عثمان پورہ کے محلے میں جاکر ٹھہر گیا۔ اس کے ملازم سردار جو اس تبدیلی پر سخت ناراض تھے دوسرے مہم پسندوں کے ساتھ کاٹھیا واڑ کی طرف چلے گئے جہاں محمود گجراتی کا لڑکا مظفر شاہ دربار اکبری سے بھاگ کر اپنے نانیہال کے رشتے داروں کی پناہ میں اپنے دن کاٹ رہا تھا۔ بغاوت پسندوں نے وہاں جاکر اسے حصول بادشاہت پر آمادہ کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔ اعتماد خاں نے شہاب الدین احمد خاں سے بہت اصرار کیا کہ وہ اپنی جماعت کو دلاسا اور تسلی دے کر واپس بلا لے لیکن اس نے قبول نہ کیا اور کہا یہ لوگ ایک عرصۂ دراز سے اس دن کے منتظر تھے اور میرے قتل کے درپے ہوگئے تھے۔ اب ان کا معاملہ میرے قابو سے باہر ہے، اب تم یہاں کے حاکم ہو، تم جانو اور یہاں کے لوگ! یہ کہہ کر وہ احمد آباد سے 20 کوس پر قصبۂ کری میں چلا گیا۔

مظفر شاہ کی بغاوت

اعتماد خاں اور نظام الدین احمد کے ایک دو آدمی باغیوں کے پاس گئے اور انھیں بہت تسلی اور دلاسا دیا، لیکن کوئی اثر نہ ہوا۔ 27 شعبان کو مظفر کاٹھیاواڑیوں اور بکھیڑے کا لشکر لے کر احمد آباد سے 12 کوس پر دولقہ کے مقام پر آ پہنچا۔ اسی وقت اعتماد خاں اور نظام الدین احمد شہر چھوڑ کر شہاب الدین احمد خاں کو واپس لانے کے لیے کرّی کی طرف کوچ کر گئے اور اس کو اطمینان دلایا کہ بدستور سابق قدیم پرگنے اس کی جاگیر میں رہیں گے اس کے علاوہ اسے 2 لاکھ روپیہ نقد بھی دیا جائے گا۔ ان لوگوں نے جانے سے پہلے احمد آباد کو شیر خاں ولد اعتماد خاں اور میر محمد معصوم بھکّری کی تحویل میں دے دیا تھا کہ ہم کری سے واپس آ کر فوج کا ساز و سامان درست کریں گے۔

مظفر شاہ نے دوسرے دن پیش قدمی کی۔ احمد آباد سے 3 کوس پر سرکھیج کے مجاوروں نے گجرات کے بادشاہوں کے مزاروں کا نقشہ تیار کر کے شگون کے لیے اس کے سر پر سایہ کیا اور اسے سلطنت کی مبارک باد دی۔ اس کے لیے تو یہ مژدۂ غیب تھا۔ غرض وہ اسی دن دھاوا مار کر شہر میں داخل ہو گیا۔

شاہی امراء کی ابتری

انہی دنوں امیر کرّی سے راتوں رات یلغار کرتے ہوئے صبح کے وقت عثمان پورہ پہنچے۔ ان کے استقبال کے لیے مظفر اپنی فوج کو آراستہ کر کے آگے بڑھا اور احمد آباد کے ریگستانی ساحل پر مقابلے کے لیے صف آرائی کر لی۔ وہ تو میدان میں پہنچ کر دم خم دکھا رہا تھا اور یہاں یہ 2 بوڑھے امیر باغیوں میں تفرقہ پیدا کرنے، بھاگے ہوئے ملازموں کو تسلی دے کر واپس بلا لانے، قرض لینے، دستاویز و تمسک لکھنے اور نامہ و پیام کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ غرض ان کے روکے بغاوت کا یہ سیلاب رک نہ سکا اور جب پانی سے سر سے گزر گیا تو وہ دونوں بغیر لڑے ہی وہاں سے فرار ہو کر نہروالہ کے شہر پٹن میں جو احمد آباد سے 45 کوس پر ہے ایک ہی دن میں جا پہنچے۔ ان کے لشکر کا سارا ساز و سامان باغیوں نے لوٹ

لیا اور لشکریوں کے اہل و عیال اسیر ہو گئے۔ نظام الدین احمد کا لڑکا محمد شریف سارا مال و اسباب لٹوا کر محافظ سپاہیوں کے ہمراہ بہ مشکل باپ سے آ کر ملا۔

شیر خاں فولادی کی واپسی

ان بھاگے ہوئے امیروں نے فتح پور سے مدد کے لئے آنے والے امراء کے ساتھ پٹن کے قلعے کی مرمت کی اور اس میں قعلہ بند ہو کر بیٹھ گئے۔ مظفر نے اپنے معمولی سپاہیوں کو بھی بڑے بڑے خطاب عطا کیے اور جاگیروں کا امیدوار بنا کر ان کے عہدے بڑھا دیے، خدا کی قدرت کہ ملازمت شاہی میں اسے تیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا تھا، اب وہ تیس ہزار سپاہیوں کا مالک بن گیا۔ اس نے شیر خاں فولادی کو جو پہلے پٹن کا حاکم تھا اور اب سورت میں نہایت تنگدستی سے گزر بسر کر رہا تھا، بلا بھیجا اور 4 ہزار سوار دے کر اسے پٹن پر حملے کے لیے رخصت کیا۔

پٹن کے سرداروں نے شہباز خاں کے بھائی زین الدین کنبو کو قطب الدین محمد خاں کے پاس بھیجا کہ وہ اِس طرف سے اور پٹن والے اُس طرف سے احمد آباد پر حملہ کریں اور مظفر کو گھیر لیں۔ مظفر نے اس کاروائی سے پہلے ہی آگے بڑھ کر ایک بڑے لشکر کے ساتھ بڑودہ میں قطب الدین محمد خاں پر حملہ کر دیا اور سخت جنگ کر کے اسے شکست دی۔ قطب الدین محمد خان بھاگ کر بڑودہ کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ اس کے لشکر کے سردار اوز ملازم سارے مظفر سے جا کر مل گئے۔

اس واقعہ سے پہلے ہی شیر خاں 5000 سوار لے کر پٹن سے 15 کوس پر قصبہ میانہ کے علاقے میں پہنچ گیا اور شہاب الدین احمد خاں بڑے تذبذب کے بعد جالور کی طرف بھاگ گئے۔ پٹن میں صرف نظام الدین احمد رہ گئے۔ ان کے ساتھ جو سردار تھے ان سب کی جمعیت 2000 سواروں سے زائد نہیں تھی۔ فریقین میں گھمسان کی جنگ ہوئی، آخر نظام الدین احمد کو فتح نصیب ہوئی اور شیر خاں شکست کھا کر احمد آباد بھاگ گیا۔ نظام الدین احمد نے بڑے اصرار سے کہا کہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے اس وقت احمد آباد پر حملہ کر دینا

چاہیے، لیکن امراء نے قبول نہ کیا، حالانکہ ان کا مشورہ بالکل درست تھا کیوں کہ لشکریوں کو اس وقت تک قطب الدین محمد خان کی شکست کی خبر نہیں لگی تھی۔ اس جنگ میں امراء کے ہاتھ کافی مال غنیمت آیا۔ یہ لوگ کرتی جا کر ٹھہر گئے اور 12 دن تک وہاں لشکر کا انتظار کرتے رہے جو مال غنیمت لے کر پٹن گیا ہوا تھا۔

بڑودہ پر باغیوں کا قبضہ

اسی اثنا میں خبر ملی کہ مظفر نے بڑودہ کے قلعے کی پرانی دیوار کو توپ اندازی کر کے گرا دیا ہے اور قطب الدین محمد خاں نے زین الدین کو پناہ کا قول نامہ لینے کے لیے مظفر کے پاس بھیج دیا ہے۔ مظفر نے زین الدین کو تو اسی وقت قتل کرا دیا اور خواجہ محمد صالح، سابقہ صدر کو جو اعتماد خاں کے ساتھ مقرر کر آئے تھے ان کی بزرگی کا لحاظ کر کے حج پر جانے کی اجازت دے دی۔ قطب الدین محمد خاں امان پا کر جب قلعے سے باہر آیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ تسلیمات بجالایا تو مظفر نے ملاقات کے وقت اس کی بڑی تعظیم کی اور استقبال کر کے اسے مسند پر بٹھالیا، وہ اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ لیکن راج سپیلہ کے زمیندار نوارتی کے بہکانے سے آخر کار اسے قتل کرا دیا۔

پرواڑ سے مظفر نے بھڑوچ پر حملہ کیا اور اس قلعے کو بھی قطب الدین محمد خاں کی بیوی اور دوسرے رشتے داروں سے صلح کر کے چھین لیا۔ وہاں مظفر کو کھنبایت کا 14 لاکھ روپیہ جو عماد الدین کروڑی لے آیا تھا اور دوسرا بہت سا ساز و سامان مل گیا۔ قطب الدین خاں کا 10 کڑور سے زائد روپیہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا اور اس نے ایک بڑی فوج اکٹھی کر لی۔ حیرت کی بات ہے کہ قطب الدین خاں کا لڑکا نورنگ خاں اور دوسرے تمام مالوہ کے امیر قریب ہی ندربار اور سلطان پور میں تھے۔ نورنگ خاں نے آگے بڑھ کر اپنے ماں باپ کی کوئی خبر نہ لی۔ اس فتح سے مظفر کی دھاک بیٹھ گئی اور مغل، پٹھان اور گجراتی بے شمار اس کے لشکر میں جا کر شامل ہو گئے۔

مرزا خان کی کاروائی

جب نظام الدین کو اس کی خبر ملی تو وہ تمام سرداروں کو لے کر پٹن میں مذکورہ دونوں امیروں سے آکر ملے۔ یہ سب لوگ پٹن میں مرزا خان ولد بیرم خاں خانخاناں کا انتظار کرنے لگے جو دربار سے دوسرے امراء کے ساتھ جالور کے راستے پٹن آرہا تھا۔ مرزا خاں نے آنے کے بعد پٹن میں ایک دن پڑاؤ کیا اور آگے بڑھ کر سرگنج میں کیمپ لگا دیا۔ مظفر بھی بڑودہ سے لوٹ کر آیا اور بھڑوچ پر اپنے سالے نصیر کو اور چرکس رومی کو جو پہلے شاہی لشکر میں تھا مقرر کردیا اور شاہ بھیکن کے مزار کے علاقے میں پہنچ کر اپنی چھاؤنی قائم کردی۔ دوسرے دن دونوں فوجوں میں بڑا سخت مقابلہ ہوا۔ مظفر شکست کھا کر محمود آباد چلا گیا اور یہ لڑائی سید ہاشم بارہہ، خضر آقا وکیل اور مرزا خان نے جیت لی۔ اس جنگ میں بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ دشمن کے جو لوگ ہلاک ہوئے ان کا کوئی شمار نہیں تھا۔

میرزا خان نے فتح پور سے پہلے منت مانی تھی کہ اگر فتح نصیب ہوجائے تو میں اپنا سارا مال ومتاع اس کے شکرانے میں خیرات کردونگا۔ چنانچہ اس نے اپنا عہد پورا کرنے کے لیے ملازمین کو ہاتھی، گھوڑے، پوشاکیں اور سارے مال و اسباب کی قیمت مقرر کرنے کا حکم دیا تاکہ یہ رقم مساکین کو تقسیم کردی جائے۔ بددیانت ملازمین نے ہر چیز کی اس طرح گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی کہ محتاجوں کو چوتھائی بلکہ دسواں حصہ تک نہ مل سکا، بلکہ اچھی خاصی رقم ان بدبختوں نے اپنی عیاشیوں میں اڑادی۔

میرزا خاں کے اکثر ملازم قلقچی تھے، جیسے دولت خاں افغان لودی، ملا محمودی اور دوسرے امراء۔ ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم آپ کے ملازم بنے ہیں کوئی قصور تو نہیں کیا؟ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بادشاہی ملازمین کے سامنے اس طرح دبے دبے اور حقیر رہیں اور وہ مجلسوں میں ہم پر ہمیشہ اپنی برتری جتلاتے رہیں۔ تسلیم و تعظیم اور دوسرے درباری مراسم میں ان کو بھی ہمارے مساوی درجہ دیا جانا چاہئے۔ یہ بغیر سرپاؤں کی بات کرتے ہیں جو مرزا خان کو بُری معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے امراء اور سرداروں میں سے ہر ایک کے لیے بھاری پوشاکیں اور گھوڑے تیار کرائے اور تمام امرا کی فہرست تیار کرکے ایک بڑا

جشن منعقد کیا اور لباس خانے میں بیٹھ کر اجلاس کی تیاری کرنے لگا۔ نظام الدین احمد کی بہن کسی وقت بیرم خان خان خانان کے نکاح میں رہی تھیں۔ اس سابقہ رشتے کی بناء پر اس نے نظام الدین احمد کو بلا کر اس بارے میں مشورہ کیا۔ انھوں نے نصیحت کی کہ "یہ کم عقل اور کوتاہ اندیش تم کو بہکا رہے ہیں اگر بادشاہ کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تو وہ کیا خیال کریں گے۔ جہاں تک تسلیمات و کورنش کا معاملہ ہے، بھلا سوچو تو کہ شہاب الدین خاں مرتبے کے لحاظ سے پنج ہزار سواروں کا منصب دار تھا تمہاری تسلیمات بجالائے تو کیا زیب دے گا؟ خود پائندہ خاں مغول بھی اس بات سے صاف انکار کر دے گا اور ممکن ہے وہ کسی جہالت کا ثبوت دیں اور خواہ مخواہ بدمزگی پیدا ہو جائے۔" مرزا خان کو یہ رائے پسند آ گئی اور اس نے اپنا یہ ارادہ ترک کر دیا۔

مظفر شاہ کی شکست اور اس کا فرار ہونا

اس فتح کے تین دن بعد قلیچ خان اور مالوہ کے دوسرے امیر احمد آباد پہنچ گئے۔ وہاں معلوم ہوا کہ مظفر محمود آباد[65] سے جو دریائے مہندری کے کنارے ہے کھنبایت چلا گیا ہے اور بھاگی ہوئی فوج کے 2 ہزار سوار اس کے پاس جمع ہو گئے ہیں۔ میرزا خاں امراء کے ساتھ اس کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ مظفر بڑودہ اور پھر وہاں سے راج پپلہ اور نادوت کی طرف نکل گیا۔ میرزا خاں نے بڑودہ پہنچ کر کھنبایت پر ایک فوج روانہ کی جس نے مظفر کے سردار دولت نامی شخص کو شکست دے کر کھنبایت پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد مرزا خان نے نادوت کی طرف پیش قدمی کی اور قلیچ خاں اور دوسرے امیروں کو وسطی پہاڑی پر جہاں مظفر پناہ گزیں تھا حملہ کرنے کے لیے مامور کیا۔ یہ ساری لڑائیاں نظام الدین احمد کی بدولت جیتی گئیں۔ شاہی فوج ساز و سامان سے لدی رہتی تھی اس کے لیے تیزی سے نقل و حرکت کرنا دشوار رہتا تھا۔ نظام الدین احمد نے امراء کے حوصلے بڑھائے اور خود بھی اپنے عہدے سے بڑھ کر کارگزاری دکھائی۔ ان کی کوشش و استقامت تھی کہ مظفر کے ساتھ لشکر نے سرگنج کی پہلی سخت لڑائی جیت لی تھی اور اب مظفر ادھر ادھر مارا مارا پھرتا تھا۔

میرزا خاں احمد آباد کو لوٹ آیا اور مالوہ کے لشکر کو اس نے بھڑوچ کے قلعے کے محاصرے پر مقرر کر دیا۔ بھڑوچ پر مظفر کی طرف سے چرکس رومی حاکم تھا 7 ماہ بعد وہ مارا گیا اور مظفر کا سالا نصیر فرار ہو گیا۔

اکبر کی الہ آباد روانگی

اسی سال مرزا خاں اور مالوہ کے لشکر کو گجرات پر مقرر کرنے کے بعد بادشاہ نے بذریعہ کشتی الہ آباد کی سیر کا ارادہ کیا۔ الہ آباد قدیم شہر پیاگ[66] کی جگہ نیا آباد کیا گیا تھا۔ یہ شہر ہندوؤں کی قدیم پرستش گاہ ہے۔ وہاں بادشاہ نے قلعے کی بنیادیں بھی رکھوائی ہیں۔ جس دن بادشاہ رخصت ہونے والے تھے، مکہ معظمہ سے شیخ سلیم چشتی کے صاحبزادے شیخ بدرالدین کے انتقال کی خبر پہنچی کہ انھوں نے 7 دن کا روزہ رکھا ہوا تھا اور تیز دھوپ میں ننگے پیر طواف کر رہے تھے جس سے پیروں میں آبلے پڑ گئے اور تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے اور عین عید قربان کے دن 990 ھ میں اللہ کے راستے میں جان دے دی۔ بادشاہ نے شیخ کی خانقاہ کے خادم حاجی حسین کے ذریعے ان کی وفات کی اطلاع بھجوائی جس سے ان کے خاندان میں واویلا مچ گیا۔ اس خاندان کے یہ آخری بزرگ تھے۔ ان پر رشد و ہدایت کا یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

راجہ رام چند کی اطاعت

الہ آباد پہنچنے کے بعد بادشاہ نے وہاں 4 مہینے تک قیام فرمایا۔ یہاں سے زین خاں کوکہ اور بیربر کو جو پہلے رام چند بیتہ کا ملازم تھا، ایلچی بنا کر چورا گڑھ روانہ کیا۔ رام چند نے اطاعت قبول کر لی اور زین خاں کو بڑی خاطر داری کے ساتھ روک لیا، پھر اس کے ہمراہ فتح پور میں آکر اس نے دربار شاہی میں حاضری دی اور 120 قیمتی لعل و جواہر جن کی قیمت 50 ہزار روپے ہوتی تھی نذرانے میں دیے۔ اپنے بیٹے بابو کو خدمت شاہی میں چھوڑ کر کچھ عرصے بعد وطن لوٹنے کی اجازت حاصل کی۔ واپسی کے چند دن بعد ہی وہ فوت ہو گیا۔

رام چند نہایت خوش اخلاق اور فیاض راجہ تھا۔ اس کی مثال ملنی مشکل ہے اس کی بخششوں کا یہ عالم تھا کہ ایک کروڑ کا سونا ایک ہی دن میں میاں تان سین کلاونت کو عطا کر دیا۔ ہم ذکر کر آئے ہیں کہ اس نے ابراہیم سور کو بادشاہی کا کتنا کچھ ساز و سامان تیار کر کے دیا تھا۔ میاں تان سین تو اس کے پاس سے واپس ہونا نہیں چاہتا تھا۔ آخر جلال خاں قورچی بڑے وعدے وعید کر کے اسے اپنے ساتھ واپس لایا۔

انہی دنوں میں حاجی پور سے اعظم خاں حملہ کرتے ہوئے الہ آباد پہنچا، لیکن اپنے لشکر کو لانے کے لیے بہت جلد واپس چلا گیا۔ امرائے شاہی نے الہ آباد میں شاندار عمارتوں کی تعمیر کا بندوبست کیا اور یہ طے پا گیا کہ آیندہ اس شہر کو پایہ تخت بنایا جائے، نیا سکہ جاری کیا جائے اور اس کے لیے شریف سرمدی چوکی نویس نے سجع کا یہ شعر نکالا تھا:

ہمیشہ چون زر خورشید و ماہ رائج باد
بشرق و غرب جہان سکۂ الہ آباد

کسی دل جلے نے شریف سرمدی کے متعلق یہ شعر کہا تھا:

دو چوکی نویسندہ ہر دو کثیف
یکی نا نفیس و دگر نا شریف

انہی دنوں ملا الہداد امروہہ اور ملا شیری جو دو آبہ پنجاب کی صدارت کے عہدے پر مامور تھے، الہ آباد آکر دربار میں حاضر ہوئے۔ ملا شیری نے بادشاہ کی خوشامد میں ''ہزار شعاع'' کے عنوان سے آفتاب کی تعریف و توصیف میں ایک نظم پیش کی جو ہزار قطعات پر مشتمل تھی یہ بادشاہ کو بہت پسند آئی۔

بادشاہ کی فتح پور واپسی

اسی سال ماہ ذی الحجہ میں گجرات کی بغاوت کے تدارک کے لیے الہ آباد سے فتح پور واپسی ہوئی۔ اٹاوہ کے علاقے میں میرزا خاں کی فتح کی خبر پہنچ گئی۔ بادشاہ دار الخلافہ کو ماہ صفر 992ھ میں لوٹ کر آئے اور گجرات کے امیروں کے نام خوشنودی کے فرمان جاری کیے

گئے۔ میرزا خاں کو خان خاناں کا خطاب، گھوڑا، خلعت، مرصع خنجر، سرداری کے لوازمات اور سب سے بڑا 5 ہزاری کا منصب عطا کیا گیا۔ نظام الدین احمد نے اس مہم میں نمایاں کارنامے انجام دیے تھے اس لیے ان کو بھی گھوڑا، خلعت اور منصب میں ترقی دی گئی۔دوسرے امراء کے منصبوں میں بھی دس بیس اور دس تیس کا حسب مدارج اضافہ کیا گیا۔

رامائن کے ترجمہ کا حکم

اسی زمانے میں بادشاہ نے مجھے[67] ''رامائن'' کے ترجمے کا حکم دیا، جو تصنیف کے لحاظ سے مہا بھارت سے پہلے کی کتاب ہے۔ اس میں 25 ہزار اشلوک ہیں۔ ہر اشلوک 65 حروف کا ایک طویل فقرہ ہے۔ رامائن میں اودھ کے راجہ رام چندر جسے عام طور پر رام کہا جاتا ہے انہی کی داستان ہے۔ ہندو ان کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں کہ اللہ نے رام کی شکل میں حلول کیا تھا۔ اس داستان کا خلاصہ یہ ہے کہ لنکا کے جزیرے پر راون نامی 10 سروں والا ایک دیو حکومت کرتا تھا وہ رام کی بیوی سیتا کو اغوا کر کے لنکا لے گیا۔ رام نے اپنے بھائی لچھمن کے ساتھ اس جزیرے کا رخ کیا۔ بے شمار بندروں اور ریچھوں کا لشکر تیار کیا اور سمندر پر 4 کوس لمبا پل بندھوایا۔ بعض بندروں کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ وہ اس فاصلے کو ایک چھلانگ میں طے کر گئے اور بعض ایسے بندر تھے کہ سمندر پر چلتے ہوئے وہاں پہنچے۔غرض ایسی بہت سی باتیں اس میں درج ہیں۔ بہرحال رام چندر ایک بندر پر سوار ہو کر اس پل پر سے گزرا اور ایک ہفتے تک جنگ کر کے راون کو اس کے اہل وعیال کے ساتھ قتل کر دیا اور لنکا کو راون کے بھائی کے حوالے کر کے اپنے شہر واپس آگئے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ رام نے سارے ہندستان پر 10 ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ ہندوؤں کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ دنیا کافی قدیم ہے، ہمیشہ سے ہے اور کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا ہے جب انسان اس دنیا میں نہ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ رامائن کے یہ واقعات صحیح نہیں، محض افسانہ اور خیالی داستانیں ہیں جیسے شاہنامہ اور امیر حمزہ کی داستانیں جو درندوں اور جنوں کے اقتدار کے زمانے میں گزرا تھا۔

جنس کی تبدیلی کا واقعہ

ان دنوں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ فتح پور کے دیوان خانے میں ایک خاکروب کی بیوی پیش کی گئی کہ یہ مرد بن گئی ہے۔ رامائن کا ایک ترجمان بھی دفتر کتاب سے اٹھ کر اسے دیکھنے گیا اور واپس آکر اس نے بیان کیا کہ وہاں ایک عورت تھی جس نے شرم سے چہرہ چھپا رکھا تھا اور بات نہیں کر رہی تھی۔ حکیموں نے اس کی تائید و تصدیق میں دلائل پیش کیے اور بتلایا کہ ایسے واقعات بہت پیش آتے رہے ہیں۔ اسی سال ملا عالم کابلی جو نہایت شیریں گفتار عالم، خوش بیان اور باغ و بہار آدمی تھے، وفات پا گئے۔ ان کی تصنیف ''فواتح الولایت'' ہے ان کی تاریخ وفات ''اشعت طباع'' نکالی گئی۔

اکبر کی حکومت کا انتیسواں سال

اس سال 8 ربیع الاول 992 ھ کو حملہ آفتاب واقع ہوا اور نوروز جلالی کے دن جلوس شاہی اور نو روز سلطانی کا انتیسواں سال شروع ہوگیا۔ جشن نو روز بڑی دھوم دھام سے منایا گیا، دکانوں، مکانوں کی آرائش کی گئی، طرح طرح کی محفلیں منعقد ہوئیں، سامری کے گوسالے کی طرح کانسے کی گائے کا ایک ناقوس بنا کر بجایا گیا۔ غبارے جو فرنگیوں کی ایجاد ہیں اور جو کپڑے سے گیند کی شکل کے بنائے جاتے ہیں، چھوڑے گئے۔ اس مرتبہ دس دس آدمیوں کی ٹکڑی شاہی خدمت میں حاضر ہوئی تھی۔ یہ لوگ اکبر کی مریدی اختیار کر کے نئے دین میں داخل ہوتے تھے۔ شجرے کے بجائے اکبر اپنی تصویر اخلاص اور رشد وہدایت کی علامت کے طور پر عطا کرتا تھا۔ اکبر نے پگڑی پر جواہرات سے جڑا ایک سرپیچ باندھ رکھا تھا۔ فرامین میں سرنامے کے لیے ''اللہ اکبر'' کا کلمہ تجویز کیا گیا۔ اس سال جوا اور سود حلال کر دیے گئے، اس طرح اور دوسری ممنوعات بھی جائز قرار دے دی گئیں۔ اکبر نے دربار میں ایک جوا خانہ بھی بنوایا، جواریوں کو شاہی خزانے سے سود پر روپیہ قرض دیا جاتا تھا اس طرح بادشاہ کی دولت میں اضافے کی ایک صورت نکل آئی۔ 14 سال سے کم عمر لڑکی اور 16 سال سے کم عمر لڑکے کی شادی کی ممانعت کر دی گئی۔ حضور اکرم ﷺ اور حضرت

عائشہؓ کے جن کا کم عمری میں عقد ہوا تھا زفاف کے قصے وغیرہ سے اکبر نے صریحاً انکار کر دیا۔ پیغمبران اکرام سے خدا کی جناب میں جو لغزشیں ہوئیں مثلاً داؤد علیہ السلام اور اوریہ کا قصہ وغیرہ وہ سب اس مطلقاً انکار کے لیے اچھا خاصا بہانہ بن گئیں۔ اکبر جسے اپنا معتقد نہیں پاتا تھا اسے لائق قتل، مردود اور نابکار سمجھتا تھا۔ ایسے شخص کو فقیہہ اور دشمن سلطنت کا نام دیا جاتا تھا۔ لیکن جیسا کہ قاعدہ ہے ہر شخص کو وہی کاٹنا پڑتا ہے جو کچھ اس نے بویا ہوتا ہے۔ دوسرے مردود و نابکار کیا ہوتے خود حضرت سلامت سارے زمانے میں گمراہ اور کفر کے نام سے مشہور ہو گئے اور ان کے مرشد و مجتہد ابو الفضل کو ''ابو جہل'' کا لقب ملا۔ غرض دنیاوی سلطنت اب دین الٰہی کے زیر تسلط آ گئی اور اکبر اپنے دین کے معاملات کو امور سلطنت سے بھی زیادہ اہمیت دینے لگا۔ عزت و ناموس کی بربادی کے لیے نو روز کی دکانوں اور مینا بازار کو کبھی کبھی مردوں سے خالی کرا دیا جاتا تھا اور بیگمات، اہل حرم اور خاص و عام پردہ نشین عورتوں کو سیر و تفریح کے لیے بلایا جاتا تھا۔ اس میلے میں بادشاہ لوگوں کو روپیہ پیسہ انعام دیتے تھے باہر سے آنے والی عورتوں کے قضیے بھی طے کیے جاتے تھے اور لڑکیوں کے نکاح بھی کرائے جاتے تھے۔ بادشاہ نے نکاح کی قید کو بھی ختم کرا دینے کی بڑی کوشش کی، لیکن ہندو اس کے لیے راضی نہیں تھے اس لیے کچھ نہ کر سکا۔ اس زمانے میں ہندوؤں کا بڑا زور تھا، آدھا ملک ان کے قبضے میں تھا وہ فوج میں بھی 50 فی صد تھے۔ مغل اور ہندستانی امراء سے وہ کہیں زیادہ مقتدر اور با اختیار تھے، اس لیے نکاح کے معاملے میں ان کے سامنے اکبر کی کچھ نہ چلی۔ رہ گئیں دوسری قومیں تو ان کی کوئی حیثیت نہ رہی تھی۔ ان میں نہ غیرت تھی نہ اتفاق، اس لیے بادشاہ نے جس طرح چاہا انکو نچا کر رکھ دیا۔

انہی دنوں حسب وعدہ اعظم خاں حاجی پور سے یلغار کرتے ہوئے حاضر ہوا۔ مرزا سلیمان مکہ معظمہ سے لوٹ کر بدخشاں پر قبضہ کر چکا تھا۔ اس نے اور میرزا شاہرخ نے اوزبکوں سے جنگ کی اور شکست کھائی اور اب دونوں ہندستان میں پناہ لینے کے لیے آ رہے ہیں۔

ذی قعدہ کے اوائل میں نیلاب سے مان سنگھ کا عریضہ پہنچا کہ میرزا شاہرخ نیلاب کے کنارے آچکا ہے۔ اس نے میرزا کا استقبال کیا اور 6 ہزار روپیہ نقد، بہت سے کپڑے اور پانچ ہاتھی میرزا کی خدمت میں پیش کیے۔ بادشاہ کو اس کی خدمت گزاری بہت پسند آئی۔

شاہی امراء کا انتقال

اس سال چند امیروں کا انتقال ہوگیا۔ محمد باقی خاں جو ادہم خاں کا بھائی تھا، اس نے اپنی جاگیر کڑہ کتنکہ میں وفات پائی۔ غازی خاں بدخشی کو الہ آباد سے اودھ کی طرف بھیجا گیا تھا وہ اسی جگہ فوت ہوگیا۔ غازی خاں آخر عمر میں اس قدر کمزور ہوگیا تھا کہ چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اسے قالین پر بٹھا کر اجلاس میں لایا جاتا تھا۔ کسی نے اس پوچھا آپ کا کیا حال ہے؟ تو اس نے جواب دیا ''الحمد للہ حرص وطمع کے بل پر زندہ ہوں اور اپنے تمام لاؤ لشکر پر حکمران ہوں''۔ نوکروں پر برہم ہوکر یہ دعا کرتا تھا کہ ''خدا کرے تو بھی ہزاری منصب ہو جائے تا کہ تجھے میری قدر معلوم ہو''۔

ایک رات قلیج خاں کے گھر پر بہت سے لوگ افطار کی دعوت میں جمع تھے، غازی خاں سورۂ "انا فتحنا" کی تفسیر بیان کر رہا تھا میں نے کوئی اعتراض کیا۔ اس نے کچھ توجیہہ کر کے درشتی سے جواب دیا، میں نے کہا، ظاہر تو یہی ہو رہا ہے۔ اس پر وہ بہت برافروختہ ہوگیا، آخر آصف خاں نے بیچ بچاؤ کر کے صلح کرادی۔

جس دن الہ آباد سے کوچ ہوا تھا، راستے میں کافی دور تک میں اور غازی خاں علمی مذاکرہ اور مشائخین کے اقوال بیان کرتے رہے تھے۔ پھر ہم نے ایک دوسرے کو وداع کیا۔ غازی خاں سے بس یہ میری آخری ملاقات تھی۔

اسی سال سلطان خواجہ بھی فوت ہوگیا وہ اکبر کے مریدان خاص میں شامل تھا۔ اس کو ایک خاص وضع کی قبر میں دفن کرایا گیا تھا جس میں ایک جالی لگائی گئی تھی کہ ہر صبح کو سورج کی روشنی اس کے چہرے پر پڑتی رہے، کیوں کہ سورج گناہوں کو پاک کرنے والا ہے،

کہتے ہیں کے منہ کو آگ سے جھلسایا بھی گیا تھا۔

ملا احمد ٹھٹھہ بھی مرگیا۔ اس کی تاریخ ''سلطان الخوارج'' ہے جس میں ایک عدد کی کمی ہے۔

مرزا شاہرخ کی آمد

993ھ/1585ء کے آغاز میں جبکہ تیسویں سال جلوس کا اختتام تھا، میرزا شاہرخ اور راجہ بھگوان داس فتح پور کے قریب پہنچ گئے۔ اکبر نے شاہزادہ دانیال کو شیخ ابراہیم چشتی اور دوسرے امراء کے ساتھ استقبال کے لیے بھیجا یہ لوگ اسے بارگاہ میں لے کر آئے۔ بادشاہ نے مرزا کو ایک لاکھ روپیہ نقد، فراش خانے کا سامان، تین عراقی گھوڑے، پانچ ہاتھی، چند اونٹ، خچر اور ملازم عطا فرمائے۔

شاہزادہ سلیم کی شادی

انہی دنوں بادشاہ نے اپنے مقررہ طریقے پر شاہزادہ سلیم کو 16 سال کی عمر میں راجہ بھگونت داس کی لڑکی سے بیاہ دیا۔ خود بادشاہ سلامت کی سواری اس کے گھر پر گئی اور عقد قاضیوں اور شرفاء کی محفل میں منعقد ہوا۔ 2 کروڑ تنکہ مہر باندھا گیا اور ہندوؤں کی تمام رسمیں جیسے آگ جلانا وغیرہ انجام دی گئیں دلہن کے گھر سے دولت خانہ شاہی تک دلہن کی پالکی پر سے بادشاہ نے سونا نچھاور کرایا۔

راجہ بھگونت داس نے چند گھوڑے اور قسم قسم کے جڑاؤ سونے کے زیور، جواہرات، سونے چاندی کے برتن، طرح طرح کے بے حد وشمار کپڑے جہیز میں دیے شاہی امراء کو بھی اس نے ہر ایک کے حسب حال عراقی، ترکی اور عربی گھوڑے سنہری زین کس کر بطور ہدیہ پیش کیے۔

اکبر کی حکومت کا تیسواں سال

جمعرات کے دن 19 ربیع الاول 993ھ/1585ء کو بہار کے موسم کا آغاز ہوا۔ نوروز سلطانی

کے دن آ گئے۔ میرزا نظام الدین احمد نے جو سن وار ترتیب سے تاریخ لکھی ہے، اس نوروز کے متعلق لکھا ہے کہ "جلوس کا تیسواں سال شروع ہوگیا۔ حالانکہ جلوس کے دوسرے قرن کا آغاز 25 ربیع الاول 994ھ/1586ء میں بمقام اٹک بنارس میں ہوا تھا، اس صورت میں یہ تیسواں جلوس کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہاں میرزا سے بھول ہوگئی۔ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایام کبیسہ کی وجہ سے قمری کے ہر تین سال پر ایک مہینے کا فرق پڑ جاتا ہے اور ہر قرن پر شمسی اور قمری سنین میں ایک سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ میرے پاس چونکہ تقویم نہیں ہے، اس لیے میں نے مجبورا میرزا ہی کی پیروی کی ہے۔ اس کی ذمے داری میرزا پر ہی ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان دنوں میرزا گجرات میں تھے، شاہی لشکر میں نہیں تھے۔

غرض یہ کہ پُرانے رواج کے تحت نور وز کا جشن خوب دھوم دھام کے ساتھ منایا گیا۔ ہر روز بڑی بڑی ضیافتیں ہوئیں۔ مینابازار یعنی کہ نوروز کی دکانیں جو امراء لگایا کرتے تھے، ہر دکان دار نے بھاری بھاری نذرانے، سب طرح کے کھانے، عطر اور اہل طرب کے انعامات کا خرچ شاہی خزانے سے ادا کیا گیا۔ حسب الحکم پنج ہزاری سے لے کر احدی تک ہر چھوٹے بڑے نے پیش کش اور نذرانے خدمت میں پیش کیے۔ مجھ[68] حقیر نے بھی کہ میری حیثیت ذرۂ ناچیز سے بڑھ کر نہ تھی، لیکن ہزار بیگھہ زمین کی وجہ سے ہزاری سمجھا جاتا تھا یوسف علیہ السلام کو خریدنے والی بڑھیا کی طرح 40 روپے کی نذر دی جسے بادشاہ نے قبول فرمایا۔

اس جشن میں بڑے شاہزادے کو بارہ ہزاری کا منصب ملا۔ ان سب کو فراش خانہ، علَم و سراپردہ اور نقارے وغیرہ بھی عطا ہوئے۔

دکن پر حملے کی تیاریاں

اس سال کے شروع میں دکن میں متعینہ امیر میر مرتضیٰ اور خداوند خاں نے برار کے علاقے سے نظام الملک کے پایۂ تخت احمد نگر پر حملہ کیا تھا۔ انھیں نظام الملک کے وزیر صلابت خاں نے شکست دے دی تھی، وہ وہاں سے بھاگ کر برہانپور میں راجہ علی خان کے پاس

چلے گئے تھے۔ راجہ علی خان نے ان کے سارے ہاتھی، گھوڑے چھین لیے تھے، ان میں سے 150 ہاتھی اس نے اپنے لڑکے ابراہیم خاں کے ساتھ دربار میں بھجوادیے تھے۔ جشن نوروز کے موقعے پر خود راجہ خاں بقیہ گھوڑے لے کر دربار میں آیا اور اکبر کو دکن پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اس کی فرمایش پر بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو جسے بعد میں میر فتح اللہ کا نام دیا گیا، عضد اللہ کا خطاب عطا فرمایا اور 5 ہزار روپیہ، گھوڑا اور خلعت عطا کی اور ہندستان کا صدر کل بنا کر دکن کی مہم پر مقرر فرمایا۔ اس کے ساتھ خان اعظم، شہاب الدین احمد خاں اور دوسرے امراء بھی مقرر کیے گئے اس کے تقرر سے صدارت کا عہدہ اپنے پورے عروج پر پہنچ گیا۔ آخر یہ معاملہ اس حد تک پہنچا کہ شاہ فتح اللہ کو اس اقتدار کے باوجود کسی امام کو 5 بیگھہ زمین بھی دینے کا اختیار نہیں رہا تھا۔ البتہ وہ ساری کی ساری زمینیں واپس لے کر بحث ضرور کرتا رہتا تھا۔ مدد معاش کی جتنی زمینیں واپس لے لی گئی تھیں وہ ساری کی ساری تباہ ہوگئیں۔ نہ ائمہ اس سے مستفید ہو سکے نہ رعایا۔ اماموں اور معاش داروں پر جو مظالم ہوئے وہ ان تمام صدور کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے جن کے اب نام تک باقی نہیں رہے ہیں۔

ماہ رجب 993 ھ/1585ء میں کابل سے خبر آئی کہ مرزا سلیمان اوز بکوں سے شکست کھا کر بدخشاں سے میرزا محمد حکیم کے پاس کابل آگیا ہے اور اساآلو نامی ایک موضع کی جاگیر پر صبر شکر کر کے بیٹھ رہا تھا، پھر اس نے قبائل کو اکٹھا کر کے بدخشاں کی سرحد پر اوزبکوں سے مقابلہ کیا اور انھیں شکست دی، بہت سے اوزبک اس لڑائی میں مارے گئے۔ جو قیدی بن کر آئے ان کو میرزا نے خلعت و انعام دے کر رہا کر دیا اور اپنا ملک دوبارہ حاصل کر لیا۔

گجرات میں دوبارہ بغاوت

ماہ شعبان میں حسب الحکم شاہی، خان خاناں گجرات سے فتح پور آیا ہوا تھا۔ اس کے گجرات سے نکلتے ہی مظفر نے دوبارہ بغاوت کا پرچم بلند کر دیا۔ مظفر کو جونا گڑھ کے حاکم جام امین

خاں غوری سے بڑی شکایات تھیں اس کے ہاتھوں اس نے منھ کی کھائی تھی، اس لیے اس بار اس نے بڑھ کر جونا گڑھ کے قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلیچ خاں تو احمد آباد میں حفاظت و ناکہ بندی کے لیے ٹھہرا رہا اور مظفر کے بغاوت کو کچلنے کے لیے نظام الدین احمد گجرات کے امیروں کو ساتھ لے کر مقابلے پر پہنچے۔ مظفر شاہی لشکر سے مقابلے کی تاب نہ لاکر دریائے رَن کو پار کر کے کچھ میں چلا گیا۔ یہ دریا سمندر سے 10 کوس اور 30 کوس کے فاصلہ سے جیسلمیر کے ریگستان میں داخل ہوتا ہے اور اسی ریگزار میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔

اسی زمانے میں نظام الدین احمد نے گجرات سے میرے نام خط بھیجا تھا کہ ''خان خاناں نے یہاں سے جاتے ہوئے وعدہ کیا ہے کہ اس بار وہ بادشاہ سے اجازت لے کر تم کو اور ملا الہداد کو اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔ مناسب یہ ہے کہ تم حسب مراتب خان خاناں سے مل لو اور دربار سے رخصت لے کر یہاں آجاؤ۔ گجرات کی سیر نہایت دلچسپ رہے گی''۔

اس خط کے بموجب میں خان خاناں سے ملنا چاہتا تھا لیکن کوئی موقع نہ ملا، صرف ایک بار جب کہ میں[70] دولت خانہ شاہی سے متعلقہ کتب خانے میں جہاں ترجمے کے کام پر میں مامور تھا، جارہا تھا تو خان خاناں سے سر راہ ملاقات ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہی وہ بہت جلد گجرات کی جانب لوٹ گیا، پھر کابل کے قضیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے گجرات جانے کے لیے رخصت لینے کا موقع نہ ملا اور وہ ارادہ جسے میں نے اپنی نجات اور بہتری کا وسیلہ سمجھ رکھا تھا پورا نہ ہو سکا۔

خان خاناں فتح پور سے رخصت ہوکر جب سروہی سے 10 کوس پر پہنچا تو اس نے سروہی اور جالور پر قبضہ کر لینے کا ارادہ کر لیا۔ نظام الدین احمد بھی وہاں پہنچ گئے۔ سید قاسم بارہہ بھی اپنی ساری جمیعت کو لے کر استقبال کے لیے آگیا۔ خان خاناں کی فوجی کاروائی کی خبر سن کر سروہی کا راجہ بھاری پیش کش لے کر خدمت میں حاضر ہوا۔ غزنین خاں جالوری بھی اس مرتبہ ملاقات کے لیے لشکر میں حاضر ہو گیا تھا لیکن جس وقت خان خاناں

دربار کے ارادے سے کوچ کر رہا تھا تو اس سے کوئی خطا سرزد ہوگئی تھی اور اب اس کے باغی ہو جانے کا اندیشہ تھا اس لیے خان خانان نے اسے قید کر دیا اور اپنے ساتھ احمد آباد لے کر چلا گیا۔ جالور کی جاگیر اس سے لے کر اپنی فوج کو وہاں مقرر کر دیا۔

عشق کا انجام

سید محمود بارہہ کے پوتے سید جمال الدین کو جو چند سال پہلے شاہی طرب خانے کی ایک حسین طوائف تھی اور جس کا نام یمین تھا اور اب تو وہ چڑیل سے کم نہیں معلوم ہوتی ہے، عشق ہو گیا۔ اس عشق بازی کا بھانڈا پھوٹا تو وہ ڈر کر دربار سے پہاڑی علاقے میں جا چھپا اور وہاں اس نے اپنی ایک ٹولی بنالی اور وہ سرکاری علاقے میں لوٹ مار کرتا رہتا تھا۔ بعد میں وہ پہاڑی سے اپنے چچا سید قاسم کے پاس جا کر پناہ گزیں ہو گیا۔ خان خانان نے حسب فرمان اس کو سید قاسم کی جاگیر پٹن سے بلوا کر قید کر لیا، پھر اس کو اور غزنین خاں کو لاہور بھیج دیا گیا۔ غزنین خاں کی شادی میاں محمد وفا خزانچی مرحوم کی لڑکی سے ہوئی تھی بادشاہ نے اس کے سالے میاں فتح اللہ شربتی کا لحاظ کر کے اس معاف کر دیا اور وہ دوبارہ ملازمت شاہی سے وابستہ ہو گیا، لیکن سید جمال الدین عتاب سے نہ بچ سکا، اسے پھانسی پر چڑھا کر تیروں سے چھلنی چھلنی کر دیا گیا۔ عشق بازی کا روگ آخر اس کی جان لے کر ہی ٹلا۔

پیر روشن کی لوٹ مار

اٹک بنارس سے راجہ مان سنگھ اور خواجہ شمس الدین کا عریضہ پہنچا کہ کابل میں مرزا محمد حکیم سخت بیمار اور فراش ہے۔ پشاور سے فریدوں ایک قافلہ لے کر کابل کی طرف گیا تھا، جب وہ کوتل خیبر پہنچا تو وہاں اس کا مقابلہ روشن ملحد کے لڑکے سے ہو گیا۔ روشن ملحد اس علاقے میں عقل مند آدمی کے طور پر جانا جاتا تھا۔ اب تو وہ روشن نہیں بلکہ پیر تاریک کے نام سے مشہور ہے۔ فریدوں خیبر پر شکست کھا کر پشاور واپس چلا آیا۔ اتفاق سے جب وہ پشاور پہنچا تو وہاں کے

قلعے میں آگ لگ گئی اور سوداگروں کا ایک ہزار اونٹوں کا لدا ہوا مال جل گیا۔

اسی اثنا میں یہ خبر بھی ملی کہ عبد اللہ خاں اوزبک نے دوبارہ ایک بڑی فوج بھیج کر بدخشاں پر قبضہ کر لیا ہے اور مرزا سلیمان کو وہاں سے بے دخل کر کے اس کے سارے مال و اسباب پر قابض ہو گیا ہے۔ میرزا سلیمان اس کے مقابلے کی تاب نہ لا کر دوبارہ کابل لوٹ آیا ہے۔

مرزا محمد حکیم کا انتقال

اس کے ساتھ کابل سے ایک اور خبر آئی کہ میرزا محمد حکیم[71] کثرت شراب نوشی سے طرح طرح کے امراض میں گرفتار تھا، چنانچہ رعشے کے عارضے میں 12 شعبان 993 ھ/1585ء کو اس کا انتقال ہو گیا۔

بادشاہ کا کابل کا ارادہ

میرزا محمد حکیم کے انتقال کی خبر تیسری ماہ رمضان المبارک کی ملی تھی، بادشاہ کو کابل اور غزنی کی حفاظت کی بڑی فکر ہوئی۔ پہلے خیال تھا کہ یہ علاقہ میر زا محمد کے لڑکوں کے سپرد کر دیا جائے۔ لیکن امراء نے عرض کیا کہ مرزا کے لڑکے ابھی چھوٹے ہیں۔ وہ وہاں کا نظم و نسق سنبھال نہیں سکیں گے۔ اس لیے بادشاہ نے خود وہاں جانے کا عزم کیا۔ خان خاناں کے نام گجرات جلد پہنچ جانے کا فرمان صادر کیا گیا۔ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں دکن کی مہم کے لیے نامزد کیے جا چکے تھے۔ عضد اللہ کو حکم دیا گیا کہ وہ دکن کی مہم انتظامات کے لئے مالوہ اور رائے سین میں ان امراء کے پاس چلا جائے۔ ان انتظامات کے بعد بادشاہ نے پنجاب کی طرف کوچ کر دیا۔ شوال کا چاند دہلی میں دیکھا گیا۔ پانی پت پہنچے تو وہاں سے میر ابوالغیث بخاری کو لکھنؤ کے نواح میں جاگیر دے کر رخصت کر دیا۔ اس ماہ کی 19 تاریخ کو ستلج کے کنارے کیمپ لگایا گیا۔

انہی دنوں شیخ جمال بختیار اور شیخ الاسلام کا پوتا خواجہ اسماعیل جو نہایت حسین اور

خوبرو شخص تھا اور عیاشی کی کثرت کی وجہ سے بیمار تھا۔ ایک ہفتے کے فرق سے یہ دونوں انتقال کر گئے۔ ایک کی وفات لدھیانہ میں ہوئی اور دوسرے کی تھانیسر میں۔ خواجہ اسماعیل کی وفات کی تاریخ ہے:

''رفت زیبا گلی زباغ جہان''

سیالکوٹ سے 3 کوس کی مسافرت پر ملاالہداد امروہہ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے سینے پر ایک داغ پڑ گیا تھا اور اسکی تپش دل تک پہنچ گئی تھی۔ اسے حکیم حسن نے ایک مسہل دیا تھا، اسی دن وہ فوت ہو گیا۔ بڑا اچھا دوست تھا جو بچھڑ گیا۔

لاہور کے علاقے میں جب قیام ہوا تو صادق خان کو بھکر کی حکومت پر مقرر کیا گیا تھا۔ 13 ذیقعدہ کو لشکر چناب کے کنارے پہنچ گیا۔ میر ابوالغیث اور شیخ محمد بخاری کا مصاحب شیخ عبد الرحیم لکھنوی خان زمان کے زوال کے بعد دربار میں آ گیا تھا اور امارت کے منصب پر فائز تھا۔ اسے بادشاہ نے پہاڑی علاقے میں پرگنہ پٹھان کی جاگیر عطا کی تھی۔ ان دنوں جنون کے عارضے میں مبتلا تھا۔ چناب کے قیام کے دوران اس نے حکیم ابوالفتح کے خیمے میں اپنے آپ خنجر مار لیا۔ اکبر نے اپنے ہاتھ سے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے سیالکوٹ میں بہ حفاظت رکھنے کا حکم دیا۔ کچھ عرصے بعد وہ صحت یاب ہو گیا، لیکن دیوانگی اسی طرح باقی رہی۔ اسی ماہ کی 27 تاریخ کو بہت دریا کو پار کیا اور اسی جگہ محمد علی خزانچی جو کابل میں مقرر تھا خدمت میں حاضر ہوا اور اطلاع دی کہ میرزا محمد حکیم کی وفات کے بعد اس کے لڑکے فریدوں خاں، کیقباد اور افراسیاب جو کم عمری کے سبب سلطنت کی اہلیت نہیں رکھتے تھے، امراء کے ساتھ مان سنگھ کے پاس پہنچا دیے گئے تھے۔ مان سنگھ نے اپنے لڑکے کو خواجہ شمس الدین خوافی کے ہمراہ کابل میں چھوڑ دیا ہے اور میرزا کے تمام آدمیوں کو تسلی و اطمینان دے کر اپنے ساتھ بارگاہ میں لے آیا ہے۔

5 ذی الحجہ کو قصبہ پنڈی[72] میں جو اٹک بنارس اور رہتاس کے درمیان ہے، قیام ہوا۔ یہاں مان سنگھ میرزا کے لڑکوں اور ملازمین کو اپنے ہمراہ لے کر حاضر ہو گیا۔ بادشاہ ان سب کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آئے اور لائق حال امداد اور خرچ عطا کیا۔

اٹک بنارس کے علاقے سے شاہرخ میرزا راجہ بھگونت داس اور شاہ قلی خاں محرم کو پانچ ہزار سواروں کے ساتھ کشمیر فتح کرنے کے لیے رخصت کیا گیا۔ اسی دن اسماعیل قلی خاں اور رائے سنگھ درباری کو بلوچوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے زین خانہ کوکہ کو ایک منظم فوج دے کر سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں پر فوجی کاروائی کے لیے روانہ کیا گیا۔

روشنیہ قبیلہ پر فوجی کارروائی

یکم محرم 994 ھ/1586 ء کو اٹک بنارس میں چھاؤنی لگائی گئی۔25 سال پہلے ایک ہندستانی سپاہی پٹھان قبیلوں میں چلا گیا تھا۔ اس نے وہاں پیر روشنائی کے نام سے بہت سے احمق پٹھانوں کو اپنا مرید بنا لیا تھا اور پٹھانوں میں الحاد و بے دینی پھیلاتا رہا تھا۔ ایک کتاب بھی ''خیر البیان'' کے نام سے لکھی تھی، جس میں مفسدانہ عقائد درج کر رکھے تھے، بعد میں انہی پٹھانوں میں اس کا انتقال ہو گیا تھا اس کا ایک لڑکا جلالہ نامی تھا جو چودہ سال کی عمر 989 ھ/1571 ء میں جب کہ بادشاہ سلامت کابل سے لوٹ رہے تھے، شاہی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور بادشاہ نے اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کیا تھا، لیکن اپنی موروثی بدقسمتی کے سبب وہ شاہی لشکر سے بھاگ گیا اور پھر پٹھانوں کے قبیلے میں شامل ہو کر ایک گروہ اکٹھا کر لیا اور لوٹ مار کرنے لگا۔ اس کے چھاپوں سے ہندستان اور کابل کا راستہ بالکل بند ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں پٹھانوں کے اس روشنائی فرقے نے کافی روز باندھ رکھا تھا۔ اس کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بادشاہ نے کابل مان سنگھ کی جاگیر میں دے دیا تا کہ وہ ان سرکشوں سے بخوبی نپٹ سکے۔

اس سال کے ماہ صفر میں سعید خاں کھوکر، بیر بر، شیخ فیضی اور فتح اللہ شربتی اور دوسرے چند امراء کو زین خاں کی مدد کے لیے روانہ کیا گیا۔ چند دن بعد ہی حکیم ابو الفتح اور امراء کی ایک جماعت کو پہلی کمک کے پیچھے ہی رخصت کیا گیا۔ یہ فوجیں زین خاں سے جا کر مل گئیں اور ان سبھی نے مل کر پٹھانوں پر سخت حملے کیے۔ ان کے علاقے پامال کر کے مردوں، عورتوں اور بچوں کی ایک بڑی تعداد کو قیدی بنا لیا۔

بیربر کی ہلاکت

ایک رات کسی شخص نے بیربر کو آکر اطلاع دی کہ ''پٹھان آج رات حملہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر تم اس تنگ گھاٹی کو جو تین چار کوس سے زیادہ نہیں ہے، جلد طے کر کے نکل جاؤ تو خطرے سے باہر ہو جاؤ گے''۔ اس وقت شام ہونے ہی والی تھی، بیر بر نے اپنی خود سری اور خود پسندی کی وجہ سے زین خاں سے کوئی مشورہ نہ کیا اور بے وقت وہاں سے کوچ کر دیا۔ سارا لشکر اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب شام کو وہ ایک گھاٹی میں داخل ہو رہے تھے، تو پٹھانوں نے آس پاس کی پہاڑیوں سے پتھروں اور تیروں کی بارش کردی اس اندھیری گھاٹی میں راستے کی تنگی اور غاروں کی کثرت کی وجہ سے سارا لشکر پراگندہ ہو گیا کسی کو کسی کی خبر نہیں رہی اور پٹھانوں نے انھیں گھیر گھیر کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے میں 8 ہزار سے زیادہ آدمی مارے گئے۔ بیر بر جو جان بچانے کے لیے بھاگا بھاگا پھر رہا تھا، قتل کر دیا گیا۔ اس ہولناک رات کو بہت سے بادشاہی امیر اور سردار جیسے حسن خان پنی، خواجہ عرب بخشی، خان جہاں اور ملا شیری جیسے شاعر مارے گئے۔ پٹھانوں نے جنھیں قید کر لیا ان کا شمار اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس واقعہ کی تاریخ '' از خواجہ عرب حیف'' سے نکلتی ہے۔ اس میں ایک عدد کم پڑتا ہے۔

اس شکست کے بعد حکیم ابو الفتح اور زین خاں پہنچے۔ ان لوگوں نے بیربر جیسے مصاحب کو مخالفت کی بنا پر ہلاک کروادیا تھا اور ان کی یہ منافقت ثابت ہو چکی تھی اس لیے کچھ دن تک یہ لوگ عتاب میں رہے اور کورنش سے محروم کر دیئے گئے، بعد میں پھر ان کے منصب بحال ہو گئے بلکہ اس سے بڑے مدارج تک ترقی پائی۔

بیربر کا ماتم

اکبر کو کسی امیر کے مرنے کا اتنا رنج نہیں تھا، جتنا بیربر کی موت کا۔ نہایت حسرت سے کہتا تھا: ''افسوس اس کی لاش اس گھاٹی سے نہیں لائی جا سکتی کہ اسے چتا تو نصیب ہو جاتی۔ پھر یہ کہہ کر خود تسلی دیتا کہ وہ تمام پابندیوں سے آزاد مجرد شخص تھا، اسے پاک کرنے کے لیے

نیر اعظم کی تمازت کافی، ویسے بھی اسے پاکی کی ضرورت نہ تھی"۔

روشنائی قبیلہ کی شکست

پٹھانوں کی اٹک کی طرف پیش قدمی کی خبر گرم تھی، اس لیے بادشاہ نے دوسرے دن شاہزادہ سلطان مراد اور راجہ ٹوڈرمل کو سندھ ندی پار کر کے باغی پٹھانوں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کیا۔ بعد میں شاہزادے کو واپس بلا لیا۔ صرف راجہ کو یہ مہم سپرد کر دی گئی۔ اس نے اس پہاڑی علاقے میں کئی قلعے بنوائے۔

مان سنگھ روشنائی قبیلہ پر مقرر تھا۔ اس نے ان کے بہت سے آدمیوں کو ہلاک اور قید کر لیا۔ اس دوران عبد اللہ خان کا ایلچی میر قریشی اس کا خط لے کر وہاں پہنچا۔ اس کے ساتھ ہی بلخ کا حاکم نظر اوزبک بھی عبد اللہ خان سے بگڑ کر اپنے تین بچوں کے ساتھ پہنچ گیا۔ بادشاہ نے ان لوگوں کو لانے کے لیے شیخ فرید بخشی کو احدیوں کے ایک دستے کے ساتھ روانہ کیا۔ انھوں نے پہنچ کر آنے والوں کا کوتل خیبر پار کرا دیا۔ روشنائی قبیلے کے آدمیوں نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی لیکن شکست کھا کر بھاگ گئے۔

اکبر کے دور حکومت کا اکتیسواں سال

25 ربیع الاول 994 ھ/1586ء کو نو روز آ پہنچا اور تخت نشینی کا اکتیسواں سال[73] شروع ہو گیا۔ اس مرتبہ نو روز کا جشن اٹک کے بادشاہی دیوان خانے میں منایا گیا۔ میر قریش کو کورنش کی اجازت ملی۔ مان سنگھ بھی اس جشن میں شرکت کے لیے حاضر ہوا۔ شیخ فیضی نے مبارک بادی کا قصیدہ کہا جس کا مطلع ہے:

فرخندہ باد یا رب بر مملکت ستانی

ازمبدۂ خلافت آغاز قرن ثانی

واضح رہے کہ یہاں تخت نشینی کے پہلے سال کے تعین میں غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف پہلے بھی ہم اشارہ کر آئے ہیں۔ میرزا کے صاحبزادے محمد شریف نے اپنے باپ

کی وفات کے بعد "تاریخ نظامی" کے سنوں کی تنقیح کی ہے۔ اختلاف سنین کو رفع کرنے کے لیے اسے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

حاکم کشمیر سے صلح

میرزا شاہرخ راجا بھگوان داس اور شاہ قلی خاں محرم کشمیر میں کوتل پھولباس تک پہنچ چکے تھے۔ جب انھیں زین خاں کی شکست کی خبر ملی تو انھوں نے کشمیر کے حاکم یوسف خاں سے اس شرط پر کہ کشمیر کے زعفران زار کی سالانہ پیداوار اور سکۂ خالصہ اکبر شاہی سے منسوب رہے گا صلح کر لی اور وہاں اپنے کارندے مقرر کر کے سارا علاقہ حسب سابق یوسف خاں کو عطا کر دیا۔ یوسف خاں دربار شاہی میں حاضری کا بہت زیادہ خواہشمند تھا اس لیے یہ سب امیر اسے ہمراہ لے کر بارگاہ شاہی میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے اس صلح کو پسند نہ فرمایا اس لیے ان امیروں کو بڑی ہی شرمندگی ہوئی اور وہ منہ چھپائے بیٹھے رہے آخر نو روز کے دن سب کو بلا کر کورنش کی اجازت ملی۔

انہی دنوں عبد اللہ خاں اوزبک کا ایلچی اور مذکورہ سردار نظر بی اپنے بچوں کے ساتھ حاضر ہوا۔ نظر بی کو 4 لاکھ تنکہ جو عراق کے 500 تومان کے برابر ہے، عطا کیا گیا۔

اکبر کی لاہور واپسی

24 ربیع الثانی 994ھ/1556ء کو بادشاہ نے اٹک سے لاہور واپسی کا ارادہ کیا۔ دریائے بہت کے کنارے پٹھانوں کے مقابلے پر مان سنگھ کے بجائے اسماعیل قلی خاں کو اور کابل پر مان سنگھ کو مقرر کیا گیا۔ اسماعیل قلی خاں کی مدد کے لیے سید حامد بخاری کو راستے کی حفاظت و انتظام کے لیے پشاور میں مقرر کیا گیا۔ 17 جمادی الثانی کو لاہور میں آنے کی خوشی میں اجلاس ہوا۔ اسی وقت عرب بہادر کا سر جو بہرائچ میں حکیم ابو الفتح سے جنگ میں مارا گیا تھا، ملاحظہ شاہی میں پیش کیا گیا۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہادر طبعی موت مرا تھا۔ حکیم نے مردہ کا سر کٹوا کر بھجوا دیا تھا۔

شہزادہ سلیم کا عقد اور راجہ بھگوان داس کی خودکشی

19 رجب کو رائے سنگھ بھتہ کی لڑکی سے شہزادہ سلطان سلیم کا عقد کیا گیا تھا۔ شعبان کے اوائل میں محمد قاسم خاں میر بحر اور فتح خاں فیل بان فوجدار اور امراء کی ایک جماعت کشمیر کو فتح کرنے کے لیے مقرر کی گئی۔ اس سے پہلے یوسف خاں کشمیری کو جو راجہ بھگوان داس کے قول و قرار پر چلا آیا تھا۔ اکبر نے قید کر کے قتل کرا دینے کا ارادہ کر لیا۔ بادشاہ کے یہ تیور دیکھ کر راجہ بھگوان داس نے اپنے قول و قرار کی حمیت و غیرت میں آپنے آپ کو جمدہر مار لیا۔

یعقوب کشمیری کی بغاوت

یوسف خاں کا لڑکا یعقوب شاہی دربار کے مصاحبوں میں شامل تھا اور مظفر گجراتی کی طرح اس کا بھی 39، 40 روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر تھا۔ وہ کسی طرح بھاگ کر کشمیر واپس چلا گیا۔ چونکہ متعصب شیعہ تھا اس لیے وہاں کے سنی قاضی کو اپنے ہاتھ سے شہید کر دیا اور اپنے باپ کے امیروں اور افسروں کو ہموار کر کے کشمیر کی حکمرانی ہاتھ میں لے لی، کیوں کہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اس کا باپ قتل کرا دیا گیا ہے۔ جب بادشاہی فوج کوتل کتریل میں پہنچی تو یعقوب اس کے مقابلے پر ایک بھاری لشکر لے کر آیا اور پہاڑ کی گھاٹیوں کو اچھی طرح مستحکم کر کے لڑائی کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔

یعقوب ایک اوباش طبیعت آدمی تھا اور اپنے آدمیوں سے بدسلوکی کرتا رہتا تھا اس لیے اس کے ملازموں کی ایک جماعت ساتھ چھوڑ کر محمد قاسم خاں سے آ کر مل گئی اور کچھ لوگوں نے کشمیر کے حاکم نشین شہر سری نگر میں اس کے خلاف بغاوت کر دی۔ یعقوب نے پہلے گھر کے فتنے کا سد باب ضروری سمجھا اور وہاں سے لوٹ کر شہر کی طرف کوچ کر دیا۔ اس کے پیچھے شاہی فوجیں بغیر کسی رکاوٹ کے کشمیر میں داخل ہو گئیں اور سارا کشمیر شاہی قبضے میں آ گیا۔ یعقوب مقابلے کی تاب نہ لا کر فرار ہو گیا اور پہاڑی علاقے میں جا کر پناہ لے لی۔

یوسف اور یعقوب کا انجام

یعقوب نے دوبارہ لاؤ لشکر جمع کر کے قاسم خاں سے جنگ کی، لیکن اس مرتبہ بھی اسے شکست ہوئی۔ ایک مرتبہ اس نے شب خون بھی مارا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، اس جنگ میں میرزا دہ طے خاں مارا گیا۔ بادشاہی فوجوں نے یعقوب کو تنگ گھاٹیوں میں چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ گرفتاری کے ڈر سے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور نہایت عاجزی کے ساتھ قاسم خاں کے پاس حاضر ہوا اور اس کے ہمراہ خدمت شاہی میں حاضر ہوا۔ بعد میں بادشاہ نے اسے بہار میں مان سنگھ کے پاس جہاں اس کا باپ یوسف بھی قید میں تھا، بھیج دیا۔ دونوں باپ بیٹے عرصے تک قید میں رہے پھر مالیخولیا کے عارضے میں دونوں کا انتقال ہو گیا۔

19 رمضان کو بادشاہ نے میر قریش ایلچی کو حکیم ابوالفتح کے بھائی حکیم ہمام اور میر صدر جہاں مفتی ساکن بھاٹی کے ہمراہ قنوج سے عبد اللہ خاں کے باپ سکندر خاں کی عزاداری کے لیے ماوراء النہر کی طرف روانہ کیا۔ محمد علی خزانچی کے ہاتھ اس کے لیے ڈیڑھ لاکھ روپے ہندستان کے لیے تحائف وغیرہ بھی بھیجے۔

روشنائی قبیلے کی فوجی کارروائی

انہی دنو ں روشنائی قبیلے کے پٹھانوں نے 20 ہزار پیدل فوج اور پانچ ہزار سواروں کی جمعیت لے کر سید حامد بخاری جو گجرات کے سلاطین کے عہد کا ایک بہت بڑا امیر تھا، حملہ کر دیا۔ اس نے اپنی تھوڑی بہت جمعیت کے ساتھ پشاور میں ان سے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ اس حادثے پر روشنائی قبیلہ کی بغاوت کو کچلنے کے لیے دربار سے زین خان کوکہ، شاہ قلی خاں محرم اور شیخ فرید بخشی کو روانہ کیا گیا۔ مان سنگھ بھی کابل سے ایک بڑا لشکر لے کر آیا اور خیبر درۂ پر پٹھانوں سے سخت جنگ کر کے اس نے روشنائی قبیلے کو شکست دی اور وہیں ٹھہرا رہا۔ پٹھانوں نے دوسرے دن واپس آ کر پھر حملہ کیا اور چو طرفہ لڑائی لڑنے لگے، اس وقت مان سنگھ کا بھائی مادھو سنگھ جو اوھنّد کے تھانے پر اسماعیل قلی خاں کے ساتھ متعین

تھا، مدد کے لیے آ پہنچا۔ اس تازہ کمک کے آجانے کی وجہ سے پٹھان میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے اور ان کے تقریباً 2 ہزار آدمی مارے گئے۔

انہی دنوں بدخشاں میں میرزا سلیمان اوزبکوں سے برابر لڑتا رہا، کبھی ان کو شکست دی اور کبھی ان سے شکست کھائی، آخر عاجز ہو کر وہ کابل اور وہاں سے خیبر میں آکر مان سنگھ سے ملا اور وہاں سے ہندستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ مرزا سلیمان ماہ ربیع الاول 995ھ/ 1587ء کو لاہور میں شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

محمد زماں میرزا کا کارنامہ

شاہرخ میرزا کا لڑکا محمد زمان میرزا 12 سال کا تھا۔ جب اوزبکوں کے مقابلے میں اس کے باپ کو شکست ہوئی تو وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ عبد اللہ خاں نے اسے پیرو مرشد خواجہ کلاں بیگ نقشبندی جو خواجہ احرار کے پوتے تھے، کے سپرد کردیا تھا کہ اسے بھی دوسرے قیدیوں کے ساتھ قتل کرادیں۔ خواجہ صاحب نے اس لڑکے کے عوض ایک دوسرے واجب القتل قیدی کو قتل کرا کے اسے رہا کر دیا اور وہاں سے رخصت کر دیا۔ جس زمانے میں سلیمان میرزا دربار میں پہنچا تو وہ ماوراء النہر کے فقیروں کی ایک ٹولی کے ساتھ بھیس بدلے ہوئے شاہی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے انسے ایک ہزار اشرفی انعام عطا کیا۔ پھر وہ ہندستان سے حج کے لیے چلا گیا۔ وہاں سے دوبارہ اس نے بدخشاں کا رخ کیا اور ایک اچھی خاصی فوج فراہم کر کے اوزبکوں سے مردانہ وار کئی ایک لڑائیاں لڑیں اور انھیں شکست دے کر وہاں کے سارے پہاڑی علاقے پر قبضہ کر لیا اور دشمنوں کو اپنے موروثی ملک سے نکال دیا۔اس وقت بادشاہ نے لاہور سے 2 ہزار اشرفی اور بہت سی بندوقیں، تیر اور کمان سوغات میں میر طوفان احدی کے ذریعہ اس کے پاس بھجوائے تھے۔ چند سال تک وہ اوزبکوں سے برابر مقابلے کرتا رہا، آخر شکست کھا کر کابل چلا آیا۔ اس کا کیا انجام ہوا؟ یہ ہم انشاء اللہ آگے بیان کریں گے۔

اکبر تخت نشینی کا بتیسواں سال

11 ربیع الثانی 995ھ/1586ء کو نو روز ہوا اور جلوس شاہی کا بتیسواں اور بقول میرزا نظام الدین تینتیسواں سال شروع ہو گیا۔

نو روز کی تقریبات حسب سابق منائی گئیں اور از سر نو ضابطہ بندی عمل میں آئی۔ایک قانون یہ نافذ کیا گیا کہ لوگ ایک سے زیادہ نکاح نہ کریں بجز اس کے کہ عورت بانجھ نکلے، کیوں کہ خدا بھی ایک ہے اس لیے بیوی بھی ایک ہی ہونی چاہئے۔ جب عورت کی عمر کافی ہو جائے اور اس کو حیض آنا بند ہو جائے تو وہ شادی نہ کرے، اگر بیوہ عورتیں شادی کرنا چاہیں تو انھیں کوئی نہ روکے۔کم عمر ہندو لڑکی کو جس نے نکاح کے باوجود شوہر کا لطف نہ لیا ہو ستی نہ کیا جائے، بلکہ کسی ایسے ہندو سے جس کی عورت مر چکی ہو اس کا نکاح کر دیا جائے۔

جب بادشاہی مرید ایک دوسرے سے ملیں تو سلام کے بجائے ایک ''اللہ اکبر'' کہے اور دوسرا ''جل جلالہ'' کہہ کر جواب دے۔ ہندی مہینوں کا حساب 28 تاریخ سے لگایا جائے نہ کہ 13 تاریخ سے جسے راجا بکرماجیت نے رواج دیا تھا۔ ہندوؤں کے مشہور تہوار اسی حساب سے منائے جائیں،لیکن یہ تاریخ رائج نہ ہو سکی، اگر چہ اس سلسلے میں فتح پور سے اور 990ھ/1582ء میں گجرات اور بنگالہ سے فرامین صادر کیے جاتے رہے تھے۔

کم حیثیت لوگوں کو شہروں میں تحصیل علم سے روکنے کا حکم بھی نافذ ہوا، کیوں کہ بادشاہ کے خیال میں یہی لوگ پڑھ لکھ کر فتنہ و فساد مچایا کرتے ہیں۔

ایک نیا ضابطہ بنا کہ ہندوؤں کے معاملات کا فیصلہ مسلمانوں کا قاضی نہیں کرے گا بلکہ وہ اس غرض کے لیے کسی دانا برہمن کے پاس رجوع کریں گے۔ اگر حلف اٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو گرم گرم لوہا انکار کرنے والے کے ہاتھ پر رکھا جائے اگر ہاتھ جل جائے تو وہ جھوٹا ہوگا ورنہ سچا، یا یہ کہ وہ جلتے ہوئے تیل میں اپنا ہاتھ ڈال دے یا یہ کہ جتنی دیر میں ایک تیر پھینکا جائے اور اسے اٹھا کر واپس لایا جائے وہ شخص پانی میں غوطہ لگائے اور اس عرصہ میں سر باہر نہ نکالے اگر وہ اس سے پہلے ہی سر نکال لے تو مدعا علیہ کو مدعی کا

حق دے دیا جائے، ایک اور حکم دیا گیا کہ مردہ کو دفناتے وقت اس کا سر مشرق کی طرف اور پیر مغرب کی طرف رکھے جائیں، سونے کے لیے بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے۔

اسی سال بادشاہ نے جلال روشنائی کی بغاوت کو کچلنے کے لیے عبد المطلب خاں کو ایک فوج دے کر بنگش کی طرف بھیجا۔ اس نے جلال کو دوسرے پٹھان سرداروں سمیت شکست دی اور بہت سے آدمیوں کو قتل کرادیا۔ زین خاں کے لشکر کے جتنے آدمی پٹھانوں کی قید میں تھے ان کے عوض دو گنے، چوگنے مرد اور عورتوں کو گرفتار کرلیا گیا۔

سلطان خسرو کی پیدائش

995ھ/1587ء میں شہزادہ سلطان سلیم کے یہاں راجہ بھگوان داس کی لڑکی سے سلطان خسرو کی پیدائش ہوئی۔ بادشاہ نے اس خوشی میں بڑا جشن منعقد کیا۔

بیربر کے زندہ ہونے کی افواہ

اسی سال ہندوؤں نے بیر بر کے زندہ ہونے کی خبر اڑادی۔ ان لوگوں نے جب بادشاہ کو بیر بر کی جدائی میں بہت زیادہ رنجیدہ اور مضطرب دیکھا تو یہ شہرت کی کہ لوگ اس کو شمالی پہاڑی میں جوگیوں اور سنیا سیوں کے ساتھ دیکھ کر آئے ہیں۔ بادشاہ سلامت نے بھی یقین کرلیا کہ وہ چونکہ دنیا سے بیزار اور مجرد تھا۔ کوئی تعجب نہیں کہ اس نے سنیاس لے لیا ہو اور یوسف زئی پٹھانوں کے واقعہ کی شرمندگی کی وجہ سے یہاں آنا نہ چاہتا ہو۔ لوگ لاہور میں اس کے متعلق عجیب عجیب کہانیاں بیان کرتے تھے۔ بعد میں بادشاہ نے ایک احدی کو تحقیق حال کے لیے نگر کوٹ بھیجا۔ آخر معلوم ہوا کہ یہ سب خبریں بے بنیاد ہیں۔

کچھ عرصے بعد اس کی جاگیر کالنجر کے حکام نے دربار میں عریضہ بھجوایا کہ وہ کالنجر پہنچا ہوا ہے، یہاں کے ایک حجام نے تیل ملتے وقت جسم کی علامتیں دیکھ کر پہچان لیا اور وہ اسی حجام کے پاس چھپا ہوا ہے۔ بادشاہ نے اس کو بھجوانے کے لیے فرمان صادر کیا۔ وہاں کے کروڑی نے در اصل ایک مسافر کو بیر بر کا دھوکہ دینے کے لیے پکڑ رکھا تھا، راز کھل

جانے کے اندیشے سے اس نے اس غریب کو مروا ڈالا اور یہ لکھ بھیجا کہ بیر بر آیا ہوا تھا لیکن وہ فوت ہو گیا۔ اس نے اس حجام کو بھی دربار میں نہیں بھجوایا۔ اس خبر پر بادشاہ نے دوبارہ بیر بر کا ماتم کیا وہاں کے کروڑی اور دوسروں کو پکڑ کر بلوایا اور ان کو کچھ عرصے کے لیے قید میں ڈال دیا کہ آخر تم لوگوں نے پہلے ہی ہم کو اس کی آمد سے آگاہ کیوں نہ کیا؟ اس جرمانے میں کروڑی سے بادشاہ نے کافی روپیہ بھی وصول کر لیا۔

اسی سال صادق خاں نے ٹھٹھہ پر فوج کشی کر کے قلعہ سیوان کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کے حاکم میرزا جانی بیگ نے جو محمد باقی ترخان کا پوتا تھا اپنے بزرگوں کے دستور کے مطابق دربار شاہی میں ایلچیوں کے ساتھ بہت سے نفیس تحائف اور نذرانے بھجوائے۔ بادشاہ نے 25 ذی قعدہ 995ھ/1587ء کو ان ایلچیوں کے ہمراہ حکیم عین الملک کو میرزا جان کے پاس روانہ کیا اور وہ علاقہ اس کے لیے بحال کر کے صادق کے نام فرمان صادر کیا کہ وہ اس سے کوئی تعرض نہ کرے۔

اوائل ربیع الثانی میں زین خان کوکہ کو کابل کی حکومت پر مقرر کر کے مان سنگھ کو وہاں سے طلب کر لیا گیا۔ اسی مہینے کے آخر میں خان خاناں، مرزا خاں، عضد اللہ، علامت الزماں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کو ہمراہ لے کر حملہ کرتے ہوئے گجرات سے لاہور آیا اور 27 رجب کو بھکر سے صادق خاں حاضر ہوا۔

گجرات کے حالات کا اعادہ

گجرات میں مظفر اور خان خاناں کے درمیان جو حالات پیش آئے ان کا خلاصہ یہ ہے کہ مظفر دوسری شکست کے بعد ناڈوت سے چنپانیر کے راستے سورت کی طرف بھاگ گیا تھا اور قلعہ جوناگڑھ سے 15 کوس پر کونڈل کے مقام پر رُکا رہا۔ 3 ہزار سواروں کی فوج اس نے جمع کر لی اور امین خاں غوری جو سورت کا حاکم تھا، ایک لاکھ محمودی سکہ اور مرصع خنجر رشوت دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اسی قدر رقم اس نے جام کو بھی دی جو عرصے سے احمد آباد کی فتح کے خواب دیکھ رہا تھا۔ امین خاں تجربہ کار آدمی تھا اس نے اسے یہ جھانسا دیا کہ تم ستر

سال جام کے پاس چلو اور اسے لے کر آگے بڑھو، میں بھی بس تمہارے پیچھے آتا ہوں۔ جام نے بھی اس کے ساتھ چال چلی اور لشکر کی تیاری کا بہانہ کر کے پیچھے رہ گیا۔ مظفر احمد آباد سے 60 کوس پر ایک موضع میں امین خاں غوری اور جام کا انتظار کرنے لگا۔ خان خاناں کو جب خبر ملی تو اس نے نہایت تیز رفتاری سے کوچ کیا اور اپنی فوجیں لے کر اس کے سر پر آپہنچا۔ مظفر جب امین خان اور جام کی مدد سے مایوس ہو گیا تو ناچار حیران وسراسیمہ پہاڑی کی طرف بھاگ گیا اور سورت کے ایک شہر دوارکا میں جا کر پناہ لی۔ جام نے اپنے وکیل کو اور امین خاں نے اپنے لڑکے کو شاہ ابوتراب کے وسیلے سے خان خاناں کے پاس بھیجا اور جام کے آدمی خان خانان کو کوہستان میں لے کر گئے۔ وہاں اسے کافی مال غنیمت ہاتھ آیا۔

مظفر ایک ہزار مغل اور کاٹھیاواڑی سواروں کے ساتھ جو اس کے ننھیال کے رشتے دار ہوتے ہیں گجرات جا کر آشنیہ نامی ایک مقام پر پناہ گزیں ہو گیا۔ یہ جگہ دریائے سابرمتی کے کنارے ہے اور کٹے پھٹے کراروں پر واقع ہے۔ یہ سرکش کولیوں کی جائے پناہ ہے۔ خان خانان نے دور اندیشی سے کام لے کر پہلے ہی اس خطرناک مقام پر اپنے امراء کو مقرر کر رکھا تھا جب مظفر وہاں آیا تو ان امیروں نے سید قاسم بارہہ کی سرداری میں اس پر حملہ کر دیا، ایک سخت جنگ کے بعد مظفر کو شکست ہوئی اور اس کے ہاتھی اور چتر آفتابی، آفتاب پرستوں کے ہاتھ آگئے۔ اس کے رشتے دار مارے گئے اور وہ سورت کے علاقے کاٹھیاواڑ کو بھاگ گیا۔

خان خاناں جب بڑودہ واپس ہوا تو اس نے جام پر فوج سے حملہ کر دیا۔ جام نے بھی 8 ہزار سوار جمع کر لیے تھے۔ کہتے ہیں جام کے 2 ہزار آدمیوں نے کھانا نہ کھانے کی قسم کھائی تھی اور جان دینے کا حلف اٹھایا تھا۔ جب جام اپنی جمعیت کو لے کر مقابلے پر آیا اور دونوں فوجوں میں 8 کوس کا فاصلہ رہ گیا تو جام نے گھبرا کر اطاعت قبول کر لی اور اپنے لڑکے کو 3 ہاتھی، 18 کچھی گھوڑے جو عربی گھوڑے کے مشابہ ہوتے ہیں اور دوسرے تحائف دے کر خان خانان کی خدمت میں بھیجا۔ اس موقعے پر خان خانان حسب الحکم پہلی

مرتبہ گجرات سے فتح پور پہنچا تھا۔

اس کی غیر موجودگی میں مظفر نے کاٹھیوں اور دوسرے زمینداروں کی مدد لے کر قلعہ جو ناگڑھ کا محاصرہ کر لیا۔ اس وقت قلیچ خاں کے حسب ہدایت نظام الدین احمد اور سید قاسم بارہہ نے احمد آباد سے سورت کی طرف کوچ کیا، مظفران سے مقابلے کی تاب نہ لا کر گجرات بھاگ گیا۔ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

دکن پر حملہ اور پسپائی

جب خان خانان سروہی اور جالور کے راستے احمد آباد پہنچ گیا تو بادشاہ نے دکن پر حملے کے لیے عضد الدولہ کو میر مرتضٰی اور خداوند خاں حاکم برار، اعظم خاں اور شہاب الدین احمد خاں اور مالوہ کے تمام امراء کے ساتھ مامور کیا اور اس علاقے کے تمام جاگیر داروں کے نام فرمان صادر ہوا کہ اعظم خاں کی سرداری میں پہلے تو برار کا علاقہ دکن والوں کے ہاتھ سے چھین لیا جائے بعد میں سب مل کر احمد نگر پر حملہ کر دیں، چنانچہ یہ فوجیں حسب الحکم روانہ ہوئیں اور دکن کی سرحد پر بمقام ہندیہ کیمپ لگا دیا، لیکن یہاں ان امیروں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اعظم خاں کو شہاب الدین خان سے پرانی دشمنی تھی کیوں کہ اس کا باپ شہاب الدین احمد خاں کی فتنہ پردازی کی وجہ سے مارا گیا تھا اس لیے وہ اس کو اور عضد الدولہ کو مجلسوں میں تنگ کیا کرتا تھا اور حق استادی کے باوجود اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ اس کے اس طرز عمل سے شہاب الدین خاں رنجیدہ ہو کر اپنی جاگیر رائے سین کو لوٹ گیا۔ اعظم خاں نے اس پر حملہ کر دیا۔ خواجہ فتح اللہ بخشی اور دوسرے نو دولتیے سردار اس فتنے کو خوب ہوا دے رہے تھے لیکن عضد الدولہ نے دوڑ دھوپ کر کے اس قصّے کو رفع دفع کرا دیا۔

شاہی لشکر کے اسی باہمی نفاق کی وجہ اسیر اور برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کو اچھا موقع مل گیا اور وہ دکنی لشکر کو اپنے ساتھ لے کر مقابلے پر آ گیا۔ شاہی لشکر مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا، اس لیے عضد الدولہ، راجہ علی خاں کے پاس گیا اور بڑی کوشش کی کہ وہ مقابلے کا ارادہ ترک کر دے لیکن راجہ علی خاں واپس جانے پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ یہ

صورت حال دیکھ کر عضد الدولہ وہاں سے نکل کر گجرات آگیا اور خان خاناں کو دکن پر حملہ کرنے کی ترغیب دینے لگا۔

راجہ علی خاں کے مقابلے میں اعظم خاں تنہا رہ گیا تھا۔ اس لیے وہ مقابلے کی تاب نہ لاکر برار کی طرف بھاگ گیا۔ وہاں بھی اس کے قدم ٹک نہ سکے۔ وہاں سے وہ ایلچ پور چلا گیا اور اس کو بُری طرح لوٹا۔ دکنی فوجیں اس کے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں اس لیے وہ ایلچ پور سے بندر بار چلا گیا اور وہاں سے لشکر کے چند آدمیوں کے ساتھ اپنے بہنوئی خان خانان سے مدد لینے کے لیے احمد آباد پہنچا۔

خان خانان نے اس کا استقبال کیا۔ ان کی ملاقات محمود آباد میں نظام الدین احمد کے گھر پر ہوئی۔ اعظم خاں اپنی بہن سے ملنے کے لیے خان خاناں کے ساتھ احمد آباد چلا گیا۔ نظام الدین احمد کو اس علاقے میں متعینہ امیروں کے ساتھ بڑودہ کی طرف بھیجا گیا اور ان کے پیچھے یہ دونوں سردار بھی احمد آباد سے روانہ ہوگئے۔ اعظم خان تیز رفتاری سے کوچ کرتا ہوا بندر بار اپنے لشکر میں پہنچ گیا اور خان خاناں بھڑوچ جا پہنچا۔ اس کے بعد اعظم خاں نے اس کو لکھا کہ بارش کا موسم آچکا ہے۔ اس لیے دکن کی مہم کو اس سال ملتوی کردینا چاہیے۔ چنانچہ خان خاناں بھڑوچ سے احمد آباد کو لوٹ گیا اور اعظم خاں ندر بار مالوہ چلا گیا اور راجہ علی خاں دکنی فوجوں کو لے کر اپنے وطن واپس ہوگیا۔

اس واقعہ کے 5 ماہ بعد اٹک بنارس میں جسے اٹک کٹک بھی کہتے ہیں خان خاناں کی عرضی پہنچی کہ حضور والا بدخشاں پر فوجی کارروائی کا مصمم ارادہ کیے ہوئے ہیں، میری خواہش ہے کہ میں بھی اس سفر میں ہمرکاب رہوں۔ جب اٹک سے لاہور لشکر پہنچ گیا تو اس کے نام فرمان گیا کہ قلیچ خاں اور نظام الدین احمد تو گجرات میں رہیں اور خان خاناں بارگاہ میں حاضر ہوجائے۔ خانخاناں کے دوبارہ لاہور حاضر ہونے اور عضدالدولہ کو ساتھ لانے کا یہی سبب تھا۔

خان خاناں کی غیرحاضری میں گجرات میں نظام الدین احمد نے بڑے شاندار کارنامے انجام دیے جس کا ذکر انھوں نے تفصیل سے تاریخ نظامی میں بھی کیا ہے۔

میر ابوالغیث بخاری کی وفات

اسی سال میر ابو الغیث بخاری جن کی تعریف حد سے زیادہ ہے، لکھنؤ میں قولنج کے مرض میں انتقال فرما گئے۔ ان کی میت دہلی لاکر خاندانی مقبرے میں دفن کی گئی۔ ان کی تاریخ وفات ''میر سترده سیر'' سے نکلتی ہے۔ میں[74] نے ان کی شان میں حسب ذیل مرثیہ کہا تھا:

بگو رستان او رو زی عبوری کردم ازعبرت   جہانی دیدم از آ سو دگان یکسر بہ میدانش
ازین سو رفتہ انبوہی وز آنسو نامده یک کس   کہ از وی حال پرسم یانشان باشد از ایشانش
دران شہرخموشان از زبان دانان من جمعی   زشارستان گیتی رفتہ و گردیده مہمانش
ازان جملہ امیری پاک طینت بو ترابی آئین   ابو الغیث آنکہ گردون غوث خواند قطب گیہانش
زہی شائستہ سیرت سیدی فرخنده طلعت ہم   کہ خلق مصطفیٰ بودی عیان دررو‌ئی خندانش
بخارائی کہ دہلی قبۃ الاسلام بود از وی   چہ شد آن قبہ وآن اسلام و یارب کومسلمانش
چو درویش سپاہی بود خاک پایش اریابم   کشم درچشم بخت خویش چون کحل صفا ہانش
ببالینش زقندیل دل خود سو ختم شمعی   اگرچہ مشعل ربانی آمد نورایمانش

بساط مرقد او ساختم نمناک ازاشکی
اگر چہ ابر رحمت مشت از باران غفرانش

عربی علوم پر پابندی

اسی سال حکم نافذ ہوا کہ لوگ علوم عربیہ کو پڑھنا ترک کردیں اور نجوم، حساب، طب اور فلسفے کے علاوہ کچھ اور پڑھا نہ جائے۔ اس حکم کی تاریخ نفاذ ''کساد فضل'' سے نکلتی ہے۔

اسی سال ماہ شعبان میں مان سنگھ دربار میں حاضر ہوا۔ خبر پہنچی کہ عبد اللہ خاں نے ہرات کو فتح کرلیا ہے اور وہاں کے حاکم علی قلی خاں کو بے شمار ترکموں اور ہرات کے باشندگان کے ساتھ قتل کرادیا ہے اس کی تاریخ ''شکست ہری'' سے نکالی گئی۔

مان سنگھ کا بیبا کانہ جواب

محرم 996 ھ/1588ء میں مان سنگھ کو بہار، حاجی پور اور پٹنہ[75] علاقہ پر مقرر کیا گیا۔ عاشورہ کی رات مان سنگھ اور خان خاناں کو خلوت میں بادشاہ نے بلا کر دوستانہ انداز میں گفتگو کی اور اپنے دین کی ترغیب دینے کے لیے ان سے بطور آزمائش کچھ باتیں کیں۔ مان سنگھ نے بے جھجک جواب دیا اگر حضور کی مریدی سے مراد جاں نثاری ہے تو ہم تو اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے ہوئے خدمت میں حاضر ہیں، کسی اور طرح ہم کو آزمانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اگر اس کے علاوہ کچھ اور منشاء ہے اور اس کا تعلق دین اور مذہب سے ہے تو میں اعتقاداً ہندو ہوں، اگر حکم ہو تو مسلمان بن جاؤں۔ ان دو کے علاوہ میں کوئی اور تیسرا راستہ نہیں جانتا کہ وہ کون سا ہے؟ اس کے جواب پر اکبر نے اس معاملے کو اسی جگہ ختم کر دیا اور مان سنگھ بنگالہ کی جانب رخصت ہو گیا۔

تقرر اور تبادلے

انہی دنوں بادشاہ نے کشمیر کی حکومت پر میرزا یوسف خاں رضوی مشہدی کا تقرر کیا اور محمد قاسم خاں کو وہاں سے واپس بلا لیا۔

12 صفر 996 ھ/1588ء کو محمد صادق خاں کو یوسف زئی قبیلے کی بغاوت کو کچلنے کے لیے بجور کی طرف رخصت کیا اور سیالکوٹ وغیرہ جو مان سنگھ کی جاگیر میں تھا اسے عطا کر دیا۔ اسماعیل قلی خاں کو بجور سے بلا کر گجرات میں قلیچ خاں کی جگہ متعین کیا اور قلیچ خاں کو دربار میں بلا لیا گیا۔

ملا احمد کا قتل اور قصاص

اسی مہینے میرزا فولاد بیگ برلاس نے آدھی رات کے وقت ملا احمد رافضی کو جو اعلانیہ صحابہ پر تبرّا کرتا تھا کسی بہانے گھر سے باہر بلوایا اور اسے قتل کر دیا۔ اس کے قتل کی تاریخ ''زہی خنجر فولاد'' سے نکلتی ہے۔ ایک دوسری تاریخ ''خوک سقری'' ہے۔ میں[76] نے خود اس کتے

کو نزع کے وقت دیکھا تھا، خدا پناہ میں رکھے اس کی شکل بالکل سور جیسی ہو گئی تھی۔ یہ صرف میں[77] نے نہیں بلکہ دوسروں نے بھی اسی طرح دیکھا تھا۔ اس کے قصاص میں مرزا فولاد کو ہاتھی کے پیر سے بندھوا کر لاہور میں گھسیٹا گیا اور وہ شہید ہو گیا۔ اکبر نے حکیم ابوالفتح کو بھیج کر اس سے پوچھا تھا کہ ''تو نے مذہبی تعصب کی وجہ سے ملا احمد کو قتل کیا ہے'' ؟ اس نے جواب دیا ''اگر تعصب ہوتا تو اس کے بجائے میں اس سے کسی اور بڑے کو قتل کرتا''۔ حکیم نے یہی جملہ جا کر بادشاہ کو سنایا اکبر نے کہا ''یہ تو بڑا حرام زادہ ہے اس کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہیے''۔ اس لیے اس کو موت کی سزا دی گئی، ویسے بادشاہ اس کی بہادری اور اہل حرم کی سفارش کی وجہ سے اس کو معاف ہی کر دینا چاہتے تھے۔ قاتل کو موت کی سزا مل گئی، لیکن مقتول کاری زخم کھا کر ابھی زندہ تھا، اپنے قاتل کی موت کے تین چار دن بعد وہ فوت ہوا۔ شیعوں نے اپنے مسلک کے دستور کی بنا پر اس کی مقعد میں ایک میخ ٹھونک کر دریا میں اسے غوطہ دیا۔ دفن کرنے کے بعد ابوالفضل اور فیضی نے اس کی قبر پر محافظوں کا پہرہ لگا دیا، اس کے باوجود لاہور والوں نے اس وقت جب کہ بادشاہ کشمیر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے اس کی قبر کھود ڈالی اور اس کی ناپاک لاش کو جلا دیا۔

حکومت کا چونتیسواں سال جلوس

22 ربیع الثانی 996ھ/1556ء کو نوروز منایا گیا اور جلوس کے 33 ویں یا 34 ویں سال کا آغاز ہوا۔ دربار عام میں جس کے 114 ایوان ہیں، بڑے نفیس کپڑے اور مصور پردے لٹکائے گئے، بڑی آرائش و زیبائش عمل میں آئی۔ اس سال بھی بہت سے خلاف شرع احکام نافذ کیے گئے۔ اس سال کی تاریخ ''شیوع معصیت'' سے نکلتی ہے۔

ٹوڈرمل پر قاتلانہ حملہ

انہی دنوں قلیج خاں گجرات سے آ کر حاضر ہوا اور بہت سے نذرانے پیش کیے۔ بادشاہ نے اسے حکم دیا کہ وہ ٹوڈرمل کے ساتھ شاہی دفتر میں ملکی اور مالی معاملات سرانجام دے۔ ان

دنوں ٹوڈرمل نہایت خوفزدہ اور بدحواس ہوگیا تھا کیونکہ ایک رات اس کے کسی دشمن نے جو گھات میں لگا ہوا تھا اس پر تلوار سے حملہ کیا تھا۔ اس حملہ سے راجہ زخمی ہوگیا تھا، لیکن زندگی تھی اس لیے بچ گیا۔

کمایوں کے راجہ کی دربارشاہی میں آمد

اسی سال کمایوں کا راجہ بادشاہ اکبر سے ملنے کے لیے سوالک کی پہاڑی سے آیا۔ اس سے پہلے وہ یا اس کے آباو اجداد میں سے کوئی کسی بادشاہ کی خدمت میں حاضرنہیں ہوئے تھے۔ اس نے لاہور میں حاضری کا شرف حاصل کیا اورقسم قسم کے تحائف اور نذرانے پیش کیے۔ ان میں کچھ تو گائے کی عجیب عجیب دمیں تھیں اور ایک مشکی ہرن بھی تھالیکن وہ گرمی کی وجہ سے راستہ ہی میں مرگیا تھا۔ میں[78] نے بھی اس مردہ ہرن کو دیکھا، بالکل لومڑی جیسا تھا۔اس کے دو چھوٹے دانت باہر نکلے ہوئے تھے اور سینگوں کی جگہ کچھ ابھار سا تھا۔ اس کا نچلا دھڑ لپٹا ہوا تھا، اس لیے اس کا پوراجسم دکھائی نہیں دیا۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ ان کے وطن میں پردار آدمی بھی ہوتے ہیں جو اڑتے ہیں اور آم کا ایک ایسا درخت بھی وہاں ہوتا ہے، جو سال بھر پھل دیتا ہے۔

انہی دنوں حکیم عین الملک بھی میرزا جان کے سفیروں کے ساتھ حاضر ہوا۔ طرح طرح کے نذرانے پیش کیے اور بادشاہ کی ہمدردی سے فیض یاب ہوا۔

رامائن کا ترجمہ

ماہ جمادی الاول 999 ھ/ 1591ء میں میں[79] نے رامائن کا ترجمہ مکمل کر کے پیش کیا یہ ترجمہ میں نے 4 سال میں ختم کیا تھا اور اس کے 2 نسخے مرتب کر دیے تھے۔ترجمہ کے آخر میں میں نے یہ شعر لکھا تھا:

ماقصہ نوشتیم بہ سلطان کہ رساند
جان سوختہ کردیم بہ جانان کہ رساند

بادشاہ کو یہ شعر بہت پسند آیا اور پوچھا ''یہ کتنے جز میں مکمل ہوا؟'' میں نے عرض کیا پہلی بار اختصار کے ساتھ تقریباً 70 جز میں اور دوسری مرتبہ تفصیل کے ساتھ 120 جز میں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس طرح مصنفوں کا دستور ہے اس کا دیباچہ لکھ دو''۔ دیباچے کی اتنی ضرورت نہ تھی پھر نعت کے بغیر اس کا خطبہ لکھنا پڑتا، اس لیے میں نے دیباچے کے معاملے کو ٹال دیا۔ اپنے اس سیاہ نامہ سے جو میرے نامۂ اعمال کی طرح داغدار ہے، خدا کی پناہ چاہتا ہوں لیکن ''نقل کفر کفر نیست''۔ پھر بھی مجھے ڈر ہے کہ یہ کتاب جو میں نے کراہتاً بادشاہ کے حکم سے مجبور ہو کر لکھی ہے میرے لیے لعنت بن جائے گی۔ اللہ ہی مجھے معاف کرے اور پناہ میں رکھے۔

مکار قلندر کا فریب

انہی دنوں شیخ کمال بیابانی نامی ایک قلندر کو دریائے راوی کے کنارے سے لوگ لے کر آئے کہ یہ عجب با کمال آدمی ہے کہ ساتھیوں سے باتیں کرتے کرتے پلک جھپکتے میں دریا کے دوسرے کنارے پر چلا جاتا ہے اور وہاں سے پکار کر کہتا ہے کہ اے فلاں اب تم اپنے گھر چلے جاؤ۔ بادشاہ اس کو خلوت میں دریا کے کنارے لے کر گئے اور اس سے کہا کہ ''ہم ایسی چیزوں کے بڑے مشتاق ہیں، اگر تم یہ کرامت ہم کو دکھلا دو تو ہمارا ملک و مال سب تمہارا ہوگا اور ہم تمہارے مرید بن جائیں گے''۔ وہ جواب میں نہ تو کچھ بولا اور نہ ہی کوئی حرکت کی۔ اسے گم سم دیکھ کر بادشاہ نے کہا'' ہم تجھے ہاتھ پیر باندھ کر قلعے پر سے دربار میں پھینک دیں گے اگر پانی سے صحیح سلامت نکل آیا تو کیا کہنے ورنہ تو اپنے آپ جہنم رسید ہو جائے گا''۔ اب تو وہ بڑا سکپکایا اور اپنے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا کہ میں یہ سارا ڈھونگ پیٹ کی دوزخ بھرنے کے لیے کرتا ہوں۔ اس نے یہ تدبیر کر رکھی تھی کہ اپنے لڑکے کو جو اس کا ہم شکل تھا دریا کے کنارے پر کھڑا کر دیتا تھا اور مغرب کے وقت کسی نہ کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے مقررہ مقام پر پہنچتا اور وضو کے بہانے وہاں کسی پہاڑ کی کھوہ میں چھپ جاتا۔ اس وقت اس کا بیٹا دوسرے کنارے سے اس کے ساتھی

کا نام لے کر آواز دیتا تھا کہ ''بس اب تم اپنے گھر لوٹ جاؤ''۔ بادشاہ نے اس کو بھکر میں بھیج دیا، وہاں بھی اس نے اپنی کرامتوں کا بڑا ڈھونگ کھڑا کر دیا۔ خانخاناں اور اس کا نائب دولت خاں بھی اس کے چکّر میں آ گئے۔ اس نے ان کو طرح طرح کے کرتب دکھائے اور ایک مرتبہ جمعہ کی رات کو بازی گروں کی طرح اپنے جسم کے عضو عضو کو الگ الگ کر کے دکھایا اور ان کرامتوں سے دولت خان افغان کو جو خان خاناں کا نفس ناطقہ اور وکیل کل تھا، اپنا معتقد اور مرید بنا لیا۔ خان خاناں نے بھی اس کی عقیدت میں دھوکا کھایا۔ اس چال باز نے ایک سونے کی گیند اپنے شیخ کے نام پر حاصل کر کے کہا کہ خضر علیہ السلام نے تمہارے نام دعا اور سلام کہلوایا ہے، پھر وہ اس گیند کو دریا میں لے کر گیا اور چھل اور مکاری سے خان خاناں کے سامنے اس کے بجائے کانسے کی ایک گیند دریائے سندھ میں ڈال دی اور سونے کی گیند اڑا لے گیا۔

رامائن کے ترجمے کا صلہ

انہی دنوں بادشاہ کو خیال آیا کہ رامائن کے ترجمے کا کچھ صلہ مجھے[80] دیا جائے، چنانچہ ایک دن شاہ فتح اللہ نے عضد الدولہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ ''فی الحال یہ شال عبدالقادر کو دے دو، گھوڑا اور خرچ بھی اسے عنایت کیا جائے گا۔'' بادشاہ نے شاہ فتح اللہ کو بساور کی جاگیر کی عطا کر دی اور وہاں کے اماموں کی آراضیات کے متعلق فرمایا کہ یہ سب تم کو بخش دی گئیں۔ پھر میرا نام لے کر کہا: ''یہ نوجوان بدایوں کا رہنے والا ہے۔ اس کی مدد معاش کو ہم کسی قصور کے بغیر دیدہ و دانستہ بساور سے منقطع کر کے بدایوں میں مقرر کیے دیتے ہیں''۔ شاہ فتح اللہ نے ایک ہزار روپے کی تھیلی حضور میں پیش کی کہ میرے کارندوں نے یہ رقم اماموں کی معاش سے بچا کر بھیجی ہے حالانکہ یہ رقم اس کے شقدار نے پرگنہ بساور کے ائمہ کی بیوہ عورتوں اور یتیموں پر ظلم و ستم کر کے وصول کی تھی۔ جب رقم پیش کی گئی تو بادشاہ نے خوش ہو کر اس سے کہا ''یہ تمہاری ہے، ہم تمہیں بخشتے ہیں''۔ اس معاملے کو 3 مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ شاہ فتح اللہ اس دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گیا۔

جب میری[81] مدد معاش کے متعلق نیا فرمان تیار ہوگیا تو میں ایک سال کی رخصت لے کر پہلے بیاور اور پھر وہاں سے بدایوں گیا۔ وہاں سے میرا ارادہ مرزا نظام الدین احمد سے ملنے اور سیر وتفریح کے لیے گجرات جانے کا تھا، لیکن کچھ ایسے موانعات پیش آئے کہ جا نہ سکا۔

کشمیر کے امراء کی وفات

اسی سن جلوس میں سید عبد اللہ خاں چوگان بیگی اور میرزادہ علی خاں جو صاحب اعتبار امیر تھے، کشمیر میں فوت ہو گئے۔ سید عبد اللہ خاں نے 12 ماہ ربیع الاول کو حضور اکرم ﷺ کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کھانا پکوایا اور فقیروں کو کھلایا اور گناہوں سے توبہ و استغفار کی۔ اسی دن وہ میرزا یوسف خاں کے ساتھ شکار پر گیا۔ شکار میں اسے بخار ہوگیا اور اسی میں جان دے دی۔ اس سے لگ بھگ ایک سال پہلے میرزادہ علی خاں اُسی رات کو جس رات یعقوب نے محمد قاسم خاں پر شب خون مارا تھا، لڑائی میں ہلاک ہوگیا تھا۔

کشمیر کی جانب اکبر کی روانگی

22 جمادی الثانی 997ھ/ 1589ء کو بادشاہ سلامت کشمیر کی سیر کے لیے، جسے بادشاہ نے ''باغ خاصہ'' کا نام دیا ہوا تھا کابل سے تشریف لے گئے۔ اہل حرم کو شاہزادہ سلطان مراد کے ساتھ بھٹنیر میں جہاں سے کشمیر کا پہاڑی راستہ شروع ہوتا تھا، چھوڑ دیا اور خود بطور یلغار آگے روانہ ہو گئے۔ اس حسین خطے کی سیر وتفریح میں کچھ عرصہ صرف کیا پھر شاہزادے کے نام فرمان آیا کہ وہ محل والوں کو رہتاس لے جا کر وہاں ہماری آمد کا انتظار کرے۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کی وفات

انہی دنوں ستمبر میں علامۂ عصر شاہ فتح اللہ شیرازی تپ محرقہ میں مبتلا ہوگیا۔ خود بھی حاذق طبیب تھا اس لیے اس نے بطور علاج ہریسہ کھانا شروع کر دیا۔ حکیم علی نے ہریسہ کھانے سے اسے بہت روکا بھی لیکن وہ نہ مانا۔ آخر کار موت اس کا گریبان پکڑ کر عالم بقا کی

طرف کھینچ لے گئی۔ شاہ فتح اللہ کو تخت سلیمان میں جو کشمیر کے ایک شہر سے متصل بڑا پہاڑ ہے، سید عبد اللہ خاں چوگان بیگ کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ ملک الشعراء شیخ فیضی نے اس کے مرثیے میں ایک ترکیب بند کہا تھا جس کے چند شعر مندرجہ ذیل ہیں:

درہنگام آن آمد کہ عالم از نظام افتد — جہانعقل را در نیم روز علم شام افتد
ہمہ گنجینۂ اقبال در دست لیام افتد — مہہ خونتابۂ ادبار در کاس کرام افتد
حقیقت گم کند سررشتۂ تحقیق مقصدرا — معانی از بیان ماند روابط از کلام افتد
زبان جہل جنبد بی محابا درسخن رانی — مطالب نا درست آید دلائل نا تمام افتد
دل مستکملان دہر در نقص ابد ماند — چو نا رس میوۂ تر شاخ ناگہ نیم خام افتد
گرامی امہات فضل را فرزند روحانی — ابو الآبائی معنی شاہ فتح اللہ شیرازی
دوصد بونصر رفت و بوعلی تا او پدید آید — بسی دارد قضا درتہ کان زین گونہ برازی
گہی با محمل مشائیاں گردزمین گردی — گہی با موکب اشرافیان کرد فلک تازی
مباہات از وجود کامل او بود دوران را — بدوران جلال الدین محمد اکبر غازی

شہنشاہ جہان را از وفاتش دیدہ پرنم شد
سکندر اشک حسرت ریخت کا فلاطون زعالم شد

حکیم ابوالفتح کا انتقال

27 رمضان المبارک کو بادشاہ کابل کی سیر کے لیے تشریف لے گئے۔ پکھلی کے راستے سے قلعہ اٹک کی طرف روانہ ہوئے۔ اسی موقع پر حکیم ابوالفتح بھی دمتوڑ کے مقام پر فوت ہو گیا جسے حسن ابدال میں دفن کیا گیا۔ اس کی تاریخ وفات ''خدایش سزادھاد'' سے نکلتی ہے۔

جب اٹک کے سامنے خیمہ شاہی لگا ہوا تھا، شاہزادہ اہل محل کو لے کر حاضر خدمت ہوا۔ اسی منزل سے شہباز خاں کو یوسف زئی قبیلے کے بقیہ پٹھانوں پر حملے کے لیے مامور کیا گیا۔

22 ذی قعدہ 997ھ/ 1589ء کو بادشاہ کی سواری کابل پہنچی۔ اس موقع پر حکیم ہمام اور صدر جہاں عبد اللہ خاں اوزبک کے پاس سے لوٹ کر آئے اور عبداللہ خان کے دوستانہ خطوط پیش کیے۔

ٹوڈرمل اور بھگوان داس کا انتقال

998ھ/ 1589ء میں راجہ ٹوڈرمل اور بھگوان داس امیر الامراء جو لاہور میں ٹھہرے ہوئے تھے، فوت ہوگئے۔ ان کی تاریخ ہے ''بگفتا ٹوڈرو بھگوان مردند'' کسی نے ایک تاریخ اور کہی ہے:

تو ڈرمل آنکہ ظلمش بگرفتہ بود عالم — چون رفت سوی دوزخ خلقی شدند خرم
تاریخ رفتنش را از پیر عقل جستم — خوش گفت پیر دانا ''وی رفت در جہنم''

کابل اور گجرات کے لیے تقرر

20 محرم 998ھ/ 1589ء کو کابل کی حکومت محمد قاسم خاں میر بحر کو عطا کر کے بادشاہ نے ہندوستان کی طرف رُخ کیا۔

گجرات پر اعظم خاں کی تقرری کا فرمان جاری کیا گیا اور اسے مالوہ سے وہاں تبدیل کر دیا گیا۔ نظام الدین احمد کو دربار میں طلب کیا گیا۔ خان خاناں کو گجرات کے بجائے جونپور دیا گیا۔ مالوہ میں شہاب خاں کی تعیناتی ہوئی۔ اعظم خاں نے شہاب خاں کی مخالفت میں مالوہ کو ویران کر کے وہاں دھول اڑادی۔

خداوند خاں دکنی کا انتقال

اسی سال خداوند خان دکنی رافضی جس کا نکاح بادشاہ کے حکم سے شیخ ابو الفضل کی بہن سے ہوا تھا اور گجرات میں کری کا قصبہ اسے جاگیر میں ملا تھا، فوت ہوگیا۔ اس کی وفات کی تاریخ ہے۔ ''خداوند دکنی مردہ''۔

اکبر کے حکومت کا پینتیسواں سال

14 جمادی الاول 998 ھ/ 1589ء کو 35 ویں سالِ جلوس کا آغاز ہوا۔ بادشاہ نے لاہور کے دیوان خانے کو آراستہ کرنے کا حکم پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ نو روز کے دوسرے دن لاہور میں بادشاہ حاضر ہوئے۔ تیسرے دن نظام الدین احمد شتر سواروں کی جمعیت کے ہمراہ ایک سو کوس کا فاصلہ صرف 12 دن میں طے کر کے خدمت میں حاضر ہوا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ جس ضرورت میں یہ شتر سوار آئے ہیں اسی طرح سیدھے ڈیوڑھی میں چلے آئیں۔ اس قافلے کی آمد بھی اچھا خاصا تماشا بن گئی۔ نظام الدین احمد پر بڑی شاہانہ نوازشیں ہوئیں۔ بادشاہ نے بھگوان داس کی وفات پر مان سنگھ کو راجا کا خطاب عطا کیا اور تعزیت کے لیے اس کے نام فرمان صادر ہوا جس میں بڑی عنایتوں کا اظہار کیا گیا تھا۔ فرمان کے ساتھ خلعت خاصہ اور گھوڑا بھی بھیجا گیا۔ شرف آفتاب کے دن میں بھی بدایوں سے آکر بارگاہ میں حاضر ہوا اور 7 سال بعد میرزا نظام الدین احمد سے ملاقات ہوئی۔

اعظم خاں کی فتوحات

اسی سال اعظم خاں نے گجرات سے سورت اور جونا گڑھ پر حملہ کیا۔ وہاں کا حاکم جام ستر سال اور دولت خاں ولد امین خاں غوری جو اپنے باپ کا جانشین بنا تھا اور اپنے لاؤ لشکر پر اسے بڑا گھمنڈ ہو گیا تھا۔ اعظم خاں کی فوج کشی پر یہ دونوں بیس ہزار کا لشکر لے کر مقابلے پر آئے اور فریقین میں بڑی سخت جنگ ہوئی۔ اعظم خان نے اپنی فوج کو 7 دستوں میں تقسیم کر کے بڑی بہادری سے جنگ کی۔ بادشاہی میمنہ کا سردار خواجہ رفیع بدخشی جو بڑا بہادر نوجوان تھا اور محمد حسین شیخ جو امرائے قدیم میں سے تھا اس معرکے میں شہید ہو گئے۔ ہراول کی فوج میں ابو تراب کا بھتیجہ شرف الدین بھی مارا گیا۔ مخالفوں کے 4 ہزار آدمی مارے گئے۔ جام کا لڑکا بھی قتل ہو گیا۔ اعظم خاں کو بڑی شاندار شان فتح حاصل ہوئی۔ یہ فتح اتوار کے دن 6 شوال 998ھ/ 1589ء کو ہوئی۔ شیخ فیضی نے "فتوحات عزیزی" سے اس کی تاریخ نکالی۔

دو بزرگوں کا انتقال

اسی سال صاحب تصانیف بزرگ شیخ وجیہہ الدین کا احمد آباد میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ ان کے نام ''شیخ وجیہ الدین'' سے نکلتی ہے۔

اسی سال شیخ عبد العزیز دہلوی کے خلیفہ جائلدہ بھی قصبۂ سیہنہ میں فوت ہو گئے۔ ان کے ایک مرید نے ''حقیقت فقر'' سے ان کی تاریخ نکالی۔

سندھ اور بلوچستان پر حملہ

بادشاہ نے خان خاناں کا جون پور سے بھی تبادلہ کر دیا اس کو ملتان اور بھکر کی حکومت عطا کر کے سندھ اور بلوچستان کی تسخیر اور میرزا جان کی بغاوت کو کچلنے کے لیے مقرر کر دیا۔ خان خاناں کو اس مہم پر چند بڑے بڑے امراء جیسے شاہ بیگ خاں، سید بہاؤ الدین بخاری اور میر محمد معصوم بھکّری وغیرہ کے ساتھ 999ھ/1590ء میں رخصت کیا گیا۔ ان کے ساتھ 100 ہاتھی بھی بھیجے گئے، شیخ فیضی نے ''قصد ٹھٹھہ'' سے اس روانگی کی تاریخ نکالی۔

شہاب الدین احمد خان کی وفات

اسی سال مالوہ سے شہاب الدین احمد خاں کی وفات کی خبر پہنچی'' شہاب خانم'' اور ''ذمیم الاوصاف'' اس کی تاریخ وفات ہے۔

تاریخ کشمیر کی ترتیب و تدوین

اسی سال مجھے[82] حکم دیا گیا کہ کشمیر کی تاریخ جس کو ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے جو بڑا عالم و فاضل شخص ہے حسب الحکم فارسی میں ترجمہ کیا تھا سادہ اور آسان عبارت میں لکھوں۔ میں[83] نے اس کا انتخاب 2 مہینے میں مرتب کر دیا، اس کے آخر میں یہ شعر لکھا:

در عرض یک دو ماہ بہ تقریب حکم شاہ
این نامہ شد چو خط پری پیکران سیاہ

یہ نسخہ شاہی کتب خانے میں داخل کر دیا گیا بادشاہ کے سامنے جز جز اس کو پڑھا جاتا ہے۔

شیخ ابراہیم چشتی کا انتقال

اسی سال شیخ ابراہیم چشتی نے فتح پور میں انتقال کیا، وہ اپنے پیچھے کافی دولت چھوڑ گیا تھا۔ اس کی چھوڑی ہوئی دولت میں سے 25 کروڑ نقد روپے، ہاتھی، گھوڑے اور دوسرا سامان شاہی خزانے میں داخل ہوگیا۔ وہ نہایت کنجوس اور بخیل مشہور تھا اس لیے اس کی تاریخ ''ومیم الاوصاف'' اور ''شیخ لئیم'' نکالی گئی۔

عرفی شیرازی کا انتقال

لاہور کے چند امراء بھی اسی سال فوت ہوئے جن میں سے خنجری ترک تو بواسیر کے مرض میں اور شیخ احمد ہاتھی کے حادثے میں فوت ہوئے۔ اسی سال مشہور شاعر ملا عرفی شیرازی نے بھی انتقال کیا۔ مرتے وقت اس نے یہ رباعی کہی تھی:

عرفی دم نزع است وہمان مستی تو   آخر بچہ مایہ باربربستی تو
فرداست کہ دوست نقد فردوس بکف   جو یای متاع است وتہی دستی تو

عرفی متقدمین اور متاخرین تمام اساتذہ کلام کے بارے میں بڑی بے ادبانہ باتیں کیا کرتا تھا اس لیے اس نے یہ تاریخ پائی:

''گفت عرفی جوانہ مرگ شدی''

اس کی ایک دوسری تاریخ ہے'' دشمن خدا''

معجم البلدان کا فارسی ترجمہ

اسی زمانے میں حکیم ہمام نے ایک کتاب ''معجم البلدان'' کی جس کی ضخامت 200 جز پر مشتمل تھی، بڑی تعریف کی اور اس کا عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے کی تجویز پیش کی کہ

اس کتاب میں بڑی عجیب و غریب حکائتیں او رمفید مضامین ہیں۔ بادشاہ نے دس بارہ عراقی اور ہندوستانی آدمیوں کو جمع کر کے اس کتاب کے اجزاء تقسیم کر دیے۔ میرے حصّے میں بھی 10 جز آئے۔ ان کا ترجمہ میں نے ایک مہینے میں کر دیا اور سب سے پہلے اسے پیش کیا اور اس خدمت کو وسیلہ بنا کر بدایوں جانے کے لیے رخصت کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی

اکبر کی حکومت کا چھتیسواں سال جلوس

24 جمادی الاول 999 ھ/1590ء نوروز کا جشن حسب دستور منعقد کیا گیا اور جلوس کا 36 واں سال شروع ہوا۔اس سال گائے،بھینس، گھوڑے اور اونٹ کا گوشت حرام کر دیا گیا۔ایک اور حکم ستی کے متعلق تھا کہ جو عورت برضا و رغبت اپنے شوہر کے ساتھ چتا پر جلنا چاہے اس کو نہ روکیں، لیکن کسی عورت کو زبردستی شوہر کے ساتھ نہ جلایا جائے۔ 12 سال سے پہلے بچوں کی ختنہ نہ کی جائے 12 سال بعد اگر لڑکا چاہے تو ختنہ کرائے نہیں تو نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے ساتھ جس کا پیشہ جانوروں کو ذبح کرنے کا ہو، اگر کوئی کھانا کھالے تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے اگر اس کے گھر والے اس کے ساتھ کھانا کھائیں تو ان کی صرف انگلیاں کاٹی جائیں۔

تبت کی سفارت

اس سال حاجی میرزا بیگ خرد تبت سے واپس آیا اور اپنے ساتھ وہاں کے حاکم علی رائے کی لڑکی کو لیتا آیا، بادشاہ نے اس لڑکی کا نکاح بڑے شاہزادے کے ساتھ کر دیا۔تبت میں دوسری مرتبہ ملا طالب اصفہانی ایلچی بن کر گیا تھا۔ اس کے اور حاجی میرزا کے بیانات سے وہاں کے جو حالات اور رسوم وعقائد سے متعلق معلومات ملی ہیں وہ ایک رسالہ کی صورت میں مرتب ہو چکی ہیں۔ اکبر نامہ میں بھی حالات درج ہیں، کیوں کہ اس میں ہندستان، کابل،تبت اور کشمیر کے حالات تفصیل سے لکھے گئے ہیں۔

مرزا نظام الدین احمد کو پرگنہ شمس آباد کی جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس سال شعبان کے آخر میں ان کو جاگیر پر روانہ کردیا گیا۔ ان کا خالہ زاد بھائی شمس آباد کے حملے میں شہید ہوگیا، اس کا نام محمد جعفر تھا یہ نہایت سعادت مند اور بہادر نوجوان تھا اس کی تاریخ شہادت ہے:

چو منشور شہادت یافت جعفر از در وا در
بود تاریخ سال او شہید پاک شد جعفر

سجدے سے انکار

اس مرتبہ مجھے[84] 5 مہینے کی رخصت ملی۔ مرزا نظام الدین نے سفارشاً عرض کیا کہ عبد القادر کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے، بھائیوں اور عزیزوں کو تسلی اور دلاسا دینے کے لیے وہ جانا چاہتا ہے اور رخصت کا طلب گار ہے تو بادشاہ نے بڑی خفگی کے ساتھ یہ رخصت عطا کی صدر جہاں نے اس موقعے پر دہرا دہرا کر کہا کہ ''بادشاہ کو سجدہ کرو'' لیکن میں[85] نے سجدہ نہیں کیا بادشاہ نے صرف اتنا کہا ''چھوڑو'' سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے ناراض ہوکر مجھے سفرخرچ کے لیے کچھ نہیں دیا۔ بہرحال میں مرزا کے ساتھ شمس آباد چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر بیمار ہوگیا۔ پھر وہاں سے بدایوں آگیا۔ مرزا لاہور کو چلے گئے۔

شاہی فرمان

شاہی کتب خانے سے'' نامہ خردافزا'' کا نسخہ گم ہوگیا تھا۔ سلیمہ سلطان بیگم نے اس سلسلے میں مجھے[86] چند مرتبہ یاد فرمایا۔ میرے پاس بدایوں میں کئی قاصد پوچھ گچھ کے لیے پہنچے لیکن میں کچھ ایسی الجھنوں میں گرفتار تھا کہ نہ جا سکا۔ آخر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ اس کی مدد معاش موقوف کردی جائے اور اسے زبردستی بدایوں سے لایا جائے۔ اس موقعے پر مرزا نظام الدین احمد نے دوستی کا بڑا حق ادا کیا۔ شیخ ابوالفضل نے بھی بادشاہ سے ہر بار یہی کہا کہ کوئی نہ کوئی مشکل ضرور درپیش ہوگی، اس لیے وہ نہیں آسکا اور وہاں رہ گیا۔

سفیروں کی دکن روانگی

اس سال شوال کے مہینے میں دربار کے 4 خاص مقربوں کو دکن حاکموں کے پاس سفارت پر بھیجا گیا۔ شیخ فیضی کو اسیر و برہان پور کے حاکم راجہ علی خاں کے پاس بھیجا گیا۔ امین الدین کا پہلے نام محمد امین تھا اس نے خود اپنا نام بدلنے کی درخواست کی کیوں کہ اس میں لفظ محمد آتا تھا اور وہ بادشاہ کو پسند نہیں تھا۔ اس کو امین الدین کا نام دیا گیا۔ امین الدین کو احمد نگر بھیجا گیا۔ احمد نگر میں اس وقت برہان الملک حاکم تھا جو دربار سے مدد لے کر وہاں کی سلطنت پر قابض ہوا تھا اور اب خود مختاری کا دعویٰ کرنے لگا تھا۔ بیجا پور کے حاکم عادل خاں کے پاس صادق خاں کے سابق ملازم میر محمد امین کو رخصت کیا گیا۔ گولکنڈہ کے حاکم قطب الملک کے پاس سفارت کے لیے میر مشیر کو نامزد کیا گیا۔ حکم یہ ہوا تھا کہ شیخ فیضی راجہ علی خاں کی سفارت سے فارغ ہو کر برہان الملک کے پاس چلا جائے، جب وہ احمد نگر پہنچا تو اس کے اور امین الدین کے درمیان بڑی دوستانہ محفلیں رہیں، لیکن آخر میں یہ دوستی مخالفت میں تبدیل گئی۔

اکبر کی علالت

اسی سال اکبر کی طبیعت کچھ علیل ہوگئی۔ پیٹ کا درد ہوتا تھا جس سے نہایت بے چینی کی حالت رہتی تھی۔ اکبر کو بڑے شاہزادے جہانگیر کی طرف سے بدگمانی ہوگئی کہ شاید اس نے زہر دے دیا ہو۔ بار باراس سے یہ کہتا تھا ''بابا شیخو جیتے رہو یہ سلطنت تو ساری تمہارے ہی لیے تھی پھر تم نے ایسی حرکت کیوں کی؟'' بادشاہ کو حکیم ہمام پر بھی، جو اُن دنوں شاہی معتمد تھا، کچھ نہ کچھ کھلا دینے کا شبہ ہوا۔ بڑے شاہزادے نے اپنے چند معتمد آدمیوں کو شاہزادہ مراد کی نگرانی پر مقرر کر دیا تھا۔ تھوڑے ہی دن بعد بادشاہ صحت مند ہو گئے۔ اس وقت حرم کی عورتوں اور شاہزادہ مراد نے اس نگرانی کا قضیہ پیش کیا۔ اس معاملے کو یکسو کرنے کے لیے بادشاہ نے 20 ذی الحجہ کو شاہزادہ سلطان مراد کو جسے وہ ''پہاڑی'' کہہ کر پکارتے تھے، مالوہ اور اس سے متعلقہ علاقے سپرد کر دے۔ شاہزادوں کو علم، نوبت، نقارہ،

پرچم، نشان اور بادشاہی کا دوسرا ساز و سامان جو شاہزادوں کے لیے مخصوص تھا جیسے چار پارچہ شاہانہ اور خلعت مرحمت فرمائی۔ اسماعیل قلی خان کو اس کا نائب بنایا گیا اور دوسرے چند بڑے بڑے امراء کو بھی اس کی ملازمت میں مقرر کر کے رخصت فرمایا تاکہ دونوں شاہزادوں میں ایک بڑی مسافت حائل رہے اور آئے دن کے ان کے جھگڑوں سے نجات مل جائے۔

شاہزادہ مراد کی فوج کشی

شاہزادہ مراد ملک کو آگے بڑھانے کے شوق میں مالوہ کی طرف چلا گیا اور بہت سے لوگ شاہزادہ مراد کی قدر ومنزلت کو دیکھ کر اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس نے آگرہ، قنوج اور گوالیار سے بے شمار فوج جمع کر لی اور لشکر لے کر روند چھہ کے زمیندار مدھوکر نامی پر حملہ کر دیا۔ یہ زمیندار اپنے کثیر لاؤ لشکر کی وجہ سے ہندستان کے راجاؤں میں بڑا درجہ رکھتا تھا اور اس علاقے میں اس نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ شاہزادے کے لشکر سے اس کا مقابلہ نرور کے علاقہ میں ہوا اور وہ شکست کھا کر بھاگ گیا۔ وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر چھاپے مارنے لگا۔ اس کے آدمیوں نے شاہزادے کے بہت سے لشکریوں کو قتل کر دیا، اس کے چھاپوں سے لشکر میں بڑا انتشار پھیل گیا اور وہ اس علاقے میں نہایت پریشان اور خستہ حال اِدھر اُدھر کوچ کرتا رہا۔ حسن اتفاق سے انہی دنوں مدھوکر طبعی موت مر گیا اور اس کا لڑکا نہایت عمدہ نذرانے لے کر شاہزادے سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا۔ شاہزادہ مراد نے اسے یار محمد ولد صادق خاں کے ہمراہ شاہی خدمت میں لاہور کو روانہ کر دیا اور اجین شہر کو اپنا مستقر بنا کر قیام کیا۔ شہزادہ مراد کا اپنے آدمیوں کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں تھا۔ لین دین، نشست و برخاست، تسلیم و تعظیم میں باپ کی دیکھا دیکھی بڑے غرور و تکبر سے پیش آتا تھا، اس کے رویے سے لوگ ناراض ہو گئے اور اجازت لے کر یا بغیر اجازت کے ہی اس کا ساتھ چھوڑ کر واپس آ گئے۔

جونا گڑھ کی فتح

انہی دنوں جونا گڑھ کے حاکم دولت خاں ولد امین خاں غوری جو جام کی لڑائی میں زخمی ہوگیا تھا، مرگیا اور اعظم خاں نے اس قلعے کی تسخیر کے لیے حملہ کردیا۔ امین خان کے وزیروں نے دولت خاں کی سرداری میں کچھ دن تک تو اعظم خاں کی مدافعت کی۔ آخر جان کی امان طلب کر کے قلعے کی کنجی اسی سال 5 ذی قعدہ کو اس کے حوالے کردی۔

ٹھٹھہ کی فتح

26 محرم 1000ھ/ 1591ء کو اکبر کی حکومت کے چھتیسویں سال، خان خاناں نے جانی بیگ سے ایک رات اور ایک دن مسلسل جنگ کی۔ دونوں طرف سے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا گیا۔ خان خاناں 2 مہینے تک اس کا محاصرہ کیے پڑا رہا۔ اس دوران بادشاہ نے خان خاناں کی مدد کے لیے ایک مرتبہ ڈیڑھ لاکھ روپیہ اور دوسری دفعہ ایک لاکھ روپیہ، ایک لاکھ من غلہ، سو بڑی توپیں، توپچیوں کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ دریا کے راستے بھجوائیں۔ رائے سنگھ کو جو 4 ہزاری امیر ہے مدد کے لیے جیسلمیر کے راستے سے روانہ کیا۔ جانی بیگ نے جان توڑ کر مقابلہ کیا اور کئی ایک سخت رائیوں کے بعد آخر کار عاجز آگیا۔ مصالحت کرلی اور اپنی لڑکی خان خاناں کے لڑکے سے بیاہ دی، وہ کشمیر کی فتح کے بعد خان خاناں کے ساتھ ملازمت میں داخل ہوا۔

اکبر کی حکومت کا سینتیسواں سال

5 جمادی الثانی 1000ھ/ 1591ء کو نوروز منعقد ہوا اور اکبر کی سلطنت کا سینتیسواں سال شروع ہوا۔ اس سال درباریوں نے بڑے اہتمام سے اپنی داڑھیاں منڈوائیں، اس لیے ان کی تاریخ ہوئی ''بگفتہ ریشہا برباد دادہ مفسدی چند''۔

کرنسی کا نیا قانون

اس سال بھی کئی ایک نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ ایک حکم یہ دیا گیا کہ پچھلے بادشاہوں کے

جتنے بھی سکے ہیں روپیہ، اشرفیاں وغیرہ سب گلا کر سونے چاندی کے بھاؤ فروخت کر دیے جائیں۔ پہلے سکوں کا نام ونشان تک نہ رہے اور بادشاہی سکے، روپے اشرفی وغیرہ خواہ وہ نئے ہوں یا پرانے ان کا چلن ایک شرح پر رہے اور سنین کا فرق ان کے چلن پر اثر انداز نہ ہو۔اس قانون کے نفاذ کے لیے قلیچ خان کو مقرر کیا گیا۔ وہ ہر روز صرافوں کو بلا کر ان سے مچلکے لیتا تھا اور جرمانے لگائے جاتے تھے اس نے بڑی سختی سے کام لیا اور چند ایک کو تو قتل تک کرا دیا۔ اس کے باوجود صراف جعل اور دھوکے سے باز نہ آتے تھے۔ بادشاہ نے کرنسی کے سلسلے میں بڑے تاکیدی فرمان ہر جگہ بھجوائے، لیکن ان کا کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر خواجہ شمس الدین خوافی دیوان کل کی کوششوں سے اس حکم کا نفاذ ہو سکا۔

جلالہ تاریکی پر حملہ

یوم شرف آفتاب کو جب سورج انیسویں درجہ حمل میں ہوتا ہے، جعفر بیگ آصف خان بخشی کو جلالہ تاریکی کے تعاقب پر مقرر کیا گیا۔جلالہ اس وقت وہ عبد اللہ خاں کے پاس سے لوٹ کر کابل کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی مدد کے لیے کابل کے حاکم محمد قاسم خاں کو مقرر کیا گیا۔ نظام الدین احمد کو ''بخشی کل'' کا عہدہ عطا ہوا۔آخر شعبان میں زین خاں کوکہ کو بھی آصف خاں کی مدد اور تاریکیوں (روشنائی قبیلے) کے مکمل استیصال اور سواد اور بجوڑ کے علاقے کو آباد کرنے کے لیے نامزد کیا گیا۔

اس سال وسط شوال میں حافظ سلطان رخنہ ہروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ نہایت مخیّر شخص تھا، خاص طور سے سرہند میں اس کی بنائی ہوئی عمارتیں اور باغ ایسے خوش منظر اور عالی شان ہیں کہ ہندوستان میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ اس کی تاریخ وفات اصول تعمیہ پر نکالی گئی:

رخنہ در باغ شد و آب نماند

فیضی سرہندی نے دو تاریخیں کہی ہیں، ایک: ''باغ بی آب شد''

دوسری:

چو او در گوشہ باغ است مدفون
بجو تاریخ او از گوشۂ باغ

ایک اور تاریخ ہے: ''یا حافظ''

یادگار گل کا کشمیر پر قبضہ

یوسف خان رضوی کشمیر میں اپنے بھتیجے یادگار گل کو نائب بنا کر 24 شوال کو خدمت میں حاضر ہوگیا۔ اس کے آنے کے بعد بادشاہ سلامت نے لاہور کے نظم ونسق پر قلیج خاں کا تقرر کیا اور عین موسم باران میں جب کہ برسات اپنے شباب پر تھی راوی ندی کو پار کیا۔ لشکر کو بڑے شاہزادے کے ہمراہ کر کے خود شکار کھیلتے ہوئے چناب ندی پر پہنچے۔

چناب کے قیام میں یہ خبریں ملیں کہ یادگار گل نے کشمیر کے بادشاہی تحصیلدار حسین بیگ نے شیخ عمری بدخشی سے جنگ کر کے اسے شکست دے دی ہے۔ کشمیر کا سرکاری قاضی علی بغدادی اماموں کا بڑا دشمن تھا اور کشمیر کی دیوانی کے عہدے پر فائز تھا اور حساب کتاب میں الجھنیں پیدا کر کے رعیت کو تنگ کر رکھا تھا۔ یادگار گل نے اس کے کان کاٹ کرا سے وہاں سے نکال دیا۔ اس واقعہ کی تاریخ ہے:

چون کہ قاضی علی بغدادی حسرت یادگار با خود برد
خامۂ منشی قضا بنوشت سال تاریخ او کہ موذی مرد

یادگار گل کی تخت نشینی

اس کامیابی کے بعد یادگار گل نے وہاں کے قدیم امراء کی مدد سے شاہی تاج سر پر رکھا۔ کشمیر میں یہ رسم ہے کہ تخت نشینی کے وقت امراء نئے بادشاہ کے اطراف ننگی تلواریں لیے کھڑے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں جب یادگار خطبہ پڑھنے کھڑا ہوا تو خوف سے لرزنے لگا اور کافی دیر تک بدحواس رہا۔ ایک اور اتفاق یہ پیش آیا کہ جس دن اس کے مہر کے لیے سجع

تجویز کیا گیا تو اس نے اپنے سامنے نگینہ کھدوایا۔ اس وقت نگینے کا ایک ریزہ اڑکر اس کی آنکھ میں پڑ گیا اور وہ دیر تک اس تکلیف میں مبتلا رہا۔ اس بدشگونیوں کی وجہ سے لوگوں کو یہ خیال ہو گیا کہ اس کی سلطنت زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہے گی۔

حسین بیگ شیخ عمری نے یادگار گل سے شکست کھائی وہ کشمیر کے درّوں سے اپنی جان بچا کر لے آیا اور راجوری میں جو کشمیر کے راستے پر ہے، شاہی حکم کا انتظار کرنے لگا۔

یادگار نے کشمیر میں اپنی بادشاہت قائم کر لی۔ لوگوں کو جاگیریں دیں، خطابات عطا کیے اور میرزا یوسف خاں کے خزانے، طویلے اور اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔ یوسف خاں کے اہل و عیال سے سارا روپیہ، زیور اور اناج وغیرہ چھین کر خچروں پر سوار کرادیا اور ان کو یوسف خاں کے بیٹے کے ہمراہ کشمیر سے باہر نکال دیا۔

یادگار گل کی شکست اور قتل

اس واقعے پر بادشاہ نے سارا الزام یوسف خان کے سر رکھا اور اسے کچھ دن تک شیخ ابو الفضل کے پاس قید میں ڈلوادیا، نیز شیخ فرید بخش کو شیخ عبد الرحیم لکھنوی اور دوسرے چند امراء کے ساتھ آگے کوچ کرنے کا حکم دے کر خود چناب پر شاہزادے کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ ابھی بادشاہ نے وہاں سے کوچ نہیں کیا تھا کہ خبر ملی کہ شاہی امراء کے مقابلے کے لیے یادگار کشمیر سے نکل کر ہیراپور نامی درے پر مورچہ جمائے تھا اور رات کے وقت وہ اپنے سراپردہ میں عیش وعشرت میں مشغول تھا۔ مرزا یوسف خان کے بعض نوکروں نے پٹھانوں کے ایک دستے کو ساتھ لے کر آدھی رات کو شب خون مارا اور یادگار خان کو قتل کر دیا۔ 3 دن کے بعد اس کا سر بھی شاہی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا کے اس کی تخت نشینی کے چالیسویں دن ہی اس کا سر کٹ کر دربار میں پہنچ گیا۔ اس کے سر کو عبرت کے لیے لاہور کے قلعے کے کنگورے پر لٹکا دیا گیا۔

جامع رشیدی کے ترجمے کا حق

اسی سال ماہ ذی الحجہ کو حسب الحکم میں[87] بدایوں سے لشکر میں حاضر ہو گیا بھٹنیر کے قیام

میں حکیم ہمام نے عرض کیا کہ عبد القادر کورنش بجا لانا چاہتا ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ وعدہ کے خلاف کتنے عرصے تک غیر حاضر رہا، حکیم نے جواب دیا: ''پانچ مہینے!'' بادشاہ نے پوچھا: ''غیر حاضری کا کیا سبب تھا؟'' لوگوں نے کہا، وہ بیمار ہو گیا تھا، تصدیق کے لئے بدایوں کے اکابرین کا محضر اور حکیم عین الملک کا عریضہ بھی پیش کیا گیا۔ جب بادشاہ نے یہ سارے کاغذات پڑھ لئے تو فرمایا: ''بیماری 5 مہینے تک نہیں رہتی'' اور مجھے کورنش کی اجازت نہیں دی۔ میں[88] نہایت شرمندہ، رنجیدہ اور غمزدہ شاہزادہ دانیال کے لشکر میں جسے رہتاس میں مقرر کیا گیا تھا ٹھہرا رہا اور حضور اکرم ﷺ پر درود بھیج کر اور قصیدہ پڑھ کے اور خدا سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں جو آخر کار بفضل ایزدی قبول ہوئیں اور میرے پہنچنے کے 5 ماہ بعد جب لشکر کشمیر سے لاہور پہنچا تو بادشاہ نے مجھ پر توجہ اور عنایت فرمائی اور ایک کتاب جامع رشیدی کے ترجمے کے لیے جو کافی ضخیم ہے، خلوت شاہی میں میر نظام الدین احمد کے ساتھ میرا نام بھی میرے غائبانے میں تجویز فرمایا اور مجھے حاضری کا حکم دیا گیا۔ اس طرح کشمیر کی واپسی کے بعد اسی سال 17 ربیع الآخر کو کورنش کی اجازت دی گئی۔ میں نے حاضر ہو کر ایک اشرفی نذر دی۔ بادشاہ نے بڑی مہربانی کا اظہار کیا اور وہ خفگی بآسانی رضامندی میں بدل گئی۔

بادشاہ نے ابوالفضل علامی کے مشورے سے مجھے جامع رشیدی کے انتخاب کا حکم دیا۔ میں نے اس انتخاب میں عباسی، مصری، اموی خلفاء کے شجرے کو جن کا سلسلہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور پھر ان سے درجہ بدرجہ تمام نبیوں اور آدم علیہ السلام تک جا کر ختم ہوتا ہے، عربی سے فارسی میں ترجمہ کر کے شاہی خدمت میں پیش کی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر اس انتخاب کو خزانہ عامرہ میں داخل کرا دیا۔

کشمیر کی سیر

6 محرم 1001ھ/1592ء کو شہنشاہ کشمیر پہنچ گئے اور 28 دن تک اس ''باغ خاصہ'' کی سیر میں

مصروف رہے۔ وہاں کی حکومت دوبارہ میرزا یوسف خان کے حوالے کردی، 6 صفر 1001ھ/1592ء کو وہاں سے لوٹ گئے اور کشتی کے ذریعہ کشمیر کی سرحد پر پکھلی کے راستے سے بارہ مولہ جا پہنچے۔ راستہ میں ''زین منکا'' نامی تالاب کی بھی سیر کی۔ یہ تالاب دو مشرقی اور مغربی پہاڑیوں کے درمیان ہے۔اس کا دور 30 کوس کا ہے اور بہت گہرا ہے ''دریائے بحت'' اسی جھیل کے درمیان سے ہوکر گزرتا ہے۔

سلطان زین العابدین نے، جس کا ذکر تاریخ کشمیر کے ضمن میں کیا گیا ہے، اس تالاب میں تقریباً ایک جریب پتھر ڈلوا کر ایک بڑا پشتہ بنوایا اور اس پر ایسی عالی شان، خوش منظر سنگین عمارتیں تعمیر کرائیں کہ انکی مثال ہندستان کے کسی شہر میں بھی نہیں ملتی۔

لرزنے والا درخت

لشکر والے کشمیر میں ایک نہایت انوکھی چیز دیکھ کر آئے تھے، یہ موضع خان پور میں ایک لرزنے والا درخت ہے جس کا تنہ تو دو ہاتھ موٹا اور اسکی بلندی ایک گز سے زیادہ ہوگی۔ اس کی شاخیں بید مجنون کی ڈالیوں کی طرح جھکی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی بچہ اس کی شاخ کو پکڑ کر ہلادے تو پورا درخت حرکت میں آجاتا ہے اور لرزنے لگتا ہے۔

کشمیر کے بعض عجائبات کا تذکرہ شاہ فتح اللہ شیرازی مرحوم نے اپنے ایک رسالے میں بھی کیا تھا جو علامی شیخ ابوالفضل کی تصنیف اکبر نامہ میں شامل کردیا گیا ہے۔

پشاور میں شاہانہ داخلہ

یکم ربیع الاول کو رہتاس میں قیام ہوا اور اسی ماہ کی 15 تاریخ کو پشاور کی طرف مراجعت ہوئی۔ 6 ربیع الثانی کو بادشاہ شہر پشاور میں داخل ہوئے۔

انہی دنوں خبر آئی کہ بہادر کودرہ نے جس کا کچھ حال ہم پہلے بیان کرآئے ہیں اڑیسہ کے حاکم قتلو خان کے انتقال کے بعد سکت سنگھ ولد مان سنگھ نے اس پر فوجی حملہ کردیا۔ وہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر جنگلوں اور پہاڑوں میں جا چھپا اور سمندر کے کنارے

تک بنگال کا سارا علاقہ بادشاہی قبضہ میں آ گیا۔

اکبر کی حکومت کا اڑتیسواں سال

اتوار 17 جمادی الثانی 1001ھ/1592ء جب سورج برج حوت سے برج حمل میں منتقل ہوا تو جشن نوروز منعقد کیا گیا اور جلوس شاہانہ کا 38 واں سال شروع ہوگیا اور چند نئے قوانین اجرا کیے گئے۔ 24 جمادی الثانی کو خانخاناں اور میرزا جان شاہی بارگاہ میں حاضر ہوئے اور خسروانہ ہمدردی سے نوازے گئے۔ ان امیروں کو بھی جو اس مہم میں خان خاناں کے ہمراہ گئے تھے حسب مراتب منصبوں اور جاگیروں میں ترقی ملی۔ ملتان پہلے میرزا جانی کی جاگیر میں دیا گیا بعد میں اسے ٹھٹھہ اور میرزا رستم کو ملتان کا علاقہ سپرد ہوا، جس کا ہم آگے ذکر کریں گے۔

مظفر گجراتی کی خودکشی

اس وقت خبر پہنچی کہ جب خان اعظم نے سورت پر قبضہ کر لیا تو وہاں سے مظفر گجراتی بھاگ کر کچھ کے ایک زمیندار کنکار کے پاس چلا گیا۔ خان اعظم اس کے تعاقب میں کنکار جا پہنچا۔ زمیندار اپنی عزت و آبرو بچانے کے لیے خان اعظم کی خدمت میں حاضر ہوگیا اور مظفر کو غفلت کی حالت میں قید کر کے خان اعظم کے پاس بھجوا دیا۔ مظفر نے راستے میں قضائے حاجت کا بہانہ کیا اور ایک استرے سے جو اس کے بازو بند میں چھپا ہوا تھا اپنا گلا کاٹ لیا۔ اس کا سر خان اعظم کے پاس پہنچایا گیا۔ خان اعظم نے اُسے ملاحظہ شاہی کے لیے لاہور بھیج دیا۔

انہی دنوں 120 ہاتھی جو اڑیسہ کی فتح میں راجہ مان سنگھ کے ہاتھ آئے تھے بنگال سے لائے گئے۔ اکبر نے یہ ضابطہ بنایا تھا کہ امرائے سرحد ہمیشہ وقفے وقفے سے دربار میں حاضر ہوتے رہیں۔ اس سال خان اعظم کی طلبی کا فرمان صادر کیا گیا جو 6 سال سے دربار میں نہیں آیا تھا، اس نے جونا گڑھ کو فتح کیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے جونا گڑھ لے کر راجہ

رائے سنگھ کے حوالے کر دیا۔

خان اعظم کی حجاز روانگی

آخری مرتبہ جب خان اعظم بنگالہ سے فتح پور میں آکر باریاب ہوا تو اس نے مذہبی معاملات میں اکبر سے بہت بحث کی تھی اور بادشاہ کے سامنے ابوالفضل اور بیربر سے سخت گفتگو کی تھی اس لیے وہ حاضری میں تأمل کر رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک اور وجہ یہ تھی کہ اس نے جام کی لڑائی میں اپنی منت کے مطابق داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ اکبر نے اس کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس میں طنزاً یہ بھی لکھا تھا کہ تیری ''داڑھی اتنی بوجھل ہے کہ تجھے آنے نہیں دیتی ہے'' اس کے جواب میں خان اعظم نے ایک طویل اور نہایت سخت عریضہ روانہ کیا۔ یہ جواب بادشاہ کے دل میں کھٹک گیا۔ منافقوں نے بھی اس کے خلاف بڑی لگائی بجھائی کی۔ دربار کا یہ رنگ دیکھ کر خان اعظم اسی سال یکم رجب کو اپنے اہل وعیال کے ہمراہ تمام مال وخزانہ لے کر ایک جہاز میں جو ناگڑھ سے بندر دیو کو چلا گیا اور حجاز چلے جانے کا ارادہ کرلیا۔ اس کی روانگی کی تاریخ ایک عدد کی کمی سے یہ کہی گئی ہے:

دلی در زعم شاہنشاہ کج رفت   بجای راستان شد خان اعظم
گفتا میرزا کو کہ بہ حج رفت   چو پرسیدم زدل تاریخ این سال

اس کا یہ جرأت مندانہ اقدام بلاشبہ ابن ادہم کے ترک سلطنت کے مشابہ تھا۔

امرائے گجرات کے تبادلے

بادشاہ کو جب خان اعظم کے چلے جانے کی خبر ملی تو مالوہ میں شاہزادہ مراد کے پاس فرمان گیا کہ اسے گجرات کی حکومت سپرد کی جاتی ہے۔ اس کی وکالت کے لیے اسماعیل قلی خان کے بجائے محمد صادق خان کو مقرر کیا گیا۔ سورت اور بھڑوچ کا علاقہ بھی قلیج خاں سے لے کر صادق خان کی جاگیر میں دے دیا گیا۔

زین خاں کوکہ اور آصف خان نے جو سواد اور بجوڑ کے پٹھانوں اور جلالہ تارکی

(روشنائی) کی بغاوت پر مقرر کیے گئے تھے، حملہ کر کے بہت سے پٹھانوں کو قتل کر دیا اور اس کے بھائی وحدت علی کو اس کے اہل قبیلہ کے ساتھ جو تقریباً 14 ہزار آدمی تھے، قید کر لیا اور اسی سال دربار میں بھجوا دیا۔

29 ذی قعدہ کو مالوہ کی حکومت شاہرخ میرزا کو سپرد کی گئی۔ شہباز خاں کنبو 3 سال سے قید میں تھا، اس سے 7 لاکھ روپیہ نقد لے کر کانگڑہ کے قلعے سے بلا کر رہا کر دیا۔ اسے شاہرخ میرزا کی وکالت اور مالوہ کے نظم و نسق پر مقرر کیا گیا۔

شیخ مبارک کی وفات

17 ذی قعدہ 1001ھ/1592ء کو شیخ مبارک دانشمند کا انتقال ہو گیا، اس کے لڑکوں نے تعزیت میں اپنے سر کے بال، داڑھی، موچھیں اور ابرو منڈوا دیے۔ ان کی تاریخ وفات ملک الشعراء فیضی نے ''فخر المکمل'' اور میں[89] نے ''شیخ کامل'' نکالی۔

میرزا رستم کی آمد

8 محرم 1002ھ/1593ء کو میرزا رستم بن سلطان حسین میرزا، بہرام میرزا بن شاہ اسماعیل صفوی جو ملک داور اور اس کے نواحی علاقے کا حاکم تھا اور قندھار و گرمسیر پر اس کے بڑے بھائی میرزا مظفر حسین کی حکمرانی تھی۔ اپنے بھائی سے ناراض ہو کر اپنے تمام اہل و عیال کے ساتھ ہندستان آ گیا اور بادشاہ کے پاس حاضر ہوا۔ اس کے استقبال کے لیے بادشاہ نے حکیم عین الملک کو بھیجا تھا اور اس کے لیے سراپردہ، قالین اور فراش خانہ کا دوسرا ساز و سامان، مرصع کمر پٹہ اور خنجر بھی روانہ کیا۔ جب وہ لاہور سے 4 کوس پر پہنچا تو حسب الحکم خان خاناں زین خان کوکہ اور دوسرے تمام اکابر امراء پیشوائی کے لیے روانہ ہوئے۔ حاضری کے وقت اس کو ایک کروڑ تنکہ نقد انعام دیا گیا اور 5 ہزاری امراء میں اس کو داخل کیا گیا اور ملتان اس کی جاگیر میں دیا گیا۔

دکن کی مہم پر دانیال اور خانخاناں کا تقرر

ملک الشعراء شیخ فیضی کچھ دن پہلے دکن سے آ چکا تھا اس کی آمد کے 4 مہینے بعد دکن کے

حکام کے ایلچی دربار میں آئے۔ چونکہ برہان الملک نے خاطر خواہ پیش کش نہیں بھیجی تھی۔ اکبر نے 21 محرم کو شاہزادہ دانیال کو دکن کی مہم پر مقرر کیا۔ خانخاناں اور رائے سنگھ اس کے وکیل مقرر ہوئے اور دوسرے بہت سے امراء ہمراہی کے لیے نامزد کیے گئے۔ اس مہم پر روانگی سے پہلے بادشاہ نے شہزادہ دانیال کا خانخاناں کی بیٹی سے نکاح کرادیا۔ اس خوشی میں ایک شاندار جشن منعقد ہوا۔ شاہزادے کو اس قدر نقد روپیہ اور مال واسباب جہیز میں ملا کہ ایک لشکر کا پورا سامان اس سے ہوسکتا تھا۔ شادی کے بعد آپ نے دانیال کو تمام شاہی لوازمات اور شان وشوکت کا سامان عطا کر کے اس مہم پر رخصت کر دیا۔ خود بھی اس کے پیچھے شکار کے ارادے سے سلطان پور کی ندی تک جولاہور سے 25 کوس پر ہے، گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد بادشاہ کی رائے بدل گئی اور شاہزادے کو واپسی کا حکم دے کر خان خاناں کو بھی جو سر ہند تک پہنچ چکا تھا، مشورے کے لیے بلوایا اور اس کو لشکر کا مستقل سردار بنا کر اور مہم کے ضروری انتظامات کر کے دوبارہ لشکر کو رخصت کر دیا اور خود وہاں سے لاہور لوٹ آیا۔

جمعہ کے دن 18 جمادی الثانی 1002ھ/ 1593ء کو میاں شیخ داؤد نے انتقال فرمایا۔ ان کی تاریخ "جان پاک شیخ داؤد" نکالی گئی۔

میں[90] یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ یہاں تک جتنے واقعات بیان کئے گئے ہیں، ان میں سے اکثر کا ماخذ "طبقات اکبر شاہی" ہے جس کا نام میں نے تاریخ کی رو سے "نظامی" رکھا ہے۔ یہ نام اس کے مصنف نے بھی پسند کیا تھا اور اسے اپنی کتاب کے ساتھ درج کیا تھا۔ اس کے بعد 2 سال کے واقعات میں مجملاً بیان کرونگا۔

اکبر کی حکومت کا انتالیسواں سال اور کوتوالی کے انتظامات

پیر کے دن 28 جمادی الثانی 1002ھ/ 1593ء نوروز منعقد ہوا اور سلطان کی تخت نشینی کا انتالیسواں سال شروع ہوگیا۔ حسب سابق 18 دن تک بڑے عیش وطرب کے ہنگامے گرم

رہے اور نئے نئے قوانین کا اجرا ہوا۔ کوتوالوں کو حکم دیا گیا کہ ہر شہر کا کوتوال اپنے شہر کے تمام محلوں اور گھروں کے حالات سے باخبر رہے اور میر محلّہ سے اس بات کا مچلکہ لکھوالے کہ جو شخص تاجر یا سپاہی یا کوئی اور پیشہ ور ان کے محلّے میں آکر ٹھہرے وہ ان کے حالات سے باخبر رہے گا۔ کسی مفسد یا چور کو اپنے محلّہ میں رہنے نہیں دے گا۔ جس آدمی کا خرچ اس کی آمدنی سے زیادہ دکھائی دے اس کی تحقیقات کر کے کوتوال کو باخبر کر دے گا، کیوں کہ اس کی فضول خرچیاں ناجائز آمدنی ہی کے سبب ہو سکتی ہیں۔ محلّے میں خوشی اور غمی کی جو تقریبات ہوں، خصوصاً نکاح، ولادت اور قتل وغیرہ کے واقعات سے محلّے والے کوتوال کو لازماً آگاہ کر دیا کریں۔ کوتوال ایک معتبر آدمی ہمیشہ ہر محلّہ، گلی بازار اور پانی کی گزرگاہ پر مقرر رکھے اور لوگوں کی اچھائی برائی کو اپنی نظر میں رکھے۔ راستوں کی ایسی ناکہ بندی کی جائے کہ بھاگا ہوا کوئی شخص یا بھولا بھٹکا آدمی بچ کر نہ جا سکے۔ کوئی سوداگر بغیر اجازت گھوڑے نہ لے جائے اور سوداگر ہندستان سے غلاموں کو لے کر نہ جا سکیں۔

لین دین کے قاعدے

سونے چاندی اور کپڑوں کا دام بھی مقرر کیا گیا کہ ان کا لین دین سرکاری شرح پر ہو اور منافع پر مقرر ٹیکس سرکاری خزانے میں داخل کیا جائے۔ مُردوں کے مال پر ایک داروغہ مقرر کیا جائے تاکہ تحقیقات کے بعد اگر اس کے ذمّے کچھ سرکاری بقایا ہو یا مرنے والا کروڑی، علمدار یا فوطے دار ہو تو اس کا مال ضبط کر لیا جائے ورنہ اس کے وارثوں کو دے دیا جائے۔ جب تک بیت المال کے داروغہ کی اجازت نہ مل جائے، مُردوں کو دفن نہ کیا جائے۔

آفتاب کی تعظیم کے لیے قبرستان کا دروازہ شہر کی مشرقی جانب رکھا جائے۔ اگر کوئی ''درشنی مرید'' مر جائے تو خواہ مرد ہو یا عورت کچا اناج اور چند پکی اینٹیں اس کی گردن پر باندھ کر دریا میں بہادیں، جہاں پانی نہ ہو وہاں اس کی میت جلادی جائے یا چینیوں کی طرح کسی درخت پر اسے باندھ دیں۔

شادی کے قانون

نکاح سے پہلے دولھا اور دلہن کو کوتوالی میں لاکر جب تک کوتوال کے گماشتوں سے ان کی عمروں کی تحقیق نہ کر لی جائے اس وقت تک ان کا نکاح نہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا قوانین سے عوام کو جو فائدہ یا نقصان ہوا وہ ہوا، لیکن ان کے نفاذ سے کوتوالی کے ملازمین اور تمام بدمعاشوں کی خوب بن آئی اور انھوں نے رشوت میں اپنے ہاتھ خوب رنگے۔

ایک حکم یہ دیا گیا کہ جو عورت اپنے شوہر سے 12 سال بڑی ہو شوہر اس سے صحبت نہ کرے۔ جو نوجوان عورت شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بے پردہ گھومتی نظر آئے یا ایسی مکار عورت جو شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہو، فاحشہ عورتوں کے محلّے میں بھجوادی جائے۔

بھوک اور اضطرار کی حالت میں ماں باپ کو اس کا اختیار ہے کہ وہ اپنے بچوں کو فروخت کردیں اور جب ان کی تنگی ختم ہو جائے تو وہ روپیہ دے کر اپنے بچوں کو چھڑالیں۔

تبدیلی مذہب کی آزادی

وہ ہندو جو بچپن میں یا جبراً مسلمان بنا لیے گئے ہوں، انھیں اختیار ہوگا کہ اگر چاہیں تو دوبارہ اپنے آبائی مذہب کو اختیار کرلیں۔ مذہب تبدیل کرنے پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔ جو شخص جس مذہب کو چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ اگر کوئی ہندو عورت کسی مسلمان پر فریفتہ ہو کر مسلمان ہو جائے تو اسے زبردستی اس کے آدمیوں کے سپرد کر دیا جائے۔

بت خانہ، گرجا اور آتش کدہ کسی بھی عبادت گاہ کی تعمیر میں غیر مسلمانوں پر کوئی پابندی نہ لگائی جائے۔

ملکی قوانین کی تفصیلات

یہ چند احکام تھے جن کا تعلق مذہبی معاملات سے تھا ان کو مختصراً لکھ دیا گیا۔ ان کی تفصیل میری[91] قوت تحریر سے باہر ہے۔ اسی طرح وہ سارے قوانین جو ملکی اور مالی امور سے

متعلق ہیں جیسے بیوتات، دار الضرب، فوج، رعیت، سوداگری، چوکی، واقعہ نویسی، کروڑی، داغ ومحل، ہاتھیوں کی لڑائی، ہرن، چیتا، مرغ، بکری، کتے اور سور کی لڑائی۔ اسی طرح اصطبل کے ضوابط، کھانے پینے، سونے اٹھنے کے اوقات کا تعین غرض چھوٹے بڑے سارے معاملات سے متعلق جو قاعدے، ضابطے بنائے گئے انھیں بیان کرنے کے لیے بھی ایک عمر اور ایک دفتر چاہیے۔ یہ تفصیلات ''اکبر نامہ'' کے دوسرے دفتر آئین اکبری میں جسے علامی شیخ ابو الفضل نے ایک ضخیم جلد میں تصنیف کیا ہے، دیکھی جا سکتی ہیں۔

تاریخ الفی کی تصحیح و ترتیب

تاریخ الفی کے تین دفتروں میں سے دو دفتر تو ملا احمد ٹھٹھہ رافضی نے اور تیسرا دفتر آصف خان نے لکھا تھا۔ ان تینوں دفتروں کی تصحیح اور مقابلے کا کام میرے[92] سپرد کیا گیا تھا، میں نے یہ کام ملا مصطفیٰ کاتب لاہوری کی مدد سے جو بڑا اچھا مددگار تھا اور احدیوں میں ملازم ہے، انجام دیا اور اس کے پہلے دفتر کو مکمل کر کے اس نوروز کے جشن میں شرف آفتاب کے دن ملاحظہ شاہی میں پیش کیا۔ بادشاہ نے اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا کہ اس نے انتہائی تعصب کے ساتھ لکھا ہے اس لیے اس کے دوسرے دفتر کی بھی تصحیح کردو۔ میں[93] نے ایک سال میں اس کا مقابلہ اور تصحیح بھی کردی، لیکن اس خوف سے کہ مبادا مجھ پر بھی تعصب کا الزام آجائے میں نے اس کے اصل مضمون میں زیادہ تبدیلی نہیں کی۔ بس سنین وغیرہ کی ترتیب درست کردی اور اس کو اسی حال میں رہنے دیا تاکہ میرے ساتھ کوئی نئی پُرخاش پیدا نہ ہو جائے۔

فیضی کی غیر منقوط تفسیر

انہی دنوں ملک الشعراء شیخ فیضی نے قرآن کی ایک تفسیر ''سواطع الالہام'' کے نام سے لکھی، جس کی ضخامت 75 جز کی تھی اور اول سے آخر تک غیر منقوط تھی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس نے 99 غیر منقوط فقروں سے اس کی تاریخ بھی نکالی اور اس کے چند جز اشاعت کے لیے

عراق بھجوائے۔ اس سال فیضی اس کی تصحیح و مقابلے میں مصروف ہے۔ اس نظر ثانی کی تاریخ ''امراء ثانی'' سے نکلتی ہے۔ اکثر عالموں نے اس کی تفسیر پر تقریظیں لکھی ہیں۔ شیخ یعقوب کشمیری نے عربی زبان میں تقریظ لکھی۔ میاں امان اللہ سرہندی نے اس کی تاریخ نکالی۔ "وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ اِلَّا فِي كِتَابٍ مبين" میر محمد حیدر معمائی نے تسمیہ کو چھوڑ کر پورے سورۂ اخلاص سے اس کی تاریخ نکالی، میں[94] نے "من احسن التفاسير بسم الله الرحمٰن الرحيم علم القرآن" سے تاریخ نکالی۔ ایک تقریظ بھی میں نے اس پر لکھی جس کا ذکر مناسب مقام پر آئے گا۔ میں[95] نے لاہور کی شکارگاہ میں جو 30 تاریخی فقرے نکالے تھے ان میں سے چند یہ ہیں۔ "الحمد لله لحصل المرام اكرم سواطع الالهام" "الهم المحرروحده لاطراء س الكلام"۔ "حدود اسرار كلام الله المرسل در رالسرز"۔ "سمو السرو الدرر علو"۔ وغیرہ۔

ماہ صفر 1002ھ/ 1593ء میں خواجہ ابراہیم حسین احدی جو میرے[96] خاص آدمیوں میں سے تھا، فوت ہوگیا۔ اس نے ''خواجہ ابراہیم حسین'' تاریخ پائی۔

اس سال میں نے توفیق خداوندی سے کلام پاک کی روشن اور صاف خط نسخ میں نہایت صاف کتاب کی اور اسے پورا کرکے یہاں شیخ حسین والی کے روضے کے لیے وقف کرادیا۔

محمد قاسم خاں میر بحر کا قتل

اسی سال 17 ذی قعدہ کو محمد قاسم خاں میر بحر اور میرزا محمد زمان جو شاہرخ میرزا کا لڑکا تھا، کابل میں مارے گئے۔ محمد زمان میرزا حج سے واپسی کے بعد بدخشاں آیا۔ بدخشاں والے اورزبکوں کے ظلم وستم سے تنگ آچکے تھے انھوں نے اسی کو اپنا سردار بنالیا اور ہندستان کی مدد کے بل پر بڑی بہادری سے اوزبکوں پر حملہ کردیا۔ بعد میں اوزبک ایک بڑی فوج لے کر محمد زمان میرزا کے مقابلے پر آئے وہ اپنی قوت سے چند سال تک برابر اوزبکوں سے لڑتا رہا اور آخر کار شکست کھاکر بھاگا اور چودہ پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ ہندستان پر حملہ

کرنے کے ارادے سے کابل کے علاقے میں پہنچا۔ یہاں پہنچنے کے بعد اسے لوگوں نے بہکایا تو کابل کے لیے اس کی نیت ڈانواڈول ہوگئی۔ اس کے ارادے کو بھانپ کر کابل کے حاکم نے جو اس وقت محمد قاسم خان تھا۔ اس نے اس کو گرفتار کر لیا، مگر وہ اس کے ساتھ نہایت تعظیم و تکریم کے ساتھ پیش آیا اور اسے گھوڑا، خرچ اور خلعت دے کر 150 سواروں کو اس کی ہمراہی کے لیے مقرر کر دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ میرزا کو لاہور بھجوا دے۔ اسی اثناء میں محمد قاسم خان کے بعض بدخشی اور کابلی ملازموں نے میرزا سے سازباز کی اور دوپہر کو سرکاری حویلی کا دروازہ توڑ کر زبردستی اندر داخل ہو گئے اور خواب گاہ میں جا کر محمد قاسم خان کو تہہ و تیغ کر ڈالا۔

محمد ہاشم ولد محمد قاسم خاں اس وقت قلعے سے باہر تھا، اس نے تو پچیوں اور محافظ دستے کی ایک جمعیت لے کر میرزا محمد زمان کا محاصرہ کرلیا اور ایک دن ایک رات مسلسل جنگ کر کے میرزا کو قتل کر دیا اور اس کا سر دربار میں بھجوا دیا۔

اس واقعے کے بعد بادشاہ نے محمد قلیچ خاں کو جو کچھ عرصے تک جملۃ الملک رہ چکا تھا، کابل کی حکومت پر مقرر کر کے روانہ کر دیا۔ دیوان مطلق کے عہدے پر تمام ملکی اور مالی معاملات سرانجام دینے کے لیے خواجہ شمس الدین محمد خوافی کا تقرر عمل میں آیا۔ انہی دنوں آصف خاں بخشی کو کشمیر کے انتظامی معاملات اور فوجی مہمات کی تحقیق و انتظام کے لیے روانہ کیا گیا۔

میں(97) بعض ناشائستہ عادتوں میں مبتلا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس سال مجھے توبہ کی توفیق عطا کی اور میں نے اپنی بد اعمالیوں کی سچے دل سے توبہ و استغفار کی۔ اس توبہ کی تاریخ لفظ ''استقامت'' سے حاصل ہوئی۔ میری توبہ پر ملک الشعراء فیضی نے یہ شعر کہا:

لقد تاب شیخی عن الحوبہ

تاریخہ سابق التوبہ

غرض یہ کہ:

رفت از سرم اندیشہ می و معشوق

بشد زخاطرم آواز بربط و طنبور

محرم 1003ھ/1593ء کے شروع میں شیخ فرید بخاری کو جو ان دنوں آصف خان کے ساتھ نائب بخشی کے عہدے پر مقرر تھا، حکم دیا گیا کہ وہ شمالی پہاڑی پر فوجی حملہ کر کے وہاں کے باغی راجاؤں کو اطاعت پر مجبور کرے اور وہاں کی زمین کی جمعبندی کر کے عمدہ پیش کش لے کر آئے۔

سفر کے شروع میں بادشاہ نے راوی ندی کو پار کیا اور اس علاقے میں25 دن تک سیر و شکار میں مصروف رہا۔

نل دمن داستان کی تصنیف

انہی دنوں بادشاہ نے ملک الشعراء فیضی کو ''پنج گنج'' تصنیف کرنے کا حکم دیا۔اس نے تقریباً 5 ماہ کی مدت میں ہندستان کی مشہور عشقیہ داستان ''نل و دمن'' کو 4 ہزار سے کچھ 200 کم اشعار میں مرتب کر کے شاہی خدمت میں چند اشرفیوں کے نذرانے کے ساتھ پیش کیا۔ یہ کتاب بادشاہ کو نہایت پسند آئی۔ اس کی کتابت اور مصوری بنوانے کا حکم دیا گیا اور نقیب خاں کو پڑھ کر سنانے پر مقرر کیا گیا۔ اس کتاب کا مطلع ہے

ای درنگ و پوئی تو آغاز
عنقای نظر بلند پرواز

واقعتاً یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ ان 300 سال میں امیر خسرو کے بعد شاید کسی نے ہندستان میں ایسی مثنوی لکھی ہو۔

مرزا نظام الدین احمد کا انتقال

میرزا نظام الدین کی قلیج خاں کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہتی تھی۔ آہستہ آہستہ میرزا کا بادشاہ کے مزاج میں بڑا دخل ہوگیا۔ اس نے مفوضہ فرائض بھی نہایت دیانت داری، محنت اور خلوص سے سرانجام دیے۔ اس کی حسن کارگزاری کا یہ اثر ہوا کہ بادشاہ نے قلیج خاں اور دوسرے مقربین کو تو مختلف مقامات پر تقرر کر کے دربار سے علیحدہ کر دیا لیکن نظام الدین

احمد پر بادشاہ کی عنایات پہلے سے کہیں زیادہ مبذول رہیں۔ بادشاہ نے اس گوہر قابل کی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن تقدیر کے فیصلے انسانی ارادوں کے پابند نہیں ہوتے۔ نظام الدین احمد اپنی ترقی اور اقتدار کے اس دور عروج میں تپ محرقہ میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت انکی عمر 45 سال تھی۔ اس مرض میں وہ دیکھتے ہی دیکھتے ہم تمام دوستوں کو آبدیدہ چھوڑ کر عالم جاودانی کی طرف کوچ کر گئے۔ ان کے حسن اخلاق نے سب کو ہی گرویدہ بنا رکھا تھا، لیکن خاص طور سے میرا ان کا تعلق نہایت بے غرضانہ اور مخلصانہ تھا۔ انکی موت کا مجھے[98] بے حد صدمہ ہوا۔ اشک بہانے اور صبر کرنے کے اور کیا چارہ تھا؟ میں[99] نے اس صدمے کے بعد فیصلہ کر لیا کہ کسی کی محبت کا دم بھرنا اس دنیا میں بے فائدہ ہے۔ ان جیسے دوستوں سے تو گوشۂ عزلت ہی زیادہ بہتر ہے۔

نظام الدین احمد کی وفات 3 صفر 1003 ھ/ 1594ء میں ہوئی۔ ان کی میت لشکر سے لاہور میں لائی گئی اور ان کے اپنے باغ میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کے جنازے پر خاص کیا؟ عام کیا؟ سبھی زار زار رو رہے تھے۔ لوگ ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک کے قصے یاد کر کے بڑی حسرت کا اظہار کر رہے تھے۔ ان کی وفات کی تاریخ کے لیے یہ قطعہ موزوں ہو گیا۔

رفت میرزا نظام الدین احمد سوی عقبیٰ چیست وزیبا رفت
جوہر او زبس کہ عالی بود در جوار ملک تعالیٰ رفت

قادری یافت سال تاریخش
گوہر بی بہا ز دنیا رفت

انہی دنوں بادشاہ نے شیخ فرید کو جس کو بخشی گری کی تقریباً تمام ذمہ داریاں سپرد ہو چکی تھیں اور وہ پہاڑوں میں سوالک کے علاقے پر حملہ کرنے گیا ہوا تھا، واپس بلا لیا اور اس کی جگہ قاضی حسین قزوینی کا تقرر کر دیا گیا۔

اعظم خان کی واپسی اور بے راہ روی

انہی دنوں اعظم خاں جو مکہ گیا ہوا تھا وہاں کے امراء کے ہاتھوں تنگ آ کر حج سے ہندستان واپس آ گیا۔ اب جو وہ لوٹ کر آیا تو اس کی شان بے نیازی جاتی رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی ساری پسندیدہ خصوصیات کو خیر باد کہہ دیا اور بادشاہی مریدوں میں داخل ہو کر تعظیم و تسلیم کے تمام مقررہ لوازمات کی اطاعت کی۔ بادشاہی سجدہ بھی کیا۔ اس تبدیلی کے بعد دربار شاہی میں اس کا چراغ جلنے لگا اور محفلوں، گفتگو گویا ہر جگہ اور ہر موقعے پر وہ پیش پیش نظر آنے لگا۔ بادشاہ نے اسے غازی پور اور حاجی پور کا صوبہ جاگیر میں عطا فرمایا اور وہ ابوالفضل کے پاس بیٹھ کر نئے مذہب کے احکام سیکھنے لگا۔

اکبر کی حکومت کا چالیسواں سال

اس سال 9 رجب 1003ھ/1594ء کو نوروز منعقد ہوا اور شاہی حکومت کا چالیسواں سال شروع ہوا۔ نوروز کے جشن کی ساری تیاریاں حسب معمول سرانجام پائیں۔

مہابھارت کی ایک حکایت

نوروز سے دو دن پہلے بادشاہ نے مجھے (100) دیوان خانہ خاص و عام کے جھروکے میں بلوایا اور براہ راست مجھے کچھ کہنے کے بجائے ابوالفضل کو مخاطب کر کے فرمایا: ''ہم فلاں کو (اشارہ میری طرف تھا) صوفی مشرب نوجوان سمجھتے تھے، لیکن اس نے اپنے آپ کو ایسا متعصب فقیہہ ظاہر کیا ہے کہ کوئی تلوار اسکے تعصب کی رگ کو کاٹ نہیں سکتی''۔ شیخ ابوالفضل نے پوچھا۔ ''صاحب! اس نے کس کتاب میں ایسا کچھ لکھ دیا کہ آپ اس کے متعلق یہ ارشاد فرماتے ہیں''۔ اکبر نے فرمایا: ''اسی رزم نامہ یعنی مہابھارت میں کل رات ہم نے اس کی تحریر پر نقیب خاں کو بھی گواہ بنایا ہے''۔ شیخ نے کہا ''اس سے غلطی ہوگئی''۔ اس وقت مجبوراً آگے بڑھ کر کہنا پڑا: ''کمترین تو بس ایک مترجم ہے اس سے زیادہ نہیں، جو کچھ ہندی کے عالموں نے ترجمانی کی تھی میں نے اس کا اسی طرح ترجمہ کر دیا۔ اگر اپنی طرف

سے میں نے کچھ بڑھایا ہو تو یقیناً قصوروار ہوں'۔ شیخ نے بھی اس بات کی تائید کی اور بادشاہ سلامت خاموش رہ گئے۔

اس اعتراض کا سبب یہ تھا کہ رزم نامہ میں، میں نے ایک حکایت نقل کی تھی جس کا مضمون یہ تھا کہ ''ایک پنڈت نے عالم نزع میں حاضرین کو نصیحت کی کہ انسان کو چاہیے کہ وہ غفلت و جہالت ترک کر کے سب سے پہلے اس صانع حقیقی کو پہچانے اور علم و حکمت کا راستہ اختیار کرے اور بے علم بے عمل پر جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا بھروسا نہ رکھے۔ حسن عمل کو اختیار کر کے تاحد امکان جھگڑوں سے بچتا رہے اور اس کا یقین کامل رکھے کہ ہر فعل کی باز پُرس ہو کر رہے گی۔ اس موقعے پر میں نے یہ مصرع لکھ دیا تھا۔

ہر عمل اجری و ہر کردہ جزائی دارد

ہندو مذہب میں جزائے اعمال کا تصور

بس یہ عبارت اور یہ مصرع تھا جو کھٹک گیا اور اکبر نے اس کو منکر نکیر کے سوال و جواب، حشر و نشر اور آخرت کے حساب و میزان پر محمول کیا۔ یہ بات چونکہ اس کے عقیدہ تناسخ کے خلاف تھی جس کے سوا وہ کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا تھا اس نے مجھ پر ملاپن اور تعصب پرستی کا الزام لگا دیا۔ یہ بات خوب چھڑی اور اچھا موقع نکل آیا۔ چنانچہ میں نے شاہی مقربان کو بخوبی سمجھایا کہ ہندستان کے تمام لوگ نیکی اور بدی کے اچھے اور بُرے انجام کے قائل ہیں اور ان کا اعتقاد یہ ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو ایک محرر جو بندوں کے نامہ اعمال کو زندگی بھر لکھتا رہتا ہے روحوں کو قبض کرنے والے فرشتے کے سامنے جس کا نام بادشاہ عدل ہے، لے جاتا ہے اور وہ نیکی اور بدی کے اندراجات دیکھ کر اور ان کی کمی و زیادتی کا مقابلہ کر کے حکم کرتا ہے کہ یہ شخص مخیّر (نیک) ہے پھر اس نیک روح سے کہا جاتا ہے کہ ہم پہلے تو تجھے جنت میں لے جائیں گے تاکہ تو وہاں اپنی نیکیوں کے برابر لذتوں سے لطف اندوز ہو جائے بعد میں تجھے دوزخ میں ڈالا جائے گا تاکہ تیرے گناہوں کی تلافی ہو جائے۔ اگر تو چاہے تو پہلے تجھے دوزخ میں پھر بعد میں جنت

میں لے جایا جائے۔ جب وہ دوزخ و جنت کی اس مدت کو پورا کر لیتا ہے تو پھر اسے دنیا میں جانے کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کے مطابق کسی جسم میں حلول کر کے زندگی کی چند گردشوں میں گھومتا رہے، یہاں تک کہ اسے نجات مطلق مل جائے اور وہ دنیا میں آنے اور جانے کی اس زحمت سے چھٹکارہ پالے۔میری اس توضیح وتقریر پر وہ معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اجمیر کی تولیت کی تجویز

شرف آفتاب کے دن اکبر نے کسی کے کہے بغیر اپنے آپ صدر جہاں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر فلاں[101] کو ہم حضرت خواجہ اجمیری کے روضے کی تولیت دے دیں تو کیسا رہے گا؟ کیوں کہ اس روضۂ منورہ کا کوئی متولی نہیں ہے۔صدر جہاں نے کہا یہ بہت اچھی تجویز ہے۔ میں[102] بھی دل سے چاہتا تھا کہ درباری الجھنوں سے کسی طرح نجات مل جائے، اس غرض کے لیے میں نے دو تین مہینے تک دربار میں بڑی کوششیں بھی کیں اور دو تین عرضیاں بھی لکھ کر پیش کیں، لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔

اس سال آخر ماہ رمضان میں صدر جہاں نے شاہی بارگاہ میں عرض کیا کہ 'فلاں[103] کی رخصت کے بارے میں کیا حکم ہوتا ہے؟ بادشاہ نے فرمایا: ''یہاں بہت سے کام نکلتے رہتے ہیں اور ہم اسے کوئی نہ کوئی خدمت سپرد کرتے رہتے ہیں۔ اس کی جگہ کسی اور کام کے آدمی کو مہیا کرلو تو دیکھا جائے گا''۔ بہرحال خدا کی مصلحت نہیں تھی رخصتی نہ ملی اور میں صبر کر کے بیٹھ رہا۔

انہی دنوں ایک دن میرے سامنے اکبر نے شیخ ابو الفضل سے فرمایا: ''فلاں[104] اجمیر کی خدمت کو بہ حسن وخوبی انجام دے گا، لیکن ہم اس سے جب کسی کتاب کا ترجمہ کراتے ہیں تو وہ نہایت اچھی طرح سے ہمارے خاطر خواہ ترجمہ کر دیتا ہے، اس لیے ہم اسے جدا نہیں کرنا چاہتے''۔ شیخ ابو الفضل اور دوسروں نے اس بات کی تائید کی۔

بحر الاسمار کی تصنیف

اسی دن بادشاہ نے مجھے حکم دیا کہ سلطان زین العابدین شاہ کشمیر نے جس ہندی افسانہ کا ''بحر الاسمار'' کے نام سے ترجمہ کرایا تھا اور اس کا بیشتر حصہ باقی رہ گیا تھا اس کا ترجمہ کر کے تکمیل کردو۔ میں نے اس کام کو شروع کردیا اور اس کتاب کی آخری جلد کو جس کی ضخامت 60 جزو کی ہے 5 مہینے میں پورا کردیا۔ اسی اثنا میں بادشاہ سلامت نے خواب گاہ خاص میں مجھے اپنے تخت کے قریب بلوایا اور صبح تک ہر باب کی حکایتیں سنتے رہے۔ پھر حکم دیا. ''کہ بحرالاسمار کی پہلی جلد جسے سلطان زین العابدین نے ترجمہ کرایا تھا پرانی اور غیر معروف فارسی میں ہے اس کو بھی تم مروجہ زبان میں تحریر کردو اور اپنے اس ترجمہ کیے ہوئے مسودے کو حفاظت سے رکھے رہو'' میں نے زمین بوس ہوکر بہ سروچشم اس خدمت کو قبول کرلیا اور اس کام کو شروع کر دیا۔ بادشاہ نے نہایت لطف و کرم کے ساتھ 10 ہزار تنکہ اور گھوڑا انعام میں عطا فرمایا۔ میں نے کہا انشاء اللہ یہ کتاب انہی دو تین ماہ کے اندر بہ حسن وخوبی مرتب ہو جائے گی تب کہیں جاکر مجھے وطن جانے کی رخصت مل سکے گی۔

دکن کی مہم پر شاہزادہ مراد اور خان خاناں کا تقرر

اسی سال ہندیہ سے حکیم عین الملک اور شہباز خان کے عریضے پہنچے کہ برہان الملک کو اس کی بدسلوکی سے ناراض ہوکر امراء نے قتل کرادیا اور ایک 12 سالہ لڑکے کو اس کا ولی عہد بنا کر تخت نشین کردیا ہے۔ بادشاہ نے ایک فرمان شہزادہ مراد کے اور دوسرا خان خانان کے نام لکھ کر بھیجا کہ دونوں جلد از جلد کوچ کر کے تسخیر دکن کے لیے سرحدوں پر پہنچ جائیں۔

شاہ بیگ خان کی فوجی کاروائی اور فتح

اس سال اوائل ماہ ذی الحج میں شاہ بیگ خان کابلی قندھار کو چلا گیا اور میرزا مظفر حسین حاکم قندھار قرا بیگ میر شکار کے ہمراہ دربار میں حاضر ہوا۔ بھاری نذرانوں کے ساتھ قیمتی جواہر بھی پیش کیا۔ بادشاہ نے اس پر عنایت فرمائی شاہ بیگ خان نے داور میں جاکر

اوزبکوں کی ایک بڑی فوج کو شکست دی ان کے اکثر سرداروں کو قتل کردیا اور بقیہ امیروں کو خلعتیں دے کر رہا کردیا۔ اوزبکوں کی ایک جمعیت بھاگ کر قلعے میں بند ہوگئی تھی۔ شاہ بیگ خان نے توپ خانے کے ساتھ قلعے پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر کے آگے کوچ کردیا۔ گرمسیر کے سارے علاقے پر اس نے بخوبی قابو پالیا۔

بادشاہ نے میرزا رستم کو صوبہ چتوڑ عطا کیا اور سنبھل کا علاقہ ابوالفضل سے لے کر میرزا قندھاری کو جاگیر میں دے دیا۔ ملتان کو جو میرزا رستم کے مظالم سے تباہ ہوگیا تھا خالصہ مین شامل کرلیا۔ انہی دنوں سعید خان مغل بنگالہ سے حاضر ہوا اور اپنے ساتھ عیسیٰ خان زمیندار کے دیے ہوئے نفیس تحفے، روپیہ اور ہاتھی بطور پیشکش لے کر آیا۔

شیخ یعقوب کشمیری کی وفات

اس سال شیخ یعقوب کشمیری صوفی جو دربار سے رخصت کر اپنے وطن گیا ہوا تھا، فوت ہوگیا:

یاران ہمہ رفتند و رہ کعبہ گرفتند   ماست قدم بر در خمار بما ندیم
از نکتہ مقصود نشد فہم حدیثی   لادین ولا دنیا بی کار بما ندیم

حکیم عین الملک کا انتقال

حکیم عین الملک راجہ علی خان کے پاس سفیر بن کر گیا تھا، وہاں سے اپنی جاگیر ہندیہ میں لوٹ کر آیا اور 5 مہینے کی بیماری کے بعد 27 ذی الحج 1003ھ/1594ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اللہ کی شان ہے کہ تمام دوست اور رفیق ایک ایک کر کے اس دنیا سے اٹھتے جارہے ہیں اور ہم اسی سیاہ دلی اور پریشان حالی کے ساتھ آخرت سے غافل ہیں اور اپنی عزیز عمر کو بیہودہ مشاغل میں گنوا رہے ہیں۔

حکیم حسن گیلانی کا انتقال

3 ماہ محرم 1004ھ/1595ء کو حکیم حسن گیلانی کا بھی انتقال ہوگیا۔ حکیم حسن نہایت درویش

مزاج، مہربان اور صاحب اخلاق تھے۔

انہی دنوں مخدوم شیخ حامد کا لڑکا شیخ موسیٰ گیلانی جو اُچہ کے سجادہ نشین شیخ عبد القادر کا چھوٹا بھائی ہے شاہی ملازمت میں داخل ہوا، بادشاہ نے اسے پانصدی کا منصب عطا کیا۔

مفتی صدر جہاں دین الٰہی کا پیرو

اسی مہینے مفتی ممالک محروسہ صدر جہاں کو ہزاری منصب عطا ہوا اور وہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ مریدان خاص میں شامل ہوگیا۔ ہزاری کا منصب اسی مریدی کا معاوضہ تھا۔ مرید ہونے کے بعد اس نے پوچھا: ''میری داڑھی کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے؟'' بادشاہ نے کہا رہنے دو! اس عرصے میں جو لوگ بادشاہی مرید بنے ان میں سے ایک تو ملا تقی شوستری ہے جو اپنے آپ کو ''اعلم العلما'' سمجھے ہوئے ہے۔ آج کل وہ حسب الحکم شاہنامے کو نثر میں لکھ رہا ہے۔ اپنی تحریر میں جہاں بھی آفتاب کا نام آتا ہے وہ اس کے ساتھ جلت عظمۃ، وعز شانہ، یا اس جیسا کوئی اور کلمہ ضرور لکھ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ شیخ زادہ گوسالہ خام نامی بنارسی، ملا شاہ محمد شاہ آبادی اور صوفی احمد مطرب مسند صاد دہلوی جو خود کو حضرت غوث الثقلین کی اولاد میں سے بتاتا ہے، مرید بنائے گئے۔ ان سب لوگوں نے ''مراتب اخلاص چہار گانہ'' کو قبول کرلیا اور ایک صدی سے پانصدی تک کا منصب حاصل کرلیا۔ بڑی عقیدت سے داڑھی منڈوا ڈالی ان کی تاریخ ''موتراش چند'' سے نکلتی ہے۔

ان نو مریدوں کا حال بس ایسا ہی تھا کہ: ''ایک ہندو مسلمان ہوگیا، اس خوشی میں لوگوں نے اسے ایک سرخ شال اوڑھا دی۔ سرخ دوشالہ اوڑھ کر اس نے اپنے لوگوں کی طرف بڑے فخر و شان سے دیکھا۔ ان لوگوں نے کہا: ''احمق یہ کپڑا تو کل پرانا ہوکر پھٹ جائے گا اور یہ مسلمانی ہمیشہ کے لیے تیری گردن کا ہار بن جائے گی''۔

صوفی احمد مطرب

یہ صوفی احمد وہی شخص ہے جو اپنے آپ کو شیخ احمد کھٹّری مصریؒ کا مرید، بلکہ خلیفہ کامل بتاکر

کہا کرتا تھا کہ: ''میں اس مرشد زمان کے اشارے سے دیار ہند میں آیا ہوں۔ میرے مرشد نے بارہا مجھ سے فرمایا تھا کہ ہندستان کے بادشاہ سے لغزش ہوگئی ہے تو وہاں جا کر اس کی مدد کرے گا اور اسے ہلاکت سے بچالے گا''، اب یہ معاملہ ہی برعکس ہوگیا کہ شکار ی خود شکار کے پھندے میں پھنس گیا۔

لاف زن جولاہہ می گفت من بس ماہرم شاید ارسا زند فردابہر جورم حلہ باف
آن شنید مستی کہ بادی جولہ دیگر چہ گفت کای برادر چند لاف اول بیاف آنگہ بلاف

گوسالہ بنارسی کا معاشقہ

گوسالہ بنارسی نے شیخ ابو الفضل کے پاس بڑی رسائی پیدا کرلی اور مکاری و چاپلوسی سے کام لے کر بنارس کا کروڑی بن گیا۔ وہاں اس نے خوب کھیل کھیلے اور بنارس کی ایک طوائف سے عشق بازی شروع کردی۔ ملا احمد صوفی مذکور بھی اسی طوائف پر عاشق تھا، بنارسی نے احمد کو کافی روپیہ دے کر درمیان سے ہٹا دیا اور اپنا ایک نگراں اس طوائف کے دروازے پر مقرر کر دیا۔ طوائفوں کے داروغہ نے یہ سارا حال بادشاہ کے پاس لکھ بھیجا۔ بادشاہ نے ایک محفل نو روزی میں احمد سفلی اور ملا شاہ محمد کی دوصدی جاگیر جو پہاڑ کے دامن میں تھی اور اس پر دونوں کا مشترکہ قبضہ تھا۔ چھین لی اور بنارسی کو بنارس سے بلالیا۔

ملک الشعراء فیضی کا انتقال

ملک الشعراء شیخ فیضی کئی بیماریوں جیسے ضیق النفس، استقا، ورم، خونی قے وغیرہ میں مبتلا ہوگیا تھا، 6 مہینے تک وہ مرض کی سختیاں برداشت کرتا رہا، آخر 10 صفر 1004ھ/1595ء کو ایڑیاں رگڑ رگڑ کر وہ اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ فیضی کو کتوں کے ساتھ بڑی انسیت تھی اور رات دن ان کتوں میں گھرا رہتا تھا۔ لوگوں کا بیان ہے کہ سکرات کے وقت اس کے منہ سے کتے کی آواز نکل رہی تھی۔ فیضی اسلام کا قطعی منکر اور بے دینی کا متعصب حامی تھا، چنانچہ مرنے سے پہلے تک وہ ایک عالم شریعت سے بیہودہ اور کافرانہ باتیں کرتا رہا۔ اس

کی تاریخ وفات ہے:

"دی فلسفی وشیعی وطبیعی و دہری"

ایک دوسری تاریخ ہے "قاعدۂ الحاد شکست"۔ ایک شناسا نے یہ تاریخ کہی:

دیدی کہ فلک چہ مایہ نیرنگی کرد
مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آن سینہ کہ عالمی درد می گنجید
تا نیم دمی بر آورد تنگی کرد

نزع کے وقت بادشاہ سلامت آدھی رات کو اس کے پاس تشریف لے گئے اور اس کا سر اپنے ہاتھوں سے تھام کر آوازیں دیں کہ: "شیخ جیو، ہم حکیم علی کو ساتھ لائے ہیں، تم آخر بات کیوں نہیں کرتے ہو؟" وہ اپنے ہوش وحواس کھو چکا تھا کوئی جواب نہ دیا۔ جب دوبارہ بادشاہ نے آواز دی تو اپنی پگڑی زمین پر گرادی آخر بادشاہ شیخ ابو الفضل کو تسلی اور دلاسہ دے کر لوٹ گئے۔ اسی وقت خبر ملی کہ وہ جاں نثار رخصت ہوگیا۔

حکیم ہمام کی وفات

فیضی کے انتقال سے چند دن بعد ہی 6 ربیع الاول 1004ھ/ 1595ء کو حکیم ہمام بھی اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ 7 ربیع الاول کو کمالائی صدر کا انتقال ہوا۔ ان دونوں کا مال و اسباب اسی وقت ضبط کرلیا گیا اور وہ دونوں کفن کے کپڑے تک کو محتاج ہوگئے۔

خاتمہ

یہ دور اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے واقعات جو میں نے بیان کیے ہیں وہ ماہ صفر 1004ھ/1595ء یعنی اکبر بادشاہ کے دور حکومت کے چالیس سالہ دور حکومت پر مبنی ہیں۔ میں نے اپنی جانکاری اور اپنے طور پر یہ سارے حالات ٹھیک طور پر بیان کردیے ہیں۔ بعض سنین کے اندراج میں جو تقدیم وتاخیر، تحریف اور تغیر ہوگیا ہے، اس کا میں ذمے دار

نہیں ہوں بلکہ اس کی ساری ذمے داری اس ماخذ یعنی تاریخ نظامی پر ہے جس سے میں نے یہ منتخب مرتب کی ہے، اگر جیتا رہا اور توفیق و اطمینان حاصل ہوا تو انشاء اللہ آنے والے حالات کا بھی میں انتخاب کر جاؤں گا ورنہ جس شخص کو بھی میسر ہو وہ ان حالات کی ترتیب وتسوید کا فرض انجام دے کہ اللہ کی سنت اسی طرح جاری رہی ہے:

مراد ما نصیحت بود گفتیم
حوالت با خدا کردیم و رفتیم

☆☆☆

حواشی

جلوس اکبری جہانگیر نے اپنی توزک میں لکھا ہے ''میرے والد نے چودہ برس کی عمر میں تخت سلطنت پر جلوس کیا تھا۔ بیرم خان نے اس صوبے کے امیروں کو جمع کر کے نیک ساعت میں مضافات لاہور پرگنہ کلانور میں تخت سلطنت پر بٹھایا تھا''۔ یہ غلطی شاید کاتب سے سرزد ہوئی ہے کیونکہ ہمایوں 7 ربیع االاول کو بالاخانے سے گراتھا اور 15 ربیع االاول کو اس کی وفات ہوئی۔ اس صورت میں دوسری ربیع الاول کو اکبر کس طرح تخت پر بیٹھ سکتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ غلطی طبقات اکبری، مطبوعہ نولکشور، ص 242 میں بھی ہے جہاں دوم ربیع الاول تحریر ہے۔ نظام الدین ہروی نے دوسری جگہ تخت نشینی کے جشن کی تاریخ 2 ربیع الثانی لکھی ہے، اس لیے ایک خیال یہ ہے کہ یہی تاریخ صحیح ہوگی۔ مآثر رحیمی کے مصنف نے ''دوپہر کا وقت جمعہ کادن 7 ربیع الثانی 963ھ لکھا ہے (ص 645) دوسرے بیانات سے مآثر رحیمی کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے، اس لیے اکبر کی تاریخ جلوس 2 ربیع الاول کے بجائے 7 ربیع االثانی یا زیادہ سے زیادہ 2 ربیع الثانی قرین قیاس ہے۔

میر عبداللطیف قزوینی۔ یہ اعاظم سادات حسینی سیفی میں سے تھے والد کا نام قاضی میر یحییٰ تھا۔ میر علاء الدولہ صاحب تذکرہ ان کا بھائی ہے۔ قزوینی شاہ طہماسپ صفوی کے مخالف تھے اس لیے بادشاہ نے ان پر سختی کی اور وہ بھاگ کر گیلان کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ جب ہمایوں ایران پہنچا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ 963ھ/1555ء میں ہندوستان آکر اکبر سے متعلق ہوگئے۔ 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور سیکری میں انتقال کیا۔ قلعہ اجمیر میں سید حسین جنگ

سلمار کی درگاہ میں ان کی قبر ہے۔ بحوالہ (مآثر الامراء، ذخیرۃ الخوانین)

بیرم خان کے زوال میں ماہم اتکہ، شہاب الدین احمد خان کے علاوہ حمیدہ بانو بیگم کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔

منتخب اللباب، جلد سوم، ص 83 میں لکھا ہے کہ پیر محمد خان دکن کا رہنے والا تھا وہ وہاں تین چار سال کسی جرم میں قید کی سزا کاٹ کر بیرم خان کے پاس چلا گیا تھا۔ بیرم خان نے سب سے پہلے اسے اپنے کتب خانہ کا داروغہ مقرر کیا تھا۔

بیرم خان کی شکست کے نتیجہ کے متعلق مورخوں میں اختلاف ہے۔ اکبری اور جہانگیری دور کے مصنفوں نے بیرم خان کی شکست ہی لکھی ہے، لیکن خافی خان نے لکھا ہے، ان مورخوں نے محض بادشاہ کی رعایت سے اصل واقعہ پر پردہ ڈال دیا ہے ورنہ حقیقت میں شکست خان اعظم شمس الدین اتکہ کو ہوئی تھی اور بیرم خان مظفر و منصور ہوا تھا۔ (منتخب اللباب، جلد سوم، ص 149، چاپ کلکتہ)

میں نے جس نسخہ کو ترجمہ کے لیے انتخاب کیا ہے اس کے اصلی متن میں ''بیتالی'' لکھا ہے جب کہ صحیح لفظ ''پٹیالی'' ہے۔

اکبر نے بوڑھے بیرم خان کے سامنے تین صورتیں رکھی تھی۔

(i) حکومت کی تمنا ہو تو چندیری اور کالپی عطا کر دیا جاتا ہے۔

(ii) مصاحبت منظور ہو سابقہ اعزاز و احترام کے ساتھ ہمارے ہمراہ رہو۔

(iii) حج کا ارادہ ہو تو سفر کا بندوبست کر دیا جائے۔

بیرم خاں نے تیسری صورت قبول کی۔

محمد بیرم خاں ترکمان۔ بیرم خاں کے آباو اجداد کا تعلق ایران کے ''قراقو ینلو'' نامی ایک ترکمان قبیلے سے تھا اس قبیلے کا ایک سردار علی شکر بیگ ترکمان تیموری خاندان سے وابستہ تھا۔ علی لشکر کی اولاد میں شیر علی بیگ ترکمان گزرا ہے۔ یہ مرزا سلطان حسین حاکم ہرات سے لڑتے ہوئے مارا گیا، اس کا بڑا لڑکا یار علی بیگ فشدز کی فتح کے بعد بابر کی ملازمت میں آگیا۔ بابر نے اسے غزنی کا حاکم مقرر کیا۔ اس کے مرنے پر اس کا لڑکا سیف علی بیگ حاکم ہوا۔ یہی سیف علی بیگ بیرم خان کا باپ تھا۔ بیرم خان بدخشاں میں پیدا ہوا۔ باپ کے مرنے پر بلخ میں جا کر تعلیم حاصل کرتا رہا، جب وہ 16 سال کا ہوا تو ہمایوں کی ملازمت اختیار کرلی، تیموری خاندان سے اس کا ننھیالی

رشتہ بھی تھا۔ (بحوالہ اکبر نامہ مؤلف ابو الفضل، جلد دوم، ص 8) بیرم علم کا قدر دان، فن موسیقی کا رسیا، خلیق، ملنسار اور منکسر المزاج تھا۔ ترکی اور فارسی دونوں زبانوں پر انھیں عبور حاصل تھا اور انھوں نے دونوں زبانوں میں شعر کہے ہیں۔ بیرم خان نہایت صاحب ذوق اور سخن شناس تھا، اکثر اساتذہ کے کلام پر اس نے تنقید و اصلاح کی ہے اس کے ساتھ ہی وہ نہایت شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع بھی تھا۔ میدان جنگ میں ایک ماہر جرنیل بہادر سپاہی تھا تو مسند وزارت پر مدبر سیاست داں اور منتظم حاکم تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی کا بھی دور دور تک شہرہ تھا۔ اکبر نے 965ھ/ 1557ء میں جالندھر میں سلطان بیگم کو بیرم خان کے عقد میں دیا تھا۔ سلیمہ ہمایوں کی بھانجی تھی۔ (بحوالہ توزک جہانگیری، ص 114، جہانگیر نامہ کشوری، ص 66، مآثر الامرا، جلد اول، ص 376) بیرم کی وفات پر اکبر بادشاہ نے اس سے شادی کر لی تھی۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 377، منتخب اللباب، جلد دوم، ص 151، جہانگیر نامہ، ص 66)۔

ان عورتوں میں جو باز بہادر کے حرم میں تھیں روپ متی بھی شامل تھی۔ اکبر جب خود تحقیقات کے لیے پہنچا تو اسے دو قیدی عورتوں کی فریاد پہنچی کہ ادھم خاں نے ان کی آبرو ریزی کی ہے۔ اس نے ان عورتوں کو کیمپ میں بلا لیا، لیکن ماہم انکہ نے اپنے بیٹے کے جرم کو چھپانے کے لیے ان مظلوم عورتوں کو قتل کرا دیا۔

- جب اکبر ادھم خاں کی تحقیقات کے لیے چلا تو ماہم انکہ نے ایک قاصد کو اس کی خبر دینے کے لیے بھیجا تھا، لیکن اکبر اس سے پہلے سارنگ پور پہنچ گیا۔ ماہم انکہ بھی دوسرے دن وہاں پہنچ گئی اور مال غنیمت پر قبضہ کر کے ادھم خاں کے معاملہ کو دبا دیا۔
- ادھم خاں کی ہلاکت: دوسری تاریخوں کی روشنی میں یہ حوالے ملتے ہیں کہ ادھم خاں کو خود اکبر نے گھونسہ مار کر نیچے گرا دیا تھا اور خود ہی جا کر ماہم انکہ کو اس حادثہ کی اطلاع دی۔ ''ماہم ہم نے تیرے لڑکے کو قتل کرا دیا ہے''۔ جب وہ مری ہے تو اکبر نے اپنی دایہ کے جنازہ کو کندھا دیا تھا۔ دونوں ماں بیٹے اکبر آباد میں ایک ہی جگہ دفن ہیں۔
- ماہم انکہ: تاریخ کی دوسری کتابوں میں ماہم انکہ کی جگہ پر ماہم اناغہ بھی لکھا ہے۔ ماہم انکہ ہمایوں کے ایک وفادار ملازم ندیم خاں کی بیوی تھی یہ وہ عورت ہے جس نے اکبر کی تربیت اور پرورش کی تھی اور اکبر کے ساتھ بیٹوں کی طرح محبت کرتی تھی۔ ادھم خاں اسی کا لڑکا تھا۔ بایزید لکھتا ہے: ''اس کی ذات میں کوئی خوبی نہیں تھی نہ عقلمند اور نہ ہی ہوشیار تھی۔ اکبر کی دایہ ہونے کی

وجہ سے اس کو اقتدار مل گیا تھا۔ حمیدہ بانو بیگم، اکبر کی حقیقی ماں سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ ابتدائی عہد میں ماہم انکہ صحیح معنوں میں سلطنت کی وزیر اعظم بنی ہوئی تھی، اس کے اشارہ پر بیرم خاں کے مقابلے میں منعم خاں کو آگے لایا گیا تھا۔ اکبر نے عرصہ تک ماہم کے اثر و اقتدار میں بسر کیے۔ جب اس کی عمر 19 سال کی ہوئی تو اس نے اسے اور اس کے بیٹے کو اقتدار سے بے دخل کر دیا۔ ایرانی مورخ انکہ کے لیے اچھے خیال نہیں رکھتا مگر ابو الفضل نے اسے پاک بازی کا گنبد لکھا ہے۔

۱۔ جوبک بیگم: ان کا پورا نام ماہ جوبک بیگم تھا۔ کہتے ہیں یہ کوئی خاندانی عورت نہ تھی۔ جب 1546ء میں حمیدہ بانو بیگم قندھار سے کابل چلی گئی، ہمایوں نے اس سے نکاح کر لیا تھا۔ جب اس کے بطن سے ہمایوں کا دوسرا لڑکا مرزا محمد حکیم پیدا ہوا تو اسے ہمایوں نے بیگم کا خطاب عطا کر دیا تھا۔ حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہوشیار اور بہادر عورت تھی۔ اس نے جس طرح کابل پر قبضہ رکھا اور بڑے بڑے امیروں پر قابو پایا یہ اس کی صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

۱۔ شیخ عبدالقدوس گنگوہی: یہ شیخ محمد بن عارف چشتی کے مرید تھے۔ ان کی ایک کتاب 'انوار العیون' ہے۔ صاحب معارج الولایت نے ان کو ولی ''مادرزاد'' لکھا ہے۔ ان کے پوتے عبدالنبی نے اپنے باپ کے رسالہ ''اباحت سماع'' سے اختلاف کر کے سماع کے خلاف بڑا مدلل رسالہ لکھا تھا۔ یہ وہ عبدالنبی ہے جن کو اکبر نے صدر الصدور بنایا تھا۔ عبدالنبی کو آخر میں اکبر نے ناراض ہو کر قید کر دیا، جس میں وہ 992ھ/ 1574ء میں فوت ہو گیا۔ شیخ عبدالقدوس کی وفات 945ھ/ 1538ء میں ہوئی تھی۔ گنگوہ کے مقام پر آپ کا مزار مبارک ہے۔

۔ ہاتھی کا شکار: ہاتھی کے شکار کے مختلف طریقے تھے۔ ایک طریقہ ''کھیدہ'' کہلاتا تھا۔ اس میں سوار اور پیادہ ہو کر شکار کھیلتے تھے۔ یہ شکار عموماً گرمی کے موسم میں کیا جاتا حا۔ ڈھول اور نقارہ بجا کر ہاتھی کو بدحواس کر دیا جاتا تھا اور اسے اس قدر دوڑایا جاتا تھا کہ وہ تھک جاتا تھا اور کسی درخت کے سایہ میں ستانے کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ شکاری موٹے رسی سے اس کی گردن اور پاؤں کو درخت سے باندھ دیتے، پھر پالتو ہاتھی کے ذریعے اسے مانوس کیا جاتا۔ ایک اور طریقہ ''چور کھیدہ'' تھا۔ پالتو ہاتھی کو جنگلی ہاتھیوں کی چراگاہ میں چھوڑ دیا جاتا تھا اور مہاوت اس پر اس طرح لیٹ جاتا تھا کہ دکھائی نہ دے۔ جب ہاتھیوں کے غول میں داخل ہوتا تو مہاوت کسی ہاتھی پر کمند پھینک کر اسے بس میں کر لیتا اور اپنے ہاتھی سمیت نکال لاتا۔ ایک اور طریقہ ''گاڈ'' ''بار'' اور بہت سارے

دوسرے طریقے بھی تھے۔

آگرہ کا قلعہ: قلعے کی عمارت لال پتھر کی ہے جس کے چاروں طرف خندق ہے۔ فصیل 70 فٹ بلند ہے۔ قلعے کا دور دو میل ہوگا، قلعے میں شاہی محل سرا، دیوان عام، دیوان خاص، مثمن برج، انگوری باغ، حوض، شیش محل مشہور عمارتیں ہیں۔ ان میں شاہ جہاں کی بنائی ہوئی مسجد نہایت خوبصورت ہے۔ یہ مسجد 1058ھ/1648ء میں تعمیر ہوئی تھی۔ ہنٹر نے لکھا ہے "یہ مسجد دنیا کے تمام مسجدوں میں سب سے زیادہ نفیس ہے۔ جہانگیر نے توزک میں لکھا ہے "ایک پرانا قلعہ تھا میرے باپ نے میری پیدائش سے پہلے اس کو گرا کر نیا قلعہ لال پتھر سے بنوایا کہ سیاح اس جیسا قلعہ اور نہیں بتاتے۔ یہ قلعہ پندرہ سولہ سال میں مکمل ہوا۔ اس میں چار دروازے اور دو کھڑکیاں ہیں۔ اس کی تعمیر میں 35 لاکھ روپے جو ایران کے مروجہ ایک سو پندرہ تومان اور توران کے ایک کروڑ پانچ لاکھ "خانی" کے مساوی ہے خرچ ہوا ہے۔

بنگال پر شیر شاہ کے وقت سے پٹھانوں کی حکمرانی چلی آرہی تھی۔ یہ بادشاہ برائے نام دہلی کے ماتحت تھے۔ عدلی شاہ کے زمانہ میں کرانی افغانوں میں سے چند امیر اور سردار دربار سے ناراض ہوکر بنگال چلے گئے اور وہاں خود مختار حکومت بنالی۔ ان کا سردار تاج خاں تھا۔ سلیمان کرانی اس کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے کٹک، بنارس، جگناتھ، کامروپ اور اڑیسہ تک کے علاقے فتح کیے۔ اس کی زندگی تک اکبر نے بنگال کا رخ نہیں کیا۔ یہ نہایت بہادر منتظم اور دیندار حکمراں تھا۔ ڈیڑھ سو عالم اور مشائخ اس کی صحبت میں رہتے تھے۔ وہ تفسیر، حدیث، نماز، روزہ کا شائق اور اوقات کا پابند تھا۔ اس کے بعد پٹھانوں میں خانہ جنگی اور سازشیں شروع ہوگئیں اور بنگال سے مغلوں کا اثر و رسوخ جاتا رہا۔

میر مرتضیٰ شریفی: یہ حضرت علامہ میر شریف جرجان کے خاندان سے تھے۔

فریدون خاں: مرزا حکیم کا ماموں تھا۔

قلعہ بھکر: ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے: قدیم زمانہ میں قلعہ بھکر کا نام "منصورہ" تھا۔ ابوالفضل کی تائید مشہور مؤرخ "ابوالفدا" بھی کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "منصورہ" وہ شہر ہے جو دریائے سندھ کی ایک شاخ سے جزیرہ کی مانند گھرا ہوا ہے۔ یہ اشارہ غالبًا اسی مقام کی طرف ہے جہاں پانچ ندیاں دریائے سندھ سے مل کر بہتی تھیں۔ اس زمانہ میں ملتان سے منصورہ کا فاصلہ بارہ پڑاؤ سمجھا جاتا تھا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شہر بھکر کو ایک مالدار عرب عمر بن حفص نے بسایا تھا اور

خلیفۂ وقت ابو جعفر منصور بن عباس کے نام پر منصورہ نام رکھا تھا۔ مذکورہ قلعہ میں ایک مقام پر ''مقیاس الماءٗ'' یا ''پیمانہ آب'' بنا ہوا ہے۔ یہ بھی غالبًا عرب فاتحین کا نصب کردہ ہے۔ اس سے دریا کے اتار چڑھاؤ کی روزانہ کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ دریائے نیل میں بھی اسی طرح کا ''مقیاس الماءٗ'' یا ''پیمانہ آب'' لگا ہوا ہے جس کا ذکر ناصر خسرو (چوتھی صدی ہجری) اور ابن بطوطہ (ساتویں صدی ہجری) جیسے سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں کیا ہے۔

2۔ رانا اودے سنگھ کا تعلق میواڑ کے راجہ خاندان سے ہے۔ یہ راجہ اپنا سلسلہ انوشیروان سے ملاتے ہیں۔ جہانگیر نے اپنے توزک میں 8 جلوس کے حالات میں رانا امر سنگھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''رانا ہندوستان کے معتبر راجاؤں میں سے ہے۔ اس ملک کے تمام رائے راجا اس کے آباد اجداد کی سرداری کو تسلیم کرتے تھے۔ ایک مدت سے سلطنت اس کے خاندان کے ہاتھ میں چلی آرہی ہے۔ پہلے یہ عرصہ تک مشرقی علاقے کے حکمراں رہے۔ پھر دکن کی طرف رخ کیا اور وہاں کی اکثر ریاستیں فتح کرلیں۔ اور راجہ کی جگہ راول کا لقب اختیار کرلیا۔ پھر میوات کی پہاڑیوں میں داخل ہوئے اور پھر چتوڑ کے قلعہ کو فتح کرلیا۔ اس وقت سے آج تک میرے جلوس کا آٹھواں سال ہے، 1271 سال ہوتے ہیں۔ اس 1010 سال کے عرصے میں اس خاندان کے 26 فرمانروا راول کے لقب سے مشہور ہوئے اور راول سے رانا امر سنگھ تک کہ اب رانا ہے۔ 460 سال میں 26 رانا فرمانروا ہوئے''۔ (جلوس8، توزک جہانگیری)

اس خاندان کا مشہور راجہ سنگرام، رانا سانگا تھا۔ مارواڑ، جودھپور، اجمیر سے لے کر رام پور اور الور تک کے راجہ اس کے باج گزار تھے۔ اس کی حکومت بیانہ سے دریائے سندھ، مالوہ سے میواڑ تک پھیلا ہوا تھا۔ بابر نے اپنی توزک میں یوں لکھا ہے: ''جب میں کابل میں تھا تو رانا نے دوستی کے خطوط لکھے اور یہ کہلوایا کہ آپ دلی پر حملہ کریں میں آگرہ پر حملہ کروں گا۔ لیکن جب میں نے ابراہیم کو شکست دی اور آگرہ بھی فتح کرلیا تو اس نے میری بات تک نہ پوچھی بلکہ کچھ ہی دن بعد کندآباد کا محاصرہ کرلیا''۔

رانا سانگا کے بعد اس کے جانشین کمزور نکلے۔ یہاں تک کہ اکبر نے اودے سنگھ کو شکست دے کر بھگا دیا۔ اودے سنگھ نے بھیل قبیلہ میں پناہ لی اور دشوار گھاٹیوں میں ایک شہر اودے پور آباد کیا۔ وہاں گھاٹیوں میں بندھ باندھ کر ایک جھیل بھی بنائی جو اب بھی اودے ساگر کے نام سے مشہور ہے۔ 42 سال بعد جب وہ مرا تو اس کا بیٹا پرتاپ جانشین ہوا۔ یہ نسبتاً باپ کے زیادہ جری ار

منتظم راجہ تھا۔

22۔ چترانگ نامی ایک راجہ نے اس قلعہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے نام پر یہ چترا کوٹ کہلایا۔ آخر بگڑ کر چتوڑ ہوگیا۔ راجپوتوں کی مشہور ریاست اودے پور کا یہ سولہویں صدی عیسوی تک پایہ تخت رہا۔ اس قلعہ کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ یہاں کے راجپوتوں نے اپنی آزادی قائم رکھنے کے لیے بڑی خونریز لڑائیاں اس جگہ لڑی تھیں۔ مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے اس کو فتح کیا تھا۔ خلجی کے بعد سلطان محمد تغلق نے اور ایک مرتبہ بہادر شاہ والی گجرات نے اس قلعہ کو فتح کیا تھا۔ آخر میں اکبر نے اس پر قبضہ کر کے راجپوتوں کی کمر توڑ دی۔ اکبر کے وقت یہاں کا حکمراں رانا اودے سنگھ تھا۔

23۔ یہ خاتون راجہ بھاڑا مل کی بیٹی تھی جو راجہ مان سنگھ کی پھوپھی ہے اور یہی جہانگیر کی ماں ہے۔

24۔ اس وقت اکبر کی عمر 28-27 سال کی تھی شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک کے کہنے پر اکبر شیخ سلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے دعا کرائی تھی۔

25۔ اس عمارت کا نام رنگ محل تھا۔ اسے اکبر نے شیخ سلیم کے مکان سے متصل مستورات کی قیام گاہ کے لیے بنوایا تھا۔ اسی محل میں شہزادہ سلیم پیدا ہوا تھا۔ بدایونی نے اس کی پیدائش شیخ کے اصل مکان میں بتائی ہے لیکن اکبر نامہ اور مآثر الامرا میں وضاحت سے اس محل کا ذکر کیا گیا ہے۔

26۔ سیکری کے پہاڑ کا نام کوہ اربلی ہے۔ اس کی ایک شاخ کے دامن میں فتح پور آباد ہے۔ سیکری کی آبادی شیخ سلیم اور ان کے مریدوں کے مکانوں سے شروع ہوئی تھی۔ جس غار میں وہ ریاضت کرتے تھے وہ مسجد سنگ تراش میں اب بھی موجود ہے۔ پہلے اس کا نام فتح آباد رکھا گیا تھا۔ اسی جگہ رانا سانگا کو بابر نے شکست دی تھی۔ اسی فتح کی یاد میں یہ نام تجویز ہوا تھا۔ بعد میں یہ شہر فتح پور کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جہانگیر اپنی توزک میں یوں لکھتا ہے ''شہر 15-14 برس کی مدت میں آباد ہوا''۔ لیکن وہ اس نام کی وجہ تسمیہ گجرات کی فتح لکھتا ہے۔

27۔ شیخ سلیم چشتی بابا فرید گنج شکرؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ والد کا نام شیخ بہاؤ الدین تھا۔ آپ کے پردادا شیخ سلیمان پٹن سے لدھیانہ میں آ کر رہنے لگے۔ ان کے انتقال کے بعد 14 سال کی عمر میں آپ اپنے بھائی شیخ موسیٰ سے اجازت لے کر سرہند گئے اور وہاں شیخ مجد الدین سے علم حاصل کیا، وہاں سے عالم اسلام کی سیاحت اور حج کے ارادہ سے روانہ ہوئے۔ تیس سال تک عرب، ایران اور مصر کے اکثر شہروں کی سیاحت کی۔ اس عرصہ میں 14 حج کیے۔ بصرہ میں خواجہ ابراہیم

عرب سے خرقہ حاصل کیا اور شیخ الہند کے نام سے مشہور ہوئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرہند کے قریب بیدآلی میں ڈھائی سال قیام کیا پھر 1533ء میں سیکری تشریف لائے۔ 1554ء میں بحری راستہ سے دوسرا حج کیا اور آٹھ سال حرمین شریفین میں مقیم رہے۔ 1563ء میں ہندوستان واپس آئے۔ شیر شاہ اور سلیم شاہ کے عہد میں آپ کا بڑا اعزاز تھا۔ آپ نے 1563ء میں فتح پور میں خانقاہ تعمیر کرائی۔ یہی خانقاہ شہر فتح پور کی آبادی کا باعث ہوئی۔ آپ کا انتقال جمعرات، 29 رمضان، 979ھ/ 1571ء کو ہوا۔

28۔ شیخ کے مکان میں شمالی دالان کا نام مجلسی دالان تھا۔ یہ انکی نشست گاہ تھی۔ اسی دالان کی چھت پر ایک چھوٹا کمرہ منذف نام کا ہے یہ شیخ کی چلہ گاہ تھی۔ کہتے ہیں اسی میں سلیم پیدا ہوا، دوسرے بیان کے مطابق مکان سے قریب اکبر نے ایک محل تعمیر کرایا تھا۔ اس میں سلیم اور دانیال دونوں پیدا ہوئے۔ (بحوالہ مآثر الامراء، جلد دوم، ص 570، اکبر نامہ، ص 267)

29۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھا ہے کہ ''یہ حسینی حسنی سادات ہیں۔ باپ کا نام غیاث الدین حسن تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد پندرہ سال کی عمر میں ہرون میں جونیشاپور کے علاقے میں ہے، خواجہ عثمان چشتیؒ کی خدمت میں پہنچے اور خرقہ خلافت حاصل کیا۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے بھی فیض اٹھایا۔ جس سال معز الدین سام نے دہلی کو فتح کیا تھا وہ ہندوستان آئے۔ گوشہ نشینی کی خاطر اجمیر پہنچے اور وہاں دین کا چراغ جلایا۔ ہفتہ کے دن 6 رجب 633ھ/ 1235ء میں آپ کا وصال ہوا۔

جہانگیر نے اپنی توزک میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے متعلق یوں لکھا ہے: ''آپ کا مولد شریف سیستان ہے۔ پہلے بخارا گئے اور علوم ظاہری کی تحصیل کی پھر خراسان آئے پھر قصبۂ ھرون (ہارون) میں شیخ عثمان ہارونیؒ کے مرید ہوئے اور ان کے حکم سے ہمیشہ وہ سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت ابراہیم ادھمؒ سے ملتا ہے۔ خواجہ قطب الدین اندجانیؒ آپ کے مرید تھے۔ ان کے مرید شیخ فریدالدین شکر گنج ہیں اور ان کے مرید شیخ نظام الدین اولیاءؒ ہیں''۔

30۔ شاہ مدار: ان کا لقب بدیع الدین تھا۔ یہ شیخ محمد طیفوری بسطامی کے مرید تھے۔ ہمیشہ خلوت میں رہتے تھے۔ ہر پیر کو ملاقات کی اجازت تھی۔ جب لوگ جمع ہوجاتے تو وہ کوئی نہ کوئی داستان سناتے۔ اس داستان میں ہر شخص کو اپنی مراد اور سوال کا جواب مل جاتا۔ انہی سے ''سلسلہ مداریہ'' کے لوگ منسوب رہے ہیں۔ ان کا مزار مکن پور میں ہے۔ ان بزرگ کا زمانہ شیر شاہ کے بعد کا

ہے۔ سلطان ابراہیم شرقی جونپور کے زمانہ میں قاضی شہاب الدین نے ان سے مباحثہ و مجادلہ کیا تھا اور نتیجہ میں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی۔ (بحوالہ آئین اکبری، ابوالفضل، دفتر سوم، ص 173)

31۔ ایک درخت کا نام ہے جو ندی کے کنارے ہوتا ہے، اسے عرب میں ''طرقا'' اور ہندوستان میں ''جھاؤ'' کہتے ہیں۔

32۔ مصنف نے ''افواہ عام'' کا لفظ لکھا ہے وضاحت نہیں کی۔ جاہل لوگ کہا کرتے ہیں ''فرشتوں سے بھی غلطی ہوجاتی ہے''۔ غالباً اسی طرف صاحب تصنیف کا اشارہ ہے۔

33۔ جنگ کے موقعے پر ہندوستان میں استعمال ہونے والا ایک مشہور ہتھیار۔

34۔ احمد آباد. یہ شہر دریائے سابرمتی کے کنارے واقع ہے۔ 810ھ/ 1407ء میں احمد شاہ والی گجرات نے اس کا سنگ بنیاد رکھا تھا۔ احمد شاہ اور محمود شاہ بیگڑہ کے دور میں شہر نے بڑی ترقی کی، گجرات کا دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے یہ دہلی کے بعد دوسرے درجہ کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ یہاں ایک ہزار سے زیادہ مسجدیں اور مقبرے تھے۔ اکبر کے عہد میں احمد آباد صنعت اور تجارت میں بڑی رونق پر تھا۔

35۔ راجہ بیر بر: ان کا اصل نام مہیش داس اور برھمداس دونوں ملتا ہے۔ اس کا باپ کالیداس مادھورام چوبہ فرقے کا برہمن تھا۔ بیر بر کا ایک بھائی موہن رائے چھوٹی عمر میں گنگا میں ڈوب کر مرگیا تھا، دوسرا بھائی گنگا رائے سادھو بن کر نیپال کے جنگلوں میں چلا گیا تھا۔ تیرہ سال کی عمر میں باپ کا بھی انتقال ہوگیا اور وہ بڑی غربت کی زندگی بسر کرنے لگا۔ حسن اتفاق سے راجہ کالنجر کے ایک درباری مہاتلی کی بیٹی سے اس کی شادی ہوگئی۔ جہیز میں کافی مال و دولت ملا اور بیر بر کے دن پھر گئے۔ اسی رشتہ کی بنا پر اس کی مہاراجہ کالنجر کے دربار میں رسائی ہوگئی اور وہ ''اشلوک'' سنانے اور گیت پڑھنے پر مامور ہوگیا۔ اکبر کے دربار میں پہنچنے کے بعد اس کو بڑا عروج حاصل ہوا۔ بیر بر اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا اور اس کا لقب ''مصاحب دانشور'' تھا۔ راگ راگنی میں بھی بڑی مہارت تھی۔ جب پشاور کے مغرب عدم آباد کے پٹھانوں کے خلاف مہم بھیجی گئی تو بیر بر بھی اس مہم کے ساتھ گیا اور اپنی بے تدبیری کی وجہ سے ان گھاٹیوں میں مارا گیا۔ اکبر کو اس کی موت کا بڑا رنج ہوا۔ بیر بر کی وفات 993ھ/ 1585ء میں ہوئی۔ اکبرنامہ اور اقبال نامہ جہانگیری میں اس کے دو لڑکوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک ہرمز رائے تھا جو خدمت شاہی میں رہتا تھا اور 1011ھ/ 1602ء میں وہ شہزادہ دانیال کی خدمت میں آگیا۔ شہزادہ دانیال اسے ''بیر بر ثانی'' کہا کرتا تھا۔

اس کے بڑے بیٹے کا نام لالہ تھا۔ 1010ھ/ 1601ء میں ملازمت چھوڑ کر گنگا کے کنارے وہ سادھو بن گیا۔ لوگوں میں بیربر اور ملا دو پیازہ کے لطیفے بڑے مشہور ہیں مگر میرے خیال میں سب فرضی ہیں۔

36۔ طوطی نامہ: اس کے سنسکرت ماخذ کا نام شک سپتتی یعنی طوطے کی ستر کہانیاں ہے۔ اس کا مؤلف ایک برہمن چنتامنی بھٹ ہے جس نے پورن بھدر کے پنچ تنتر سے عورتوں کی بدچلنی کی کہانیاں لے کر کسی پرانی شک سپتتی کی مدد سے یہ کتاب لکھی۔

37۔ سنگھاسن بتیسی یہ سنسکرت کی قدیم داستان ہے اس کا ہیرو راجا بکرماجیت ہے جس کے نام سے ہندوؤں کا بکرمی سن منسوب ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں بکرماجیت کے تخت پر راجہ بھوج نے مداخلت کی تھی۔ جب بھوج نے بکرماجیت کا سنگھاسن جو 32 پتلیوں کے سروں پر کھڑا ہوا تھا ایک کھنڈر سے نکالا اور اس پر جلوس کرنا چاہا تو ایک پتلی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اس نے ایک داستان سنائی اس طرح پوری 32 پتلیاں 32 داستانیں سناتی ہیں۔ جو سب کی سب راجہ بکرماجیت سے متعلق ہیں۔ انہی داستانوں کا مجموعہ یہ کتاب ہے اور اس کتاب کا سنسکرت میں نام ''وکرم چرتر'' اور سنہاسن وترنی'' ہے اور اس کے مصنف کے متعلق کافی اختلاف ہے۔

38۔ خواجہ امینا: ان کا پورا نام خواجہ امین الدین تربتی تھا۔ تربت خراسان کے رہنے والے تھے۔ ہمایوں کے ایران کے سفر میں خدمت میں حاضر ہوئے۔ بیرم خان کے معتمد خاص تھے، خواجہ جہان کا خطاب اکبر نے انھیں عطا کیا تھا۔

39۔ منتخب التواریخ کے تصنیف کے وقت تک۔

40۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

41۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

42۔ اکبر کے زمانے میں سب سے پہلے کل ممالک محروسہ کی پیمائش کرائی گئی۔ البتہ علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں بندوبست اور مالگذاری کا ایک ضابطہ محاصل ضرور مرتب ہوا تھا۔ ناپنے کے لیے جو جریب استعمال ہوتی تھی وہ پہلے رسی کی تھی۔ اس کے بعد بانس میں لوہے کے حلقے ڈال کر جریب بنائی گئی۔ پہلے لمبائی 50 گز کا تھا اس کے بجائے 60 گز کا طول مقرر کیا گیا۔ کروڑیوں کی بداعمالیوں کی وجہ سے مالگزاری کا یہ بندوبست ناکام رہا، لوگ اس قدر اس سے تنگ تھے کہ گھر گھر اس پیمائش اور کروڑیوں کا رونا تھا۔

43۔ آئین داغ: یہ ترکوں کی قدیم رسم ہے۔ پہلے صرف بادشاہ کی ملکیت کے اظہار کے لیے گھوڑوں پر نشان لگادیا جاتا تھا۔ بہار کے موسم میں داغ کا جشن منعقد ہوتا تھا، بعد کے وقتوں میں یہ فوج میں بھرتی کا قانون بن گیا۔ ہندوستان میں علاؤ الدین خلجی نے گھوڑوں کی حاضری اور شمار کے لیے داغ کا قانون سب سے پہلے رائج کیا۔ فیروز شاہ تغلق نے جاگیرداری کا طریقہ اختیار کیا اور داغ موقوف ہوگیا۔ شیر شاہ نے دوبارہ آئین داغ کو نافذ کیا۔ اس کے بعد اکبر نے ہی اس کو تازہ کیا۔

44۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

45۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

46۔ صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

47۔ جزیہ: اکبر سے پہلے بھی غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا قاعدہ تھا جو کبھی کبھی موقوف بھی ہو جاتا تھا۔ جزیہ کی معافی کا سن 987ھ ہے۔ اکبر کا ہندوؤں سے وہ معاملہ نہیں تھا جو پہلے سلاطین کا رہا تھا وہ انھیں اپنائے رکھنے کی پالیسی پر کاربند تھا۔ چنانچہ جلوس کے پہلے سال ہی اس نے جزیہ معاف کردینا چاہا تھا۔ 9 سنہ جلوس میں دوبارہ جب یہ معاملہ سامنے آیا تو علما کی مخالفت کی وجہ سے اس پر پوری طرح عمل نہ کیا جاسکا۔ لیکن عملاً اکثر مقامات پر جزیہ موقوف ہوگیا۔ 983ھ میں اکبر نے دوبارہ جزیہ لگانے کا حکم دیا۔ لیکن جلد ہی منسوخ کردیا گیا۔ آخر 25 سنہ جلوس 988ھ میں اکبر نے مستقلاً جزیہ کے معافی کا حکم جاری کیا تھا۔

48۔ اہل فرنگ سب سے پہلے اکبر کے دربار میں 979ھ/ 1571ء میں حاضر ہوئے تھے۔ اس وقت ابراہیم حسین مرزا نے بغاوت کرکے سورت پر قبضہ کرلیا تھا۔ اکبر نے جب اس کا محاصرہ کرلیا تو اس نے اپنی مدد کے لیے اہل فرنگ کو بلایا تھا۔ یہ اس کی مدد کو آئے تھے اندر ہی اندر قلعہ پر قبضہ کرلینے کے منصوبے تھے۔ لیکن جب شاہی فوجوں کو فتح ہوئی تو یہ مکار تحفے تحائف لے کر سفیروں کے بھیس میں بادشاہ کے پاس حاضر ہوئے اور خلعت و انعام لے کر رخصت ہوگئے۔ پھر اکبر نے کئی سال بعد خود حاجی حبیب اللہ کاشی کو گوا بھیجا تاکہ وہ یورپ کے تحفے فرنگیوں سے لے کر آئے۔ کاشی یورپ کا ساز و سامان اور اہل ہنر و کمال کی ایک جماعت کو لے کر دربار میں واپس آیا۔

49۔ کورنش: بادشاہوں کے دربار میں سلام کے مختلف طریقے تھے۔ کہیں سینہ پر ہاتھ باندھنے، کہیں سر جھکانے، کہیں دو زانو ہوکر جھکنے کا رواج تھا۔ اکبر کے دربار میں سلام کا طریقہ یہ تھا کہ حاضر

ہونے والا ادب سے آکر سامنے بیٹھے سیدھے ہاتھ کی مٹھی بند کر کے ہاتھ کو پیچھے کر کے زمین پر ٹیکے اور پھر آہستہ سے سیدھا اٹھ کر کھڑا ہوجائے اور سیدھا ہاتھ سر پر رکھ کر اتنا جھکے کہ دہرا ہوجائے، پھر داہنی طرف کو جھوک دیتا ہوا سیدھا ہوجائے۔ اسی کو ''کورنش'' اور تسلیم کہا جاتا تھا۔ اکبر نے یہ طریقہ خود اپنے ایک واقعہ سے اخذ کیا تھا۔ بچپن میں ہمایوں نے ایک مرتبہ اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔ اتالیقوں کے اشارے پر اکبر نے سلام کرنا چاہا، چونکہ تاج بڑا تھا اس لیے اسے سنبھالتے ہوئے جھک کر اور سیدھا ہوکر آداب بجالایا۔ اس وقت سہارے کے لیے مٹھی زمین پر بھی ٹکائی۔ ہمایوں کو اس کی یہ ادا پسند آئی اور اس نے حکم دیا کہ کورنش وتسلیم اسی طرح ہوا کرے۔ اکبر نے اس طرح کورنش کا باقاعدہ آئین مقرر کردیا۔ بعد میں سجدۂ تعظیمی کا حکم دے دیا گیا۔ جہانگیر کے زمانہ میں بھی سجدہ ہوتا رہا۔ جہانگیر نے مجدد الف ثانیؒ کو سجدہ اور کورنش نہ کرنے پر ہی قلعہ میں قید کرادیا تھا۔ شاہ جہاں نے سب سے پہلا حکم اسی سجدہ کی موقوفی کا دیا۔ شاہ جہاں کے دسویں سال میں کورنش بھی بند ہوگئی۔ صرف شرعی سلام دربار کا سلام مقرر کیا گیا۔

50۔ کتاب الاحادیث یہ ملا عبدالقادر بدایونی کی مرتبہ ہے۔ انھوں نے یہ کتاب شاہی ملازمت سے پہلے 976ھ/ 1568ء میں اپنے شوق سے لکھی تھی۔

51۔ متن میں پرکھوتم آیا ہے۔ جب کہ ھندو حضرات میں پرشوتم نام معمول ہے۔

52۔ شیخ زماں: بدایونی نے شیخ زماں لکھا ہے۔ اصل نام عبدالملک لقب امان اللہ تھا، شیخ امان پانی پتی کے نام سے مشہور تھے۔

53۔ ''میری'' مؤلف منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی سے مراد ہے۔

54۔ 'میری' یعنی میں سے مراد 'ملا عبدالقادر بدایونی' ہے۔

55۔ تان سین: تان سین کا اصلی نام ٹانا سینا یا ٹونا ساٹنا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس کی پیدائش اٹلی کی تھی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی پرورش کشمیر میں ہوئی۔ شاید وہ کشمیر ہی میں پیدا ہوا ہو۔ 1567ء میں وہ کشمیر سے لاہور آیا۔ وہاں سے 18 سال کی عمر میں دہلی چلا گیا۔ یہاں ایک بزرگ ملاّ سلامت کے ہاتھ پر مسلمان ہوگیا اور ان کے ساتھ وہ یکم رمضان 1569ء کو پشاور بھاگ گیا۔ لیکن سرکاری آدمی دونوں کو دہلی پکڑ لائے۔ تان سین کے گانے کی دہلی میں بڑی شہرت تھی۔ اس کو یہاں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مُلاّ سلامت کے مرنے کے بعد وہ دہلی سے آگرہ چلا گیا پھر وہ یہاں چھ ماہ ٹھہر کر بہار اور بنگال چلا گیا اور وہاں وہ داؤد شاہ کے دربار میں ملازم ہوگیا۔ داؤد شاہ

کی شکست کے بعد وہ آگرہ لوٹ آیا اور کچھ دن رک کر دربار میں حاضر ہوا۔ تان سین کے یہاں چار بیٹے مختلف بیویوں سے ہوئے۔ ان میں سے تین بیٹے تو مولوی بن گئے اور ایک نے اپنے باپ کے فن کو زندہ رکھا۔ تان سین کا انتقال 1595ء میں ہوا۔ اس کی قبر آگرہ میں تھی جو 1857ء میں تباہ کردی گئی۔

56۔ پرکھوتم: متن میں یہ نام پرکھوتم آیا ہے جب کہ اصل میں یہ نام پرشوتم ہونا چاہیے۔

57۔ نیلاب ندی: سندھ ندی کو نیلاب ندی بھی کہتے ہیں۔

58۔ خواجہ نظام الدین احمد: خواجہ نظام الدین احمد، دور اکبری کے مشہور مورخ ہیں۔ ان کے والد خواجہ مقیم ہروی بابر بادشاہ کے دیوان تھے۔ ہمایوں کے عہد میں وزیر رہے اور مرزا عسکری کے ساتھ گجرات پر مقرر تھے۔ اکبر نے خواجہ نظام الدین احمد کو گجرات اور جونپور میں بخشی گری کا عہدہ عطا کیا تھا۔ ان کی مشہور تصنیف جو تاریخ کے موضوع پر مبنی ''طبقات اکبری'' ہے جو 367ھ سے شروع ہوکر اکبر کے جلوس کے 38ویں سال کے واقعات پر مشتمل ہے۔ اکبر کے حکم سے شائع کتاب ''تاریخ الفی'' میں وہ بدایوانی، حکیم ہمایوں، فتح اللہ شیرازی، ملا احمد اور آصف خاں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ ملا عبدالقادر نے اپنی اس تصنیف میں ''طبقات اکبریٰ'' کو ہی ''تاریخ نظامیٰ'' کے نام سے یاد کیا ہے۔

59۔ دکھن: جس نسخہ سے متن اخذ کیا گیا ہے اس میں دکھن آیا ہے جب کہ لفظ دکن زیادہ مناسب ہے۔

60۔ ناچیز سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

61۔ میں سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

62۔ ہندی: یہ تصنیف سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئی تھی۔

63۔ مجھ سے مراد صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

64۔ آبان: ایران میں رائج پارسی مہینہ کا نام ہے جو سال کا چوتھا مہینہ ہے۔

65۔ معمود آباد: متن میں معمود آباد آیا ہے شاید کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ اصل میں یہ محمود آباد ہے۔

66۔ پیاگ: سنسکرت نام پریاگ ہے جس کو فارسی میں پیاگ لکھا جاتا ہے۔

67۔ مجھے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

68۔ یہاں مجھ سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

69۔ میرے نام سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

70۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

71۔ مرزا محمد حکیم اکبر کا سوتیلا بھائی تھا جو ماہ چوچک بیگم کے بطن سے تھا جو شاہی خاندان کی عورت تو نہیں تھی البتہ کنیزوں کا درجہ تھا۔ ہمایوں نے اس سے نکاح کرلیا تھا۔

72۔ پنڈی: اب اسے راول پنڈی کہتے ہیں اور پاکستان میں واقع ہے۔

73۔ تاریخ نظامی کی روشنی میں یہ اکبر کے تخت نشینی کا 32واں سال تھا۔

74۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

75۔ بہار، حاجی پور، پٹنہ مغل دور حکومت میں الگ الگ صوبے تھے۔ انگریزوں کے عہد میں مارچ 1922ء میں بہار صوبہ بنا جس میں یہ تینوں صوبے ایک ہوگئے۔

76۔ میں: صاحب تصنیف یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

77۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

78۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

79۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

80۔ مجھے یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کو۔

81۔ میری، صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ مجھے، صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

83۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

84۔ مجھے سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہے جس کے مؤلف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

85۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ یعنی ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

86۔ مجھے ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے جو صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

87۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

88۔ میں سے مراد صاحب تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر ہیں۔

90۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

91۔ میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

92۔ میرے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

93۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

94۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

95۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

96۔ میرے سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

97۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

98۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

99۔ میں سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

100۔ مجھے سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہے۔

102۔ میں سے مراد عبدالقادر بدایونی ہے۔

101۔103۔104۔ سبھی جگہ فلاں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

منتخب التواریخ

جلد سوم

فہرست

عہد اکبری کے مشائخین کرام

عہد اکبری کے علماء

عہد اکبری کے حکما

عہد اکبری کے شعرا

عہدِ اکبری کے مشائخین کرام

نظام الدین احمد مؤلف ''تاریخ نظامی'' نے اپنی تاریخ کے آخر میں شاہی دربار سے منسلک امراء کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ میری نگاہ میں ان امیروں میں سے اکثر زندہ، گمراہ اور بدعمل ہیں کیونکہ

من وفائی ندیدم زکسان
گر تو دیدی دعائی من برسان

(میں نے کسی سے بھی کوئی وفا نہیں دیکھی اگر تو نے کوئی وفا دیکھی ہو تو میری دعا ان تک پہنچا دے)

ان امراء کی گمراہیوں کی وجہ سے میں نے اپنے قلم کو ان کے فضول تذکروں میں الجھنے نہیں دیا، بلکہ یہ صفحات اس عہد کے بعض مشائخین کرام کے تذکرے سے شروع ہوتے ہیں۔ دورِ اکبری کے بزرگوں میں سے اکثر رحلت فرما چکے ہیں۔ ان میں سے جو مشہور شخصیتیں ہیں ان کے حالات تحریر کیے جاتے ہیں۔

میاں حاتم سنبھلیؒ

میاں حاتم سنبھلی بہت بڑے عالم تھے۔ مدتوں علوم کا فیض ان کی ذات سے جاری رہا۔ صوری اور معنوی کمالات ان کی شخصیت میں جمع تھے۔ ابھی وہ تحصیل علم میں مشغول تھے کہ

ان پر ''حال'' غالب آ گیا اور قیل و قال کو ترک کر کے اپنے استاد شیخ عزیز اللہ دانشمند طلبنیؒ جو اپنے عہد کے عالم ربانی اور ولی کامل تھے، ان کے مرید ہو گئے۔ شیخ علاؤالدین چشتیؒ دہلوی کی خدمت میں بھی سلوک کے طریقے سیکھے۔ ان دونوں بزرگوں سے تربیت و تعلیم اور مرید کرنے کی اجازت حاصل کی۔ جذب کی ابتدائی کیفیت میں میاں صاحب سنبھل اور امروہہ کے جنگلوں میں دس سال تک ننگے سر ننگے پیر گھومتے رہے۔ اس ساری مدت میں نہ بستر سے پیٹھ لگی، نہ سر کو تکیہ میسر ہوا۔ ذوق سماع ان کی طبیعت پر غالب تھا۔ جب بھی بات کرتے یا مسکراتے تو ''اللہ'' کا کلمہ برابر زبان پر ہوتا۔ آخر جذب و کیفیت کا یہ عالم ہوا کہ راگ سننے کی تاب نہ رہی، راگ پڑھتے ہی بے خودی کے عالم میں کہیں سے کہیں جا پہنچتے۔

960ھ/1552ء میں جب کہ میری عمر صرف 12 سال تھی، میں اپنے والد ماجد کے ساتھ سنبھل میں ان کی خدمت میں گیا۔ ان کی خانقاہ میں ''قصیدہ بردہ'' کا درس ختم کر کے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ انھوں نے تبرکاً ''حنفی'' فقہ کی کتاب ''کنز'' کے چند سبق پڑھائے اور مجھے اپنے خاص مریدوں میں داخل کر لیا۔

میرے والد سے فرمایا کہ ہم نے تمہارے لڑکے کو اپنے استاد شیخ عزیز اللہ کی طرف سے کلاہ اور شجرہ دیا ہے تاکہ اسے علوم ظاہری کا فائدہ بھی پہنچے۔ شیخ ممدوح نے 969ھ/1561ء میں رحلت فرمائی۔ ان کی تاریخ رحلت'' درویشِ دانش مند'' سے نکلتی ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ میرے والد کا بھی اسی سال انتقال ہوا۔ یہ ان کی حسن عقیدت کا ثمرہ تھا۔

شیخ جلال الدین تھانیسریؒ

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے خلیفہ ہیں۔ علوم ظاہر و باطن دونوں پر ان کی گہری نظر تھی۔ کافی عرصے تک دینی علوم کی نشر و اشاعت میں مشغول رہے۔ آخر میں علوم رسمی کو ترک کر دیا۔ جلوت چھوڑ کر خلوت میں جا بسے۔ ان کے اکثر اوقات قرآن پاک کے ختم، نوافل، دعا اور درود ہی میں صرف ہوتے تھے۔ 193 سال کی عمر کو پہنچے تو نہایت کمزور اور ضعیف ہو گئے،

بس ہڈی چمڑا ہو کر رہ گئے تھے:

پیرا از نامرادی رگ چو پیدا شد ز پوست
بہر تعلیم مریدان راستی را مسطر است

اس عمر میں حال یہ ہو گیا تھا کہ بیٹھنے اور حرکت کرنے کی قوت نہیں رہی تھی۔ ہر وقت غذا کی کمی اور کمزوری کی وجہ سے ٹیک لگائے بس غنودگی میں پڑے رہتے تھے، لیکن دل کی قوت کا یہ حال تھا کہ جیسے ہی اذان کی آواز کان میں پڑتی کسی کے مدد کے بغیر جھٹ سے اُٹھ کر کھڑے ہوتے، جوتیاں پہنتے، لاٹھی تھام کر خود طہارت اور وضو کر کے نماز ادا کرتے، یہ قوت جیسے نماز ہی کے لیے پیدا ہو جاتی تھی، چنانچہ نماز سے فارغ ہوتے ہی اسی طرح پھر بستر پر لیٹ جاتے۔

مجھے دو مرتبہ ان کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ پہلی بار تو میں 969ھ/ 1561ء میں آگرے میں ملا تھا جبکہ وہ تھانیسر کے اماموں کی سفارش اور کاربرآری کے لیے تشریف لائے ہوئے تھے۔ دوسری مرتبہ 981ھ/1573ء میں یہ سعادت نصیب ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حسین خان الغ میرزا کا تعاقب کرتے ہوئے تھانیسر پہنچا تھا۔ یہ ملاقات میں نے حسین خان کے ساتھ کی تھی۔ اس وقت مجھے ان کی شخصیت مجسم نور دکھائی دی۔

شیخ جلالؒ نے 989ھ/ 1581ء میں رحلت فرمائی۔

شیخ محمد غوث گوالیاریؒ

شیخ محمد غوث، شیخ طہور اور حاجی حضور عرف حاجی حمید کے مرید ہیں۔ شطاری سلسلے میں ان کا نسب سلطان العارفین شیخ بایزید بسطامیؒ سے ملتا ہے۔

ابتدائی زمانے میں وہ 12 سال تک چنار کے پہاڑی دامن میں مقیم رہے۔ غار اُن کا ٹھکانہ تھے اور غذا درختوں کے پتے۔ اس عرصے میں انھوں نے بڑی سخت ریاضتیں کیں۔ علم واسماء الٰہی میں مقتدا اور صاحب تصوف تھے۔ اس علم کی اجازت ان کو اپنے بڑے بھائی

شیخ بہلولؒ سے جو بڑے صاحب کرامت بزرگ گزرے ہیں، سے حاصل تھی۔ ان دونوں بزرگوں سے ہمایوں بادشاہ مغفرت پناہ کو بڑی مخلصانہ عقیدت تھی۔ ہمایوں کو شاید ہی کسی اور سے ایسی عقیدت رہی ہو انہی سے ہمایوں نے بھی ''دعوت اسماء'' کا طریقہ سیکھا تھا۔

جب شیر شاہ نے اقتدار سنبھالا تو ہمایوں کے تعلق کی وجہ سے وہ شیخ غوثؒ کے خلاف ہو گیا۔اسلئے شیخ گجرات چلے گئے۔ وہاں کے حکام وسلاطین نے سر آنکھوں پر لیا اور وہ سب شیخ کے عقیدت مند رہے۔ شیخ کی کرامتوں اور کمالات باطنی کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ میاں شیخ وجیہہ الدین جیسا متبحر عالم ربانی بھی ان کی بارگاہ تقدس کا حاشیہ نشین بن گیا تھا۔ ان کے دامن فیض سے دہلی، گجرات اور بنگالہ میں کتنے ہی صاحب مرتبہ بزرگ پیدا ہوئے۔ ان کے کمالات روحانی کے آثار اب تک ہندوستان میں باقی ہیں۔

میں[1] نے انھیں سب سے پہلے 966ھ/1558ء میں آگرہ کے بازار میں دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سوار ہو کر جا رہے تھے اور ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں لوگوں نے اتنا ہجوم کر رکھا تھا کہ اس بھیڑ میں کسی کا داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ اس قدر ومنزلت پر ان کے انکسار وتواضع کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو دائیں بائیں گھوم کر اوراس قدر جھک کر سلام کا جواب دے رہے تھے کہ ان کے سر کو لحظہ بھر کے لیے قرار نہ تھا۔ ان کی پشت زین کے تکیہ سے ٹکرائی جاتی تھی۔

اس سال شیخ ممدوح گجرات سے آگرہ آئے تھے۔ اکبر کی نوعمری کا زمانہ تھا۔ وہ ان کی تحریص وترغیب پر ان کے مریدوں میں شامل ہوگیا، لیکن کچھ ہی دن بعد ان کا منکر ہو گیا۔ خان خانان، بیرم خاں اور شیخ گدائی سے ان کی نبھ نہ سکی اس لیے وہ ناراض ہو کر گوالیار چلے گئے۔ وہاں ایک خانقاہ قائم کر کے مریدوں کی تربیت وتکمیل میں مشغول رہے۔ سماع وسرود اور وجد کا بھی ذوق تھا بلکہ انھوں نے سماع کے متعلق رسالہ بھی تصنیف کیا ہے۔

لباس فقر میں بڑے جاہ وجلال والے تھے۔ انکی مددِ معاش ایک ہزار تنکہ تھی۔ جو کوئی ان سے ملنے آتا تھا وہ اس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے تھے۔ غیرمسلموں سے

بھی ان کا یہی سلوک تھا۔ اسی سبب بعض اہل فقر اُن کے مخالف بھی ہو گئے تھے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ان کی نیت کیا تھی:

چون ردو قبول ہمہ در پردۂ غیب است
زنہار کسی را نکنی عیب کہ عیب است

(چونکہ ردّ و قبول بھی پردۂ غیب میں ہے اس لیے کسی کا عیب ظاہر مت کرو کہ یہ خود عیب ہے)

80 سال عمر پا کر 970ھ/1562ء میں آگرہ میں انتقال فرمایا اور گوالیار میں دفن کیے گئے۔ شیخ نہایت سخی اور دریا دل آدمی تھے۔ طبیعت میں بڑا انکسار تھا۔ چنانچہ کبھی اپنے آپ کو "میں" نہیں کہا ہمیشہ خود کو "فقیر" ہی کہا کرتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا کچھ عجیب طرح کا حال تھا کہ جب کسی کو غلہ دیتے تو اس کے وزن کو ظاہر کرنے کے لیے "من" کا لفظ ادا نہیں کرتے تھے بلکہ کہتے تھے اتنے "میم" اور "نون" (من) فلاں آدمی کو دے دو!

شیخ برہانؒ

شیخ برہان بڑے زاہد، متوکل، گوشہ نشین اور مستغنی بزرگ تھے۔ کہتے ہیں وہ میاں الہداد باری کی، جن کا سلسلہ ایک واسطے سے سید محمد جون پوری سے ملتا ہے کی صحبت میں صرف 3 دن رہے اور فقر وفنا کا یہ فیض حاصل کیا، کہ درجۂ کمال تک جا پہنچے۔ نہایت عبادت گزار اور صاحب حضور تھے۔ تقریباً 50 سال تک گوشت بلکہ بہت سی چیزوں کا کھانا پینا ترک کر دیا، صرف تھوڑے سے دودھ اور شیرینی پر گزر کرتے رہے۔ آخری عمر میں تو پانی تک ترک کر دیا تھا۔ دیکھنے میں بس ایک روحانی اور نورانی مجسمہ دکھائی دیتے تھے۔ کالپی میں ان کا حجرہ نہایت تنگ و تاریک تھا۔ اس حجرے میں وہ ہمیشہ ذکر و فکر اور مراقبے میں مشغول رہتے تھے۔ مہدوی طریقہ پر "پاس انفاس" میں مصروف رہتے تھے۔ عربی علوم نہیں پڑھے تھے پھر بھی قرآن کی تفسیر اس بلاغت کے ساتھ فرماتے کہ حیرت ہوتی تھی۔ ان کی صحبت میں دلوں کو کھول دینے والا اثر تھا۔

میں[2] جب چنار کے سفر سے لوٹا، یہ 967ھ/1559ء کا کوئی مہینہ تھا اور عبداللہ

خاں اوزبک کا دور دورہ تھا۔ ایک رات شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بڑی پہنچی ہوئی باتیں کیں اور اپنے ہندی کے شعر جن میں وعظ، نصیحت، تصوف، توحید اور تجرید کے مضامین تھے وہ بھی سُنائے۔

دوسرے دن مہر علی سلدوز جو درویش دوستی کی صفت کے باوجود پورا ترکی تھا اور مردم آزاری، ستم رانی سے باز نہیں آتا تھا۔ میرے ساتھ شیخ کی ملاقات کے لیے آیا، اتفاق یہ تھا کہ جب وہ چلنے لگا تھا تو اس نے اپنے خدمت گاروں اور ملازموں کی خوب پٹائی کی تھی اور ان کو مغلظ گالیاں دی تھیں، جب ہم[1] پہنچے تو شیخ نے سب سے پہلے جو بات فرمائی وہ یہ حدیث تھی

"قال النبی ﷺ المسلم من سلم المسلمون من یدہ ولسانہ"

(رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں)

یہ حدیث پڑھ کر انھوں نے اس کے نکات کے بڑی عالمانہ اور دلکش تشریح کی۔ مہر علی پر ایسا اثر ہوا کہ وہ کھڑا ہوگیا اور اپنے کیے پر نادم و شرمندہ ہوکر توبہ کرنے لگا۔ شیخ سے دعا و فاتحہ کی درخواست کی، کچھ نذرانہ بھی پیش کیا جو شیخ نے قبول نہ کیا۔ شیخ ممدوح کی عمر 100 سال ہوئی ہے۔ انھوں نے 970ھ/1562ء میں رحلت فرمائی۔ میں[1] نے ان کی تاریخ اس مصرعے سے نکالی ہے

"دل گفت کہ شیخ اولیاء بود"

ان کو وصیت کے مطابق اسی حجرے میں دفن کیا گیا جس میں کہ وہ گوشہ نشین رہے تھے۔

شیخ محمد کنبو سنبھلیؒ

قادری سلسلے کے بزرگ تھے۔ راہ سلوک میں انھوں نے بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کی تھیں۔ وجد و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے، خود بھی نہایت خوش آواز تھے۔ جب ان پر حال و کیفیت طاری ہو جاتی تو بے اختیار خود بھی گانے لگ جاتے اور اس درد بھری آواز میں کہ

حاضرین پر رِقت طاری ہو جاتی۔ان کی محفلوں میں سماع کا لطف حاصل ہوتا تھا۔ اس کا خیال اب بھی مجھ(۶) کو سرشار کر دیتا ہے۔

ابتدا میں علوم ظاہری کی تحصیل کی تھی۔ عشق و تعشق کے میدان میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ کسی نہ کسی دلرُبا صورت سے ان کے عشقیہ تعلقات ضرور قائم رہتے تھے۔ اس معاملہ میں ایسے آزادمشرب تھے کہ لوگوں کی انگلیوں کی انھیں کوئی پرواہ نہ ہوتی تھی۔ کھلے بندوں دل کے معاملات میں الجھے رہتے تھے۔ اسی مناسبت سے وہ شیخ محمد عاشق مشہور ہو گئے۔

985ھ/1578ء میں ان کا وصال ہوا۔ ان کی وفات ''ششم از شوال'' سے نکلتی ہے۔

شیخ فخرالدینؒ

ایک گوشہ نشین متوکل عبادت گزار بزرگ تھے، ہمیشہ لوگوں سے دور خلوت میں رہا کرتے تھے۔ ہر جمعہ کو ان کی خانقاہ میں صوفیوں کی مجلس منعقد ہوتی تھی جس میں سماع لازماً ہوا کرتا تھا۔ ان کی محفل سماع میں سماع کا کیسا ہی منکر اور مخالف آجاتا، وجد و حال سے بچ نہیں سکتا تھا۔ شیخ کی مستانہ کیفیت دوسروں کو متاثر کر دیتی تھی۔

اس مجلس کے بعد دسترخوان بچھایا جاتا تھا۔ ان کی مجلس میں چھوٹے بڑے کا کوئی امتیاز نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ اور فقیر برابر کے ہم نشین ہوتے تھے۔ خان خاناں بیرم خاں جمعہ کی نماز اکثر انہی کی مسجد میں ادا کرتا تھا۔ شیخ کی صحبت میں اس پر اکثر اوقات بڑی رقت طاری ہو جاتی تھی۔ خانقاہ کے معمول کے مطابق خان خاناں وہاں نشست و برخاست اور تناول طعام (یعنی کھانے پینے) میں دوسروں سے کوئی امتیاز نہیں برتتا تھا۔

شیخ عزیز اللہؒ

معرفت الٰہی اور عشق خداوندی کے سرتاپا مظہر تھے۔ صفائی قلب اور سوز و گداز ان کے بشرہ سے عیاں تھا۔ صاحب ذوق ایسے کہ دن رات گریہ و زاری کرتے رہتے تھے۔ گانے کی بھنک بھی ان کے کان میں پڑ جاتی تو اس طرح بے قرار ہو جاتے جیسے کسی نے ان کے

باطن میں آگ لگا دی ہو۔ ان کے یہاں صبح و شام سماع کی محفل جمی رہتی تھی، اس وقت ان کا یہ عالم رہتا تھا کہ اگر پتھر پر بھی اس عالم میں نگاہ پڑ جائے تو پانی بن جائے۔

اپنے والد بزرگوار شیخ حسن سے بیعت تھے۔ اپنے بڑے بھائی شیخ محمد حسن سے جو شیخ امان پانی پتی کے پیر تھے، انھوں نے فیض حاصل کیا تھا۔ طبیعت میں عجز و انکسار بہت تھا۔ خدمت خلق کا بڑا خیال و اہتمام کرتے تھے۔ اگر وہ چلّے میں بھی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی محتاج شخص خواہ وہ کسی غیر مسلمان کے پاس سفارش کے لیے لے جانا چاہتا تو حجرۂ اعتکاف سے نکل آتے اور اس کے گھر دور دراز کی مسافت طے کر کے پیدل ہی چلے جاتے۔ حاجت برآری کے بعد لوٹ کر پھر اعتکاف میں بیٹھ جاتے، گویا اس سے ان کا چلہ نہیں ٹوٹتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی عبادتوں پر لوگوں کی حاجت روائی کو مقدم سمجھتے تھے۔ اگر کوئی کافر یا ظالم حاکم ایک بار کہنے پر ان کی سفارش کو قبول نہ کرتا یا جان بوجھ کر گھر سے ملاقات کے لیے نہ نکلتا تو وہ سارا دن اس کے انتظار میں وہیں بیٹھے رہتے۔ پھر بھی ملاقات نہ ہوتی تو دوسرے دن جانے کے لیے انکار نہ کرتے اور بے تکلف اس طرح چلے جاتے جیسے ان کو کسی طرح کی کدورت نہیں ہوئی۔ ان کے اس انکسار کو دیکھ کر وہ شخص شرمندہ ہو جاتا اور ان کے پاؤں پر گر پڑتا اور اس حاجت مند کی حاجت پوری ہو جاتی۔

ایک دن شیخ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر حسب معمول مجلس سماع میں بیٹھے تھے کہ اچانک ایک دیوانے شخص نے چیخ ماری اور شیخ کو جھولی بھر کر اٹھا لیا اور سر کے بل ان کو زمین پر پٹک دیا۔ ان کی دستار کھل کر گر گئی۔ لیکن ایسا ضبط وتحمل تھا کہ چہرے پر ناگواری کا ذرہ برابر بھی اثر نہ تھا۔ اس کے وجد وحال کا خیال کر کے کوئی تعرض نہ کیا۔ اس پاگل نے دوبارہ یہی حرکت کی تو شہر کے حاکم نے اسے سزا دینے کا ارادہ کیا شیخ نے اسے اپنی حمایت میں لے لیا اور بڑی عذر خواہی کر کے اسے سزا سے بچا لیا۔

علوم ظاہری میں ان کی بڑی دسترس تھی۔ اپنے شاگردوں کو عموماً ''تفسیر عرائس، عوارف اور فصوص الحکم'' نیز ان کی شرحیں پڑھایا کرتے تھے۔ شیخ امان پانی پتی نے ایک رسالہ ''غیریہ'' لکھا تھا۔ اس کے جواب میں شیخ عزیز اللہ نے ایک رسالہ ''عینیہ'' کے نام

سے لکھا، اس رسالہ میں نظریۂ ''وحدت الوجود'' کے بڑے اہم نکات بیان کیے ہیں۔

جس زمانے میں خان خاناں کی سرکشی کے قصے چل رہے تھے، کچھ عرصہ تک اور اس کے بعد بھی چند سال تک میں[6] نے ان کی خدمت میں تصوف کی بعض کتابوں کی سماعت کی تھی۔ 975ھ/1567ء میں وہ عالم فنا سے عالم بقاء کوتشریف لے گئے۔ ان کی وفات کی تاریخ ہے۔

''قطب طریقت نماند'' (قطب طریقت حیات نہیں رہے)

اپنے رسائل و تصنیفات اور خطوط میں وہ ہمیشہ خود کو ''ذرۂ ناچیز عبد العزیز'' لکھا کرتے تھے۔ اس لیے ان کی تاریخ کسی نے ''ذرۂ ناچیز'' سے بھی نکالی ہے۔

شیخ سلیم چشتیؒ

حضرت شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد میں سے ہیں۔ ان کا اصل تعلق دہلی سے تھا۔ سلسلہ بیعت میں خواجہ ابراہیم سے متعلق تھے۔ خواجہ ابراہیم 6 واسطوں سے خواجہ فضیل بن عیاضؒ کے سجادہ نشین ہوئے ہیں۔

شیخ سلیم خشکی اور تری کے راستوں سے 2 مرتبہ حرمین شریفین کی زیارت و طواف کے لیے ہندستان سے تشریف لے گئے تھے۔ روم، بغداد، شام، نجف اور مغرب کے دوسرے شہروں کی سیاحت بھی کی تھی۔ وہ سال بھر سیر و سیاحت میں رہتے تھے لیکن حج کے زمانے میں مکہ ضرور پہنچ جاتے تھے۔ اس طرح انھوں نے 22 حج ادا کیے۔ 14 حج اپنی سیاحت کے پہلے دور میں اور 8 حج دوسرے دور میں۔ آخری بار جب حرمین شریفین پہنچے تو چار سال مکہ معظمہ میں اور چار سال مدینہ طیبہ میں مقیم رہے۔ جس زمانے میں وہ مکہ میں مقیم تھے، میلاد کا زمانہ تو مدینے میں گزارتے اور حج کا موسم مکہ میں گزارتے تھے۔ اس آخری دورہ میں شیخ یعقوب کشمیری بھی ان کے ساتھ تھے۔ قیام کی تاریخ انھوں نے یوں کہی تھی:

شکر خدا را کہ بہ محض کرم　　منزل باشد حرم محترم

ہر کہ پرسید ز تاریخ سال سخن اجناہ دخلنا الحرم

بلادِ عرب میں شیخ سلیم'' شیخ الہند'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی عمر 95 سال کی ہوئی، ساری عمر انھوں نے شریعت نبویؐ کے اتباع میں بڑی بڑی ریاضتوں اور سخت مجاہدوں میں گزاری۔ ایسی ریاضت مشائخین کے عہد میں سے کسی اور نے کم ہی کی ہو گی۔ غسل روزانہ کرتے تھے۔ طہارت کا بڑا اہتمام کرتے تھے۔ کبھی نماز پنجگانہ فوت نہیں ہوئی۔

جب شیخ امان پانی پتی ان سے ملنے آئے تو پوچھا سلوک و طریقت کا مقصود آپ کو استدلال کے ذریعہ ملا یا کشف کے ذریعے؟ انھوں نے جواب دیا'' ہمارے مسلک کا تعلق بس دل ہی سے وابستہ رہا''۔

بہت سے اہل کمال شیوخ نے ان کے دامن تربیت سے استفادہ کیا، ان کے قائم مقام بنے۔ ان تربیت یافتگان میں ایک شیخ کمال الوری تھے۔ یہ نہایت بوڑھے آدمی تھے لیکن دل میں عشق الٰہی کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ایک اور بزرگ شیخ پیارے بنگالی ہیں جو بنگالہ کے شہروں میں بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح شیخ فتح اللہ ترین سنبھلی، شیخ رکن الدین اجودھنی اور حاجی خادم ہیں جو فتح پور کی خانقاہ کے منتظم اور ان کے خلیفہ ارشد ہیں۔

جس زمانے میں کہ شیخ دوسری مرتبہ ہندستان تشریف لائے تھے، مجھے پتہ چلا کہ وہ عربی انشاء میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ میں نے ان کی آمد کی تاریخ نکالی اور عربی میں مبارک بادی کا خط لکھ کر بدایوں سے بھجوایا تھا۔

976ھ/ 1568ء میں شیخ اعظم بدایونی کے واسطہ سے جو ان کے چچا کا لڑکا اور داماد تھا، خدمت میں حاضر ہوا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران مجھ[7] سے پوچھا کہ احادیث میں حضور اکرم ﷺ اور شیخینؓ کی قبروں کا حال کس طرح بیان کیا گیا ہے؟ میں نے کہا'' احادیث میں تو اس طرح ذکر ہے اور بعض نے اس طرح بیان کیا ہے''۔ شیخ نے کہا سہروردی نے '' واقعہ صاعقہ'' میں تینوں قبروں کی صورت بیان کی ہے اور پہلے قول کو ترجیح دی ہے۔

میں[8] حسب ارشاد 2 روز شیخ اعظم مذکور کے ہمراہ پرانی خانقاہ کے حجرے میں مقیم

رہا۔ اس دوران میں نے تفصیل سے گفتگو نہ کی، پھر اجازت لے کر پشاور چلا گیا۔ اس کے بعد 978ھ/1570ء میں نے بھی کئی بار حاضری دی۔

میں[۹] نے شیخ کی جو کرامت دیکھی وہ یہ تھی کہ فتح پور کے اس پہاڑ میں جہاں سردی کا موسم نہایت سخت ہوتا ہے سوائے ایک باریک کرتے اور ململ کی چادر کے وہ دوسرا کوئی کپڑا نہیں پہنتے تھے۔ ہر روز دو مرتبہ غسل کرتے تھے۔ چلہ میں وصال کے روزے رکھتے تھے اور صرف آدھے تربوز بلکہ اس سے بھی کم پر گزر کر لیتے تھے۔

شیخ سلیم کی وفات 979ھ/1571ء میں واقع ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ ہندی'' ہے۔

شیخ نظام الدینؒ امیٹھی وال

امیٹھی لکھنؤ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ نظام الدین اس قصبہ کے رہنے والے اور شیخ معروف چشتی کے شاگرد اور مرید ہیں۔ ان کا سلسلہ شیخ نور قطب عالم سے ملتا ہے۔ پہلے اکتسابی علوم کے طالب علم رہے، لیکن ان کی فطرت بلند پرواز تھی اس لیے علوم ظاہری سے فیوض باطنی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ہمیشہ آنکھیں بند کیے اللہ سے لو لگائے رہتے تھے۔ ذکر اور باطنی توجہ سے کبھی غافل نہ رہے۔

یک چشم زدن غافل ازان ماہ نباشم
ترسم کہ نگاہی کند آگاہ نباشم

(میں پلک جھپکنے کے وقت تک بھی اس معشوق سے غافل نہیں رہنا چاہتا، کیونکہ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مجھ پر نظر کرے اور میں آگاہ نہ رہوں)

تھوڑی ہی مدت میں اپنے پیر سے ارشاد و تکمیل کی اجازت لے کر قصبۂ امیٹھی میں آ کر رہ گئے۔ یہاں وہ بڑے توکل و قناعت سے گزارا کرتے تھے۔ خاص و عام سے دور ہی رہتے تھے، جامع مسجد کے سوائے کہیں اور نہیں جاتے تھے، البتہ کبھی کبھی خیرآباد شیخ سعد کے مزار کی زیارت اور شیخ صوفی کے خلیفہ اللہ دیہ سے ملنے چلے جاتے یا گوپامئو میں اپنے

خاص مرید قاضی مبارک گوپا موی سے ملنے چلے جاتے۔ قاضی صاحب بھی بڑے متقی، صاحب کمال اور دولت مند آدمی تھے۔ قاضی مبارک جب طالب علم تھے تو انھوں نے شیخ کو اپنے والد کی خانقاہ میں دیکھا تھا اور ان میں بڑے اثر و جذب کو محسوس کیا تھا۔ شیخ عبد الغنی سے ملنے کے لیے وہ فتح پور بھی گئے تھے۔ شیخ عبد الغنی بھی بڑے صاحب مرتبہ بزرگ تھے۔ جس وقت بھی شیخ نظام الدین شیخ اللہ دیہ کی خانقاہ میں جاتے تو ان کی خدمت میں ایک روپیہ یا ایک تنکہ یا کوئی اور چیز بطور ہدیہ ضرور پیش کرتے۔

کہتے ہیں ایک مرتبہ انھوں نے شیخ اللہ دیہ کے لڑکے شیخ ابوالفتح کے ہاتھ میں جو اپنے والد کے سجادہ نشین ہیں، ابن عربی کی ''فصوص الحکم'' دیکھی، شیخ سے یہ کتاب چھین کر رکھ لی اور انھیں کوئی دوسری کتاب دے کر کہا: ''اس کا مطالعہ کیا کرو''۔

عبادات ومعاملات میں وہ ہمیشہ ''احیاء العلوم''، ''عوارف''، ''رسالہ مکیہ''، ''آداب المریدین'' اور اس جیسی دوسری کتابوں سے ہی رجوع کیا کرتے تھے۔ ان کا معمول تھا کہ جمعہ کی نماز سے پہلے ظہر کی نماز باجماعت پڑھ لیتے تھے، اس کے بعد جمعہ کی جماعت کرتے تھے۔ ان کے جمعہ کے خطبے میں بادشاہ کا ذکر قطعاً نہیں آتا تھا۔

میں[10] نے ایک بار دیکھا کہ انھوں جمعہ کی نماز جوتے پہنے ہوئے ادا کی اور فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ نے بھی جوتے پہن کر نماز ادا کی تھی۔ ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ان سے کافیہ کی کتاب تبرکاً پڑھنی چاہی لیکن شیخ نے اغماض برتا، جب اس نے بڑی عاجزی اور اصرار کیا تو جواب دیا: ''کوئی دینی کتاب پڑھو''۔ اس نے کہا یہ بھی تو دینی کتاب ہے اور علم دین کا اس پر انحصار ہے''۔ یہ سن کر شیخ کو جذبہ آگیا اور فرمایا علم دین کا اس کتاب پر کس طرح انحصار ہو سکتا ہے کہ جس میں پہلی بحث ہی یہ ہے کہ اس کے مصنف نے کسر نفسی کے طور پر خدائے عز و جل کی حمد ہی درج نہیں کی۔

شیخ بہت کم مرید کرتے تھے۔ کوئی شغل نہیں بتاتے تھے۔ تلقین بھی بہت کم کرتے تھے۔ ان کے معزز مریدوں میں سب سے بڑے شیخ حاتم گوپا مئوی تھے۔ یہ بھی قاضی مبارک کی خانقاہ میں طالب علم تھے۔ انھیں اسی خانقاہ سے شیخ نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

شیخ حاتم کو کبھی کبھی درس دیا کرتے تھے۔ کبھی کوئی کتاب عطا کر دیتے اور دوسرے مشاغل کی تلقین بھی کرتے، اس طرح انھوں نے حاتم کو بالکل اپنا مطیع بنا لیا تھا۔ انھیں دستار، جوتے اور کپڑے بھی عطا کرتے رہتے تھے۔ قاضی مبارک اور دوسرے طالب علموں نے جب یہ عنایات دیکھیں تو وہ شیخ حاتم سے جلنے لگے، شیخ نے ان کی دلی کیفیت بھانپ لی اور فرمایا ''میں کیا کروں اللہ کی یہی مرضی ہے کہ اسے پھٹے کپڑوں، پرانے جوتوں اور مفلسی کے باوجود اللہ کی نعمت خاص عطا ہو''۔ چنانچہ انھوں نے شیخ حاتم کے لیے اپنے پورے اثر وجذب سے کام لیا کہ تھوڑی ہی مدت میں وہ درجۂ کمال تک پہنچ گیا۔ شیخ حقائق و معارف کی گفتگو صرف شیخ حاتم سے کیا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد شیخ حاتم کی حالت میں تنزل ہونے لگا اور اس سے بعض لغزشیں سرزد ہوگئیں۔ بعد میں پھر اس نے اپنی حالت سنبھال لی اور شیخ کے پاس وہی مرتبہ حاصل کرلیا۔ جب وہ حضرت کی خلافت اور وراثت کا پوری طرح اہل بن گیا تو خدا نے اسے دنیا سے اٹھا لیا۔ شیخ نے اس کو یاد کرکے بارہا فرمایا کہ: ''خدا کا ایک بندہ تھا کہ میں جب بھی اس سے خدا کی باتیں کہتا تھا وہ سمجھ جاتا تھا، وہ بھی اٹھ گیا۔ اب میں کس سے یہ بات کروں''۔

جس زمانہ میں میں[11] شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اس وقت شیخ اپنے سالے عبد الرزاق کو جو بعد میں ان کے خسر بھی ہو گئے تھے گفتگو میں مخاطب کرتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے بیٹے شیخ محمد کو بھی واسطہ بنا کر خطاب کیا کرتے تھے۔ شیخ محمد اب ان کے سجادہ نشین اور قائم مقام ہیں۔

محمد حسین خان مرحوم کو جس کے حالات میں[12] نے تاریخ میں بیان کیے ہیں، انھیں حضرت سے بڑی عقیدت تھی۔ حسین خان اور میرے[12] اچھے روابط تھے۔ جس وقت اسے لکھنؤ جاگیر میں ملا تھا تو میں[12] اس سے ملا تھا۔ 976ھ/1568ء میں سید اصغر بدایونی اور قاضی مبارک گوپامئوی کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ پہلی ہی ملاقات میں شیخ ہر شخص سے ایسی بات کرتے تھے جو اس کے حالات سے عین مطابقت رکھتی تھی۔ ان کی زبان پر ہمیشہ الحمد اللہ، سبحان اللہ، لا الہ الا اللہ، بسم اللہ،

لاحول ولاقوۃ الا باللہ، قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث یا کسی بزرگ کا قول ہی رہتا تھا۔ سید اصغر سے مصافحہ کیا تو درود پڑھا، قاضی احمد سے ملے تو سبحان اللہ کہا، میری[12] باری آئی تو بسم اللہ، اسی طرح ہر ایک کے مطابق کوئی نہ کوئی کلمہ ارشاد فرمایا۔ اسی اثناء میں کہ ابھی وہ گفتگو نہ کر پائے تھے کہ ایک غریب طالب علم نہایت برے حال میں آ کر ملا۔ اس سے مل کر شیخ نے **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھا۔ پھر شیخ عبدالرزاق کو مخاطب کر کے "**کل شئ ھالک الاوجھه**" کی تفسیر بیان کرنے لگے۔ وہ ہاں ہاں کرتے جاتے تھے۔ کبھی بطور تلمیح کسی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے تھے۔ کسی اور کو خوف اور رعب کے مارے بات کرنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میں بھی مبہوت بنا سن رہا تھا اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کر کے ڈر رہا تھا کہ ایسا نہ ہو میرے[12] پوشیدہ حالات حضرت پر منکشف ہو گئے ہوں اور وہ اسے ظاہر فرما دیں۔ اسی ڈر سے میں[12] مجلس سے نکل بھاگنے کی فکر میں تھا کہ وہ طالب علم بول اٹھا، اس آیت میں "**وجھه**" کی ضمیر کسی اور چیز کے لیے آئی ہو جیسا کہ بعض اہل معرفت نے بیان کیا ہے۔ اس کی بات سن کر حضرت جلال میں آ گئے۔ ان کا چہرہ تمتمانے لگا اور فرمایا میں نے اس شیطان سے ملتے ہی تعوذ پڑھا تھا چنانچہ دیکھ لو اس کی شیطانیت ظاہر ہو گئی۔ چونکہ وہ جان چکے تھے کہ اس کے اعتراض کے پیچھے کون سی بات چھپی ہوئی ہے۔ اسی لیے بار بار **لا حول و لا قوۃ الا باللہ** پڑھا۔ پھر قصیدہ بردہ کا یہ شعر پڑھا

یا لائمی فی ہول العذری معذرۃ

منی الیک و لو انصفت لم تلم

شیخ پر اس وقت بڑا جلال طاری تھا۔ آخر آپ نے حکم دیا کہ اسے مجلس سے اٹھا دو۔ پھر اسے اپنے پاس بلا کر ملائمت کا اظہار کیا۔ حاضرین کو یہ واقعہ دیکھ کر بڑی عبرت ہوئی۔ وہ رات ان کی خانقاہ میں، میں[12] نے بڑی مشکلوں سے کاٹی اور بھاگ جانے کے لیے بے چینی سے صبح کا انتظار کرنے لگا۔ خدا خدا کر کے رات کٹ گئی۔ ابھی اتنا اندھیرا تھا کہ بغیر چراغ کے ایک دوسرے کے چہرے کو پہچاننا مشکل تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ ابھی رات

باقی ہے۔ حضرت نے صبح کی نماز پڑھائی جب سورج نکلا، حضرت حجرے سے باہر تشریف لائے اور مسجد کے دروازے پر کھڑے ہوکر ہم تین مہمانوں کے لیے شیخ محمد کو کھانا لانے کا حکم دیا۔ میرے اضطراب کا یہ حال تھا کہ میں ہر لحہ شیخ محمد کو واسطہ بنا کر رخصت ہونے کی اجازت حاصل کرنا چاہتا تھا، حضرت شیخ ایک ہاتھ میں قرآن پاک اور دوسرے ہاتھ میں نمک لیے ہوئے کسی بات کے ضمن میں آیت کریمہ **"واعدولهم ما استطعتم من قوة و من رباط تحیل"** کی وضاحت کر رہے تھے، میری روانگی کی اجازت کو ٹال گئے۔ ایک اور بات کہ میں حسین خان کو جو اس وقت اسولی کے پرگنہ میں تھا بڑی توجہ سے یاد فرمایا اور کہا ''وہ میرا طوطا ہے''۔

حضرت بڑے فیاض تھے امیر ہو یا فقیر ہر ایک کو کچھ نہ کچھ نقد یا نمک یا کوئی اور چیز ضرور دیتے تھے۔ مجھے[12] انھوں نے ایک تنکہ عنایت فرمایا تھا۔ اس سفر میں میں[12] نے ان کی ایک کرامت بھی دیکھی۔ جس وقت ہم تینوں آدمی انبیٹھی، حضرت سے ملنے جارہے تھے وہ صورت سے فقیر معلوم ہو رہا تھا۔ ہمارے پہنچے کے بعد وہی شخص اسی طرح حاضر ہو کر حضرت کے دروازہ پر آیا اور سوال کرنے لگا۔ بڑی عاجزی اور لجاجت کی لیکن حضرت نے اسے کچھ نہ دیا۔ حاضرین جو ان کی سخاوت اور دریادلی سے واقف تھے انھیں نہایت تعجب ہوا۔ انھیں متعجب دیکھ کر حضرت نے اچانک فرمایا ''اس چور کو دیکھو کہ راہزنی بھی کرتا ہے اور فقیری بھی'' پھر آپ نے اسے مجلس سے نکال دیا لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ اس وقت ہم نے جو غور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہ وہی شخص ہے جو چوری میں پکڑا گیا تھا۔ ایسا ہی ایک واقعہ دوسرے دن بھی پیش آیا جس کا ذکر طویل ہو جائے گا۔

رمضان کی آخری تاریخ کو حسین خان کے ہمراہ ہم لوگ پرگنہ سے حملہ کرتے ہوئے انبیٹھی پہنچے۔ ہم یہ چاہتے تھے کہ فجر کی نماز شیخ ممدوح کے پیچھے ادا کریں اس لیے تیزی سے کوچ کرتے رہے۔ صبح ہو چکی تھی، ابھی 3 کوس باقی رہ گئے تھے۔ ہمیں جماعت کے فوت ہو جانے کا افسوس ہوا اور ہم نے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا یہاں تک کہ طلوع آفتاب سے بس کچھ ہی پہلے شیخ موصوف کی مسجد میں پہنچے۔ اس وقت گھر سے باہر تشریف

لائے، جماعت قائم کی اور نماز پڑھائی۔ ایسا گمان ہو رہا تھا کہ وقت باقی نہیں رہا۔ تاہم ہمیں جماعت کا شرف حاصل ہوگیا۔ اتنی دیر سے جماعت کرنا حضرت کے معمول کے خلاف تھا کیونکہ وہ ہمیشہ صبح کی نماز ایسے وقت ادا کرتے تھے کہ ابھی صبح صادق کے طلوع کا بس گمان ہی ہوتا تھا۔ اسی دن شام کو انھوں نے مسجد میں تصوف پر تقریر کی اور خواجہ حافظ کے چند شعر پڑھے۔ بیان کے دوران حسین خان مرحوم کے ایک ساتھی نے پوچھا ''خواجہ حافظ کس کے مرید تھے؟'' فرمایا ''خواجہ نقشبندی کے'' کسی بات پر ایک شخص نے پوچھا ''گھوڑے کا گوشت امام اعظم کے مسلک میں حلال ہے''۔؟ آپ نے فرمایا ''امام اعظمؒ نے خود گھوڑے کا گوشت کھایا تھا''۔ جب آپ اس شعر پر پہنچے

صوفیان در دمی دو عید کنند
عنکبوتان مگس قدید کنند

مجھے اپنے خلوص پر پورا بھروسا تھا اس لیے میں نے بالکل ہی خالی ذہن ویسے ہی پوچھ لیا ''دو عید سے کیا مراد ہے''؟ یہ سوال انھیں پسند نہ آیا اور فرمایا، یہ بات بایزید اور جنید کے پوچھنے کی ہے، شبلی اور منصور کے پوچھنے کی ہے تو کہاں اور یہ سوال کہاں؟ پھر اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی باتیں بتائیں۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکالیا اور بڑا نادم ہوا۔ حسین خان حیرت سے دانتوں میں انگلی دابے میری طرف دیکھ رہا تھا اور تمام ساتھی حیرت زدہ رہ گئے تھے۔ میری خوش نصیبی سے اس وقت عید کے چاند کے دکھائی دینے کا شور بلند ہوا اور لوگ مبارک باد دینے اور مصافحہ کرنے میں مشغول ہوگئے۔ مجھے[12] موقع مل گیا اور میں وہاں سے کھسک کر مغرب کے وقت اس خیمہ میں جو مسجد سے متصل باغ میں لگا ہوا تھا نہایت رنجیدہ اور اداس چلا گیا اور زندگی سے بس بیزار ہوگیا۔ حضرت شیخ جب اندر تشریف لے گئے اور مہمانوں کے لیے انھوں نے دسترخوان لگوایا تو اس وقت پوچھا ''فلاں کہاں ہے؟ ان کے لڑکے شیخ محمد نے جواب دیا: ''وہ اپنی اس گستاخی کی وجہ سے مسجد میں ٹھہر نہیں سکا اور چلا گیا ہے۔ جماعت میں بھی وہ شریک نہیں تھا۔ یہ سن کر حضرت نے اپنے سامنے سے کھانا اور حلوہ اٹھا کر تبرکاً میرے لیے بھجوایا''۔ اس وقت مجھے بڑی

تسکین اور اطمینان حاصل ہوا اور معافی کی امید بندھ گئی!

صبح سویرے ہی حسین خان عید کے لیے لکھنؤ چلا گیا اور میں امیٹھی میں اکیلا رہ گیا۔ حضرت شیخ نے مسجد ہی میں عید کی نماز ادا کی اور نماز کے بعد کتاب ''عوارف'' کا درس دینے لگے۔ اسی موقع پر شیخ محمد نے میرا قصور معاف کرنے کے لیے سفارش کی۔ حضرت نے سبق بند کر دیا اور بڑی مہربانی اور شفقت سے ہم[12] سے بات کی۔ میں[12] نے روتے ہوئے ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ حضرت نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور کہا: ''میرے دل میں کسی کی طرف سے دشمنی اور کینہ نہیں رہتا۔ میں کسی کو کچھ کہتا ہوں تو صرف نصیحت اور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہی کہتا ہوں اور رسول اللہ کی طرح جس کسی کو سخت بات کہہ دیتا ہوں تو اس کا نتیجہ بھلائی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اگر کسی پر لعنت بھی بھیجوں تو وہ رحمت بن جاتی ہے''۔ پھر آپ نے اپنے سر سے ٹوپی اتار کر مجھے عنایت کی اور پاس کے حجرے میں مجھے اپنے ساتھ تنہا لے کر گئے اور فرمایا: ''میرے سامنے وضو کر کے دو رکعت نماز پڑھو''۔ یہ دوگانہ میں نے ایک عجیب ہی حالت میں ادا کیا۔ حضرت نے فرمایا ''لوگ مجھے کہتے ہیں کہ میں طالبوں کو تلقین نہیں کرتا میں انھیں کیا تلقین کروں، میری تلقین تو بس یہی ہے کہ زبان پر خدا کا ذکر رہے اور دل شکر گزار رہے''۔ اس کے بعد بس حضرت کا دریا جوش میں آ گیا اور بہت سی باتیں بیان کیں۔ اس موقع پر حضرت کی روش کے برخلاف کسی نے ہندی راگ چھیڑ دیا تھا اور اسے سن کر دو سندھی درویش نہایت درد بھری آواز میں آہ و فریاد کرنے لگے۔ اس وقت میرے دل پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ[12] پر حال طاری ہو گیا۔ حضرت نے فرمایا کہ: ''صحابہ جب نو مسلم بدوؤں کو دیکھتے تھے کہ وہ قرآن مجید سن کر بری طرح رونے لگتے ہیں تو خود پر افسوس کیا کرتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے فرمایا کرتے تھے۔ ''**کنا نحن امثالکم ثم تست قلوبنا ای ثمکنت و استقرت قلوبنا**'' (ہم بھی تمہارے ہی جیسے تھے لیکن اب ہمارے دل ٹھہر گئے ہیں) اس کے بعد حضرت نے کچھ اور باتیں بیان کیں جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ پھر آپ نے مجھے[12] یہ دعا پڑھنے کی اجازت دی جسے میں[12] ہمیشہ پڑھتا رہتا

ہوں "اللهم انی اعوذبک من الصم والبکم والجنون والجذام والبرص"۔

جب میں[12] حضرت سے رخصت ہوکر لکھنؤ میں آکر مقیم ہوگیا تھا، کبھی نمک، کبھی خاص چاول اور کبھی مٹی کا پیالہ وغیرہ میرے لیے بھیج دیا کرتے تھے۔ حضرت کی عادت تھی کہ عموماً مجلسوں میں بیٹھے ہوئے نمک چاٹا کرتے تھے اور یہ حدیث پڑھتے تھے: "الملح دواء سبعین واء الأسام" (نمک بجز موت کے ستر بیماریوں کی دوا ہے)۔

حضرت نے میرے[12] چھوٹے بھائی شیخ محمد مرحوم کو بھی اپنی بیعت سے نوازا تھا، چنانچہ وہ حضرت کی تھوڑی سی توجہ سے بڑا عبادت گزار اور فرشتہ خصلت بن گیا تھا اور اکثر اوقات ''طے کا روزہ'' رکھے رہتا تھا۔ ہمیشہ قرآن پاک کی تلاوت، نوافل اور ذکر و اذکار میں مصروف رہتا تھا۔ اس طرح اس کا ایک لمحہ بھی فضول باتوں میں ضائع نہیں ہوتا تھا اور میری[12] طرح وہ بیکار مشغلوں میں الجھا ہوا نہیں رہا:

در حق گلاب و گل حکم ازلی این بود
کین شاہد بازاری و آن پردہ نشین باشد

انہی دنوں اسی قابل رشک حالت میں وہ فوت ہوگیا۔ یقین ہے کہ وہ ایمان کے سایہ تلے جنت میں خوشی سے ہوگا۔

حضرت ممدوح کی عمر 80 سال سے زیادہ ہے، ان کے یہاں پیری میں بھی اولاد ہوتی رہی۔ آپ نے 979ھ/1571ء میں انتقال کیا۔

شیخ بھیکنؒ کاکری والے

لکھنؤ کے علاقے میں کاکری[13] نامی ایک قصبہ ہے۔ شیخ بھیکن اسی قصبہ کے رہنے والے تھے۔ یہ بڑے عالم، متقی اور متشرع تھے، تقویٰ اس درجہ کا تھا کہ اس معاملہ میں وہ امام اعظم ثانیؒ تھے۔ برسوں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔ شاطبی کا درس دیا کرتے تھے۔ طریقت میں میر سید ابراہیم ایرجی کے خلیفہ تھے۔ ایرجی موصوف اپنے زمانہ کے بڑے عالم گزرے ہیں۔ شیخ بھیکن تصوف کی باتیں صرف

خلوت میں وہ بھی محرمانہ راز سے کہا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر توحید کے رموز اعلانیہ بیان کیے جائیں تو وہ یا تو کہنے والے پر پڑتے ہیں یا سننے والوں پر بظاہر تو وہ ایسی باتوں کی ممانعت ہی کرتے تھے۔

ان کے لڑکے بڑے صاحب کمال ہیں۔ وہ سب کے سب علم وحکمت، فضل وتقویٰ سے آراستہ ہیں۔ میں ان بزرگوں کی خدمت میں محمد حسین خان مرحوم کے ہمراہ لکھنؤ میں حاضر ہوا تھا۔ وہ رمضان کا مہینہ تھا۔ اس وقت کوئی شخص علم منطق کی کوئی کتاب درس لینے کے لیے ان کے پاس آیا۔ آپ نے فرمایا ''علوم دینی کی کوئی کتاب پڑھو''۔ ان کی وفات 891ھ/1456ء میں ہوئی۔

شیخ سعدیؒ

یہ بڑے مشائخین میں سے تھے۔ اپنے والد بزرگوار شیخ محمدؒ سے خلافت پائی۔ شیخ محمد وہی بزرگ ہیں جنھوں نے ''شاطبی'' پر فارسی میں ایک شرح 70 جزو میں لکھی ہے۔

شیخ سعدیؒ اکثر وجد و حال میں رہتے تھے، کیا ظاہر کیا باطن سراپا خلوص تھے، ہمیشہ خوش، بشاش اور مسکراتے رہتے تھے۔ اپنی عمر نہایت خوش اوقاتی اور آزادگی سے گزاری۔ انھوں نے اپنے ایک دوست کو رخصت کرتے ہوئے ایک پرچہ دیا جس میں یہ شعر درج تھا:

دیدہ سعدی و دلی همراہ تست
تا نپنداری کہ تنہا میروی

ان کا انتقال 1002ھ/1593ء میں ہوا۔

سید تاج الدینؒ

شیخ محمد غوث کے خلیفہ تھے۔ یہ بزرگ ''دعوت اسماء'' کے مجاز تھے۔ ریاضت، فقر اور توکل میں ان کی اپنی ایک شان تھی۔ نہایت ایثار پیشہ اور سخی آدمی تھے۔

جب لکھنؤ آئے تو بہت سے آدمیوں نے ان کی صحبت سے فائدہ اٹھایا اور ارشاد و اصلاح کا مرتبہ حاصل کرلیا۔ ان کا لکھنؤ ہی میں انتقال ہوا تھا۔

شیخ محمد قلندر لکھنوی

پہلے یہ بزرگ سلطان ابراہیم لودی کے زمانہ میں سپاہگری کا پیشہ کرتے تھے، جس وقت بابر بادشاہ نے ہندوستان کو فتح کیا، سپاہ گری ترک کرکے فقر و عزلت گزینی کی راہ اختیار کرلی اور شیخ بہلول کے مرید بن کر عبادت اور ریاضت میں مصروف ہوگئے۔ اپنے پیر سے اسماء الٰہی میں سے چند اسماء کی دعوت و تلقین حاصل فرمائی اور ایک باغ میں جس کے اکثر درخت انھوں نے خود لگائے تھے، گوشہ نشین ہوگئے اور لوگوں سے میل جول اور تعلقات کا دروازہ بند کردیا۔

کہتے ہیں کہ تیس سال سے زیادہ ہوئے کہ وہ صرف دودھ پر گزارہ کرتے ہیں اور اناج وغیرہ کچھ نہیں کھاتے۔ ایک دن محمد حسین خان ان کی ملاقات کے لیے گیا، میں[14] بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ایک بلی شیخ کے پاس آکر درد بھری آواز میں چلانے لگی۔ آپ نے فرمایا یہ بلی فریاد کررہی ہے کہ: ''تم لوگوں نے آکر اپنے بھی اوقات ضائع کیے اور صاحب خانہ کے بھی نیز حضور قلب میں خلل پیدا کردیا''۔

شیخ نظام نارنولیؒ

نارنول ہندوستان کا مشہور شہر ہے۔ شیخ نظام نارنولی سلسلۂ چشتیہ میں شیخ خانو گوالیری کے جو قلعہ گوالیار میں رہتے تھے، مرید ہیں۔ لیکن انھوں نے زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی شیخ اسمٰعیل سے ہی کیا اور تربیت و خلافت حاصل کی۔ ان کے بھائی ایسے صاحب ذوق صوفی تھے کہ ہمیشہ ان پر جذب و شوق کی حالت طاری رہتی تھی۔ عزلت نشین اصحاب خانقاہ کے احوال و کیفیات سے بخوبی واقف تھے۔ خود بھی بڑے صاحب تصوف اور اہل دل بزرگ تھے۔

میں[14] نے معتبر آدمیوں اور شیخ کے مریدوں سے سنا ہے کہ وہ چاند گرھن کی راتوں میں اپنے مزیدوں کو بالنگنی کا تیل، کھلاتے تھے۔ یہ ہندوستان میں بڑی مشہور اور عام دوا ہے۔ اس کی تعریف میں اطباء نے رسالے لکھے ہیں۔ میں[14] نے خود بھی اس کے بعض خواص کا تجربہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ اس تیل کے کھانے سے ان پر آخرت کے حالات کا کشف ہو جاتا تھا اور بڑے عجیب عجیب امور کا مشاہدہ ہوتا تھا۔ واللہ اعلم

شیخ نظام چالیس سال تک رشد و ہدایت کی مسند پر متمکن رہے، ان کے زمانہ سے آخر عمر تک ان کا یہی معمول تھا کہ ہر سال بڑے ذوق و شوق کے ساتھ حضرت قطب عالم خواجہ قطب الدین بختیار اوشی کی زیارت کے لیے پیدل دھلی جایا کرتے تھے۔ آخر عمر میں بڑھاپے اور بعض دوسرے موانعات کی وجہ سے خواجہ موصوف کا عرس انھوں نے نارنول میں منایا۔

شیخ نظام اپنے پیر کی طرح کسی کی تعظیم نہیں بجا لاتے تھے۔ امیر ہوں یا غریب ہر ایک کے ساتھ ایک ہی طرح نہایت بے تکلفی اور سادگی سے ملتے تھے، یہی روش مرید بنانے میں بھی ملحوظ رہتی تھی۔

میں[14] نے انھیں ایک بڑے ہجوم میں دیکھا تھا۔ گفتگو کا موقع نہیں ملا۔ ان کی وفات 997 ھ/1589 ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''آہ نظام'' ہے۔

شیخ اللہ دیہ خیر آبادیؒ

بڑے متبحر عالم تھے۔ ابتدائے حال میں درس و افادہ میں مشغول رہے۔ شیخ صفی خلیفہ شیخ سعید سے ارادت و ارشاد کا تعلق تھا۔ ابتدائی دور میں علوم ظاہری کی تدریس میں مشغول رہے، مگر بعد میں انھوں نے کلیتاً صوفیاء کا مسلک اختیار کر لیا۔ فقر و توکل، تجرید و ایثار اور تصوف کے تمام لوازمات پر عمل پیرا رہے۔ ان پر ہمیشہ سماع و وجد کا ذوق غالب رہتا تھا۔ درود ہر وقت ورد زبان رہتا تھا اور محض اس لیے کسی کی ضیافت قبول نہیں کرتے تھے کہ ان کے تمام بچے اور متعلقین فقر و فاقہ میں اپنے والد کی طرح صبر و شکر کے ساتھ رہتے تھے۔

ان کے صاجزادے شیخ ابو الفتح جو صاحب سجادہ اور اپنے وقت کے بڑے عالم اور ظاہر و باطن میں اپنے والد کا مکمل نمونہ ہیں مختلف علوم پر بڑے پایہ کی تصانیف کے مالک ہیں۔

شیخ اللہ ہدیہ کے دروازہ سے کبھی کوئی سائل خالی ہاتھ نہیں لوٹا۔ ایک دن محمد حسین خان نے شیخ سے پوچھا، سالار مسعود جن کے معتقد ہندوستان کے عوام ہیں، کیسے آدمی تھے؟ آپ نے جواب دیا: ''ایک افغانی تھا جو شہید ہوگیا''۔

وہ آخر عمر میں بادشاہ کی طلبی پر فتح پور تشریف لائے تھے اور اس '' خلیفہ زمان'' (اکبر) سے ملاقات کی تھی۔ اکبر کو معلوم ہوا کہ ان کو بلانے جب آدمی گیا تو وہ خانقاہ سے باہر سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ طلبی کی اطلاع دی گئی تو وہیں سے کچھ تیاری کئے بغیر ہی ساتھ ہوگئے۔ ان کے خادم سفر کا سامان اور پالکی پیچھے لے کر آئے۔ اکبر کو یہ بات سنکر بہت خوشی ہوئی۔ جب اکبر نے ان سے کچھ دریافت کیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا کہ میں اونچا سنتا ہوں۔ اکبر نے کچھ رقم انھیں دی، ان کی مدد معاش کا حکم صادر کیا اور اسی وقت رخصت ہونے کی اجازت دے دی شیخ کی وفات 993 ھ/1585 ء میں ہوئی۔

شیخ داؤد جھنی والؒ

جھنی لاہور کے مضافات میں ایک قصبہ ہے۔ شیخ داؤد کے بزرگ عرب سے آئے تھے اور ملتان کے علاقے میں بمقام سیت پور مقیم رہے۔ شیخ اسی سیت پور میں ہی پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پیدا ہونے سے پہلے ہی والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ پیدائش کے کچھ عرصے بعد والدہ بھی فوت ہوگئیں اور وہ یتیم و یسیر رہ گئے۔ ان کی سرپرستی اور تربیت ان کے بڑے بھائی میاں رحمۃ اللہ نے کی۔ جس وقت وہ قرآن کا سبق لیا کرتے تھے تو آنسو ان کے رخساروں پر بہنے لگتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے یہ پڑھنے پڑھانے کی مصیبت میں نہ ڈالو، بس اللہ کے سپرد کردو۔ لوگوں نے آخر سمجھ لیا کہ انھیں کسی معلم کی ضرورت نہیں ہے:

بہ تعلیم آداب اور چہ حاجت

کہ او خود ز آغاز آمد مؤدب

(اس کو تعلیم کے آداب کی کیا ضرورت ہے کہ وہ ابتداء سے ہی مؤدب رہا ہے)

مشہور ہے کہ انھوں نے حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ کو خواب میں دیکھا تھا کہ انھوں نے سورۂ فاتحہ کی چند آیتیں ان کو سکھائیں۔ جب کبھی تفریح کی خاطر کھیلنے جاتے تو حیران رہ جاتے تھے اور کہتے تھے کہ مجھے ان لڑکوں کے چہرے نوچے ہوئے، ان کے جسم خون آلودہ اور کھال ادھڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ بعض مجھے یوں دکھائی دیتے ہیں جیسے ان کے سر نہیں ہیں۔

ایک لمبے عرصہ کی مصیبتوں کے بعد حضرت اپنے وطن سے ستگرہ، پھر وہاں سے لاہور آئے۔ لاہور میں آپ نے مولانا عارف جامی کے شاگرد مولانا اسمٰعیل اُچھ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور کم عمری ہی میں اس خوبی کے ساتھ شرح اصفہانی پڑھ لی، ان کے ساتھ جو ولایتی[15] طالب علم پڑھتے تھے وہ ان کی ذہانت و ذکاوت پر حیران رہ گئے۔ ان کے استاد کہا کرتے تھے کہ جس طرح ہم اپنے استاد مولانا جامی کی ذات پر فخر کیا کرتے تھے اسی طرح یہ نوجوان بھی ایسا صاحب مرتبہ ہوگا کہ لوگ اس کے دیدار کو ہی بڑی برکت جانیں گے اور اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے بالآخر یہ ظہور میں آکر رہا:

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط ننوشت

بغمزہ مسئلہ آموز صد مدرس شد

کچھ عرصہ بعد آپ نے بڑی ریاضتیں کیں۔ اس دوران خود بخود آپ پر ایک خاص جذبہ طاری ہوا اور حضرت غوث الثقلین سے ایک باطنی مناسبت پیدا ہوگئی۔ عالم مراقبہ میں وہ جو کچھ سوال کرتے تھے اس کا جواب انھیں مل جاتا تھا۔ پھر یہاں تک نوبت پہنچی کہ اسی عالم جذب میں سروپا برہنہ دیپال پور کے علاقے کے جنگل میں جسے شیر گڈھ کہا جاتا ہے اور جو جنگلی جانوروں کا مرکز ہے گھومتے رہتے تھے۔

ما عاشق سر گشتۂ صحرائی و مستقیم

کبھی کبھی جب وہ حضرت مخدوم عالم گنج شکرؒ کے مزار پر چلے جاتے تو وہاں ان کو باطنی اشارے ملتے، بشارتیں سنائی دیتیں اور صاحب مزار سے گفتگو ہوتی، جس کی تفصیلات اس مختصر کتاب میں درج نہیں کی جاسکتی البتہ شیخ ابو المعالی ولد شیخ رحمت اللہ کی تصنیف ''نغمات داؤدی'' میں دیکھی جاسکتی ہیں۔ اس جنگل میں حضرت ممدوح نے 20 سال گزار دیے۔ اس کے بعد آپکی توجہ سلوک وارشاد کی طرف مائل ہوئی لیکن مشکل یہ تھی کہ بظاہر آپ کا کوئی پیر و مرشد نہ تھا۔ حضرت غوث اعظمؒ نے اپنی روحانیت سے آپ کی راہنمائی کی کہ سلسلۂ طریقت کے تحفظ کے لیے وہ شیخ حامد قادری ولد شیخ عبد القادر ثانی کے ہاتھ بیعت کریں۔ شیخ حامد چونکہ بارہا خود ان سے مقامات سلوک میں مدد لیتے رہتے تھے اور ہر مشکل مرحلہ میں ان سے دعا کراتے رہتے تھے اس لیے ان کو اپنا مرید بنانے، شجرہ لکھ کر دینے میں تأمل تھا۔ یہاں تک کہ شیخ داؤد خود ایک دن ستگڑھ جہاں مخدوم شیخ حامد مقیم تھے تشریف لے گئے اور نہایت عالم جذب میں ان سے فرمایا کہ ''یہ دیکھو خود غوث اعظم تشریف لائے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ سجادۂ عصا، شجرۂ خلافت، گھوڑا پالکی اور دوسرے لوازمات پیشوائی میرے حوالہ کردو''۔ جب شیخ مخدوم کو بھی اس معاملہ میں عین الیقین حاصل ہوگیا تو انھوں نے شیخ داؤد کی تمام فرمائشوں کی تکمیل کر دی اور وہ وہاں سے شیر گڑھ کے نئے شہر میں آکر جھنی کے قریب مقیم ہوگئے۔ یہ مقام ملتان اور پٹن کے درمیان تھا، آپ نے یہاں قیام فرما کر سلسلۂ سہروردیہ و چشتیہ اور قادریہ کو رواج دیا۔ ان کے تلقین وارشاد کی ایسی شہرت ہوئی کہ تا قیامت یہ شہرہ ختم نہیں ہوسکتا۔

جس زمانہ میں مخدوم الملک عبد اللہ سلطان پوری اھل اللہ کے درپے آزار ہوگیا اور بعض طالبان حق کو شہید بھی کرادیا تھا۔ سلیم شاہ افغان سور نے گوالیار سے حضرت کی طلبی کے لیے فرمان بھجوایا تھا۔ آپ تنہا ایک دو خادموں کے ساتھ گوالیار گئے۔ سلیم شاہ نے گوالیار سے باہر نکل کر نہایت عزت و احترام کے ساتھ آپ سے ملاقات کی۔ اسی جگہ آپ نے قیام کیا۔ سلیم شاہ نے نہایت خلوص وعقیدت کے ساتھ حضرت سے بات چیت

کی۔ اس رنگ کو دیکھ کر ہی فتنہ پردازوں کے ہوش اڑ گئے اور وہ اِدھر اُدھر کھسک گئے اور ایسے روپوش ہوئے کہ تلاش کے باوجود ان کا پتہ نہ چل سکا۔ مخدوم الملک نے کہا: ''یہ جھوٹ بولنے والے آدمی نہیں ہیں''۔ کچھ گفتگو کے بعد آپ نے دریافت کیا: ''ہم فقراء کو طلب کرنے کا آخر سبب کیا تھا؟'' مخدوم الملک نے کہا، ہم نے سنا تھا کہ: ''آپ کے مرید ذکر کے وقت ''یا داؤد یا داؤد'' کا نعرہ لگاتے ہیں''۔ آپ نے جواب دیا یہ سننے والے کی غلط فہمی ہے میرے مرید تو ''یاودود، یا ودود'' کا ذکر کرتے ہیں۔

مخدوم الملک کے ساتھ آپکی ایک دن یاایک رات نشست رہی۔آپ نے اسے حقائق ومعارف کی باتیں بتائیں اور چند نصیحتیں بھی کیں۔ وہ نہایت متاثر ہوا اور آپ کو اسی مقام سے پورے اعزازواکرام کے ساتھ رخصت کیا۔

ایک مرتبہ ان کی مجلس میں میاں حسام الدین طلبنہ[16] کے زہد وتقویٰ کا ذکر چھڑ گیا۔آپ نے کہا افسوس میاں ظاھری رسوم واخلاق میں پھنس کر حق تعالیٰ کی محبت ذاتی سے دور رہ گیا''۔

حضرت نہایت ایثار پیشہ اور فیاض دست تھے۔ ہر سال ایک یا دو بار اپنا سارا مال جو ھدیوں اور نذرانوں میں جمع ہو جاتا تھا' راہ خدا میں لٹا دیتے تھے۔ اپنی بیوی کے ساتھ اپنے سکونتی حجرہ میں اس حال میں رہتے تھے کہ بجز مٹی کے پیالے اور پرانے بوریئے کے کچھ اور باقی نہ رہتا تھا۔ جب بھی ان کے پاس روپیہ جمع ہو جاتا اسی طرح خیرات کر دیتے۔اس دریا دلی وکشادہ دستی کے باوجود حضرت غوث اعظم کے یوم ولادت اور عرس کے موقع پرانکی خانقاہ کے لنگر سے تقریبا ایک لاکھ زائرین کیا خاص، کیا عام سبھی کو کھانے پینے کی اشیا دی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کے لنگر کی رونق اسی طرح قائم ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہو چکی ہے۔

آپ کی زبان مبارک سے بعض بڑے موثر کلمے ادا ہوئے ہیں مثلاً ''بسم اللہ الدلیل الھادی فی ظلمات السجار والبوادی'' اس پاک کلمہ کا اثر خطرات اور حادثات کے موقع پر ظاہر ہوا ہے اور بارہا اس کا تجربہ ہو چکا ہے: ایسی ہی بہت سی تسبیحات

ذکر اور اذکار آپ سے منسوب ہیں۔ آپ نے اپنی مہر کا سجع خود ہی تجویز کیا تھا:

محیٔ داؤد عن اسم و رغم

فـان الـفـقـر یـمحو کل و سم

میں[17] بیرم خاں کے عہد میں جو بلا شبہ ایک بہترین زمانہ تھا اور اس وقت ہندوستان حجلۂ عروسی کی طرح دلکش و بارونق تھا، آگرہ میں تعلیم پا رہا تھا۔ اس وقت میں نے بعض درویشوں سے آپ کی شان بزرگی کے قصے سنے تھے اور آپ کی عقیدت ومحبت کا بیج میرے دل میں پیوست ہوگیا تھا۔ اسی طالب علمی کے زمانہ میں چند بار میں[18] نے حضرت کی خدمت میں جانے کے ارادے سے شیر گڑھ کا ارادہ کیا لیکن والد مرحوم[19] مانع ہوئے اور راستہ ہی سے مجھے واپس لوٹا لیا۔ بعض اوقات کچھ اور موانعات پیدا ہوئے کہ میں[20] اس برکت سے محروم ہی رہا اور انتظار میں 12 سال نکل گئے۔

ایک مرتبہ حضرت کا ایک مرید شیخ کالو نامی جس کی زبانی میں[20] حضرت کا حال سن کر غائبانہ معتقد ہوگیا تھا، بدایوں آیا۔ وہ جب بھی ملتا مجھ سے کہتا تھا: ''بڑا افسوس ہے کہ میاں صاحب زندہ ہیں اور تم ان سے ملنے ایک بار بھی نہیں گئے۔ اس کی یہ بات میرے خرمن اشتیاق کے لیے چنگاری بن گئی۔ پھر اللہ تعالی نے بھی ایک اچھا سبب پیدا کر دیا کہ محمد حسین خاں نے جس کی ملازمت سے میرا[21] تعلق تھا ابراھیم حسین میرزا کے تعاقب میں کولہ و کانت سے پنجاب کی طرف کوچ کیا اور مجھے اس سعادت سے فیض یاب ہونے کا موقع مل گیا۔ چنانچہ میں پنجاب سے حضرت کی ملاقات کے لیے شیر گڈھ پہنچا میں نے حضرت کے جمال مبارک میں ایسا حسن پایا کہ کسی صاحب حسن کو اس سے نسبت نہیں دی جاسکتی۔ گفتگو کرتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے آپکے دانتوں سے نور برستا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جس سے دل کی تاریکی چھٹ جاتی تھی۔

میں[21] وہاں چند دن مقیم رہا۔ اس دوران کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا جس میں کہ سو سو، پچاس پچاس ہندو اپنے گھرانوں سمیت آکر اسلام قبول نہ کرتے ہوں۔ آپکی شخصیت کی وجہ سے مجھے تو اس شہر کے درو دیوار شجر و حجر تک تسبیح و ذکر کرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

حضرت نے مجھے[21] ایک ٹوپی عنایت کر کے کہا کہ میری طرف سے اپنے اہل وعیال میں تم نائب رہو میرا یہی طریقہ ہے۔ پھر آپ نے میرے متعلقین کے لیے اپنے گھر سے ایک دو پٹہ اور رومال منگا کر عنایت کیا۔ میں نے عرض کیا اگر ایک پیراہن بھی عطا ہو جائے تو میرے لیے نور علی نور ہے۔ بڑے تأمل کے بعد فرمایا: ''وہ بھی وقت پر مل جائے گا''۔ میں[22] نے حضرت سے بعض دلی مقاصد اوراسرار بیان کیے اور ان کے جواب سنے، اس کے بعد میں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت طلب کی۔ اسی اثناء میں حضرت بھی کمزوری کی وجہ سے پالکی میں بیٹھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے۔ میں[22] نے ان کی پالکی کا پایہ اپنے کاندھے پر لے لیا اور کئی قدم چلا۔ اس وقت مجھ پر اس قدر گریہ طاری ہوا کہ ضبط نہ کر سکا۔ حضرت نے پالکی رکوائی اور مجھے بہت سی معرفت و محبت کی باتیں بتائیں۔

جس دن میں رخصت ہو رہا تھا میں نے میاں عبدالوہاب کے وسیلہ سے حضرت سے عرض کیا کہ ہندستان کے مشائخ کہتے ہیں کہ ایک سید کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ ان میں سے اکثر نے ایک سید پر اتفاق بھی کرلیا ہے جس کے آباو اجداد اس سے پہلے کچھ عرصہ تک دہلی اور بدایوں پر حکمران بھی رہے ہیں اور اب وہ لوگ جہاد کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ حضرت غوث اعظمؒ کی طرف سے اس اہم خدمت پر مامور کیے گئے ہیں۔ ان لوگوں نے سرحد کے بعض امیروں کو بھی اپنا حامی بنالیا ہے، بعض لوگوں نے مختلف مقامات پر بشارت پاکر اس گروہ میں شرکت کرلی ہے اور اب یہ سب اپنے ارادوں کو عملی صورت دینے کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے پوچھا اس سید کی وضع اور حالت کیسی ہے؟ میں[22] نے کہا وہ ایک گوشہ نشین متشرع اور متوکل فقیر ہے، بڑی عبادت و ریاضت کرتا ہے، دن کو مقبروں میں بیٹھا رہتا ہے، رات کو اپنے حجرہ میں عبادت کرتا رہتا ہے، سپاہ گری کے فن میں بھی بے مثل اور لاثانی ہے، اس کے اخلاق وعادات نہایت شائستہ ہیں، شادی شدہ کنبہ والا ہے۔ آپ نے فرمایا، اس جماعت کے لوگ درویش نہیں معلوم ہوتے کہ حضرت غوث اعظمؒ پر یہ افترا باندھتے ہیں اور اس بچارے سید کا بھی خانہ

خراب کرنا چاہتے ہیں ان کی وہ ساری بشارتیں محض شیطانی وساوس ہیں۔ بھلا حضرت غوث اعظمؒ اس بات پر کس طرح راضی ہو سکتے ہیں؟ ان کا حکم تو یہ ہے کہ دنیا کی محبت بالکل دل سے نکل جائے اور خلوص و سچائی کے ساتھ عشق خداوندی حاصل کیا جائے، حرص و ہوس کا نام تک باقی نہ رہے۔ عبادت اور ریاضت کا طریقہ چھوڑ کر دنیا کے جال میں پھنسنا کہاں کی ہوش مندی ہے۔ میری جانب سے تم اس سید سے کہنا کہ تم نے جو ارادہ کیا ہے اس میں اللہ تعالیٰ تم کو استقامت عطا کرے، اگر تمہارے دل میں اس دنیائے فانی کی لذتوں کا ذرا سا شائبہ بھی رہ گیا ہے تو پہلے تم اس کو دور کرنے کی فکر کرو اور اس نادان جماعت کے بہکانے سے مغرور ہوکر بے راہ نہ ہو جاؤ۔ طالب دنیا کا منتہا و مقصود صرف سلطنت ہے جو چند روزہ اور فانی ہے، طالب عقبیٰ کو جاودان نعمتیں حاصل ہوں گی۔ اگر خدا کا طالب اپنے مطلب سے محروم رہ کر حسرت ہی میں رہ جائے تو اس کی ناکامی اول الذکر کی کامیابی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس سلسلۂ کلام میں انھوں نے بڑی نصیحت آمیز باتیں کیں جنھیں سن کر حاضرین پر ایسا اثر ہوا کہ سب بے اختیار رونے لگے، میں بھی وہاں سے روتا اور آنسو بہاتا رخصت ہوا۔

اس زمانہ میں اُلغ بیگی مرزاؤں کی بغاوت کی وجہ سے شیر گڑھ سے لاہور تک کا راستہ خطرناک ہوگیا تھا اور میں تنہا تھا، اس لئے آپ نے اپنے ایک خادم کو میرے ساتھ کر دیا کہ وہ مجھے شیخ ابو اسحٰق مہر کی خدمت میں جو حضرت کے بڑے اچھے خلیفہ تھے، پہنچادے پھر وہ مجھے حسین خان کے لشکر میں جو طلبنہ سے لاہور آیا ہوا تھا اور وہاں سے کانت وکولہ جانے والا تھا، پہنچادیں۔غرض میں لاہور پہنچ کر حسین خان کے لشکریوں کے ساتھ ہندوستان کے لئے روانہ ہوگیا ایک دن سہارن پور کے مقام پر ایک باغ میں بیٹھا ہوا حضرت کی یاد میں ملول تھا کہ ایک مسافر قادر پیراہن ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پاس آیا اور کہا کہ: ''یہ لے لو ایک پیر بزرگ کے یہاں سے یہ مجھے حاصل ہوا تھا اور مجھے اس کے عوض کچھ راستہ کا خرچ دے دو''۔ میں[22] نے جب اس کرتے کے ملنے کا حال پوچھا تو اس نے بتایا کہ میں میرزا ابراہیم حسین کے لشکر میں تھا جب اسے شکست ہوئی تو سپاہیوں کا

ایک گروہ جس میں میں[23] بھی شامل تھا لٹ لٹا کر اس حال میں کہ پہننے کے لیے کپڑے تک نہیں رہے تھے شیر گڑھ میں حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں پہنچا، انھوں نے ہم میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ عنایت کیا۔ جب میری باری آئی تو یہ کرتا اپنے بدن سے اتار کر مجھے دے دیا۔ میں نے اسکو پہننا بے ادبی جانا اور ہدیہ و تحفہ کے طور پر اسے محفوظ رکھے رہا۔اب وہ میں تمہیں دے رہا ہوں۔ میں[21] نے اسے غیبی سے لے لیا

نکہت پیراہنت آمد بہ من　　لذت جان یافتم زان زائچہ
خواندہ بودم فاتحہ وصل ترا　　شد قبول الحمد اللہ فاتحہ

مجھے حضرت کی وہ بات یاد آ گئی کہ فرمایا تھا ''کرتا بھی اپنے وقت پر تم کو مل جائے گا''۔ بلاشبہ یہ آپکی کرامت تھی۔ میں اس پیرہن یوسف کو جان کے برابر حفاظت سے رکھے ہوئے ہوں

شوق تو در ضمیرم ومہر تو دردلم　　باشیر اندرون شد وبا جان برون شود

شیخ داؤد جھنی وال اپنے وقت کے قطب اورصاحب کشف و کرامات بزرگ تھے۔ آپ نے بڑی بڑی ریاضتیں اورسخت مجاہدے کیے تھے۔ ابتدا میں علوم ظاہری حاصل کیا اور ان کی تعلیم بھی دی، پھر ایسے متوکل اورخانہ نشین ہوئے کہ کبھی اہل دنیا سے ملنے نہیں گئے۔ صرف ایک بار شیر گڑھ سے گوالیار، وہ بھی سلیم شاہ کے بلانے پر گئے تھے۔ اکبر بادشاہ جب پٹن گیا تو اس نے شہباز خان کو شیخ کے بلانے کے لیے بھیجا تاکہ وہ ملاقات کا موقع دیں، لیکن آپ نے عذر فرمایا کہ ہماری غائبانہ دعا ہی کافی ہے۔ غرض آپ دنیا داروں کی صحبت سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور ''الفقر فخری'' پر عمل کر کے ہمیشہ بخشش و ایثار سے کام لیتے تھے۔ جو طالبان حق آتے ان کو تلقین و ارشاد فرماتے۔ جو شخص بھی حضرت کی صحبت میں پہنچ گیا وہ آپ کے فیض روحانی سے مستفید ہو کر لوٹا۔

آپ نے 982ھ/1574ء میں وصال فرمایا۔ آپ کی تاریخ وفات ''یا شیخ داؤد ولی'' ہے۔

شیخ ابن امروہہؒ

سالک طریقت اور مجذوب تھے۔ اس حالت جذب کے باوجود شریعت کے لوازم ترک نہیں ہوتے تھے۔ ذرا ذرا سی پابندی کا بھی اہتمام رہتا تھا۔ ان کی بہت سی کراماتیں مشہور ہیں۔ آزادانہ زندگی گزارتے اور لوگوں کو مرید بھی کرتے تھے۔

جس زمانہ میں میں[25] میاں شیخ داؤد سے مل کر پنجاب سے واپس ہوا تھا اور امروہہ کے راستے بدایوں جا رہا تھا تو حضرت کی خدمت میں پہنچا تھا۔ اس وقت وہ کسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہوئے، بغیر کلام پاک کے ایک آیت بیان کر رہے تھے۔ کبھی کبھی میری طرف دیکھ لیتے تھے۔ انھوں نے اس وقت جزا اور صبر کرنے والوں کے اجر کی فضیلت بیان کی اور اس سلسلہ میں آیت ''والباقیات الصالحات'' میری طرف دیکھ کر تلاوت کی۔ اس تلقین کا مطلب جلد ہی ظاہر ہوا۔ ان کا اشارہ کسی مصیبت کی طرف تھا، چنانچہ میری[26] ایک بچی تھی جس کو میں بہت چاہتا تھا۔ میں ابھی سفر میں تھا کہ وہ بدایوں میں فوت ہو گئی۔ ان کے وہ تسلی آمیز ارشادات غالبًا میرے ہی لیے تھے۔ واللہ اعلم۔ ان کی وفات 987ھ/1589ء میں ہوئی۔

خواجہ عبد الشہیدؒ

یہ خواجکا خواجہ کے صاحبزادے اور خواجکا خواجہ حضرت خواجہ احرار کے لڑکے ہیں۔ جس وقت خواجہ عبد الشہید پیدا ہوئے تو لوگ انھیں خواجہ احرار کی خدمت میں لے کر گئے۔ حضرت نے ان کو گود میں لے کر فرمایا: ''مرد حق آگاہ بنے گا''

خواجہ عبد الشہید ظاہری اور باطنی کمالات کا مجموعہ تھے۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ ان کی شخصیت انسانی کمالات کا آئینہ تھی۔ خلق خدا نے ان کی تلقین و ہدایت سے بڑا فیض اٹھایا۔ وہ طریقہ سلوک میں خواجہ احرار کے قدم بقدم چلتے تھے۔

سمرقند سے ہندستان آ کر یہاں 18 سال تک بسر کیے۔ 982ھ/1574ء میں فرمایا کرتے تھے: ''ہماری رحلت کا وقت قریب آ چکا ہے اور یہ ہمارے لیے لازمی ہے کہ ہم

اپنی ہڈیوں کو سمرقند میں آبائی قبرستان میں پہنچادیں''۔ چنانچہ وہ سمرقند کے لیے روانہ ہوگئے۔ جس وقت وہ کابل پہنچے تھے تو میرزا شاہ رخ نے کابل والوں کو گھیر لیا تھا اور بدخشاں جارہا تھا۔ خواجہ صاحب کی سفارش سے تقریباً 10 ہزار آدمی ظالموں کی قید سے رہائی پا گئے۔

خواجہ صاحب سمرقند پہنچنے کے دو تین دن بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہوگئے اور اپنے بزرگوں کے زیر سایہ مدفون ہوئے۔ خواجہ صاحب کا مرتبہ اس سے بلند ہے کہ ان کی کرامتوں کا ذکر کر کے ان کے مراتب کو ظاہر کیا جائے۔

میں نے حضرت کا دیدار اس وقت کیا تھا جب کہ شاہی لشکر پٹنہ سے واپسی میں بھون گاؤں اور پٹیالی کی حدود میں پہنچا تھا۔ آپ اکبر بادشاہ سے وداع ہونے کے لیے تشریف لائے تھے، میں نے دور ہی سے آپ کو دیکھا۔ ملاقات اور گفتگو کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

شیخ ادھنؒ جونپوری

چشتی سلسلہ میں اپنے والد شیخ بہاؤالدین کے مرید تھے۔ اپنے وقت کے بڑے مقتدر اور پیشوا تھے، طویل عمر پائی، ان کی زندگی عمر طبعی سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ ان کے لڑکے تک ان کے سامنے ستر ستر، اسی اسی برس کے ہوگئے۔ اسی طرح پوتوں کی بھی ان کی زندگی میں لمبی عمریں ہوئیں۔

شیخ ادہن نے اپنی ساری زندگی عبادات اور حصول معرفت میں گزاری، علوم ظاہری بھی انھوں نے بہت حاصل کیے تھے لیکن کبھی درس نہیں دیا سماع کا بڑا ذوق تھا۔ آخر عمر میں جسمانی کمزوری کی وجہ سے وضو بنانے اور نماز پڑھنے اور ضروری حاجتوں کے لیے خادموں کی مدد کے بغیر اٹھ نہیں سکتے تھے۔ اس حال میں بھی اگر راگ کی آواز کان میں پڑ جاتی تو سماع کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے، پھر ان پر ایسا حال آتا کہ چند آدمی بھی مل کر ان کو بہ مشکل سنبھال سکتے۔ فرض نماز کے ادا کرنے میں بھی یہی حال تھا۔ سنت اور نفل تو

بیٹھ کر پڑھ لیتے لیکن فرض کھڑے ہو کر ادا کرتے تھے اور کسی کی مدد اور سہارے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔

مشہور ہے کہ ان سے کرامتیں بے تکلفی سے صادر ہوتی رہتی تھیں۔ انھیں اللہ نے بکثرت اولاد دی تھی۔ محفل میں جب وہ اپنے ہوش مند سفید سفید داڑھی والے بچوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے تو آنے والا بڑے شبہ میں پڑ جاتا کہ ان بڈھوں میں سے حضرت کون ہیں اور ان کے لڑکے کون!

اپنی محفلوں میں طریقت وحقیقت کے باب میں ایسی گہری باتیں بیان کرتے تھے کہ عوام تو عوام، خواص بھی ان کا احاطہ نہیں کر سکتے تھے۔ کوئی بوالہوس ان اسرار و رموز کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔ ان کی یہی رمز بیانی ان کے متعلق شبہ کا باعث ہوگئی تھی۔

اکبر پہلی بار جب باغیوں کی بغاوت کو کچلنے کے لئے جونپور گیا تھا اور جونپور پہنچنے میں ابھی 3 دنوں کا سفر باقی تھا کہ شیخ کا جونپور میں انتقال ہوگیا میں[27] ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے محروم ہی رہا۔

آپ کی وفات 970ھ/1562ء میں ہوئی۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ ادھن'' سے نکلتی ہے۔

شیخ عبدالغفورؒ اعظم پوری

اعظم پور، سنبھل کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ موصوف شیخ عبدالقدوس چشتی کے مرید ہیں، ظاہری اور باطنی کمالات کا مظہر تھے۔ بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کی طرح توفیق خداوندی ان کے ہمراہ رہتی تھی۔ ان تصرف واثر ملنے والوں پر بڑی جلدی ہوتا تھا۔ اگر طالب کی اہلیت و مناسبت کمتر بھی ہوتی تو شیخ کی کشش بہت جلد اسکو آگے بڑھادیتی اور وہ بے اختیار خدمت گزاری پر مائل ہوجاتا۔

اکثر اوقات دینی علوم کا درس دیتے تھے۔ ان کا روح افزا کلام پریشان دلوں کے لیے راحت بن جاتا تھا اور ان کی معجز بیان زبان بے قرار جانوں کے لیے مرہم کا کام کرتی

تھی حسن صورت اورحسن سیرت دونوں میں وہ اپنے عہد میں سب سے ممتاز تھے۔ مرید بنایا کرتے تھے۔ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتے رہتے تھے۔ تصوف کے موضوع پر کئی ایک رسالے بھی لکھے تھے۔ بلا شبہ شیخ کے ظاہری اور روحانی کمالات میں کوئی کمی نہیں تھی۔ آپ نے 975ھ/1567ء میں رحلت فرمائی اور اعظم پور میں دفن ہوئے۔

میاں وجیہہ الدینؒ احمد آبادی

یہ علوی نسب سے تعلق رکھتے تھے لیکن اپنے نسب کو انھوں نے مسافر ہونے کی وجہ سے شہرت نہ دی۔ اپنے زمانہ کے بڑے عابد و متقی عالم تھے۔ شریعت کی نہایت پابندی کرتے تھے۔ گوشہ نشینی ان کا شعار تھا۔ ہمیشہ دینی علوم کی درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ تمام عقلی اور نقلی علوم پر قدرت و عبور حاصل تھا۔ چنانچہ ''صرف ہوائی'' سے لے کر ''قانون''، ''شفا''، ''شرح مفتاح'' اور ''عضدی'' جیسی کتابوں میں سے شاید ہی کوئی ایسی کتاب ہوگی جس پر انھوں نے شرح یا حاشیہ نہ لکھا ہو۔ ایک مخلوق ان کے علمی افادہ سے فیض اٹھاتی رہی۔

اللہ نے ان کی دعا میں بڑا اثر دیا تھا اور شفا رکھی تھی، چنانچہ ہر روز بے شمار مریض ان کے پاس دعا کرانے کے لیے آتے تھے۔ ان کی دعا کا بھی بڑی جلدی اثر ہوتا تھا۔ وہ کبھی اپنے طور پر دنیا دار اصحاب کے گھر نہیں گئے اگر ایک دوبار گئے بھی تو وہ بھی طلب کرنے پر نہایت اکراہ کے ساتھ۔ اپنے گھر اور مسجد سے ان کا قدم جمعہ کی نماز کے لیے بھی باہر نہیں نکلتا تھا۔ ان کا گھر ادنی و اعلی سب کا مرکز و مرجع تھا۔

وضع و لباس میں بھی وہ عام لوگوں سے کوئی امتیاز نہیں رکھتے تھے۔ موٹے جھوٹے کپڑوں پر ہی قانع رہتے تھے۔ جو کچھ نذر نیاز آتی وہ خیرات کر دیتے تھے۔

ارادت کا تعلق تو کسی اور سے تھا لیکن شیخ محمد غوث سے تربیت و ارشاد حاصل کیا تھا اور آداب طریقت میں ان کے پیرو تھے۔ انہی کے پاس سلوک کی تکمیل کی تھی۔ صوفیانہ مشرب سے بڑا ذوق اور مناسبت تھی۔

سلطان محمود گجراتی کے عہد میں جب شیخ محمد غوث ہندوستان سے گجرات گئے تو شیخ علی متقی نے جو نہ صرف اس عہد کے بہت بڑے عالم تھے بلکہ دربار میں بھی ان کا بڑا اثر و اقتدار تھا، ان کے قتل کا فتویٰ صادر کردیا۔ سلطان نے اس فتویٰ کو میاں وجیہہ الدین کے دستخط و تصدیق پر منحصر کردیا۔ چونکہ میاں وجیہہ الدین، شیخ محمد غوث کے گھر جا چکے تھے اور پہلی ہی بار ان کے شیدا و فریفتہ ہوگئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اس فتویٰ کو پھاڑ کر پھینک دیا۔

جب شیخ علی متقی کو معلوم ہوا تو وہ دوڑے ہوئے میاں کے گھر آئے اور اپنے کپڑے پھاڑ دیے، کہا آپ کس لیے بدعت اور دین میں رخنہ اندازی کے حامی بن گئے ہیں، انھوں نے جواب دیا، ہم اہل قال ہیں اور شیخ محمد غوث ارباب حال میں سے، ہم ان کے اعلیٰ کمالات کو نہیں سمجھ سکتے اور ظاہر شریعت کے اعتبار سے بھی ان پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا۔

شیخ محمد غوث گوالیاری سے سلاطین گجرات کو جو عقیدت رہی ہے اس کا سبب یہی واقعہ تھا۔ میاں صاحب کے اس رویہ کی وجہ سے شیخ موصوف پھانسی سے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد میاں صاحب اکثر اپنی مجلسوں میں کہا کرتے تھے۔ ظاہر شریعت پر ایسی ہی نظر ہونی چاہیے جیسی شیخ علی متقی کی ہے اور حقائق پر ایسی جیسے ہمارے پیر شیخ محمد غوث کی نظر ہے۔

میاں وجیہ کا انتقال 998ھ/1580ء میں ہوا۔ ان کی تاریخ وفات ''وجیہ الدین'' سے نکلتی ہے۔ واضح رہے ان چار بزرگوں سے جن کا ذکر کر آیا ہوں مجھے ملاقات کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

میاں عبداللہ نیازیؒ سرھندی

نیازی پٹھانوں کے ایک قبیلے کا نام ہے۔ میاں عبداللہ پہلے شیخ سلیم چشتیؒ فتح پوری کے مرید تھے۔ آپ اس حجرہ میں جو نئی خانقاہ سے متصل ہے اور اب وہاں عبادت خانہ شاہی

کی عمارت بنی ہوئی ہے۔ ہمیشہ معتکف رہا کرتے تھے۔

جس وقت شیخ سلیم پہلی بار براہ خشکی حج کے سفر پر گئے تھے، وہاں سے لوٹ کر آئے تو میاں عبد اللہ نے شیخ سے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مانگی۔ شیخ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے ان تمام شیوخ و اہل اللہ کا اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ایک تذکرہ دیا جن سے شیخ نے عرب و عجم اور ہندوستان میں ملاقات کی تھی۔ میاں عبد اللہ نے بہت سے شہروں کی سیاحت کی اور ان مشائخین سے ملاقاتیں کیں۔

سید محمد جونپوری نے مہدویت کا دعویٰ کیا تھا۔ میاں عبد اللہ کا گجرات اور دکن میں اس سلسلہ سے تعلق ہوا اور انھوں نے اسی مسلک کو اختیار کر لیا۔ بیانہ میں آکر کچھ عرصہ تک گوشہ گمنامی میں دنیا سے بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرتے رہے۔ جب بیانہ کے شیخ علائی کی تحریک کی دھوم ہوئی تو سلیم شاہ نے مخدوم الملک کے بہکانے سے میاں عبد اللہ کو بھی سخت ایذائیں دیں اور انھیں بری طرح پیٹا گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئے۔ اس واقعہ کے بعد وہ دوبارہ دنیا کی سیاحت کے لیے نکل گئے۔

آخر عمر میں میاں عبد اللہ نے مہدوی عقائد کو ترک کر دیا تھا اور سرھند میں عزلت گزیں ہو گئے اور تمام مشائخین کی طرح سلوک و طریقت پر کار بند ہو گئے تھے۔ جس زمانہ میں اکبر نے فتح پور میں اور ایک حجرہ کو جو شاہی محل سے متصل تھا تعمیر کرایا اور اس کا نام عبادت خانہ رکھا تھا تو اسی سلسلہ میں میاں عبد اللہ کا حال اکبر کو معلوم ہوا تھا۔ اکبر نے ان کو سرہند سے بلا کر تنہائی میں گفتگو کی اور ان کے حالات دریافت کیے۔ اس وقت انھوں نے مہدویت سے انکار کر کے کہا، چونکہ پہلے یہ جماعت مجھے اچھی معلوم ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے اس مسلک کو اختیار کر لیا تھا جب مجھے حقیقت کا پتہ چلا تو میں نے اس سے ہاتھ کھینچ لیا۔

اکبر جب 993ھ/1585ء میں اٹک جاتے ہوئے سرہند پہنچا تو انھیں دوبارہ طلب کر کے ملاقات کی اور ان کی مدد معاش کے لیے زمین کی پیش کش کی۔ انھوں نے توکل و قناعت کی وجہ سے اسکو قبول نہ کیا لیکن اکبر نے فرمان لکھوا کر ان کے حوالہ کر ہی دیا۔

انھوں نے مجبوراً وہ فرمان لے لیا لیکن توکل وقناعت کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اور اس زمین سے مرتے دم تک کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کے سارے عمل کا انحصار ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' پر تھا۔

الغ میرزا کی بغاوت کے زمانہ میں میں[28] محمد حسین خاں کے ہمراہ تھا۔ اس وقت ان سے میں نے سرھند جاکر ملاقات کی تھی۔ ان کے سامنے ''احیاء العلوم'' کھلی ہوئی تھی۔ اس کے چند مضامین انھوں نے بیان کیے۔ اس وقت محمود خاں اور اُس کے ایک شناسا نے جو سلیم شاہ کے عہد سے ان کی مصاحبت میں تھا اور شیخ علائی کی تحریک کے وقت میاں نے اسے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا۔ میاں صاحب سے پوچھا: ''دل کیا ہے؟'' انھوں نے جواب دیا ''دل سے ہمارا فاصلہ ہزاروں منزلوں کا ہے اس کے بارے میں کیا پوچھتے ہو؟ اخلاق وعمل کی باتیں دریافت کرو'' اس کے بعد ایک بوڑھے مغل نے کسی ذکر میں میر سید محمد جونپوری کی مہدویت کا مسئلہ چھیڑ دیا اور ان سے تصدیق و شہادت طلب کی۔ انھوں نے کہا. ''جس وقت میر سید محمد جونپوری نے رحلت فرمائی تھی میں فراہ میں حاضر تھا، انھوں نے مہدویت کے دعویٰ سے انکار کیا تھا اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا تھا میں مہدی موعود نہیں ہوں'' واللہ اعلم۔ ان کی بات سن کر محمود خان نے آہستہ سے کہا میاں عبد اللہ نے بھی اچھا کام کیا کہ مہدویت کی حمایت کرکے بیچارے شیخ علائی کی گردن کٹوادی اور خود دامن بچا کر اس دائرہ سے نکل آئے۔

میاں عبد اللہ نے 90 سال کی عمر میں 1000ھ/ 1591ء میں اس سرائے فانی سے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔

شیخ ابوالفتح گجراتیؒ

یہ حضرت میر سید محمد جونپوری کے داماد تھے لیکن انھوں نے سید صاحب کو نہیں دیکھا تھا۔ یہ رشتہ ان کی وفات کے بعد ہوا تھا۔ یہ بڑے جاہ وجلال والے بزرگ تھے۔ سلسلہ مہدویہ میں نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ تھے۔ مکۂ معظّمہ اور گجرات میں شیخ گدائی کے ساتھ

ان کی خوب دوستی رہی تھی۔ بیرم خاں خان خانان کے عہد میں کسی اہم کام کے سلسلہ میں آگرہ آگئے تھے۔ کچھ ہی دن بعد جب بیرم خاں کی بساط الٹ گئی تو وہ گجرات چلے گئے۔

میں[29] اپنی طالب علمی کے زمانہ میں حاجی مہدی لاہوری کے داماد مولانا عبداللہ قندھاری کے ساتھ آدھی رات کے وقت شیخ کی خدمت میں پہنچا تھا وہ اس وقت آگرہ میں جمنا کے پار شیخ بہاؤ الدین مفتی کے محلّہ میں مقیم تھے اور ایک خالی حجرہ میں تنہا بیٹھے کسی شغل میں مصروف تھے۔ ہم[30] پہنچے تو انھوں نے حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیث: "**لایعقد قوم یذکرون اللہ الاحقھم الملائکۃ و غشیتھم الرحمۃ و نزلت علیھم السکینہ و ذکرھم اللہ فیمن عندہ**" پڑھی اور اس کی تشریح کی، پھر انھوں نے مجھے اس حدیث کے ذکر کی تلقین کی۔ میں[31] نے کچھ عرصہ تک اس حدیث کا ذکر کیا اور واقعی میں نے اس کا بڑا اثر اور فیض محسوس کیا اور قرآن کا مطلب مجھ پر واضح ہوگیا۔ چند بار تو ایسا ہوا کہ جو بھی آواز میرے کان میں پڑتی تھی میں اسے ذکر ہی سمجھتا تھا۔

میں[32] نے ان کے بعض مریدوں کو دیکھا کہ انھوں نے اپنے لبوں کو سریش لگا کر بند کر دیا تھا کہ بے فائدہ گفتگو سے بچے رہیں۔ بعض اس مطلب کے لئے منہ میں کنکریاں بھر لیا کرتے تھے۔

ان کی وفات کے متعلق معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کہاں ہوئی۔

شیخ ابو اسحاقؒ لاہوری

حضرت میاں شیخ داؤد کے خلیفہ تھے اور اپنی تیز رفتاری میں مشہور تھے۔ اپنے آپ کو پیر کی محبت میں فنا کر رکھا تھا اور ایسی مناسبت پیدا کرلی تھی کہ دونوں ایک ہی مطلب کی دو عبارتیں معلوم ہوتے تھے۔ دنیا کے الٹ پھیر سے ہمیشہ بے نیاز رہے۔ ان کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی اور دل میں خدا طلبی کا جذبہ جاگ جاتا تھا۔ بلاشبہ وہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی تھے۔

ان کے صرف دو تین رفیق تھے جو ان کے پیر کے ہمراز اور ہم زبان تھے اور لاہور

میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ وہ کسی کو اپنے یہاں نہیں بلاتے تھے۔ پیری مریدی کا کوئی سلسلہ نہیں رکھا تھا، ہمیشہ ایک اندھیرے حجرہ میں جو ایک باغ میں تھا، گوشہ نشین رہتے۔ جب کبھی حضرت میاں سے ملاقات کا اشتیاق ہوتا تو لاہور سے پیدل نکل جاتے اور ایک رات میں 40 کوس کا فاصلہ طے کر کے شیر گڑھ پہنچ جاتے اور پیر کی آستان بوسی کر کے بغیر ملے اسی وقت لوٹ جاتے۔ کیوں کہ ان کو میاں صاحب کے دیدار کی تاب نہیں تھی۔

ایک سال میں[33] بھی ان بزرگوار کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ان کے یہاں ایک رات ایک دن مہمان رہا۔ دوسرے دن شیر گڑھ کے لیے صرف ایک محافظ کے ساتھ روانہ ہوگیا وہ زمانہ نہایت خطرناک تھا، راستہ میں راہزن اور رلیٹرے میرا راستہ روک لیتے تھے اور حیران ہوکر پوچھتے تھے اس خطرناک جنگل میں تم تنہا کہاں جا رہے ہو؟ میں جیسے ہی جواب میں یہ کہتا کہ میں میاں شیخ ابو اسحاق کی خدمت سے حضرت پیر دستگیر کی خدمت میں جا رہا ہوں تو وہ محض ان کا نام سن کر ہی احترام و عقیدت سے پیش آتے اور کھانے پینے کے لیے دودھ، دہی وغیرہ لے آتے اور راستہ بتا کر احتیاط و حفاظت کے لیے حضرت میاں کے نام کے ذکر اور ورد کرتے رہنے کی تاکید کرتے۔ اس علاقہ میں حضرت کا نام ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ غرض میں بحفاظت منزل پر پہنچ گیا۔

جس سال حضرت میاں نے وصال فرمایا تھا، ان کی وفات کے کچھ ہی دن بعد پنجاب میں عام وبا پھوٹ پڑی تھی اسی وبا میں تین چار ماہ کے اندر اندر حضرت کے تمام اہل خاندان اور مشہور خلفاء جو تقریباً پچاس ساٹھ آدمی تھے، جن میں ترجمان اسرار میاں عبد الوہاب جن کو ''میاں بابو'' بھی کہا جاتا تھا شامل تھے ایک کے پیچھے ایک اس دنیا سے رخصت ہوکر حضرت سے جا ملے۔ حضرت کی وفات کے کچھ ہی عرصہ بعد میاں شیخ ابو اسحاق بھی انتقال فرما گئے۔

میاں شیخ داؤد کے بعد سلسلہ عالیہ قادریہ کے نام لیوا ان کے صاحبزادے میاں شیخ عبد اللہ رہ گئے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس سلسلہ کے گدی نشین میاں شیخ ابوالمعالی ہیں:

سلام اللہ اکر اللیالی!
علی الشیخ الصفی ابی المعالی

شیخ رکن الدینؒ

شیخ عبد القدوس گنگوہی کے صاحبزادے ہیں۔قلم ان کے علم وکمال کا پوری طرح احاطہ نہیں کرسکتا۔ انھوں نے جو ''مکتوبات قدسی'' جمع کیے ہیں وہ ان کی فضیلت کا واضح ثبوت ہیں۔ گنگوہ تھانیسر کے علاقے میں ایک قصبہ ہے اور یہی قصبہ ان کا وطن بھی ہے۔ یہ بڑے صاحب مرتبہ بزرگ ہیں۔ ان کے بشرہ سے ہی ان کے کمالات جھلکتے ہیں۔تصوف میں ایک خاص شان کے مالک ہیں۔ ان کے سلوک کا معاملہ ان کے شیوخ کے طریقہ پر ہے۔ ذوق وحال سے بڑی مناسبت ہے۔ امراء و حکام کے گھر شدید ضرورت کے علاوہ نہیں جاتے۔ ہمیشہ گوشہ نشین رہتے ہیں۔ میں[34] نے انھیں بیرم خاں کے ہنگاموں کے وقت دہلی میں شیخ عبد العزیز کی محفل میں دیکھا تھا۔

میاں مصطفیٰؒ گجراتی

وہ اس بوہرہ فرقہ کے فرد تھے جو گجرات میں تجارت کرتا ہے۔ میر سید محمد جونپوری کے ایک مرید کے مرید ہوئے اور فقر وفنا کا راستہ اختیار کرلیا اور مرتے دم تک اسی راہ پر گامزن رہے۔

جب اکبر بادشاہ بنگالہ کی تسخیر کے بعد پٹنہ سے لوٹ کر اجمیر گیا تھا تو حسب الحکم آصف خان ثانی میر بخشی ان کو گجرات سے اپنے ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اکبر نے ایک رات دیوان خانہ کے صحن میں علماء کی مجلس منعقد کی اور شیخ مصطفیٰ سے مہدویت کے مسئلہ کی تحقیق چاہی، انھوں نے جواب دیا اور علماء سے ان کا بڑا طویل مناظرہ ہوا۔ اس بحث میں ابراہیم سرہندی نے اپنی منحوس عادت کے مطابق سخت کلامی سے کام لیا اور شیخ کو بڑی اذیت پہنچائی۔

میر سید محمد کے ایک مرید شیخ محمد لاہیجی نے ایک کتاب ''شرح گلشن'' تصنیف کی تھی اور خود بھی مہدویت کا دعویٰ کر کے بڑے فتنے بر پا کیے تھے۔ اس بحث کے دوران میں[35] نے اس کتاب کے مضمون کو نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا۔ یہ بات چونکہ شیخ کے مدعا کے خلاف پڑتی تھی اس لیے ان کو مجھ سے غالبا رنجش ہو گئی ہوگی۔ جب بادشاہ فتح پور پہنچ گئے تو ان کے لیے حکم صادر ہوا کہ وہ چند دن تک خواجہ عبد الصمد مصور شیریں قلم کے گھر مقیم رہیں۔ اس وقت میں[36] ان کے یہاں معذرت خواہی کے لئے گیا اور اپنی گستاخی کی معافی چاہی۔

اس وقت وہ بہت کمزور ہو گئے تھے اسی محفل میں ان کے لیے طشت لایا گیا ان کے منھ سے بہت سا خون گرا۔ جب ان کو گجرات جانے کی اجازت مل گئی تو وہ وطن پہنچنے کے بعد یا راستہ ہی میں انتقال فرما گئے۔ یہ واقعہ 983ھ/1575ء میں پیش آیا۔ ان کے مکتوبات ان کی یادگار ہیں۔ جو فقر و فنا اور سوز و ساز سے بھرے ہوئے ہیں۔

شیخ اسحٰق کاکوؒ لاہوری

ان کے والد کا نام شیخ کاکو تھا۔ لاہور والے شیخ اسحاق کی ولایت کے معتقد ہیں۔ یہ بڑے صاحب علم، متوکل اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ کبھی کسی کے دروازہ پر نہیں گئے نہ کسی سے مدد مانگی۔ ہمیشہ درس وتدریس میں مصروف رہتے۔ صوفی مشرب ہونے کے باوجود تمام علوم کے بہت بڑے عالم تھے۔ ہمیشہ اللہ کی یاد میں مشغول رہتے تھے۔ جب تک ان سے کوئی بات پوچھی نہ جاتی اس وقت تک وہ خود سے بات نہ کرتے تھے۔

ایک دن ایک نا معقول شخص نے راستہ چلتے ہوئے ان کو پکڑ لیا اور کھیر کا ایک مٹی کا دیگچہ ان کے سر پر رکھ دیا اور کہا اسکو میرے ساتھ لے چل۔ حضرت نے بلا تأمل و انکار اسے سر پر اٹھا لیا اور بازار سے اس کے مکان تک لے جا کر پہنچا دیا۔ اسی دن سے اس شخص کے دل کا کھوٹ نکل گیا اور دنیاداری چھوڑ کر وہ آخرکار عالم دین بن گیا۔

میں[36] نے 995ھ/1587ء میں شیخ موصوف سے ملاقات کا شرف حاصل کیا تھا۔

ایک دن میں نے شیخ فیضی سے جسے انھی دنوں ملک الشعراء کا خطاب ملا تھا، مذکورہ بالا حکایت بیان کی۔ فیضی نے جیسا کہ اس کی عادت تھی کہ وہ ماضی و حال کے تمام علماء و مشائخ کا مذاق اڑاتا رہتا تھا،حضرت کی بھی مذمت کرنے لگا۔ اس کی باتوں پر میں(36) صبر کرکے خاموش ہو رہا۔ ٹھیک یادنہیں وہی رات تھی یادوسری، میں(36) نے خواب میں دیکھا کہ ''شیخ ابو الفضل ایک جنگل میں ٹھہرا ہوا ہے اور ایک پرانے کھنڈر میں جس کی دو تین دیواریں کھڑی ہوئی تھیں شیخ اسحٰق ان توپچیوں کی جماعت میں ہیں جو ہر چاند رات کو بادشاہی اعزاز میں بندوقیں سر کرتے ہیں۔ انھوں نے بندوق اٹھا کر میری طرف چلادی اور میرے چاروں طرف چنگاریاں بکھر گئیں، یہ دیکھ کر میں خوف سے جاگ اٹھا۔ دوسرے ہی دن میں شیخ کی خدمت میں نذرانے لے گیا جسے آپ نے قبول فرمالیا۔ میں نے اپنا یہ قصہ بیان کیا تو، کچھ نہ کہا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

وہ لاہور کے بہت سے مشہور علماء کے استاد ہیں جیسے شیخ سعد اللہ جو اپنے زمانہ کے بے مثل عالم ہیں اور شیخ منور وغیرہ۔

جوانی میں حضرت شکار کے بڑے شوقین تھے، چنانچہ جب بھی سبق پڑھانے سے فارغ ہوتے، باز، عقاب وغیرہ لے کر شکار کے لیے نکل کھڑے ہوتے اور شکار گاہ میں پیدل ہی گھومتے رہتے۔

ان کی عمر 100 سال سے زیادہ ہوئی اور 996ھ/1588ء میں انتقال فرمایا۔

شیخ سعد اللہ بنی اسرائیل

شیخ اسحاق کاکو کے شاگرد رشید ہیں۔ ان کی زندگی مختلف مرحلوں سے گزری۔ ابتدا میں شریعت کے بڑے پابند تھے۔ پھر اچانک سب کچھ چھوڑ کر ایک گانے والی کے عشق میں مبتلا ہو گئے اور سفید داڑھی کے باوجود آوارہ گردی کرتے رہے:

زین پیش اگر چہ خلق گردی گرفتی زما سبق
عشق آمد و نماند نشانی زما سبق

ان کا تو عشق نے یہ حال کیا اور لوگ خوش عقیدگی کی وجہ سے اسے بھی ایک حال جان کر ان کو ولی سمجھنے لگے۔ اس واہی تباہی کی حالت میں عین نخاس میں کھڑے ہو کر درس دینے لگتے، جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے اپنے اس محبوب کے پیچھے لٹا دیا۔ ایک رات وہ اس کے ساتھ بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ محتسبوں کی ایک جماعت نے ان کے طلباء کے ساتھ چھاپہ مارا تو اور دیوار پر چڑھ کر گھر میں داخل ہوئے۔ لہو ولعب کا سارا سامان توڑ دیا۔ اصلاح کی خاطر انھیں سزا دینا چاہتے تھے کہ انھوں نے ان لوگوں سے وہی بات کہی جو کسی نے خلیفۂ ثانی امیر المومنین حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ: ''میں نے ایک خلاف شریعت کام شروع کیا اور تم لوگ تین غیر شرعی خطاؤں کے مستحق ہوئے ہو۔ اس لیے تم مجھ سے زیادہ سزا کے مستحق ہو۔ ایک تو یہ کہ تم نے میری برائیوں کی ٹوہ لگائی، دوسرے اجازت نہیں لی، تیسرے دیوار پھاند کر گھر میں داخل ہوئے'' یہ سن کر وہ سب لوگ نہایت شرمندہ ہوئے اور وہاں سے لوٹ گئے۔

کچھ عرصہ کے بعد انھوں نے ان بد اعمالیوں سے توبہ کر لی اور احیاء العلوم، کو اپنا دستور العمل بنا کر ہمیشہ عبادتوں اور ریاضتوں میں بسر کرنے لگے۔

انھوں نے نہایت مفید اور بلند مرتبہ کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔ امام غزالی کی تصنیف '' جواہر القرآن'' پر ایک شرح بھی لکھی تھی۔

اکبر نے ان کو خلوت میں بلا کر گفتگو کی تھی اور ان سے پوچھا کہ تم کس قوم کے ہو؟ انھوں نے برجستہ کہا لکھنے والوں کی قوم سے جن کو ہندی زبان میں کایستھ کہتے ہیں ان کی یہ بے تکلفی بادشاہ کو بہت پسند آئی اور کافی دیر تک ان سے باتیں کرتا رہا۔

میں[36] نے پہلی بار ان سے لاہور میں ملاقات کی تھی کسی موضوع پر ملتان کی بربادی، لاہور کے آباد ہونے، سلاطین لنکاہ، خاص طور سے سلطان حسین کا قصہ انھوں نے اس دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ میں ان کی فصاحت اور واقعات کے تجزیہ و تنقید سے حیران رہ گیا۔ گفتگو کی یہ حلاوت و شیرینی میں نے مشکل ہی سے کسی میں پائی۔ وہ نہایت فیاض طبع انسان تھے۔ کوئی سائل ان کے در سے محروم نہیں جاتا تھا۔ ان کی نہ تو تجارت تھی نہ زراعت بادشاہ کی طرف سے کوئی مدد معاش بھی نہیں ملتی تھی، کسی کو پتہ نہیں چلتا تھا کہ

آمدنی کے بغیر وہ اس قدر ایثار و فیاضی کس طرح کرتے ہیں۔ لوگ اس معاملہ میں ہمیشہ حیران ہی رہے۔ تقریباً 80 سال کی عمر میں انتقال ہوا۔ ان کے جنازہ میں چھوٹے بڑے ہزاروں آدمی شریک تھے اور بڑی عقیدت سے کاندھا دے رہے تھے۔

میاں شیخ عبداللہ بدایونی

میاں صاحب اپنے زمانہ کی ایک زندہ نیکی اور اللہ کی برکت ہیں۔ بچپن میں جب وہ بوستان پڑھ رہے تھے تو اس شعر پر پہنچے:

محال است سعدی کہ راہ صفا
تو ان رفت جز درپی مصطفٰے

(سعدی یہ محال معلوم ہوتا ہے کہ سچائی کے راستے کو کوئی سوائے محمد ﷺ کے علاوہ کسی دوسرے راستے پر چل کر حاصل کرلے)

انھوں نے استاد سے کہا اس شعر کا مطلب ہندی زبان میں بتادیجیے۔ استاد نے کہا تجھے اس حکایت سے کیا غرض؟ آپ نے فرمایا: ''جب تک آپ اس کا مطلب ذہن نشین نہیں کرائیں گے سبق نہیں پڑھوں گا''۔ جب معلم نے اس کے معنی بتادیے تو انھوں نے حضور اکرم کے متعلق پوچھا کہ وہ کون تھے؟ استاد نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ حالات اور معجزے بیان کیے۔ بس اتنا سنتے ہی ایک جذب سا ان پر طاری ہوا، اپنا کرتہ پھاڑ دیا اور کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس واقعہ کی جب ان کے والدین کو خبر ہوئی تو دوڑے آئے لیکن جب دیکھا کہ ڈرانے دھمکانے سے وہ اپنے خیال سے نہیں ہٹیں گے تو انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا اور وہ اپنے آبائی وطن سامانہ سے قرآن سیکھنے، احکام دین معلوم کرنے کی خاطر دہلی چلے آئے اور بڑے بڑے علماء و مشائخین کی صحبت سے فیض اٹھا کر اپنے زمانہ کے بڑے عالم بن گئے۔

شیخ الباقی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، انھی سے ذکر کی تلقین حاصل کی، پھر شیخ صفی خیر آبادی اور دوسرے بزرگوں سے وابستہ رہے اور بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کئے اور طریقت و سلوک کا تکملہ کیا۔ اپنے زمانے کے اکثر رہنماؤں سے فیض تربیت حاصل کیا،

خاص طور سے میاں شیخ لادن دہلوی اور میر سید جلال بدایونی سے ان کو بڑی عقیدت رہی۔ میر سید جلال کی وفات کے بعد ان کی جگہ پر برسوں بدایوں میں درس دیتے رہے بڑے بڑے مشہور عالم ان کی مجلس درس کے باعث عالم کہلائے۔

دور دور سے لوگ ان سے استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ آخر حال میں ان پر حالت جذب کا غلبہ رہتا تھا۔ مجلس سماع میں حاضر ہوتے تھے اور انتہائی جذب وشوق میں نعرہ لگا کر اٹھ کھڑے ہوتے اور چند قدم تک جھومتے جاتے لیکن رقص اور وجد کیے بغیر ہی اچانک لاحول پڑھ کر اپنی جگہ لوٹ جاتے تھے۔ ان کے شاگرد بہت کہتے کہ حضرت تکلیف نہ کیا کریں ہم یہ خدمت بجالاتے ہیں، وہ قبول نہیں کرتے تھے۔

ان کے چہرہ مبارک پر فقر وفنا کی جھلک صاف نظر آتی تھی۔ ان کو اپنے بزرگوں سے تلقین و ارشاد اور سند خلافت ملی ہوئی ہے۔ لیکن پیری مریدی کے بکھیڑے میں نہ پڑے، بلکہ اس سے دور ہی بھاگتے ہیں۔

میں[30] ان کے پاس کلام، تحقیق اور اصول فقہ کی شرحیں پڑھا کرتا تھا میرے ساتھ نہایت ذہین اور مخلص شاگرد شریک درس رہا کرتے تھے اور سبق پڑھتے ہوئے بڑی الجھی ہوئی اور دقیق بحثیں کرتے تھے۔ میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا کہ ان اونچی بحثوں اور گہرے نکات کے حل و افادہ میں انھیں کسی کتاب کے دیکھنے کی ضرورت ہوئی ہو۔ تمام علمی نظریے ان پر بخوبی روشن تھے اور گہرے نکات کے حل وافادہ میں انھیں کسی کتاب کا محتاج نہ ہونا پڑا، انھیں حل و تحقیق کا بڑا ملکہ حاصل تھا، خدا کی تائید و توفیق بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس وقت ان کی عمر 90 سال ہے۔

شیخ جلال الدین قنوجی

ایک مجذوب اور سالک تھے۔ ان کے بزرگ ملتان سے آکر ہندستان کے قدیم شہر قنوج میں مقیم ہوگئے تھے۔ سلوک کا مرحلہ طے ہوا تو جذب کی حالت طاری ہوگئی مگر اس حال میں بھی اتباع شریعت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

جب کبھی ان پر حال آجاتا تو وہ منہ کالا کر کے چار پائی کی رسی گردن میں ڈال کر بازاروں میں گھومنے لگتے اور بڑی درد انگیز آواز میں فریاد کرتے رہتے، اس قسم کی حرکتیں ان سے اکثر سرزد ہوتی رہتی تھیں۔

ایک دن مسجد حقیٰ میں جمعہ کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں(36) ان کی خدمت میں پہنچا۔ وہ اٹھ کر مسجد کے صحن میں اپنے بزرگوں کی قبروں کی طرف چلے گئے۔ایک خادم ان کے ساتھ تھا۔ ہر قبر پر علیحدہ علیحدہ فاتحہ پڑھی اور خادم سے ہر ایک کا حال بیان کرتے رہے۔ وہاں سے لوٹتے ہوئے فرائض میں سے ایک مسئلہ اس خادم سے پوچھا،اس نے جواب دیا کہ اگر کوئی شخص مرجائے، ایک لڑکا اور ایک لڑکی وارث چھوڑ جائے تو لڑکے کو میت کی چھوڑی جائداد میں سے 2 حصے اورلڑکی کو ایک حصہ ملے گا'' مسئلہ بڑی توجہ سے سنا اور پھر کچھ کہے بغیر چلے گئے۔

بعد میں پتہ چلا کہ اس حدیث کے مطابق کہ: ''قبروں پرعلم فرائض کا کوئی مسئلہ کہا جائے اور ورثے کی تقسیم کا ذکر کیا جائے تو اس کی برکت سے تمام اہل قبور کی مغفرت ہو جاتی ہے''۔ حضرت کا یہ معمول رہتا تھا کہ وہ کسی جمعہ کو ترک نہیں کرتے تھے۔

شیخ کپور مجذوب گوالیاری

حسینی سادات سے تعلق رکھتے تھے۔ پہلے سپاہ گری کا پیشہ کیا کرتے تھے۔ اچانک نوکری چھوڑکر سقّہ گیری کا کام شروع کردیا۔ راتوں کو پردہ نشین بیوہ عورتوں کے گھر پانی پہنچایا کرتے تھے۔ لوگوں کو بغیر اجرت کے پانی دے دیتے تھے۔ اسی حال میں ان پر جذب طاری ہوگیا۔ کسی سے نہیں بولتے تھے۔ ہمیشہ اپنے آپ میں گم رہتے تھے:

می شدم دست بدیوار زضعف از کویت
آمدی جلوہ کنان صورت دیوار شدم

(میں اپنی کمزوری کے باعث تیری گلی میں دیواروں پر ہاتھ رکھ کرگزار رہا ہوں
جب تو نے اپنا جلوہ دکھایا تو میں دیوار کی طرح مبہوت وساکت ہوگیا)

گوالیار کے بازار کے ایک سرے پر اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ وہ اس جگہ ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں نظر آتے تھے۔ اگر حاضرین میں سے کسی کے دل میں کوئی بات کے پوچھنے کا خیال آجاتا تو بے کہے ہی وہ ہذیان کی صورت میں بڑ بڑاتے ہوئے اس کا جواب دے دیتے اور اس کی مشکل حل ہو جاتی۔ غیب کی باتوں کی خبریں بیان کرتے رہتے۔ راتوں کو ہمیشہ قیام کی حالت میں رہتے، کبھی روتے اور کبھی ہنستے۔

میں[37] نے معتبر لوگوں سے سنا ہے کہ ایران سے ایک سید نے آکر ان سے سیادت کا ثبوت مانگا تھا۔ جواب میں آپ نے لکڑیاں جمع کر کے آگ بھڑکانے کا حکم دیا۔ پھر اس سید کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''آؤ ہم دونوں اس آگ میں داخل ہوجائیں تاکہ جھوٹ اور سچ ظاہر ہوجائے۔ سید تو سہم کر کھڑا رہ گیا اور وہ آگ میں جاکر صحیح سلامت نکل آئے''۔ ان کی ایسی بہت سی خوارق عادت مشہور ہیں۔

979ھ/ 1571ء کو ایک رات سانپ سانپ چلاتے ہوئے دوڑے اور دروازے سے نیچے گر پڑے اور اسی وقت جان بحق ہوگئے۔ شیخ فیضی نے تاریخ وفات ''کپور مجذوب'' سے نکالی ہے۔

شیخ اللہ بخش گڑھ مکتیسری

دریائے گنگا کے کنارے سنبھل کے تحت گڑھ مکتیسر ایک قصبہ ہے۔ شیخ اللہ بخش اسی قصبہ میں 40 سال تک فقر و قناعت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ بڑے متوکل بزرگ تھے۔ ہمیشہ خدا کی یاد میں مشغول رہتے۔

70 سال کی عمر میں آپ سنبھل تشریف لے گئے تھے۔ شیخ بنجو مرحوم سنبھلی کی ایک بوڑھی خادمہ جو بڑی عبادت گزار صائم الدہر اپنے وقت کی بی بی رابعہ تھی 35 سال سے شوہر کے بغیر زندگی بسر کر رہی تھی۔ ہمیشہ افطار دودھ سے کیا کرتی تھی غائبانہ طور پر شیخ ممدوح کی معتقد ہوگئی اور ان سے درخواست کی کہ: ''مجھے خدا کا راستہ دکھادیجئے! آپ نے جواب بھجوایا کہ ''جب تک تم حضور اکرمؐ کی پیروی نہیں کروگی اور کسی سے نکاح نہ کرلوگی

اللہ کے راستہ کی تلاش تمہارے لیے ایک وبال ہے''۔ وہ اس وقت پالکی میں بیٹھ کر حضرت کے پاس پہنچ گئی اور انہی سے ان کا نکاح ہوگیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد دونوں آخرت کی منزل کے لیے کوچ کر گئے۔ میں[38] دہلی کے ایک معزز سید زادے سید قاسم کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ میں[38] نے انھیں نہایت خوش کلام اور خوش طبیعت پایا۔ جب ہاتھ دھونے کے لیے آفتابہ اور طشت آیا تو انھوں نے فرمایا: ''ان سید صاحب سے ابتدا کی جائے کیونکہ ہاشمی کو اولیت حاصل ہے''۔

شیخ عارف حسینیؒ

یہ صاحب دعوت بزرگ شاہ اسمٰعیل صفوی کے پوتوں میں سے ہیں۔ انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ جلی ہوئی جو کی روٹی اور کڑوی کسیلی ترکاری سے افطار کر لیتے ہیں، ایسی غذا کوئی دوسرا نہیں کھا سکتا۔

شریعت کی پابندی کا بڑا اہتمام رہتا ہے۔ کسی سے نہیں ڈرتے۔ چنانچہ شاہی دربار میں ابوالفضل کی بیٹھک کے بالکل ہی سامنے وہ بے جھجک پانچ وقت کی اذان کہتے ہیں ان کی بہت سی کرامتیں لوگوں میں مشہور ہیں وہ کاغذ کی گول کترنیں جلتی انگیٹھی میں ڈال دیتے ہیں اور اس میں سے سکہ لگی ہوئی اشرفیاں نکال کر جتنے بھی حاضرین مجلس ہوں انھیں دے دیتے ہیں۔ اگر انھیں کسی حجرے میں مقفّل کر دیا جائے تو وہاں سے غیر محسوس طور پر نکل کر کسی اور جگہ ظاہر ہوتے ہیں۔

جب گجرات سے لاہور آئے ہوئے تھے تو انھوں نے لوگوں کو جاڑے کے پھل گرمیوں میں اور گرمیوں کے پھل جاڑوں میں دیے۔ اس کرامت پر پنجاب کے علماء خاص طور سے مخدوم الملک نے اعتراض کیا کہ یہ پھل ظاہر ہے لوگوں کے باغوں سے ہی ان کی اجازت کے بغیر حاصل کیے گیے ہیں۔ اس لیے ان کا کھانا غیر شرعی اور حرام ہے۔ ان علماء کی وجہ سے جب لاہور میں ان کی نبھ نہ سکی تو وہ کشمیر چلے گئے۔

کشمیر کے حاکم علی خان کو ان سے بڑی عقیدت ہوگئی۔ اس نے اپنی لڑکی کا ان سے

نکاح کر دیا۔ جب دیکھا کہ وہ ٹک کر رہنے والے آدمی نہیں ہیں تو ان سے لڑکی کا مہر لے کر طلاق دلوادی اور شاہ عارف حسینی وہاں سے نکل کر تبت چلے گئے۔

تبت میں بھی ان کی کرامتیں بڑی مشہور ہیں۔ ایک عجوبہ یہ تھا کہ وہ درخت کو پکڑ کر ہلاتے تھے تو اس سے درہم و دینار جھڑنے لگتے تھے۔ غرض گجرات، ہندستان، کشمیر اور تبت میں ان کے بڑے تصرفات اور اثرات رہے ہیں۔ مگر جہاں جاتے تھے لوگ ان کے پیچھے پڑ جاتے تھے، اس لیے وہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں نکل جاتے تھے۔

جس وقت اکبر بادشاہ کشمیر سے کابل کی طرف سفر کر رہا تھا، شاہ صاحب نے اسی سفر میں اکبر سے ملاقات کی تھی اکبر نے ان پر محافظ اور نگران کار مقرر کر دیئے جب بھی وہ اکبر کی ملاقات کو آتے تھے تو ایک سونے کے پیالہ میں مشک کافور اور دوسری تمام خوشبویات ڈال کر بطور تحفہ لے کر آتے تھے۔ اکبر نے ان سے بہت کہا کہ: ''آپ ہم سے کچھ سونا یا کوئی جاگیر قبول فرمالیں''۔ وہ ہر بار یہی جواب دیتے کہ: ''روپیہ تم اپنے احدیوں کو دو کہ وہ بد حال ہیں، میں لے کر کیا کرونگا؟''

میں[39] ایک مرتبہ قلیچ خاں کے ساتھ ابوالفضل کی کچہری میں ملاقات کے لیے گیا۔ حضرت، ابوالفضل کی ہی نگرانی اور حراست میں تھے۔ اس وقت وہ ابوالفضل کے بالا خانہ میں تھے۔ منھ پر نقاب ڈالے بیٹھے کتابت کر رہے تھے۔ کہنے لگے: ''یہ جو قلیچ خان ہے وہ کہہ رہا تھا میں قلیچ ہوں، تمہارا خادم اور غلام''۔

چہرہ چھپائے رکھنے کی عادت بہت پرانی تھی۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر جائیں تو کوئی انھیں پہچان نہ سکے۔ میں نے ایک قابل اعتماد مقرب سے سنا ہے کہ کشمیر میں اکبر نے ایک دن شیخ ابوالفضل اور حکیم ابوالفتح کو شاہ صاحب کی خدمت میں بھیجا۔ ان لوگوں نے حسب الحکم ان سے پوچھا کہ: ''اگر آپ نقاب اٹھالیں تو کیا حرج ہے میں آپ کا دیدار کرلونگا۔ انھوں نے قبول نہ کیا اور کہا ہم فقیر آدمی دنیا سے الگ تھلگ ہیں اور ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو، تکلیف نہ دو''۔ حکیم ابوالفتح بڑا شوخ اور بے باک آدمی تھا اس نے ہاتھ بڑھا کر نقاب اتار لینا چاہا۔ شاہ صاحب نے اسے روک

دیا اور نہایت غصہ میں کہا: ''میں بدشکل اور بدنما آدمی نہیں ہوں، لو میرا چہرہ دیکھ لو''۔ یہ کہہ کر گریباں پھاڑ ڈالا اور چہرہ سے نقاب اتار کر زمین پر پھینک دی۔ اس کے بعد کہا: ''حکیم تو نے تو میرا چہرہ دیکھ لیا لیکن انشاء اللہ اس کا نتیجہ ایک دو ہفتے میں تیرے سامنے آجائے گا''۔ چنانچہ پندرہ دن پورے بھی نہیں ہوئے ہوں گے کہ حکیم ابوالفتح اسی سفر میں اسہال کے مرض میں فوت ہوگیا۔ ایسی کرامتیں شاہ صاحبؒ سے بے شمار ہوتی رہی ہیں۔

ایک دن اکبر نے کہا: ''شاہ یا تو آپ ہمارے جیسے ہو جائیں یا ہم کو اپنے جیسا بنالیں''۔ انھوں نے جواب دیا کہ ہم بدنصیب اپنے آپکو تمہارے جیسا کس طرح بنا سکتے ہیں، ہاں اگر تم چاہتے ہو تو ہمارے برابر آکر بیٹھ جاؤ تا کہ ہمارے جیسے بن جاؤ''۔

میر سید علاء الدین اودھیؒ

بڑے اعلیٰ مقام پر پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ اللہ کی جیتی جاگتی نشانی تھے۔ ان کی کرامتیں اور کمالات نہایت روشن اور واضح تھے۔ لوگ ان کے عجیب وغریب خوارق بیان کرتے ہیں۔

صاحب کلام اور باذوق آدمی تھے، حقائق و معارف کو کبھی کبھی نظم میں بھی ادا کرتے تھے۔ ان کا یہ مطلع تو بہت مشہور رہا ہے:

ندانم آن گل خودرو چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہرچمنی گفتگوی او دارد

ان کے ایک ترجیع بند کا ایک بند حسب ذیل ہے:

کہ بچشمان دل مبین جز دوست
ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

شیخ عرفی نے اسی زمین میں کہا ہے:

کہ جہان صورت است و معنی دوست
در بمعنی نظر کنی ہمہ اوست

کسی اور کا شعر ہے:

کہ جہان پر تویست از رخ دوست
جملہ کائنات سایۂ اوست

اسی موضوع پر میرا[40] بھی ایک شعر ہے:

اوست مغز جہان جہان ہمہ پوست
خود چہ مغز وچہ پوست چون ہمہ اوست

ان کی تربیت کے دامن سے بڑے بڑے مشائخ اٹھے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ میر سید ماہرو اپنے والد کے قدم بقدم نظر آتے ہیں۔ ایک اور مرید میر سید علی سہری تھے، جو بڑے صاحب حال تھے۔ ہمیشہ روپوش رہتے تھے۔ ان کا فقر بھی ایک خاص شان رکھتا ہے۔ تصوف کے مضامین بڑی عجیب زبان میں ادا کرتے تھے۔ میں کانت وکولہ، جو کہ سنبھل کا ایک قصبہ ہے، میں حسین خان کے ساتھ ان کی خدمت میں گیا تھا اور ان کی گفتگو سے فائدہ اٹھایا تھا۔ میر سید علی ہمیشہ یہ دعا کرتے کہ: ''یا اللہ ہمیں شہید اٹھانا''۔

ایک مرتبہ ان کے گھر میں ایک چور گھس آیا۔ جب شور مچا تو میر صاحب اس وقت 90 سال کے ضعیف ہونے کے باوجود ایک لوہا اٹھائے اللہ اللہ کہتے ہوئے اُس کا پیچھا کرنے لگے اور ایک دو کو مار گرایا اور زخمی کردیا آخر ایک ضرب ان کو لگی اور وہ شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ 998ھ/1580ء کا ہے۔ ان کی تاریخ وفات۔ ''چہ شد آن مرشد کامل'' سے نکالی گئی ہے۔

شیخ حمزہ لکھنوی

یہ ملک آدم کاکر کے پوتے ہیں جو سلطان سکندر اور ابراہیم لودی کے امرا میں سے تھا، ہمیشہ اپنے دادا کی قبر کے مجاور بنے بیٹھے رہتے تھے۔ ملک آدم کی قبر دو عام قبروں کے برابر بلکہ اس سے کچھ اور لمبی تھی۔

شیخ حمزہ بلند، بالا، صاحب جذب اور بڑے شکوہ والے بزرگ تھے۔ جب کبھی شہر میں آتے شیر کی طرح خراماں خراماں راستہ طے کرتے۔ ان کے ہاتھوں میں پتھر ہوتے، انھیں وہ ہر طرف پھینکتے جاتے لیکن کمال یہ تھا کہ وہ پتھر کسی کو لگتے نہ تھے۔ان کی گفتگو زندگی کے عمل کے واسطے پاکیزہ تھی۔ ہمیشہ کلام پاک کی تلاوت کرتے رہتے تھے جس کسی کو اہل جانتے تھے اس سے بات کرتے تھے، ان کو اپنے پاس بلا کر بٹھاتے۔ میں بھی ان کے پسندیدہ آدمیوں میں سے تھا۔ ان سے ملاقات کو میں اچھا شگون جانتا تھا۔ ورنہ اکثر لوگ تو ان کی حرکتوں کو دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے اور پاس نہیں پھٹکتے تھے کہ کہیں کوئی ضرر نہ پہنچ جائے۔

شیخ پیرکؒ

شیخ پیرکؒ بھی لکھنو کے رہنے والے ہیں۔ دریائے کودی (دریائے گومتی)[42] کے کنارے جنگل کے اندر ایک غار میں جہاں تک کسی شخص کا پہنچنا محال ہے، چھپے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک بار جمعہ کی نماز کے بعد افطار کرتے تھے۔ ان کے گھر میں ایک بوڑھی عورت رہتی تھی جو خشک روٹی اور اس بیری کے بیر جسے اس نے خود بویا تھا ان کے کھانے کے لیے لے آتی تھی۔

اگر کوئی بڑی مشقتیں برداشت کرکے ان کی ملاقات کے واسطے جاتا تو وہ مقررہ وقت پر اپنے حجرے کے دروازہ پر آکر بیٹھ جاتے مگر کوئی بات نہیں کرتے۔ جس زمانہ میں حسین خان لکھنؤ کا حاکم تھا میں[43] بھی اپنے ایک دوست عبد الرحمٰن نامی شخص کے ساتھ جو حسین خان کا خلیفہ تھا شیخ پیرک سے ملنے کے لیے گیا۔ اتنے ضعیف اور کمزور تھے کہ بس ہڈی چمڑہ نظر آرہے تھے۔ اس غار کے اندر اور باہر بہت سے بڑے بڑے سانپ پھن نکالے ہوئے نظر آرہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے ڈر کر سانپ کو لکڑی سے مارنا چاہا، انھوں نے اشارہ سے روک دیا اور کہا: ''ان سانپوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟'' معلوم ہوا کہ 30 سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا وہ اس غار میں رہتے ہیں اور یہ سانپ ہیں کہ ان سے مانوس ہوچکے ہیں اور کسی کو نقصان نہیں پہنچاتے۔ جب ہم لوگ رخصت

ہونے لگے تو انھوں نے چند باسی روٹی کے ٹکڑوں اور خشک میوہ کی طرف جو ان کے سامنے رکھا ہوا تھا اشارہ کیا کہ: ''یہ اٹھالو'' میرے[44] ساتھی نے سونے کا ایک ٹکڑا بطور تحفہ دینا چاہا، انھوں نے قبول نہ کیا۔ لکھنؤ کے یہ دونوں بزرگ شیخ حمزہ لکھنوی اور شیخ پیرک انہی دنوں انتقال فرما گئے تھے۔

شیخ محمد حسین سکندریؒ

سکندر دوآبہ کا ایک قصبہ ہے۔ شیخ محمد حسین بڑے صاحب ذوق بزرگ تھے، لوگوں سے دور عزلت نشین رہتے تھے۔ ملازمت ترک کرکے پورے پچاس سال تک عبادت و ریاضت میں گزارے تھے۔ اس دوران کسی کے دروازہ پر نہیں گئے۔ جب میں[45] 974ھ/1566ء میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے خواجہ حافظ کے اس شعر کے معنی پوچھے:

عفو خدا بیشتر از جرم ماست
نکتۂ سربستہ چہ گوئی خموش

میں[45] نے پوچھا اس میں آپکو کس جگہ پریشانی محسوس ہو رہی ہے؟ انھوں نے کہا: ''حافظ نے جب خود نکتۂ سربستہ کہہ دیا تو پھر خاموش رہنے کا حکم کیوں دے دیا؟'' میں[45] نے کہا: ''اس کی وضاحت آپ خود فرمائیں تو بہتر ہے''۔ انھوں نے کہا: ''میرے ذہن میں تو یہ آتا ہے کہ ''نکتۂ سربستہ'' غالباً یہ ہو کہ ''ہمارے سارے گناہ خدا ہی کے خلق کیے ہوئے ہیں''۔ یہ بات کہنا ہی حد ادب سے تجاوز کرنا ہے، اس لیے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ میں بھی جواب میں خاموش رہا۔

اسی طرح کی تاویل انھوں نے اس آیت میں بھی کی ''واعبد ربک حتی الیقین'' ان کا کہنا تھا کہ یہاں ''حتیٰ'' کا لفظ ''انتہائی غایت'' کے لیے آیا ہے اور ''انتہائی غایت'' کی یہاں پر گنجائش ہی نہیں۔ شاید یہ انتہائی کاف خطاب کے لحاظ سے ہو''۔ ان کی اس بات کا مطلب میں سمجھ نہ سکا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے اس سے اس کی کیا مراد تھی؟ ان سے وہ میری[46] آخری ملاقات تھی۔

شیخ عبدالواحد بلگرامیؒ

بلگرام قنوج کے ماتحت ایک قصبہ ہے یہ بڑے صاحب فضل و کمال بزرگ تھے۔ ریاضت و عبادت بہت کیا کرتے تھے۔ ان کی ذات تمام اخلاق حمیدہ کی جامع تھی۔

ابتداء میں وہ ہندی راگ گایا کرتے تھے اور خود بخود حال میں آجاتے۔ کچھ عرصہ سے راگ راگنی کا یہ مشغلہ چھوڑ دیا ''نزھۃ الارواح'' کی انھوں نے بڑی محققانہ شرح لکھی تھی۔ اسی طرح علم تصوف پر اور بھی کئی ایک رسالے لکھے، ان میں ایک ''سنابل'' نام کی کتاب بھی ہے اور بھی کئی دیگر عمدہ تصانیف ہیں۔

یہ اگر چہ کسی اور بزرگ کے مرید ہیں، لیکن شیخ حسین سکندرہ سے فیض و تربیت پائی ہے۔ ہر سال بلگرام سے حضرت شیخ کے عرس پر تشریف لاتے ہیں۔ اب بینائی کمزور ہوچکی ہے اس لیے اب آجا نہیں سکتے۔ قنوج میں انتقال ہوا۔

میں[47] 977ھ/1569ء میں لکھنو سے بلگرام گیا تھا وہ رات کو میری عیادت کے لیے تشریف لائے یہ میری[47] پہلی ملاقات تھی جو میرے لیے مرہم و شفاعت سے کم نہ ثابت ہوئی۔ کہنے لگے: ''یہ سب عشق کے پھول اور پتے ہیں''۔ اتفاق کی بات ہے کہ اسی جگہ پر بدایوں سے مخدومی شیخ عبداللہ بدایونی بھی پہنچ گئے۔ مجھے یقین ہوگیا کہ میرے لیے اگر کوئی رات شب قدر کے مانند ہے تو وہ یہی رات ہے۔

شیخ عبدالواحد کو نظم سے بھی مناسبت اور لگاؤ تھا۔ چنانچہ اپنے ایک ملیح و خوش ادا محبوب راجا نامی شخص کے لیے یہ شعر کہا تھا:

ای کردہ خیال تو بہ تخت دل ماجا
ہر گز بنود در دل ما غیر ترا جا

انہی کا ایک شعر یہ ہے:

مرد بنگ چو اول بہ صلح آمدۂ
دمی بلطف نشین تاز خویش برخیزم

عہد اکبری کے علماء

صرف انہی علماء کا ذکر کیا گیا ہے جن سے میری[47] ملاقات ہوئی یا جن کا میں[47] شاگرد رہا ہوں یا ایسے علماء جن کا اس عہد میں نام وشہرہ رہا ہے۔ جو شمار سے کہیں زیادہ ہے۔

میاں حاتم سنبھلی

یہ میاں عزیز اللہ طلبنی کے شاگرد ہیں۔ معقول ومنقول میں انکی طرح جامع عالم کوئی اور نہ تھا، خاص طور سے علم کلام، اصول فقہ اور عربیت میں بے نظیر تھے۔ مشہور ہے کہ شرح ''مفتاح اور''مطول'' انھوں نے اول سے آخر تک 40 مرتبہ پڑھائی تھی، دوسری منتہی کتابیں اسی طرح پڑھاتے رہتے تھے۔

مخدوم الملک کے متعلق ان کی رائے تھی کہ وہ علم محاضرات[48] میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مطلب یہ ہے کہ علوم دین کے مقابلہ میں وہ معلوماتی علوم پرزیادہ قادر ہیں۔

ملا علاؤ الدین لاری شرح عقاید نسفی پر ایک حاشیہ بڑے دعوی سے لکھ کر ان کے پاس لے گئے۔ میاں صاحب نے مطالعہ کے بعد اس پر ایسے اعتراضات کیے کہ ملا علاؤالدین سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

میاں صاحب فقہ میں امام اعظم ثانی کے برابر تھے۔ ریاضت اور مجاہدہ بھی بہت

کرتے تھے۔ تقوی و صلاح سے آراستہ تھے۔ ان علمی کمالات کے ساتھ لمبے عرصہ تک مقتدر حاکم بھی رہے۔

خان خاناں بیرم خان کے زمانہ میں ایک مرتبہ میں 5 سال بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اسی دوران شیخ مبارک کے یہاں تعلیم حاصل کرتا رہا۔ پہلے میاں صاحب اتنے لمبے عرصے تک ملاقات نہ ہونے کے احوال پوچھتے رہے۔ پھر انھوں کے دریافت کیا: ''شیخ مبارک کیسے مولوی ہیں؟'' میں نے جواب دیا ''علمیت، تقوی، فقر و مجاہدہ، امر معروف و نہی منکر میں بے مثل و بے نظیر ہیں''۔ اس زمانہ میں شیخ موصوف ان تمام باتوں کے بڑے پابند تھے۔ میاں حاتم نے کہا ہم نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے لیکن مشہور ہے کہ وہ مہدوی ہیں۔ آخر اس کی حقیقت کیا ہے؟'' میں نے کہا: ''وہ میر سید محمد جون پوری کی بزرگی اور ولایت کے قائل ہیں ان کی مہدویت کے قائل نہیں۔ اس پر میاں صاحب نے کہا: ''میر سید محمد کے کمالات میں کیا شک ہو سکتا ہے''۔ اس مجلس میں میاں صاحب کے شاگرد میر سید محمد میر عدلی بھی موجود تھے، انھوں نے دریافت کیا: ''پھر ان کو یعنی ملا مبارک کو مہدوی کیوں کہتے ہیں؟ میں نے کہا: ''وہ چونکہ سب کو امر معروف اور نہی منکر کرتے رہتے ہیں اس لیے لوگ ان کو مہدوی سمجھتے ہیں'' انھوں نے کہا: ''ایک بار عبد الحی خراسانی جس کو چند دن کے لیے منصب صدارت برائے نام مل گیا تھا، خان خانان کے سامنے شیخ کی بڑی مذمت کر رہا تھا، اس کی کیا وجہ تھی؟'' میں نے کہا: ''شیخ مبارک نے اس کو ایک خط لکھ کر نصیحتیں کی تھیں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ مسجد میں آکر جماعت کے ساتھ نماز پڑھا کرو۔ بس یہ بات اسے ناگوار معلوم ہوئی اور اس نے یہ گمان کیا کہ شیخ مہدوی ہیں اور مجھ کو رافضی سمجھتے ہیں'' یہ سن کر میر سید محمد عدلی نے کہا: ''عبد الحی خراسانی کا اپنے رفض پر یہ استدلال تو صرف اسی صورت میں درست ہو گا جبکہ وہ اس منطقی کلیہ پر پورا اترے کہ تو نماز باجماعت ادا نہیں کرتا اور جو کوئی باجماعت نماز نہ پڑھے رافضی ہے اس لیے تو رافضی ہوا، حالانکہ اس کلیہ کا کبریٰ ممنوع ہے۔ اس طرح یہ بات بھی منطقی کلیہ پر پوری نہیں اترتی کہ شیخ امر معروف کرتے ہیں جو کوئی امر معروف کرے وہ مہدوی ہے۔

اس کے بعد میاں صاحب نے کہا میں اس استفتاء پر مہر لگاؤں گا لیکن میرے پاس ایک اور استفتاء آیا ہوا ہے جس پر تمام علماء کے دستخط ہیں۔ مجھے اس میں کچھ شبہات ہیں۔ تم اسے شیخ بہاؤالدین جو بڑے محقق مفتی ہیں، کے پاس لے جاؤ اور ان سے کہنا کہ سفر کی وجہ سے میرے ساتھ کتابیں نہیں ہیں۔ اگر آپ اس روایت کو بعینہ بھیج دیتے تو بہتر ہوتا جس کی بنیاد پر آپ نے اس استفتاء پر دستخط کیے ہیں۔ آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ لوگ مصیبت کے عالم میں اپنے بچوں کو فروخت کر سکتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ یہ روایت صرف ''ابراہیم شاہی'' میں ملتی ہے۔ فقہ کی دوسری کتابوں سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ خود یہ ابراہیم شاہی علماء کے نزدیک معتبر کتاب نہیں سمجھی جاتی کہ فتویٰ دینے کے لیے سزاوار ہو۔ اگر آپ یہ کہیں کہ مفتی مرجوعہ روایتوں میں سے کسی کو ترجیح دے سکتا ہے تو پھر میں یہ کہوں گا کہ ابراہیم شاہی کی عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ حالت اضطرار میں ابوین کو اولاد کی بیع جائز ہے ظاہر ہے ''ابوین'' کا لفظ باپ اور دادا دونوں پر مشتمل ہے۔ چنانچہ کتاب نکاح میں جس کے ابوین مسلمان ہوں وہ اس کا کفو ہے جس کے آبا، شرف اسلام سے مشرف ہوئے اس لیے یہاں باتفاق ابوین سے باپ اور دادا مراد ہے نہ کہ ماں اور باپ۔ ہم اس روایت میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اولاد کی بیع کا دونوں کو مل کر بطریق اجتماع اختیار حاصل ہے نہ کہ فرداً فرداً علیحدہ و انفرادی حیثیت کے لیے آخر کیا دلیل ہو سکتی ہے۔

میاں صاحب نے شیخ مبارک کا تو استفتا رکھ لیا اور مذکورہ استفتا مجھے دے دیا۔ یہ استفتا میں نے شیخ مبارک کو دکھایا تو اس نے میاں حاتم کی فقاہت کو بہت سراہا اور کہا: ''ان کو دعا کے بعد میری جانب سے کہنا ہم نے بھی اس وقت کی وجہ سے اس پر مہر نہیں لگائی ہے''۔ جب میں نے وہ شیخ بہاؤالدین کو دکھایا تو انھوں نے قول پر بھروسہ کیا اور زیادہ غور نہ کیا۔ بے شک مجھ سے سہو ہو گیا۔ یہ بھی شیخ بہاؤالدین کی حق بینی وحق پرستی، نیک نفسی اور انصاف پسندی تھی کہ باوجود اس عظمت و کمال کے انھوں نے اپنی غلطی تسلیم کر لی:

بر سر آن نامہ کہ آصف نوشت
قدم رحم اللہ من انصف نوشت

میاں حاتم سنبھلی 70 سال تک برابر لوگوں کو اپنے علم و اخلاق سے فائدہ پہنچاتے رہے۔ 968ھ/1560ء میں وہ بھی اپنے والد سے جا ملے۔ ان کے چند نالائق لڑکے وارث رہ گئے ہیں:

چند بناز پرورم مہربتان سنگ دل
یاد بدر نمی کنند این پسران ناخلف

مولانا عبداللہ سلطان پوریؒ

قوم کے انصاری ہیں۔ ان کے آباؤاجداد نے سلطان پور میں آکر سکونت اختیار کرلی تھی۔ عبداللہ سلطان پوری اپنے زمانہ کا منفرد و یگانۂ روزگار عالم تھا۔ خاص طور سے عربی زبان، اصول فقہ، تاریخ اور دوسرے تمام علوم نقلی میں اسے بڑی مہارت حاصل تھی۔ بڑی اچھی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ جن میں سے ''عصمت انبیاء'' اور ''شرح شمائل النبی ﷺ'' بہت مشہور ہیں۔ ہمایوں بادشاہ جنت مکانی نے مخدوم الملک کا خطاب اور شیخ الاسلامی کا عہدہ دیا تھا۔ شریعت کو پھیلانے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہا۔ نہایت متعصب سنی تھا۔ انھوں نے بہت سے ملحدوں اور رافضیوں کو قتل کرادیا تھا۔

وہ نہایت اصرار سے کہتا تھا کہ ''روضۃ الاحباب'' کا تیسرا دفتر امیر جمال الدین محدث کا نہیں ہے، جس سال کہ گجرات فتح ہوا تھا اور وہ بادشاہی دیوان خانہ کا وکیل مختار تھا اور یہ زمانہ اس کے عین جاہ و جلال کا زمانہ تھا۔ میں[49] پنجاب کے سفر سے لوٹ کر آیا اور شیخ ابوالفضل جو اس وقت تک ملازم نہیں ہوا تھا اور حاجی سلطان تھانیسری کے ساتھ مخدوم الملک سے ملنے کے لیے گیا۔ ہم نے دیکھا وہ تیسرے دفتر کو سامنے کھولے بیٹھا ہے اور کہہ رہا ہے: ''دیکھو ایرانی عالموں نے دین میں کیا خرابی پیدا کردی''۔ پھر اس نے وہ شعر دکھایا جو حضرت علیؓ کی تعریف میں کہا تھا:

ھمین بس بود حق نمائی او
کہ کردند شک در خدائی او

اور کہنے لگا: ''اس نے تو رفض سے آگے بڑھ کر حلول خداوندی تک معاملہ پہنچا دیا۔ میں نے تو طے کیا ہے کہ اس جلد کو شیعوں کے سامنے جلادوں''۔ میں[49] اس وقت نہایت گمنام اور غیر معروف تھا اور یہ اس سے پہلی ملاقات تھی، پھر بھی جرأت کر کے میں[49] نے کہا یہ شعر تو اس شعر کا ترجمہ ہے جو امام شافعیؒ سے منسوب ہے:

لو ان المرتضیٰ ابدی محله　　لصار الناس طر اسجد اله

کفی فی فضل مولانا علی　　وقوع الشاب فیه انه الله

عبد اللہ سلطان پوریؒ نے مجھے[50] گھور کر دیکھا اور کہا: ''یہ کس جگہ کی روایت ہے؟'' میں کہا: ''شرح دیوان امیر کی!'' اس نے کہا: ''اس دیوان کا شارح قاضی میر حسین میبذی ہے اور وہ بھی رفض سے متہم ہے''۔ میں[51] نے کہا: ''یہ دوسری بات ہے''۔ شیخ ابو الفضل اور حاجی سلطان اپنے لبوں پر ہاتھ رکھ کر برابر مجھے[51] خاموش ہوجانے کا اشارہ کرتے رہے۔ پھر میں نے کہا کہ: ''بعض معتبر آدمیوں سے میں نے سنا ہے کہ تیسرا دفتر میر جمال الدین کا نہیں ہے بلکہ اس کے لڑکے میرک شاہ یا کسی دوسرے کا ہے، اس لیے اس کی عبارت پہلے دو دفتروں کی عبارت سے نہیں ملتی کیوں کہ اس کی عبارت شاعرانہ ہے اور دو دفتروں کی عبارت محدثانہ''۔ مخدوم الملک نے جواب دیا: ''ارے بابا میں نے تو دوسرے دفتر میں بھی ایسی باتیں دیکھی ہیں جو بدعت اور فاسد عقیدے پر صریحاً دلالت کرتی ہیں۔ میں[52] نے ان مقامات پر حواشی لکھ رکھے ہیں۔ چنانچہ مصنف نے لکھا ہے کہ طلحہؓ نے جب سب سے پہلے حضرت امیر المومنین (علیؓ) سے بیعت کی تو آپ نے فرمایا ''یدشلاء و بیعة شلا یعنی ہاتھ بھی شل اور بیعت بھی شل''۔ غور کرو کہ جو ہاتھ اُحد کے دن حضور اکرم ﷺ کی پناہ بنا ہوا تھا اور جس پر 11 زخم آئے تھے، اس کو حضرت علیؓ بُرا شگون کہیں جو شرعاً ممنوع ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا میں اسے جھوٹ سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا'' تفاؤل اور شگون میں تو بڑا فرق ہے''۔ اس وقت ابو الفضل نے چپکے سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر رگڑ ڈالا اور روک دیا۔ مخدوم الملک نے کہا: ''ان کی تعریف کیا ہے''۔ ساتھیوں نے اس سے میرا[53] کچھ حال بیان کیا اور وہ ملاقات بخیر و خوبی ختم ہوگئی۔

جب ہم وہاں سے نکلے تو دوستوں نے کہا بڑی خیر ہوگئی کہ انھوں نے کسی بات کا برا نہیں مانا، ورنہ ڈانٹ پھٹکار سننا پڑتی۔

شروع شروع میں جب مخدوم الملک نے شیخ ابو الفضل کو دیکھا تھا تو اپنے شاگردوں سے کہا کرتا تھا: ''اس شخص سے دین میں جتنا بھی خلل پیدا ہو کم ہی ہے''

چو بطفیلش بدیدم بنمودم اہل دین را
کہ شود بلای جانہا بہ شما سپردم این را

مخدوم الملک نے 990ھ/1582ء میں مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد گجرات میں انتقال کیا۔ اس کی تاریخ وفات میں یہ قطعہ کہا گیا:

رفت مخدوم ملک و با خود برد رحمۃ اللہ نشانی پیشانی
جستم از دل چو سال تاریخش گفت بہ شمار مصرعۂ ثانی

اس کی اولاد میں چند نا خلف لڑکے رہ گئے جو لائق ذکر نہیں۔ اس بارے میں تمام اسلاف اخلاف سے شاکی ہی رہیں گے کیونکہ زمانہ کا ماحول ان کو اچھا رکھ سکتا ہے نہ اچھا ہی پیدا کرتا ہے:

خوبی اندر جہان نمی بینم گویا روز گار عنین شد

یہ تو وہ کہانی ہوئی کہ ایک متعصب سنی بادشاہ نے سبزوار پر جو رافضیوں کا مسکن اور مرکز ہے، حملہ کیا۔ وہاں کے رئیس اور سردار حاضر ہوئے اور کہا: ''ہم تو مسلمان ہیں کس گناہ میں آپ نے ہم پر فوجی حملہ کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''اس جرم میں کہ تم لوگ رفض میں بہت حد سے گزر گئے ہو''۔ انھوں نے کہا: ''یہ تو ہم صریح کے کام کو انجام دے رہے ہیں'' بادشاہ نے کہا کہ: ''اگر تم سچے ہو تو اپنے شہر میں سے کسی ابو بکر نام کے شخص کو تو لا کر دکھاؤ تا کہ میں تم پر حملہ بند کروں''۔ لوگوں نے بڑی تلاش کے بعد ایک مفلوک الحال غیر معروف سے شخص کو پیش کیا کہ: ''یہ اس نام سے منسوب ہے جو تم نے لیا تھا''۔ بادشاہ نے جب اسکو پھٹے پرانے کپڑوں اور بری حالت میں دیکھا تو کہا: ''تم اس سے بہتر کسی آدمی کو

نہیں لا سکتے تھے''۔ ان لوگوں نے کہا: ''بادشاہ سلامت تکلف برطرف، سبزوار کی آب و ہوا اس سے بہتر ابو بکر پیدا نہیں کرسکتی''۔

مولوی رومی نے اسی قصہ کی طرف اشارہ کیا ہے:

سبزوار است این جہان بیمدار
ماچو بو بکر یم دروی قار وزار

شیخ مبارک ناگوری

اپنے زمانہ کے بڑے نامی گرامی علماء میں سے تھے۔ تقویٰ، توکل اور صلاح میں سب سے ممتاز تھے۔ پہلے پہل انھوں نے بڑی ریاضتیں اور مجاہدے کیے۔ امرِ معروف اور نہی عن المنکر کا ہر وقت خیال رہتا تھا۔ اگر ان کی محفل وعظ میں کوئی سونے کی انگوٹھی، ریشم، سرخ موزے یا سرخ و زرد کپڑے پہن کر آجاتا تو اسی وقت ان چیزوں کے اتار دینے کا حکم دیتے۔ جس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے ہوتا، اسے پھاڑ دینے کی تاکید کرتے۔ اگر راستے میں کسی جگہ راگ نغمے کی بھنک بھی پڑ جاتی تو وہاں سے قدم بڑھا کر تیزی سے نکل جاتے۔ مگر آخر میں یہ حال ہوگیا تھا کہ کوئی راگ، گانا یا ساز سنے بغیر ان کو چین نہیں پڑتا تھا۔ ان کے مسلک اور طریقے ہمیشہ بدلتے رہے، طبیعت میں بڑا تلون تھا۔

پٹھانوں کے دور میں کچھ عرصہ تک وہ شیخ علائی کے ساتھ رہے۔ جب اکبر کے عہد میں نقشبندی صوفیوں کو اقتدار حاصل ہوگیا تو خود کو اس سلسلہ سے وابستہ کر لیا۔ کچھ عرصہ تک ہمدانی مشائخین سے منسوب رہے، آخر میں جب عراقیوں نے دربار میں اپنا رنگ جمالیا تو انہی کے رنگ میں باتیں کرنے لگے: "تکلموا الناس علی قد عقولھم" (لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق بات کرو!) پر ان کا عمل تھا۔

ہمیشہ علوم دینی کے درس دینے میں مشغول رہتے تھے۔ ہندستان کے علماء کے بر خلاف انھوں نے شاعری، معمہ گوئی اور مختلف فنون میں بڑی دسترس حاصل کی تھی۔ تمام علوم پر ان کی نگاہ تھی۔ خاص طور سے تصوف پر بڑا عبور حاصل تھا۔ ''شاطبی'' تو پوری کی

پوری ان کو حفظ تھی۔ اس کے درس دینے کا انہی کو حق پہنچتا تھا۔ قرآن کی سات قرأتوں کے حافظ اور قاری تھے۔

کبھی بادشاہوں کے گھر نہیں گئے۔ نہایت خوش گفتار اور صاحب مجلس بزرگ تھے۔ ان کی بذلہ گوئی اور نقلیں بڑی مشہور ہیں۔ آخر عمر میں جب بینائی کمزور ہوگئی تو گوشہ نشین ہوگئے اور اس فرصت میں ایک تفسیر لکھی جو تفسیر کبیر کی طرح چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جس میں بڑی اچھی معلومات ومضامین درج ہیں۔ انھوں نے اس کا نام ''العیون'' رکھا۔ اس کے دیباچہ میں انھوں نے ایسا مضمون لکھا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ انھیں اس صدی کے مجدد ہونے کا دعویٰ تھا، انھوں نے جو کچھ تجدید کی ہے وہ سب پر روشن ہے۔ اس تفسیر کو ختم کرنے کے بعد وہ ہمیشہ قصیدہ فارضیہ جو 7 سو اشعار کا قصیدہ ہے، قصیدہ بردہ شریف، قصیدہ کعب بن زہیر اور دوسرے قصیدے جو ان کو یاد تھے، پڑھتے رہتے تھے۔ شیخ مبارک کا لاہور میں 1001ھ/1592ء میں انتقال ہوا۔ بلاشبہ ایسا جامع کمال عالم پھر نظر نہیں آیا۔ لیکن افسوس دنیا کی محبت اور جاہ و مرتبہ کی خواہش نے کہیں کا نہ رکھا۔ لباس تو درویشی کا بنا رکھا تھا لیکن درحقیقت اسلام سے کوئی محبت اور انسیت نہ تھی۔

میں[54] نے ابتدائے عمر میں آگرہ میں ان سے چند سبق پڑھے تھے۔ ان کی استادی کا مجھ پر بڑا حق ہے لیکن انھوں نے جس طرح کی دنیا داری اور بے دینی اختیار کر رکھی تھی۔ روپیہ کے لالچ میں جو مکروفریب اور زمانہ سازی کرتے رہتے تھے، دین و مذہب میں تحریف و تمنیخ کا جو جال بچھا رکھا تھا، اس سے میرا[55] دل ان کی طرف سے پھر گیا اور ان کی استادی و تعظیم کے سارے حق زائل ہوگئے۔ جیسا کہ لوگ کہتے ہیں بیٹے کی وجہ سے باپ پر بھی لعنت پڑتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں یزید اور اس کے باپ پر لعنت اسی طرح ان کا اور ان کے لڑکوں کا معاملہ ہے۔

میر سید محمد میر عدلی امروہی

امروہہ، سنبھل کے تحت قصبہ ہے۔ میر عدلی نہایت متقی اور صالح بزرگ تھے وہ اور

میرے[56] والد سنبھل اور بدایوں میں ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ بدایوں میں انھوں نے میر سید جلال دانش مند سے جو حدیث میں میر سید رفیع الدین کے شاگرد تھے، پڑھا۔

تحصیل علم سے فارغ ہونے کے بعد درس و تدریس کا مشغلہ رہا۔ آخر عمر میں بادشاہی مقربوں میں شامل ہوگئے۔ میر عدلی کا عہدہ انھیں عطا کیا گیا۔ اپنے فرائض منصبی وہ نہایت انصاف، سچائی اور دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ چنانچہ قاضی القضات بھی ان کے خوف سے اپنی خیانتوں اور خباثتوں سے باز آ گیا تھا۔

جب تک وہ دربار میں رہے کسی بدعتی اور ملحد کو دین میں دخل اندازی کی ہمت نہ ہوسکی۔ ان کے بعد میر عدلی کا عہدہ کسی کی ذات پر نہیں جچا۔ یہ خطاب بس برائے نام ہی رہ گئے۔

موروثی تعلقات اور قدیم روابط کی وجہ سے وہ مجھ[57] پر بڑے مہربان رہتے تھے۔ میری ملازمت کے ابتدائی دنوں میں ہمیشہ کہا کرتے تھے۔ مدد معاش کے چکر میں نہ پڑو اور صدور کی خوشامد، در آمد کی ذلت نہ اٹھاؤ۔ باقاعدہ ملازمت میں داخل ہوکر ''پادشاہی داغ'' کرالو، کیونکہ یہ حکام بڑے فرعون اور متکبر ہیں۔ میں[58] نے ان کی یہ نصیحت قبول نہیں کی تھی اس لیے مجھے یہ سب دیکھنا پڑا، جو خدا کسی کو نہ دکھائے۔984ھ/1576ء میں میر سید محمد عدلی کو بھکر کی عملداری عطا کی گئی اور وہ 986ھ/1578ء میں اپنے رب سے جا ملے۔

شیخ گدائی دہلوی کنبوئی

یہ مشہور شاعر شیخ جمالی کے صاحبزادے ہیں۔ ظاہری علوی میں بڑا کمال حاصل کیا تھا۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے علماء کی صحبتیں دیکھی تھیں۔

بیرم خاں کے ساتھ محبت و دوستی کا تعلق تھا۔ چنانچہ خان خانان نے ہندستان کی صدارت کا عہدہ ان کے ذمہ دے رکھا تھا۔ چند سال تک ان کا مکان ہندستان، خراسان، ماوراء النہر اور عراق کے اکابر و افاضل کا مرکز ومرجع بنا رہا۔ شاعری کا بڑا اچھا ذوق تھا۔

ہندی میں بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بیکانیر کے علاقے میں بیرم خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی واپس آ گئے۔ بیرم خاں کے قضیوں کے باوجود ان کے عزت و احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔

دہلی کے بزرگوں کے مزاروں پر عرس کے دنوں میں ضرور تشریف لاتے تھے اور اپنی محفلیں بڑی شان و شوکت کے ساتھ منعقد کرتے تھے۔ 976ھ/1568ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے بزرگوں کی طرح ان کی اولاد بھی نالائق ہی نکلی۔

شیخ گدائی کے کلام کا نمونہ:

غزل

گہی جان منزل غم شد گہی دل	غمت رامی برم منزل بہ منزل
مشو غافل زحال درد مندی	کہ از حال تو یکدم نیست غافل
دل دیوانہ درزلف تو بستم	گرفتارم بآن مشکین سلاسل
بجان دادن اگر آسان شدی کار	نبودی عاشقان را کار مشکل
گدائی جان بنا کامی بر آمد	نشد کامم زلعل یار حاصل

میں[59] نے یہ اشعار تذکرۂ میر علاء الدولہ سے نقل کیے ہیں۔ یہ تذکرہ کچھ زیادہ قابل اعتماد نہیں۔ میرا[60] تو یہ خیال ہے کہ یہ اشعار شیخ گدائی کے نہیں۔

میاں جمال خان مفتی دہلی

اپنے والد شیخ نصیر الدین اور بھائی میاں لادن کے شاگرد ہیں۔ کنبوہ برادری سے تعلق تھا۔ اپنے وقت کے بڑے عالم تھے۔ علوم عقلی اور نقلی خاص طور سے فقہ و کلام، عربیت اور تفسیر میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ ''مفتاح'' کی دونوں شرحوں پر بڑا اچھا محاکمہ کیا ہے ''عضدی'' جو درس کی منتہی کتابوں میں سے ہے، کہتے ہیں انھوں نے اس کا 40 بار اول سے آخر تک درس دیا تھا۔

ہمیشہ وہ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ دینی علوم کا افادہ عام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کے گھر نہیں جاتے تھے۔ ہمیشہ حاکموں کی نگاہ میں وہ معزز و محترم رہے۔ ان کے اکثر شاگرد اچھے عالم اور مفکر ہوئے ہیں۔

90 سال کی عمر پائی اور 984ھ/1576ء میں انتقال فرمایا۔

قاضی جلال الدین ملتانی

ان کا تعلق بھکّر کے قلعہ کے مضافات سے رہا ہے۔ نہایت متبحر، حق گو اور حق پرست عالم تھے۔ پہلے تجارت کیا کرتے تھے پھر درس و تدریس کا مشغلہ اختیار کر لیا۔ چند سال تک آگرہ میں پڑھاتے رہے۔

جب بعض وجوہ سے قاضی یعقوب کو معزول کر دیا گیا تو انھیں قضاوت کا عہدہ دیا گیا۔ اپنی ذات میں وہ بلا شبہ نہایت متدّین اور امین قاضی تھے لیکن ان کا لڑکا نہایت بد دیانت اور ناخلف تھا۔ محکمہ کے تمام وکیل بھی انتہائی بدنفس تھے۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کی لپیٹ میں وہ بھی آ گئے، چونکہ اہل زمانہ کے ساتھ زمانہ سازی کی صلاحیت نہیں تھی۔ اس لیے بادشاہ نے ان کو دکن کی طرف جلا وطن کر دیا۔ دکن والے ان کی حق گوئی اور دین حق پر ثابت قدمی کا ذکر سن چکے تھے، اس لیے انھوں نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پھر وہ وہاں سے کعبۃ اللہ حج کے لیے تشریف لے گیے اور اسی جگہ حق کو لبیک کہا۔

قاضی طوائیس

طوائیس خراسان کے علاقے میں ہے۔ یہ بہت دیانت دار قاضی تھے، لیکن بے علمی کی وجہ سے بعض احکام میں انھوں نے بڑی غلطیاں کیں۔ امراء کے ہاتھوں ان کو بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی تھیں۔ اس لیے وہ ان امیروں سے ہمیشہ بدگمان رہتے تھے۔ مقدمات میں امیروں کے مقابلے میں غریبوں کی جانبداری کرتے تھے خواہ ان ہی کی طرف سے زیادتی کیوں نہ ہو۔ یہ نہیں جانتے تھے کہ اس زمانہ میں ظالم ہی فریادی بن کر عدالت میں پہنچ جاتا

ہے۔ چنانچہ شیخ ابو الفضل کہا کرتا تھا اگر امام اعظم ہمارے زمانہ میں ہوتے تو وہ ایک دوسرا ہی فقہ لکھتے۔

جب خان زمان کا قصہ پیش آیا تو انھوں نے بادشاہ سے کہا تھا۔ باغی کا مال لینا جائز نہیں ہے۔ اس بات پر انھیں معزول کر کے قاضی یعقوب کو قاضی بنایا گیا اور وہ انھی دنوں فوت ہو گئے۔

قاضی یعقوب مانک پوری

یہ قاضی فضیلت کے داماد ہیں۔ علم فقہ اور اصول میں بڑے کامل تھے۔ نہایت خوش مزاج اور شگفتہ بیان تھے۔ مزاحاً عربی کے شعر ہندی بحروں میں کہا کرتے تھے۔ چند سال تک وہ ہندوستان کے قاضی القضاۃ رہے۔ کہتے ہیں اس زمانہ میں وہ قوت باہ کے معجون بہت کھایا کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہی مجلس میں سرور انگیز چیزیں پینے کھانے کے لیے لائی گئیں۔ بادشاہ نے قاضی کو بھی شرکت کے لیے کہا۔ انھوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ نے پوچھا: ''تم کس قسم کا نشہ کرتے ہو؟'' ایک ہندستانی مصاحب نے برجستہ کہا: ''قاضی پارہ کھاتے ہیں'' ان کو قاضی القضاۃ کے عہدہ سے معزول کر کے بنگالہ کی قضاوت پر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بھی اپنے نفس کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے قوت باہ کے نسخے اور دوائیاں ظلم و تعدی کر کے حاصل کیے تھے۔ جب معصوم کابلی نے بغاوت کی تو وہ بھی اس کے ساتھ ہو گئے۔ اس جرم میں انھیں بلا کر قلعہ گوالیار میں قید کر دیا گیا۔ گوالیار کے راستے ہی میں انتقال کیا اور میر معز الملک اور ملا احمد یزدی سے جا ملے۔

شیخ عبد النبی صدر الصدور

یہ شیخ احمد بن شیخ عبد القدوس گنگوہی کے بیٹے ہیں۔ چند بار مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ جا کر حدیث کا علم حاصل کیا۔ وہاں سے لوٹ کر آئے تو اپنے بزرگوں کی روش پر سماع کے منکر

تھے۔ محدثین کے طریقہ پر عمل کرتے تھے۔ تقویٰ، پاکبازی اور عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ جب انھیں صدارت کا عہدہ ملا تو انھوں نے لوگوں کو اتنی زمین مدد معاش میں دی اور اتنے وظیفے اور وقف قائم کیے کہ کسی بادشاہ کے زمانہ میں ایسا مقتدر صدر کوئی نہیں ہوا۔ جس قدر وظیفے اور اعانتیں انھوں نے جاری کیں۔ اس کا دسواں حصہ بھی کسی صدر نے نہ کیا ہوگا۔ اکبر کچھ عرصے تک تو ان کا ایسا معتقد رہا کہ ان کی جوتیاں سیدھی کر کے رکھا کرتا تھا۔ آخر مخدوم الملک اور دوسرے بدنفس علماء کے جھگڑوں کی وجہ سے بادشاہ کی عقیدت ان سے ختم ہوگئی:

جاہلانند ہمہ جاہ طلب
خویش راعلماء کردہ طلب

ان کے زوال کا بڑا سبب یہ تھا کہ جس زمانہ میں بادشاہ بانسوالہ کے سفر سے لوٹ کر فتح پور آئے تھے، تو قاضی عبد الرحیم قاضی متھرا نے شیخ کے پاس ایک استغاثہ بھیجا کہ ہم ایک مسجد کی تعمیر کا ارادہ کیے ہوئے تھے لیکن یہاں کے ایک سرکش مالدار برہمن نے ہمارا عمارتی ساز و سامان اٹھوالیا اوراس سے بت خانہ کی تعمیر شروع کرادی۔ میں نے جب اس کی تحقیق کا ارادہ کیا تو گواہ موجود ہیں، اس نے حضور اکرم ﷺ کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور مسلمانوں کی سخت توہین کی۔ شیخ نے اس برہمن کو بلا بھیجا لیکن وہ نہ آیا۔ آخر بادشاہ نے بیربر اور شیخ ابو الفضل کو بھجوایا اور وہ اسے لے آئے۔ شیخ ابو الفضل نے جو کچھ لوگوں سے سنا تھا بیان کیا اور کہا کہ اس بات کی تحقیق ہوگئی ہے کہ اس نے گالی بکی تھی۔ اس کی سزا کے معاملہ میں علماء کے دو گروہ ہوگئے۔ ایک تو اسے قتل کرانا چاہتا تھا دوسرا اس کی تشہیر اور جرمانے پر زور دے رہا تھا۔ اس معاملہ میں بحث طول پکڑ گئی۔ شیخ نے بادشاہ سے اس کے قتل کی اجازت حاصل کرنے کے لیے بڑا اصرار کیا۔ بادشاہ نے صراحتاً اجازت نہ دی اور گول مٹول کہہ دیا کہ شرعی سزائیں تم سے تعلق رکھتی ہیں ہم سے کیا پوچھتے ہو؟ وہ برہمن اس جھگڑے میں مدتوں قید میں پڑا رہا۔ بادشاہی محل کی عورتیں اس کی رہائی کے لیے سفارشیں کرنے لگیں، لیکن بادشاہ کو شیخ کا بڑا لحاظ تھا اس لیے رہائی کا حکم نہ دیا۔ شیخ نے

اس کے قتل کے لیے جب اور زیادہ اصرار کیا تو بادشاہ نے جواب دیا۔ ہم تو تم سے پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ تم جو مناسب جانو کرو۔ شیخ نے مکان پر پہنچتے ہی اس کے قتل کا حکم دے دیا۔ جب یہ بادشاہ کے کانوں میں پہنچی تو اسے سخت غصہ آ گیا۔

ہندو رانیوں نے حرم میں اور ہندو مصاحبوں نے محفل میں کہا کہ ان ملاؤں کو آپ نے اپنی مہربانیوں سے سر پر چڑھا لیا ہے۔ اب تو ان کی جرأت ہوگئی ہے کہ آپکی مرضی اور پسند کا بھی ان کو خیال نہیں رہا اور آپکے حکم کے بغیر ہی وہ اپنا اختیار اور دبدبہ جتانے کے لیے لوگوں کو قتل کردیتے ہیں۔ غرض اس طرح بدگویوں نے بادشاہ کے کان بھرے کہ مزید تحمل ممکن نہ رہا اور جو مادہ عرصہ سے اندر ہی اندر پک رہا تھا، پھوٹ کر بہہ نکلا۔

ایک رات انوپ تلاؤ کی محفل میں بادشاہ نے یہ معاملہ پیش کرکے اپنے دین کے نئے نئے مفتیوں سے اس مسئلہ پر رائے مانگی۔ کوئی کہتا تھا اس مقدمہ میں گواہوں پر اچھی طرح جرح اور تعدیل نہیں کی گئی۔ کوئی بول اٹھا شیخ عبد النبی تو خود کو امام اعظم کی اولاد کہتا ہے، حالانکہ امام اعظم کے مذہب میں اسلامی حکومت کے ماتحت کافر نبی علیہ السلام کے بارے میں بدزبانی کریں تو ان کی یہ حرکت نقض عہد اور برائی ذمہ کا سبب نہیں بن سکتی۔ یہ بات حنفی فقہ کی کتابوں میں وضاحتاً موجود ہے۔ حیرت ہے کہ شیخ نے اپنے دادا سے کس طرح اختلاف کیا۔ اچانک دور سے بادشاہ کی نگاہ مجھ[62] پر پڑی۔ میری طرف متوجہ ہو کر نام لے کر آگے بلایا اور کہا'' آگے آؤ، میں جب پہنچا تو پوچھا کیا تم نے بھی یہ مسئلہ سنا ہے کہ اگر ایک شخص کے قتل پر 99 روایتیں ہوں اور رہائی کے لیے صرف ایک روایت ملتی ہو تو مفتی کو اس ایک روایت کو ترجیح دینا چاہیے؟'' میں[63] نے کہا ہاں ایسا ہی ہے جیسا کہ حضور فرماتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ''ان الحدود و العقوبات تندرئی بالشبہات'' میں نے اس کا مطلب فارسی میں سمجھایا۔ نہایت افسوس کے ساتھ پوچھا: ''کیا شیخ عبد النبی اس مسئلہ سے واقف نہیں تھا، اس نے بے چارے برہمن کو قتل کرادیا، آخر ایسا کیوں ہوا؟'' میں[64] نے کہا شیخ خود بڑے عالم ہیں وہ ضرور جانتے ہونگے۔ اس روایت کے ہوتے ہوئے انھوں نے حکم دیا تو ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ بادشاہ نے پوچھا: ''کیا مصلحت ہوسکتی

ہے؟'' میں نے کہا: فتنہ و فساد کی روک تھام اورعوام کی دلیری کا سدباب۔ اس سلسلہ میں قاضی عیاض کی ''شفا'' کی ایک روایت جو میری نظر سے گزر چکی تھی بیان کی، لیکن بعض خبیثوں نے کہا قاضی عیاض مالکی ہیں، ان کی بات حنفی ملک میں سند نہیں بن سکتی۔ بادشاہ نے مجھ[65] سے پوچھا: ''تمہارے پاس کیا جواب ہے؟'' میں نے کہا وہ یقیناً مالکی ہے۔ لیکن اگر کوئی تحقیق، مفتی، سیاسی مصلحت کی بنا پر اس کے فتویٰ پر عمل کرے تو شرعاً جائز ہے۔ اس موضوع پر بڑی لمبی چوڑی بحث ہوگئی۔ شہنشاہ کے مونچھ کے بال لوگوں نے بخوبی دیکھا کہ شیر کے بالوں کی طرح کھڑے ہوگئے تھے اور لوگ مجھے پیچھے سے ٹھوکے دے دے کر بحث سے روک رہے تھے۔ اچانک بادشاہ سے جھلا کر کہا: ''تم جو کچھ کہہ رہے ہو، نامعقول ہے''۔ میں اسی وقت تسلیمات بجا لایا اور واپس آکر جرگہ میں کھڑا ہو گیا۔ اسی دن سے میں نے پیش قدمی اور سبقت چھوڑ دی اور بحث اور مباحثہ سے کنارہ کشی کر کے گوشہ نشینی اختیار کرلی، کبھی کبھی کورنش بجالاتا تھااور بس۔

اس واقعہ کے بعد سے شیخ عبدالنبی کا برابر زوال ہوتا گیا۔ اس کے اور بادشاہ کے درمیان ایک حجاب سا پڑ گیا۔ دونوں ایک دوسرے سے کترانے لگے، یہاں تک کہ شیخ نے دربار میں جانا بالکل ہی بند کردیا۔

اسی زمانہ میں شیخ مبارک آگرہ سے فتح پور کوکسی معاملہ میں مبارک دینے کے لیے آیا تھا۔ بادشاہ نے اس سے بھی یہ ماجرا بیان کیا اس نے کہا: ''تم خود اپنے زمانہ کے مجتہد اور امام زمان ہو، شرعی اور ملکی احکام کے اجراء میں ان ملاؤں کےمحتاج کیوں بنتے ہو؟ جو بجز جھوٹی شہرت کے ذرہ برابر بھی علم سے واقف نہیں ہیں''۔ بادشاہ نے کہا: ''تم ہمارے استاد ہو ہم تم سے سبق پڑھتے رہیں گے، کسی طرح مجھے ان ملاؤں کے دباؤ سے نکال لو'' شیخ مبارک کو پرانی مخاصمت اور دشمنی کا سودا چکانے کا خوب موقع ملا۔ اُس نے نہایت بدباطنی کے ساتھ: ''آپ اجتہاد کا دعوی کردیا اور اس دعویٰ پر ان عالموں سے محضر لکھوا لیا''۔

یہی وہ واقعہ تھا جس کی بنیاد پر شیخ مبارک نے بادشاہ کے اجتہاداور تمام مجتہدوں پر اس کی افضلیت کے متعلق محضر تیار کیا اور پاجیوں کی اس مجلس میں شیخ عبدالنبی اور مخدوم

الملک کو زبردستی پکڑ کر لایا گیا کسی نے ان کی تعظیم نہ کی، بچارے جوتیوں کے پاس ہی بیٹھ گئے پھر ان کے ساتھ ایسی زبردستی کی گئی کہ انھوں نے اسی بے بسی میں اپنی گواہی لکھ دی جیسا کہ ہم تاریخ میں بیان کرآئے ہیں۔ دونوں کو بادشاہ نے حجاز کے سفر پر روانہ کردیا۔ شیخ عبدالنبی کی وفات 991ھ/1583ء میں ہوئی۔

شیخ احمدی فیاض انبیٹھی وال

یہ بڑے عالم، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ بہت زیادہ معمر ہوگئے تھے، چنانچہ چلنے پھرنے کی بھی طاقت نہ رہی تھی۔ اس بڑھاپے کے عالم میں سخت بیمار ہوگئے۔ بڑھاپے کی ان مصیبتوں کے باوجود انھوں نے ایک سال کے اندر پورا کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔ اکثر درسی کتابیں پڑھاتے رہتے تھے۔ اگر کوئی شاگرد پڑھتے ہوئے غلطی کرتا تو محض یادداشت سے اسے ٹوک دیتے۔

تفسیر، حدیث، سیرت اور تاریخ پر بڑی اچھی نظر تھی۔ شیخ میاں نظام الدین انبیٹھی وال کے ہم شہر اور ہمعصر تھے۔ میاں صاحب سے کہا کرتے تھے کہ وہ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے سے کیوں روکتے ہیں؟

میں[66] جس وقت ان سے ملنے کے لیے گیا تو وہ شرح کافیہ کا درس دے رہے تھے۔ ایک ہزلیہ قطعہ کوئی شاگرد، ان سے پڑھ رہا تھا۔ وہ قطعہ یہ ہے:

ابو بکر الولد المنتجب　　　اراد الخروج لاعجب
فقد قال افی عزمت الحروج　　　لکفتارۃ هی لی ام اب

شک یہ پڑ گیا تھا کہ یہاں لفظ ''کفتارہ'' ہے یا ''کفارہ'' جو کافر کی تانیث میں مبالغہ کا صیغہ ہے، انھوں نے فرمایا معنی کے لحاظ سے'' کفارہ'' ہوگا اور ''گفتار'' کا لفظ تو فارسی ہے۔ میں[67] نے کہا ''بہر حال'' ''گفتارہ'' ''کفارہ'' سے کہیں زیادہ واضح ہے۔

قاضی صدرالدین جالندھری

بڑے عالم متبحر، اہل تصوف و سلوک کے بڑے معتقد، نہایت خوش مزاج اور مجلسی آدمی

تھے۔ اگرچہ یہ مشہور ہے کہ انھوں نے کسی وقت شیخ عبداللہ مخدوم الملک سے پڑھا تھا، لیکن میں نے ان کی علمی تحقیقات کو مخدوم الملک سے کئی درجہ بڑھا ہوا پایا۔

اپنے مشرب میں ایک بے قید آدمی تھے۔ مزاج میں آزادہ روی بہت تھی۔ یہاں تک کہ لوگ ان کے متعلق بے دینی کا شبہ کرنے لگتے تھے۔ لوگوں کے ساتھ وہ بڑا حسن ظن رکھتے تھے۔ جو شخص بھی تارکِ دنیا ہو جاتا ہے خواہ وہ بدعتی ہی کیوں نہ ہو بڑے اعتقاد سے اس کی خدمت میں جا پہنچتے اور ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑے ہو جاتے ان کی باتوں کو حجت مان لیتے۔ مشہور ہے کہ ایک بدعتی مجذوب بنا پھرتا تھا، وہ ان کے سامنے سے گزرا، قاضی اپنی عادت کے مطابق ہاتھ باندھ کر تعظیم کے لیے کھڑے ہوگئے۔ وہ مکار کہنے لگا کہ: ''خضر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہتے ہیں''۔ قاضی اس کے پیروں پر گر گئے اور کہا: ''ہم کو بھی خضر سے ملا دو''۔ اس مکار نے کہا فی الحال میں اپنی لڑکی کی شادی کے سلسلہ میں سخت متفکر ہوں اور یہ شادی 700 تنکہ کے لیے رکی ہوئی ہے، اس کام سے جب میں[68] فارغ ہو جاؤں گا تو تجھے ضرور خضر سے ملا دونگا''۔ قاضی نے اسی وقت 700 تنکہ اسے دے دیا اور وہ شخص 2 دن بعد قاضی کے پاس آیا اور کہا آؤ میں تمھیں خضر سے ملاؤں۔ انھیں لے کر وہ دریا پر گیا۔ وہ شخص نہایت بلند قامت اور قاضی پست قد تھے۔ وہ پانی میں گردن تک جا کر کھڑا ہو گیا اور کہا آؤ خضر یہاں ہے۔ قاضی نے کہا: ''میں تیرنا نہیں جانتا کس طرح آؤں؟'' اس نے کہا: ''میں نے تو تم کو خضر کا ٹھکانہ بتادیا اب تم نہیں آتے تو میرا کیا قصور؟

لوگ ان کے متعلق ایسی ہی اور مضحکہ خیز حکایتیں بیان کرتے ہیں جن کا لکھنا سنجیدگی کے شایان شان نہیں۔ اس واقعہ سے قاضی کی سادہ لوحی کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

جس زمانہ میں بادشاہ نے لاہور کے امراء و اکابر کو مختلف علاقوں پر نامزد کر کے بھیجا تھا تو ہر ایک کو ایک شہر میں کسی ایک عہدے اور منصب پر مقرر کر دیا تھا۔ قاضی صدر الدین کو اس کو اس وقت گجرات میں بندر بھڑوچ کا قاضی بنایا گیا، وہ وہیں جا کر رہ گئے اور اسی جگہ انتقال کیا۔

...

ان کا ایک لڑکا شیخ محمد نامی ہے جو عالم و قابل آدمی ہے اور اسی مقام پر اپنے باپ کا جانشین بنایا گیا۔

میاں الہداد لکھنوی

نہایت صاحب تصرف، مستعد، دانشور اور عالم تھے۔ طبعاً نہایت ذہین تھے۔ خاص طور سے فقہ اور اصول فقہ میں تو ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ علم نحو میں انھوں نے ایک رسالہ لکھا تھا۔ اس رسالہ کا نام ایک مقتدر حاکم کے نام پر ''قطبی'' رکھا تھا۔ میں نے میاں صاحب سے ملاقات کی تھی۔ ان کی تصانیف میں دو چیزیں بڑی عجیب و نادر تھیں۔ پہلا تو ایک رسالہ تھا جس کا طول 14 سطر کا تھا اور عرض بھی اتنی سطروں کا تھا، اس کے حاشیوں پر بھی مضمون لکھا تھا۔ اس رسالہ میں 14 علوم کے احکام و مسائل درج تھے۔ دوسرا ایک اور رسالہ تھا جو مقامات حریری کے طرز پر لکھا گیا تھا۔ اس کے 5 حصے تھے اس کا نام انھوں نے ''قیطون'' رکھا تھا ان کا کہنا تھا کہ میری اور بھی تصانیف ہیں۔

ان کے چچا زاد بھائیوں کا بیان ہے یہ 14 علمی رسالے اور رسالہ قیطون اصل میں حکیم زبرقی کی تصانیف ہیں۔ جو جون پور میں آیا تھا اور قاضی شہاب الدین سے اس کا مشہور مناظرہ و مباحثہ ہوا تھا، پھر زمانہ کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے وہ شیخ اعظم لکھنوی کے کتب خانہ میں جنھیں ثانی امام اعظم خطاب ملا ہوا تھا، پہنچا۔ ان کے بعد وہ میاں الہداد کے پاس مرتے دم تک رہا۔ میاں الہداد شیخ اعظم کے صاحبزادے تھے۔

میر سید جلال الدین قادری

آگرہ کے مشہور سید ہیں۔ توکل و زہد میں ایک امتیازی شان کے مالک تھے۔ شروع سے آخر تک گوشۂ تنہائی میں رہے۔ امراء کی صحبت سے دور ہی دور رہے۔ بڑے آزاد مشربی کے ساتھ زندگی گزاری۔ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانیؒ کی طرف سے لوگوں کو مرید بناتے تھے۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے میر سید داؤد اپنے باپ کے

قائم مقام ہوئے۔ وہ نہایت تنگدستی اور فقر کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

جب شیخ مبارک کے خاندان کو عروج ہوا تو ان بیچاروں کا خاندان بھی ادبار و زوال کا نشانہ بن گیا:

صد ہزاران طفل سر بریدہ شد
تا کلیم اللہ صاحب دیدہ شد

شیخ حسین اجمیریؒ

ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ حضرت قطب المشائخ سلطان الواصلین خواجہ معین الدین سجزی چشتیؒ کے پوتوں میں سے ہیں۔ابتدائی زمانہ میں جب اکبر کو حضرت اجمیریؒ سے بڑی عقیدت ہو گئی تھی تو شیخ حسین سے اس کا مزاج مکدر ہی رہا۔ بادشاہ کا یہ رنگ دیکھ کر دشمنوں کی بن آئی اور انھوں نے فتح پور کے بعض مشائخین کے اشارے پر اس بات کی گواہیاں دیں کہ شیخ صاحب نے کوئی اولاد نہیں چھوڑی تھی۔ اس معاملہ میں صدر اور قاضیوں نے بھی زمانہ سازی کے بموجب محضر لکھ دیے۔ اس طرح اجمیر کی سالہا سال کی موروثی تولیت دوسروں کے سپرد کر دی گئی۔ دراصل شیخ کا وہاں بڑا عمل دخل تھا اور وہ اس صوبہ میں ایک طرح سے شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کا یہ اثر و رسوخ بادشاہ کو کھٹک گیا۔ پھر کچھ اور چھوٹے بڑے معاملات ایسے بھی پیش آئے کہ شاہانہ تکبر و غیرت بھڑک اٹھی۔ آخر اکبر نے شیخ حسین کو جلا وطن کر کے مکہ بھجوا دیا۔ جب بادشاہی لشکر بانسوالہ کے سفر میں تھا۔ شیخ حسین اجازت لے کر مکہ گیے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس آئے۔ جس وقت اکبر فتح پور سے آ کر محمد حکیم مرزا کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کابل جا رہا تھا، شیخ حجاز کے سفر سے واپس آئے اور دربار میں پہنچے۔دربار میں نئے مذہب کے نومسلم مریدوں اور نو دولیتے مصاحبوں نے تعظیم و تسلیمات کے نئے نئے آداب وضع کر رکھے تھے۔ شیخ نے یہ آداب و تسلیمات ادا نہیں کیے۔ بادشاہ نے جب ان کو مطیع و مخلص نہ پایا تو گرفتار کر کے بھکر کے قلعہ میں بھجوا دیا۔ چند سال تک شیخ حسین بھکر میں رہے۔

1002ھ/1593ء میں بعض مقربوں کی سعی و سفارش سے شیخ کو بھکّر سے طلب کیا گیا۔ شیخ بھکّر سے آئے تو ان کے ساتھ اور بھی قیدی تھے۔ جن میں شیخ کمال بیابانی قلاب جیسے لوگ اور فتح پور کے قاضی بھی تھے، جو شیخ ابراہیم چشتی کی کوششوں سے 14 سال سے وہاں قید تھے۔ ان باغیوں کے نام میرزا نظام الدین احمد کے ذریعہ طلبی کا فرمان جاری کیا گیا تھا۔ یہ سب لوگ دربار میں آئے حسب قاعدہ کورنش بجالائے، بادشاہ کو سجدہ کیا، اکبر نے خوش ہو کر ان کی رہائی کا حکم صادر کر دیا۔ لیکن شیخ حسین جو اس وقت 70 سال کے بوڑھے ہو رہے تھے کبھی شاہانہ تسلیمات کے نئے آداب پر عمل نہیں کیا تھا، اس بار بھی انھوں نے قدیم وضع پر تعظیم کی اور بس اچٹتی ہوئی تسلیمات بجالائے۔ ان کے اس رویہ کو دیکھ کر اکبر دوبارہ ان سے خفا ہو گیا اور مرزا نظام الدین سے کہا کہ ان کی مدد معاش کے لیے 300 بیگھہ کی زمین بھکّر ہی میں دی جائے اور انھیں دوبارہ اسی جگہ بھیج دیا۔ اکبر کی والدہ بیگم بادشاہ نے محل میں ان کی سفارش کرتے ہوئے کہا: ''یوتم (اکبر کا پیار کا نام) شیخ کی والدہ بہت ضعیف ہیں اور اجمیر میں رہتی ہیں۔ بیٹے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل کباب ہو رہا ہے اگر ان کو وطن جانے کی اجازت دے دی جائے تو کیا حرج ہے؟ وہ تو تم سے کسی مدد معاش کی خواستگار بھی نہیں ہیں''۔ اکبر نے ماں کا کہنا قبول نہ کیا اور کہا: ''آچہ جیو (ماں کو پکارنے کا نام) وہ وہاں جائے گا تو پھر اپنی دکان کھول کر بیٹھ جائے گا۔ لوگ اس کے لیے نذور نیاز اور ہدیے بہت لے کر آئیں گے اور وہاں لوگوں کو گمراہ کرنے لگے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ وہ اپنی والدہ کو اجمیر سے یہاں بلالے''۔ والدہ کو بلانے کی بات شیخ کے لیے بھکّر جانے سے زیادہ نا قابل قبول اور دشوار گزار تھی۔

اجمیر کی تولیت کے معاملہ میں بادشاہ نے خود میرا[69] نام تجویز کیا تھا۔ ایک رات صدر جہاں نے اس سلسلہ میں مجھے[70] خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کا خیال بدل گیا اور اس تجویز کو جسے خود ہی پیش کیا تھا بدل دیا اور مجھے دربار ہی میں رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس موقع پر صدر جہاں سے دریافت کیا وہ سادہ لوح بوڑھا (شیخ حسین) کہاں ہے؟ میں نے یاد دلایا ''لاہور میں ہے'' میں[71] نے صدر جہاں کو بڑے اصرار سے کہا کہ: ''اگر اس

سعادت کے لائق نہیں ہوں تو کم از کم اسے، شیخ حسین کو کوشش کر کے متولی بنوادو تا کہ حق، حقدار کو پہنچ جائے۔ لیکن کیا کیا جائے ان ہندستانی امیروں کو اپنے آدمیوں کی ترقی و تربیت کا ڈھنگ نہیں آتا اور یہ آپس میں ایک دوسرے سے صفائی اور خلوص سے نہیں رہتے۔ اس لیے صدر جہاں کی کوششوں کا مجھ (72) بے کس کے حق میں کوئی نتیجہ نہ نکلا اور نہ بیچارے شیخ حسین کے لیے کچھ ہو سکا۔ شیخ حسین شکستہ دل اور مضطرب گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے ہیں، نہ تو کسی کے گھر جانے کی قوت ہے نہ کچھ وسائل کہ روزی پیدا کرے۔ بادشاہ کے پاس اب عرض و گزارش اور سفارش کی بھی کوئی راہ نہیں رہی ہے۔

بہر حال شیخ حسین کی ذات نہایت غنیمت اور اس زمانہ میں باعث برکت ہے۔ میری ان سے کوئی جان پہچان اور ربط و تعلق نہیں۔ لیکن اس وقت جب کہ وہ حج کر کے پھر قید و بند کی زحمتیں برداشت کر کے آئے ہیں۔ مجھے (73) تو وہ ایک نورانی وجود اور فرشتہ صورت دکھائی دیتے ہیں۔ ہمیشہ ریاضت و عبادت اور مجاہدہ میں مشغول رہتے ہیں۔ صائم الدہر اور قائم اللیل ہیں، ملنے جلنے میں کسی سے وہ دنیا کی بات نہیں کرتے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو کامیابی اور کشائش عطا کرے گا۔ کیوں نہ ہو؟'' امید ہے ان صاحب خدا بزرگ کے طفیل میں مجھ جیسے قیدی کو بھی رہائی مل جائے تا کہ میں اس دربار کی بے معنی پریشان گفتاری، ہرزہ گوئی، بیہودگی اور جھوٹ لکھنے سے نجات پا جاؤں اور وطن جا کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہوں اور بقیہ عمر کسی مفید مشغلہ میں گزار دوں:

بسر آنم کہ گرز دست بر آید
دست بکاری زنم کہ غصہ سر آید

اسی وقت جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، صبح صادق طلوع ہو رہی ہے اور نسیم سحر چلنے لگی ہے۔ اگر میری اس دعا کا تیر قبولیت کے نشانہ پر جا لگے تو کرم خداوندی سے کیا بعید کہ وہ میری مشکل حل کر دے:

غالباً خواہد کشود از دولتم کاری کہ دوش
من ہمی کردم دعا و صبح صادق می دمید

اگر چہ کسی شکوہ شکایت کا محل نہیں لیکن کیا کروں ایسا مضطرب اور بے قرار ہو گیا ہوں کہ یہ ایک دو درد ناک آہیں بے اختیار نوک قلم پر آ گئیں، خدا معاف کرے:

ہر گز چنین بنودم کز درد دل بنا لم
این بار بر دل من غم میکند گرانی

شیخ عبد القادر

اوچہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم شیخ حامد قادری کے صاحبزادے ہیں۔ جس وقت بیرم خان کے عہد میں حضرت مخدوم آگرہ میں تشریف رکھتے تھے، میں طالب علم تھا لیکن بدقسمتی سے ان کے پاس حاضری کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔

بیرم خاں بعض اہل بغض حاسدوں، خاص طور سے شیخ گدائی کے بہکانے سے حضرت مخدوم کے ساتھ اچھی طرح پیش نہیں آیا اور ان کو اوچہ سے طلب کر لیا۔ مخدوم کو اس سلوک سے بڑا رنج ہوا۔ انھوں نے بیرم خاں کو بد عا دی، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ بیرم خان کو جو بھگتنا تھا وہ بھگت کر چلا گیا۔ شیخ محمد غوث بیرم خان کے اس وبال کو اپنا اثر سمجھتے تھے۔ غرض جب حضرت مخدوم ملتان پہنچے تو ان کا وہاں انتقال ہو گیا اور ان کی لاش ملتان کے قریب موضع حامد پور میں امانتاً دفن کی گئی۔

ان کی وفات کے بعد شیخ عبد القادر اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ کے درمیان سالہا سال تک سجادہ نشینی کا جھگڑا ہوتا رہا۔ شیخ موسیٰ اکثر لشکر میں رہا کرتے تھے اور شیخ عبدالقادر فتح پور میں، ایک رات اکبر نے شیخ عبد القادر کو کوکنار پینے کے لیے کہا۔ شیخ نے انکار کر دیا۔ اس وجہ سے بادشاہ کا مزاج مکدر ہو گیا۔ چنانچہ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر فتح پور کے دیوان خانہ خاص میں جماعت سے فارغ ہو کر نفل پڑھنے لگے تو بادشاہ نے فرمایا: ''شیخ نفل نماز گھر جا کر ادا کرو'' شیخ نے نہایت جرأت کے ساتھ کہا: ''بادشاہ سلامت یہ کوئی تمہاری ملکیت ہے کہ تمہارا حکم چلے''۔ اکبر نے رنجیدہ ہو کر کہا: ''یہ شیخ کس قدر جاہل ہے؟'' پھر انھوں نے حکم دیا: ''جب تم ہماری ہماری ملکیت تسلیم نہیں کرتے تو ہمارے ملک میں بھی نہ

رہو"۔ شیخ اسی وقت وہاں سے اٹھ آئے، مدد معاش کو چھوڑ کر چھوٹے بھائی سے جانشینی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس سے دستبردار ہوئے اور اوچہ میں اپنے آبائی مقبرہ میں جاکر گوشہ نشین ہو گئے۔ شیخ موسیٰ کے غائبانہ مخدوم شیخ حامد کی ہڈیاں بھی اوچہ لے جا کر اسی قبرستان میں دفن کر دیں اور اپنے اسلاف کی اتباع میں فقر و توکل کا مسلک اختیار کر لیا۔ ان کی عزیمت کی یہ برکت ہے کہ لوگ انھیں اتنا کچھ نذر و ہدیہ دیتے ہیں کہ کسی مدد معاش کے محتاج نہیں رہے۔

چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ برسوں کے زہد و عبادت و مشیخیت چھوڑ دربار میں پہنچے اور بادشاہ کے ساتھ ارادت و عقیدت کا اظہار کیا۔ سپاہ گری کا پیشہ قبول کر کے فوج میں ملازم ہو گئے۔ اکبر نے ان کو پانصدی امیروں کی صف میں جگہ دے دی۔ یہ تو وہی مثل ہوئی کہ ایک شخص مسلمان ہوا تو دوسرے نے کہا بڑا اچھا کام کیا۔ مسلمانوں میں بس تیری ہی ایک کمی تھی۔ اس تبدیلی کے باوجود شیخ موسیٰ کا یہ حال تھا کہ اگر نماز کا وقت ہو جاتا تو وہ عین دیوان خانہ خاص و عام میں بادشاہ کی موجودگی میں خود اذان دے کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کو کچھ کہے۔ جب ان کے منصب پانے کی خبر عبدالقادر کو ملی تو انھوں نے کہا "وہ تو ہزاری منصب کا اہل تھا، اس سے بڑا منصب کیوں حاصل نہیں کیا اور بے وجہ اب تک محروم پڑا رہا آخر شیخ کو ملتان میں جاگیر مل گئی"۔

شیخ عبد القادر نے دنیا کو ٹھوکر ماری اور فقر و توکل کی بدولت وہ بڑی عزت و توقیر کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن رہے۔ خلق خدا کو ہدایت و ارشاد سے مستفید کرتے رہے۔ ان کے اکثر اوقات عبادتوں، سخت ریاضتوں اور مجاہدوں میں گزرتے رہے۔ ان کی دینی سیادت کا سکہ سب کے دل پر نافذ ہے

ما تو بروی فقر و قناعت نمی بریم
با پادشہ بگوئی کہ روزی مقدر است

شیخ کبیر

یہ مخدوم شیخ بہاؤ الدین زکریاؒ کے سجادہ نشین ہیں۔ ملتان کے لوگ ان کو اپنے وقت کا ولی

کہتے ہیں۔ ملتان والے ان کے اس قدر معتقد ہیں کہ اگر وہ کہہ دیں تو ایک دن میں ہزار سوار بلکہ اس سے زیادہ جمع ہو جائیں۔

ذکر و شغل اس قدر کرتے تھے کہ دیکھنے والا سمجھتا تھا کہ انھوں نے نشہ پی رکھا ہے۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے آنکھیں اکثر سرخ رہتی تھی۔ اس لیے لوگ مست سمجھا کرتے تھے:

از بسکہ خون خورم ہمہ شب بی خود اوفتم
مردم نہند تہمت می خوارگی مرا

شیخ موسیٰ قادری جن کا ذکر آچکا ہے۔ شیخ کبیر کے متعلق نشہ اور مستی کا ہی گمان رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ پچھلے اولیاء جن کا کتابوں میں ذکر ہے کہیں ایسے نہ رہے ہوں جیسے ہمارے شیخ کبیر ہیں کہ ولی بنے بیٹھے ہیں اور پہلے کے شاعر کہیں شیخ فیضی اور اس جیسے دوسرے شاعروں کی طرح نہ گزرے ہوں کہ ملک الشعرا بنا ہوا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ فتح پور میں شیخ کبیر سے حسین خاں کے ساتھ ملاقات کی تھی۔ شکوہ بزرگی تو ان کے ظاہر سے عیاں تھا، باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے، قطعہ:

ہر کرا جامہ پارسا بینی ‌ ‌ پارسا دان ونیک مرد انگار
در تو احوال او ندانی چیست ‌ ‌ محتسب را درون خانہ چکار

ان کی وفات 995ھ/1587ء میں ہوئی۔ اپنے بزرگوں کے مقبروں میں دفن کیے گئے۔

میر سید علی لدھیانہ

یہ بزرگ جھنجھانہ کے شیخ عبد الرزاق کے خلیفہ ہیں۔ بڑے عالم صاحب کمال تھے۔ وجد و حال کی کیفیت بڑی غالب تھی۔ 80 برس سے زیادہ عمر پائی تھی۔

جب سے انھوں نے اپنے مرشد سے تلقین و ارشاد کی اجازت حاصل کی، اس وقت سے ساری عمر گھر پر ہی گزاری، قدم باہر نہیں نکالا۔ ان کی محفل میں کیا امیر کیا فقیر ساری

مخلوق حاضر رہا کرتی تھی، ان کی بڑی کرامتیں مشہور ہیں۔ سب سے بڑی کرامت تو یہی تھی کہ جو بھی خلوص و عقیدت کے ساتھ ان کی صحبت میں حاضر ہوتا وہ گنہ گاری اور دنیا داری چھوڑ کر اللہ کا مطیع و فرماں بردار بن جاتا اور حقیقی منزل کو پالیتا۔

ان کے معتقدین میں میرزا نظام الدین احمد کا داماد محمد جعفر بھی تھا کہ یہ نہایت سلیم الطبع نوجوان تھا، لیکن فسق و فجور میں مبتلا رہتا تھا، پرگنہ شمس آباد اسے جاگیر میں ملا ہوا تھا۔ وہ لاہور سے اس پرگنہ کی فوجداری کے لیے رخصت ہوا تو اثنائے راہ میں لدھیانہ ٹھہرتا ہوا یہاں میر موصوف کی خدمت میں پہنچنے کی اسے توفیق ہوئی، بس ایسا اثر ہوا کہ بد اعمالیوں سے توبہ کر لی۔ شہادت کا ایسا شوق اس کے دل میں پیدا ہو گیا کہ بے جھجک اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیتا تھا اور جان کی پرواہ نہ کرتا تھا۔ بارہا اس نے میر صاحب سے شہادت پانے کے لیے دعا کی التجا کی۔ انھوں نے اس پر پھونک ماردی۔ تین چار مہینے کے اندر وہ اس قدر صالح، عبادت گزار اور نیک بن گیا کہ بہت سے متقی اور پرہیزگار اس پر رشک کرنے لگے۔ اس کی خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ اس حکومت، شان و شوکت کے باوجود تہجد کی نماز کے لیے اٹھتا، کسی خادم کو زحمت دیے بغیر وضو کا پانی خود لے آتا۔ میر صاحب نے شہادت کے لیے جو پھونک ماری تھی اس کا اثر بہت جلد ظاہر ہو گیا اور میرزا جعفر شمس آباد کے ایک موضع میں حربی کافروں سے مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہو گیا۔

اسی سال اس موقع پر جب کہ میں[74] میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رخصت لے کر وطن جارہا تھا تو میر صاحب موصوف کی خدمت میں پہنچا۔ اس وقت جعفر کی شہادت کا ذکر چھڑ گیا۔ آپ نے فرمایا: ''شہیدوں کو اس عالم میں بڑی فرحت و لذت حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ کلام پاک میں بھی کہا گیا ہے:

''بل احیاء عند ربھم یرزقون فرحین''

(وہ اللہ کے پاس زندہ ہیں اور خوشی و مسرت ان کے لیے مہیا کی گئی ہے)

اس سلسلۂ گفتگو میں انھوں نے ایک قصہ بھی بیان کیا کہ: ''ایک نوجوان جس کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اس علاقے میں شہید ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی اصلی شکل میں جمعہ کی راتوں

کو اپنی بیوی کے ساتھ بستر پر گزارا کرتا تھا'' یہ قصہ مجھے[75] معلوم تھا اس لیے میں نے عرض کیا کہ میں نے لوگوں سے یہ تک سنا ہے کہ ان میاں بیوی کے بچے بھی ہوئے ہیں۔

اسی طرح پیاور میں جو میرا[76] وطن ہے ایک اور قصہ مشہور ہے۔ وہاں اسحٰق نامی پٹھان شہید ہوگیا تھا۔ اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ بھی ہر جمعہ کی رات اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس آیا کرتا تھا اور اس کو اس راز کے افشا سے اس نے منع کر دیا تھا۔ انہی دنوں اس کی بیوہ حاملہ ہوگئی اور لوگوں نے اس پرنا جائز کام کا الزام لگا دیا تو اس نے بڑا اصرار کرنے کے بعد اپنی ساس یعنی اسحٰق شہید کی ماں سے سارا قصہ بیان کر دیا۔ مقررہ رات کو اس کی ساس نے جو اپنے بیٹے کو دیکھ لیا اور وہ اس کا نام لے کر آغوش میں لینے کے لیے دوڑی مگر وہ شکل اچانک غائب ہوگئی۔ اسی دن سے بس اسحٰق کی وہاں آمد و رفت بند ہوگئی اور وہاں ماں سے اپنے بیٹے کے نام ایک کنواں کھدوایا، جواب تک موجود ہے۔ پیاور کا قصہ بھی میں[77] نے اس محفل میں بیان کر کے میر صاحب سے پوچھا: ''کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ انھوں نے جواب دیا: ''ممکن ہے عقلاً بھی اِس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ میرزا نظام الدین نے کہا ہوسکتا ہے کوئی جن اِس شہید کی صورت میں آتا ہو''۔ آپ نے فرمایا: ''جنوں کو انبیاء، اولیاء، صلحاء اور شہید کی تمثیل اتارنے پر قدرت حاصل نہیں ہے''۔ میر سید علی کی وفات 1002/1593ء میں ہوئی۔ ایک علم نے ''شیخ انام'' ان کی تاریخ کہی ہے۔ اب ان کے جانشین میر سید محمود ہیں۔

شیخ معین

یہ مشہور واعظ ''معراج النبوۃ'' کے مصنف ملا معین کے پوتے ہیں۔ نہایت نیک نفس اور فرشتہ خصلت آدمی تھے۔ مدت تک لاہور میں قاضی رہے۔

ان کے متعلق مشہور ہے کہ اپنی قضاوت کے دوران ایک مقدمہ بھی فیصل نہیں کیا۔ اگر مدعی مقدمہ کے فیصلے پر اصرار کرتا تو وہ اسے انتہائی عاجزی کے ساتھ کہتے تھے خدارا تم دونوں آپس میں صلح کرلو تاکہ میں تمہارے جھگڑے میں اللہ کے پاس پکڑا نہ جاؤں اور

مجھے آخرت میں شرمسار نہ ہونا پڑے۔ وہ فریقین سے کہا کرتے تھے کہ تم دونوں عقل مند ہو اور مجھ اکیلے نادان کو دو دانشمندوں سے سابقہ آپڑا ہے۔ خدا را تم دونوں مجھے اللہ کی بارگاہ میں شرمندہ نہ کرو۔

اگر کوئی عورت اپنے شوہر کے غائب رہنے کی بنا پر تفریق کا مطالبہ کرتی تو وہ تاحد امکان اپنے پاس سے اس کا خرچ دے دیتے اور کہتے یہ رقم لے کر جا اور شوہر کا انتظار کرو اور اس سے علیحدگی اختیار نہ کرو۔ اپنی مدد معاش کو جو کافی اچھی تھی، ساری کی ساری کاتبوں پر خرچ کر دیتے تھے۔ ان کاتبوں سے وہ قیمتی اور عمدہ کتابیں لکھواتے۔ ان کا مقابلہ و تصحیح کراتے، پھر جلد بندھوا کر طالب علموں کو مفت دے دیتے۔ ساری عمر ان کا یہی مشغلہ رہا اور انھوں نے لوگوں کو ہزاروں جلدیں بخش دیں۔ 935/1528ء میں انھوں نے انتقال کیا۔ ان کے دولڑکے رہ گئے ہیں ایک تو پہلوانی میں اور دوسرا کبوتر بازی میں مشہور ہے۔ بادشاہ سلامت کے یہاں بھی ان کے فنوں کا ذکر آیا تو بادشاہ نے دونوں کو بلا کر ان کے کھیل تماشے دیکھے۔

میر عبد اللطیف قزوینی

یہ سیفی حسینی سادات میں سے ہیں۔ علوم عقلی اور نقلی کے بڑے عالم تھے۔ ان کے باپ اور دادا سے علم تاریخ گویا ان کے یہاں موروثی ہے۔ چنانچہ حیرتی شاعر نے قاضی یحییٰ کے والد کی تعریف میں کہا ہے:

قصہ تاریخ ازو باید شنید
کس درین تاریخ مثل اُوندید

انھوں نے یا ان کے کسی عزیز نے شاہ اسمٰعیل کے خروج کی تاریخ ''مذہب تا حق'' سے نکالی تھی۔ جب اس گستاخی پر پکڑے گئے اور مواخذہ ہوا تو کہہ دیا کہ ہم نے تو "مذھبنا حق" ہمارا مذہب حق ہے! تاریخ کہی تھی۔ بس یہ معنی خیز جواب دے کر چھوٹ گئے۔

سیفی سید سب کے سب بڑے پکے سنّی رہے ہیں، چنانچہ اس جرم میں شاہ طہماسپ نے ان کی زمینیں جاگیریں چھین لی تھیں۔ ہندوستان میں میر عبد اللطیف کے آنے کا بھی یہی سبب تھا۔

میں[78] نے میرزا غیاث الدین آصف خاں کی زبانی سُنا ہے کہ جب بادشاہ میر عبداللطیف اور ان کے خاندان کا دشمن ہوگیا تھا۔ میر علاؤ الدولہ نے جو تذکرہ کا مصنف ہے اور عبد اللطیف کا چھوٹا بھائی ہوتا ہے اور انہی سے تربیت پائی ہے۔ اپنے بڑے بھائی کو ''حضرت آقا'' کہا کرتا تھا۔ کسی مصلحت کی وجہ سے اس نے اپنی مذمت میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک مصرع ہے۔

لعنت کنم بہ یحییٰ و بر حضرت آقا

لوگوں نے اس سے کہا تو نے تو میر صاحب کی آغوش میں تعلیم و تربیت پائی ہے، پھر ان کی توہین کیوں کی؟ اس نے جواب دیا، دیکھتے نہیں ہو، اسی حق کی وجہ سے تو اس کو میں نے ''حضرت آقا'' کہا ہے اور اپنے باپ کا نام یحییٰ تو بغیر تعظیم ہی کے لیا ہے۔

جب فتنہ پردازوں نے شاہ طہماسپ کو میر یحییٰ کی طرف سے بدگمان کر دیا تو شاہ نے اپنے ایک نمائندے کو آذربائیجان فرمان دے کر بھیجا کہ میر یحییٰ اور ان کا لڑکا میر عبد اللطیف نہایت متعصب سنی ہیں اور انہی کی وجہ سے قزوین میں سنیوں کا زور بندھا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو گرفتار کر لیا جائے اور اہل سنت کی جو کتابیں ان کے پاس ہیں، ضبط کر کے ہمارے پاس بھیج دی جائیں۔ ان کے اہل و عیال اور قبیلہ والوں کو اصفہان میں منتقل کر دیا جائے۔ میر علاؤ الدولہ کو بھی جو ان دنوں آذربائیجان میں تھا، ایک تیز رفتار قاصد کے ذریعہ اسی طرح کا خط لکھ کر بھیجا۔

غرض حسب الحکم میر یحییٰ کو سپاہیوں نے گرفتار کر لیا اور وہ ڈیڑھ سال تک اصفہان میں قید رہے اور اسی قید میں ان کا انتقال ہوگیا۔ میر عبد اللطیف وہاں سے فرار ہو کر عرصہ تک گیلان کے پہاڑوں میں رہے، پھر بادشاہ غفران پناہ (ہمایوں) کے وعدے پر

ہندستان چلے آئے۔

یہاں آنے کے بعد ان کا بڑا اعزاز و اکرام رکھا گیا اور بے اندازہ شاہانہ سرفرازیوں سے نوازے گئے۔ اکبر نے ان کے پاس دیوان حافظ کے چند سبق اور کچھ دوسری چیزیں بھی پڑھیں۔ میر عبداللطیف نے 5 رجب 981ھ/1573ء کو فتح پور میں انتقال فرمایا۔ قلعہ اجمیر پر میر سید حسین خنگ سوار کے پہلو میں دفن ہوئے۔ قاسم ارسلان نے ان کی تاریخ ''فخر آل یسٰین'' نکالی ہے۔

میر غیاث الدین علی

میر عبد اللطیف قزوینی کا لڑکا ہے۔ اسے دربار سے نقیب خاں کا خطاب حاصل ہے۔ یہ نہایت فرشتہ خصلت اور صاحب علم و کمال شخص ہے۔ علم سیر، تاریخ اور اسماء الرجال میں تو عرب و عجم میں بھی اس جیسا ماہرِ فن اور کوئی نہ ہوگا۔

میرزا کے ساتھ میرا[79] بڑا دوستانہ رہا۔ وہ اور ہم[80] ساتھ ساتھ پڑھے بھی تھے۔ اب وہ رات دن بادشاہ سلامت ہی کی خدمت میں رہتا ہے اور تقریباً 100 سال سے خلوت و جلوت میں تاریخی قصے، حکایات جو فارسی اور ہندی افسانے، جس کا اسی زمانہ میں ترجمہ ہوا ہے، بادشاہ کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔

اکبر کے ساتھ اس کا ایسا ملاپ ہے کہ وہ خاندان شاہانہ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ اکبر ایک لحظہ کے لیے بھی اس کی جدائی کو گوارا نہیں کرتا تھا۔

ان دنوں اسے ہلکا سا بخار ہو گیا ہے امید ہے کہ جلدی اسے شفا ہو جائے گی۔ بہر حال نیک لوگ ہر جگہ معزز رہتے ہیں۔ خدا ان کو سلامت رکھے۔ بُروں کی زندگی کی دعا کیوں کی جائے کہ وہ رہیں گے تو وہی اپنی برائی کرتے رہیں گے۔

خواجہ محمد یحییٰ

حضرت خواجہ احرار سے 3 واسطوں سے خاندانی رشتہ رکھتے ہیں۔ فن تحریر میں بڑا عبور حاصل

تھا۔ 7 طرح کے خطوط بڑی عمدگی کے ساتھ لکھتے ہیں۔ اس فن میں وہ ماہر استاد تھے۔

نہایت اچھے اخلاق و عادات کے مالک تھے۔ یہ خوبی تو ان کو موروثی ملی تھی، کم سخن تھے لیکن ہمیشہ ان کی محفل گرم رہتی تھی۔ سخی ایسے تھے کہ جو بھی جاگیر کی آمدنی ہوتی وہ ان کے دسترخوان پر صرف ہو جاتی تھی۔ لوگوں کے آڑے وقتوں میں ہمیشہ کام آتے تھے۔

جب دربار میں مفسدوں کا دخل حد سے زیادہ بڑھ گیا اور پرانی محفل درہم برہم ہو گئی تو انھوں نے بھی دربار سرکار سے کنارہ کشی کر لی اور حجاز جانے کی اجازت حاصل کر لی۔ بادشاہ نے ان کو حجاج کے قافلے کا میرحاج مقرر کیا اور کافی خرچ دے کر انھیں رخصت کیا۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے لوٹ آئے۔

آگرہ میں ان کے اکثر اوقات عبادت و ریاضت میں گزرتے تھے۔ اسی جگہ ان کا انتقال ہوا:

ترا ز کنگرۂ عرش میزنند صفیر
ندانمت کہ درین دام گرچہ افتادہ است

شیخ حسین بدخشی

مخدوم شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ تھے۔ ان پر سکر کی کیفیت غالب رہتی تھی۔ فجر کی نماز کے بعد ہر روز کبرویہ سلسلہ کے طریقہ پر کتاب مصباح کو جو شیخ رشید کی تصنیف ہے، ان کی محفل میں پڑھا جاتا تھا۔ کتاب سنتے سنتے ان پر حال طاری ہو جاتا تھا۔ اسی طرح ان کے یہاں مثنوی مولوی معنوی بھی لازماً پڑھی جاتی تھی۔ شریعت پر ثابت قدم تھے۔ ان کی صحبت و گفتگو بڑی اثر انگیز ہوتی تھی۔ اگر کوئی شخص ان کی تعریف کرتا تو کہتے: ''اپنے اوپر تم ہمارا بھی عکس دیکھتے ہو''۔

بدایوں میں چند ترک ان کے مرید تھے۔ ان سے ملنے وہ چند بار بدایوں تشریف لائے تھے اور بدایوں والے ان کی صحبت مبارک سے فیض یاب ہوئے۔ وہاں سے لوٹ کر جب وہ آگرہ میں مقیم تھے تو ان کا وصال ہو گیا۔

شیخ عبد القادر

اوچہ کہ شیخ عبد القادر ثانیؒ کی اولاد میں سے ہیں۔ شیخ صاحب اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ اللہ بخش دونوں نے بڑے تقویٰ و پرہیز گاری کے ساتھ تربیت پائی۔ دونوں بڑے صاحب کمال رہے۔

کچھ عرصہ تک یہ دونوں فتح پور میں رہے۔ جس زمانہ میں نئے مذہب کی باتیں شروع ہوئی تھیں اکبر نے شیخ اللہ بخش پر مہربان ہو کر گجرات میں صدر کے عہدہ پر فائز کیا تھا نیز شہباز خان کے پاس بھیج دیا تھا۔ یہ تقرری در حقیقت ان کی جلاوطنی تھی۔ جب گجرات میں بغاوت ہوئی تو انھوں نے بڑی اچھی خدمات انجام دیں اور وہاں باغیوں کی نقل و حرکت کی اطلاع تیز رفتار قاصدوں کے ذریعہ بھجواتے رہے۔ بادشاہ نے خوش ہو کر 3 صدی کے منصب کے لیے فرمان صادر کر دیا۔ اسی زمانے میں ان کا وہاں انتقال ہو گیا۔

اکبر نے ان کے بڑے بھائی شیخ عبد القادر کے لیے مکہ معظمہ کی طرف خارج کر دینے کا حکم جاری کیا تھا۔ جس زمانہ میں خان خانان بیرم خان اور میرزا نظام الدین احمد گجرات کے نظم و نسق پر مامور تھے، وہ وہاں تشریف لے گئے تھے۔ ان کے لیے سامان سفر درست کیا گیا اور وہ حج و زیارت کی برکت سے فیض یاب ہو کر واپس آئے۔ اب اپنے وطن لاہور میں عبادت الٰہی میں مشغول ہیں۔

شیخ ابوالمعالی

میاں شیخ داؤد کے بھتیجے، داماد اور جانشین ہیں۔ احوال و مقامات میں نہایت تیز رس اور بلند مقام رکھتے ہیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز، بلکہ بزرگوں سے بھی آگے ہیں۔ اپنے پیر کی محبت میں انھوں نے خود کو بالکل ہی مٹا دیا اور ہمیشہ پیر کی اتباع میں مصروف رہے۔ خود ان کے اشعار ہیں:

ہستم از جام محبت ہمہ دم والہ و مست　　　این و آن راچہ شناسم من داؤد پرست

دل افسردہ کسی باید بگفت ہر کسی گرمی
دم داؤدی باید کہ آھن رادھد نرمی

بہ تخت فقر بنشینم چو حاصل گشت مقصودم
سلیمانی کنم کز جان غلامِ شاہ داؤ دم

رباعی

یارب نظری زعین مقصودم بخش   آزادگی زبود و نابودم بخش
ہر چندیم در خوراین دولت خاص   یک ذرہ زعشق شیخ داؤد بخش

ان کی زبان پر اکثر یہ جملے رہتے تھے۔

"یا ابا المعالی، کن عبد الرب المتعالی دلا تکن عبد الدراھم دلالی"

کہتے ہیں جب یہ پیدا ہوئے تھے تو ان کو قطب الاقطاب حضرت میاں شیخ داؤد کے پاس لے کر گئے اور ان سے نام رکھنے کے لیے کہا گیا۔ حضرت میاں نے فرمایا: ''ان کا نام شاہ ابو المعالی رکھو''۔ اس زمانہ میں ایسے نام ہندستان میں نہیں ہوا کرتے تھے، کیونکہ یہ مغلوں کے نام کے مشابہ تھا۔ لوگوں نے اسے مغلوں کی آمد کے لیے فال نیک سمجھا' چنانچہ ایک برس بھی نہیں گزرا ہوگا کہ ہمایوں ہندستان آ گیا اور اس نے اپنے محبوب ابوالمعالی کو پنجاب کی حکومت عنایت کی۔

ابو المعالی کی پیدائش کی تاریخ '' ابو المعالی حق پرست'' سے نکلتی ہے۔ ان کے یہ شعر ان کی مستانہ وار محبت کے گواہ ہیں:

غربتی از حال میگوید سخن   بی سخن این قیل وقال دیگر است
حالت عشقش بود گفتن محال   ورنمی گویم محال دیگر است

غربتی نقد جان فدا کیش کن
دولت وصل رائگان نہ ہند

سخن عشق بدل ورنہ ولب رابکشا
سراین شیشہ فرو بند کہ بادل نخورد

غربتی بانگ اناالحق زن واز دار مترس   زانکہ معراج درین راہ رسن دار بود

آنچہ مازان جان جانہا دیدہ و دانستہ ایم
بہر گفتن نیست بہر دیدن و دانستن است

انھوں نے مجھے(81) لاہور میں یہ رقعہ بھجوایا تھا:

''عزیزی! اس ہنگامہ پرور زمانہ میں ہر آنے جانے والے سے ہم تمہاری خیر و خیرت کے طالب رہے کہ اچانک تمہارا محبت نامہ وصول ہوا۔ اس وقت حضرت قادری کے اشعار میری روح کو بے چین کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے مزید کچھ لکھنے سے معذور ہوں۔ سب کو ہماری طرف سے دُعا۔''

آن عزیزی کہ ہمہ شب بدل من گردد
خرم آن روز کہ در دیدۂ روشن گردد

سلام شوق! مولانا عبد الغفار اور شیخ عمر کا ایک ضروری کام ہے جو آپ کی ذرا سی توجہ سے پورا ہو جائے گا، اگر فرصت ہو تو ان کا کام کر دیجیے۔

مولانا جمال تلہ

لاہور میں ان کے نام سے ایک محلّہ بھی مشہور ہے۔ حاجی مہدی کے داماد ہیں۔ حاجی مہدی بہت مشہور عالم گزرے ہیں۔ مولانا جمال اوچہ کے مُلا اسمٰعیل کے شاگرد ہیں، لاہور میں مدرس ہیں، اپنے وقت کے بڑے عالم ہیں۔ تقریباً تمام علوم عقلی و نقلی کو انھوں نے حاصل کیا ہے۔ ذاتی طور پر نہایت ذہین، جدت طراز اور قابل جوہر ہیں۔

8 سال سے برابر درس و تدریس کا مشغلہ ہے، ان کی خوش بیانی اور تنقیح و توضیح کا بڑا شہرہ ہے۔ چنانچہ وہ معقول و منقول کسی بھی علم کی مشکل مسائل بآسانی شاگردوں کو سمجھا

دیتے ہیں۔ نہایت مہربان و شفیق اُستاد سمجھے جاتے ہیں۔ صلاح و تقوٰی سے آراستہ نہایت با اخلاق انسان ہیں اور قرآن کے حافظ بھی ہیں۔

شیخ فیضی کی تفسیر میں اکثر مقامات پر اُنھوں نے اصلاح دی ہے اور اس کی تحریر کو مربوط کیا ہے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس(50)، ساٹھ(60) سال کے لگ بھگ ہے:

چیست بحث علم اگر تا فرق فرقد میرود
ذکر مولانا جمال الدین محمد میرود

مولانا عبد الشکور لاہوری

بڑے دانش و عالم ہیں۔ متانت فہم اور جدت طبع میں کافی مشہور ہیں۔ مشائخ سے گہری عقیدت اور حسن ظن رکھتے ہیں اور اپنے اکثر اوقات صوفیا کے اقوال کے مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ ہمیشہ عبادتوں، نوافل، وظائف، دعاؤں اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے ہیں۔ سخی ایسے کہ جو کچھ پونجی ہوتی ہے وہ فقراء اور اہل ضرورت پر خرچ کر دیتے ہیں۔

جب علماء ابتلا و آزمائش میں مبتلا ہو گئے تھے، بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے جونپور کا قاضی بنا دیا تھا جب بادشاہ نے الٰہ آباد کا سفر کیا اور وہ دربار میں حاضر ہوئے تو وہاں کی قضاوت کا عہدہ قاضی زادہ رومی کو جو نہایت خوش مزاج اور باکمال عالم ہیں تفویض کر دیا گیا۔ اس وقت سے مولانا عبد الشکور معزول ہیں، تھوڑی سی آمدنی پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ اطمینان سے علمی افادے میں مشغول ہیں۔

شیخ کبیر ولد شیخ منور

اپنے والد کے قائم مقام ہیں۔ یہ ایک صالح نوجوان ہیں جو چھوٹی عمر میں ہی بلند مدارج تک پہنچ گئے اور ایسا کمال حاصل کیا کہ بوڑھے اساتذہ سے بھی آگے ہو گئے۔ اس آخری زمانہ میں لڑکا باپ سے بہتر نکلے تو اسے بس عجوبہ ہی سمجھنا چاہیے۔

انھوں نے اکثر متداولہ علوم اپنے والد اور خسر میاں سعد اللہ بنی اسرائیل سے حاصل کیے اور ان بزرگوں سے آداب محفل اور دوستی کا سلیقہ خوب سیکھا ہے۔ بادشاہ کے مزاج

شناس ہیں۔ افیون کی بُری لت لگی ہے۔ اس کے علاوہ تکبر، جھوٹ اور شیخی کے بھی بیمار ہیں خدا ان بُری باتوں سے انھیں توبہ کی توفیق عطا فرمائے۔

جس زمانہ میں وہ بادشاہ کے حسب الحکم اپنے والد کے ہمراہ پرگنہ بجواڑہ اور شمالی پہاڑی کے دامن کی طرف گئے ہوئے تھے تو انھوں نے وہاں سے مجھے[82] یہ رقعہ لکھا تھا۔

رقعہ

"کان لی قلب اعیش بہ صناع منی تقلبہ"

''امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہونگے۔ جناب من ہمارا دل عبادت کدۂ خلوص میں معتکف ہے اور یہ خاکی جسم کہ اس پر خاک ہی پڑے تو بہتر۔ اس بیابان کثرت میں درندوں اور وحشیوں کے ساتھ آوارہ نہیں بلکہ ایسے گروہ کے ساتھ بندھا ہوا ہے کہ وحشی جانور بھی ان کو دیکھ کر وحشت کھا جائیں۔ سبحان اللہ! خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا ہو کر رہے گا۔ ذلیل نفس نے اب گوشۂ عافیت کی قدر جانی ہے۔

جب سے میں سن تمیز پر پہنچا اس وقت سے اب تک کہ میری عمر 40 سال ہو گئی ہے۔ میری ہمیشہ توجہ اسی جانب رہی کہ روحانی دردمندوں کی صحبت میں رہ کر اپنے نفسانی عیوب اور باطنی بیماریوں کا علاج کروں لیکن اللہ تعالی نے ایسی سخت بیماری میں مبتلا کر دیا کہ اب اس کا علاج خود اللہ کے سوا کسی اور سے نہیں ہونے کا۔

بہرحال اب نہ وہ صحبت روحانی حاصل ہے، نہ اطمینان قلب، وہ گوشۂ عافیت بھی اُجڑ کر رہ گیا۔

آپ براہِ کرم نواب فیاضی علامی فہامی کو سلام وشکر یہ پہنچا دیں۔ دعاؤں میں مجھے ضرور یاد رکھیے۔ امید ہے میاں احمد صحت وسلامتی سے ہونگے مجھے اپنا مشتاق سمجھیں''۔

شیخ سعد اللہ نحوی

مشرقی ہند کے رہنے والے ہیں۔ بیانہ میں مقیم رہے اور بچپن ہی سے شیخ محمد غوث کی

خدمت سے مشرف رہے اور ان کے فیض سے دعوت اسماء کے عمل اور وظیفہ کے لیے بڑی مستقل مزاجی سے ریاضتیں کیں۔

بیانہ میں انھوں نے ایک خانقاہ تعمیر کرائی تھی جو برسوں طالب علموں اور اہل سلوک کا ملجا و ماوا بنی رہی۔ وہ لوگوں کی تلقین و ہدایت میں برابر لگے رہتے تھے۔ خاص طور سے علم نحو میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ اپنے زمانہ کے بے مثل نحوی تھے۔

70 سال تک سوائے دودھ اور جنگل کے پھل اور پھلہری کے اور چیز سے افطار نہیں کیا۔ سخاوت اور ایثار میں بھی بڑے دراز ہاتھ ہوئے ہیں۔

میں سلیم شاہ کے عہد میں اپنے نانا کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ ان سے میں نے کافیہ کے چند سبق پڑھے ہیں۔

آخری دنوں میں وہ تمام چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ ہمیشہ ایک عالم حیرت میں ڈوبے رہتے اور ایک علیحدہ کمرے میں گوشہ نشین رہتے تھے۔ بچوں تک کو اپنے پاس نہیں بلاتے تھے۔ اسی عالم میں 989ھ/ 1581ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اسی خانقاہ میں دفن کیے گئے۔

کہتے ہیں جس دن ان کا انتقال ہوا تھا ایک چڑیا ان کی میت پر اچانک آ کر گر پڑی۔ دیکھنے والے اس واقعہ پر نہایت حیران رہ گئے۔

شیخ نصیر الدین

ہندوآن کے رہنے والے ہیں۔ کیمیا گری میں ان کی بڑی شہرت ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ ہمایوں بادشاہ کے سفر و حضر کے رفیق و مصاحب تھے۔

جوئے کی شکست کے بعد جب ہمایوں آگرہ پہنچا تو اس نے شیخ سے کہا کہ نئے لشکر کی تیاری کے لیے روپیہ کی ضرورت ہے۔ شیخ نے تانبے کی تمام دیگیں، تھالی اور برتن جمع کرائے اور بادشاہ کے سامنے انھیں خالص سونا بنا کر دے دیا۔ اس بات کا بڑا چرچا ہوا اور دور دور تک ان کی شہرت پہنچ گئی۔

میری[83] رشتہ داری بھی انہی کے خاندان میں ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں، میں[84] نے تحقیق کی تو پتہ چلا کہ شیخ خود کیمیا کے نسخہ سے واقف نہ تھے انھیں کسی درویش نے کیمیا کے اجزاء سے بھری ہوئی ایک زنبیل دے دی تھی اس سے انھوں نے بہت سے تانبے کو سونا بنا لیا۔ جب وہ ختم ہوگئی تو سونا بنانا ان کے بس میں نہ رہا کیونکہ وہ اس علم سے واقف نہ تھے۔

میں[84] نے ان کو بیرم خان کے عہد میں میر سید رفیع الدین محدث کے بھتیجے سید شاہ میر کے مکان پر دیکھا تھا۔ بڑے با اخلاق نورانی چہرے والے بزرگ تھے۔ اسی زمانہ میں ان کا انتقال ہوگیا تھا اور ھنڈون ہی میں دفن کئے گئے۔

شیخ مبارک الوری

سلیم شاہ ان کو شاہ مبارک کہا کرتا تھا اور ان کی اس قدر تعظیم کرتا تھا کہ خود اپنے ہاتھ سے ان کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ وہ غالباً سید ہونے کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ پٹھانوں کے بیچ ان کی بڑی عزت تھی۔

جس زمانہ میں پٹھانوں کو زوال ہوا اور وہ مغلوں سے شکست کھا کر بھاگے، بعض پٹھانوں نے شیخ الاسلام فتح پوری کو اس شبہ میں کہ ان کے پاس بہت روپیہ ہے، گرفتار کرکے رنتھنبور کے قلعہ میں بھیج دیا۔ اس خبر کو سن کر شیخ مبارک الور سے یساور کے راستہ وہاں پہنچے اور شیخ سلیم کو چھڑا لیا۔

انھوں نے جب دوسری بار کعبۃ اللہ کی زیارت کی تھی تو میں[84] 16 سال کا تھا اور اس وقت اپنے والد کے ساتھ یساور جاکر شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ بعد میں 987ھ/1589ء میں جب کہ اکبر نے اجمیر کی آخری زیارت کی تھی اور الور کے راستہ فتح پور لوٹ رہا تھا میں[84] نے دوبارہ حضرت سے ملاقات کی تھی۔

بلا شبہ وہ نہایت صاحب کمال شخص تھے۔ نہایت فیاض اور ایثار پسند آدمی تھے۔ سننے میں آیا ہے کہ حال ہی میں 90 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا ہے۔

شیخ چائین لدہ سوہنوی

قصبہ لدہ سوھنہ کے رہنے والے ہیں۔ یہ قصبہ میوات میں دہلی سے 18 کوس کے فاصلہ پر ہے۔ وہاں ایک گرم چشمہ ہے جو گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔ اس کا پانی سبز رنگ کا ہے اور اس سے گندھک کی بو آتی ہے۔ جاڑوں میں بھی اتنا گرم رہتا ہے کہ جسم پر ڈالا نہیں جا سکتا۔ خارش کے مریض کے لیے اس چشمہ میں نہانا مفید ہے۔ اس کی بو اور پانی کا رنگ خود بڑا ثبوت ہے کہ یہ گندھک کی کان سے نکلتا ہے۔

وہاں کا ایک اور عجوبہ ہے کہ گرمیوں کی راتوں میں اس قصبہ کے پہاڑوں میں کسی کے جلائے بغیر جگہ جگہ تھوڑی تھوڑی آگ جلتی ہوئی نظر آتی ہے۔

شیخ چائین حضرت عبد العزیز دہلوی کے مشہور خلفاء میں سے ہیں۔ فقر و قناعت ان کا مسلک ہے۔ خاص خاص شاگردوں کو تصوف کی کتابیں جیسے ''فصوص'' اور ''نقد فصوص'' وغیرہ کا درس دیتے ہیں۔ آخری عمر میں شہنشاہ اکبر ان کا نہایت معتقد ہو گیا تھا اور بعض مہموں میں ان سے دعا کرائی تھی۔ اپنے محل خاص کر قریب عبادت خانہ میں ان کی رہائش کا انتظام کرا دیا تھا۔ راتوں میں ان کے ساتھ خلوت میں باتیں ہوا کرتی تھیں، لیکن جب اکبر نے ان کو ''نماز معکوس'' پڑھتے دیکھا تو اس کی عقیدت وارادت جاتی رہی۔

989ھ/1581ء میں جب بستر مرگ سے جا لگے تو شیخ عبد العزیز کے لڑکے شیخ قطب عالم کو جو فوج میں ملازم تھا، دہلی سے بلوایا اور خرقہ، عصا اور مشیخیت کا سارا سامان اس کے سامنے رکھ کر کہا یہ تمہارے والد کی امانت تھی اس کے لیے تم سے زیادہ کوئی دوسرا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کی تاریخ وفات ''حقیقت فقر'' سے نکلتی ہے۔

شیخ عبد الغنی بدایونی

یہ بھی شیخ عبدالعزیز کے خلیفہ ہیں۔ ترک تعلق میں اپنے وقت کے ادہمؒ اور عالم تجرید میں اپنے زمانے کی شبلیؒ ہیں۔

بدایوں میں وہ طالب علم ہی تھے کہ ان پر کیفیت و حال طاری ہو گیا۔ کبھی کبھی ایسا

ہوتا تھا کہ عین سبق پڑھنے کے دوران جب کہیں سے نغمہ کی آواز آجاتی تو پہروں بے ہوش ہو جاتے۔ جب ان کے ساتھی پوچھتے کہ تم نے کیا دیکھا جو یہ حالت ہوگئی؟ تو کہا کرتے تھے مجھے کچھ پتہ نہیں۔

شادی شدہ ہونے کی وجہ سے روزی کی تلاش میں دہلی آئے اور وہاں کے حاکم تاتارخاں کی خدمت میں پہنچے۔ تاتارخاں تھا تو حاکم لیکن درحقیقت نہایت خدا رسیدہ آدمی تھا۔ اس ملازمت کے دوران شیخ موصوف شیخ عبد العزیز کے مرید ہو گئے اور تمام مروّجہ مشہور کتابیں ان سے پڑھیں اور تحصیل علم کے بعد برسوں سبق پڑھایا۔ درس و تدریس کے مشغلہ کے دوران ہی جذبہ باطنی اچانک جوش میں آیا اور تمام مشاغل ترک کر کے شیخ عبد العزیز کی خانقاہ میں کچھ عرصہ تک عبادت گزار درویشوں میں شامل رہے۔ بڑے مجاہدے اور ریاضتیں کیں۔ جب کمال باطنی حاصل کرلیا تو آبادی سے باہر قدمگاہ حضور اکرمؐ کے قریب ایک مسجد میں جا کر جو خان جہان کی مسجد مشہور ہے، مقیم ہو گئے۔ اگرچہ اہل و عیال اور خاندان کی بڑی ذمہ داریاں تھیں لیکن انھوں نے کل کا مسلک اختیار کر لیا اور تقریباً ایک قرن ہو چکا، اس گوشہ عزلت سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔

1003ھ/1594ء میں خان خاناں ان کی خدمت میں گیا اور ان سے نصیحت کرنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے فرمایا ''حضور اکرمؐ کی پیروی اختیار کرو''۔ اس تحریر کے قریبی زمانہ ہی میں احمد صوفی، حامی بنارسی جو اس آخری دور فتن کے سر برآوردہ اشخاص ہیں اور نئے دین الٰہی کے نومسلم ہیں:

حذر از صوفیان شہرو دیار ہمہ نا مردمند و مردم خوار
ہر چہ دادی بدست شان خوردند ہر چہ آمد زدست شان کردند
کارشان غیر خواب وخوردن نہ ہیچ شان فکر روز مردن نہ

ان لوگوں نے اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے اور اپنے فسق کو چھپانے کے لیے یہ چاہا کہ شیخ عبد الغنی اور ایک دو اور بقیہ السیف بزرگوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا جائے، چنانچہ ان لوگوں کو دہلی سے لاہور حاضر ہونے کے لیے فرمان جاری کر دیے گئے۔ شیخ نے میرے پاس ایک

خط بھیجا جس میں انھوں نے آنے سے بڑی معذوری ظاہر کی تھی۔ میں نے احمد صوفی کو کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کی مجبوریاں سمجھائیں یہاں تک کہ اس نے ان بزرگوں کی حاضری کا خیال چھوڑ دیا اور معافی کا ایک خط لکھ کر بھیج دیا۔ اس طرح یہ معاملہ بخیر وخوبی گزر گیا۔

شیخ بہلول دہلوی

علم حدیث کے بڑے اچھے عالم تھے۔ صاحبان فقر وفنا کی صحبت میں رہے۔ چنانچہ وہ ایک عرصہ سے فقر وتوکل کے راستہ پر نہایت ثابت قدمی سے قائم ہیں۔ دنیا اور دنیا والوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ ہمیشہ طالب علموں کو درس دینے اور علمی فیض پہنچانے میں مشغول رہتے ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی

آپ کا تخلص حقی تھا۔ علوم عقلی ونقلی دونوں سے بہرہ یاب اور ہنر وکمال کا مجموعہ تھے۔ تصوف میں بھی آپ کا بلند درجہ تھا۔ ان کی تصانیف میں ایک تو ''تاریخ مدینہ سکینہ (جذب القلوب الی دیار المحبوب)'' کا ترجمہ اور ہندستان کے متاخر مشائخین کرام کے حالات کا ایک مجموعہ (اخبار الاخیار فی اسرار الابرار) ہے جس کی تاریخ تصنیف ''ذکر الاولیاء'' سے نکلتی ہے۔

عنفوان شباب سے ہی انھیں علوم وفنون سے بڑی دلچسپی تھی۔ شیخ فیضی اور مرزا نظام الدین احمد سے قدیم روابط تھے۔ کچھ عرصے تک وہ ان لوگوں کے ساتھ فتح پور میں رہے۔ اس زمانہ میں میں(84) نے بھی ان سے استفادہ کیا تھا۔ جب دین بادشاہی کا قضیہ پیدا ہوا اور حالات بڑی حد تک تبدیل ہو گئے تو دوستی اور تعلقات میں بڑا فرق پیدا ہو گیا۔ شیخ موصوف کے بھی بعض لوگوں سے تعلقات بگڑ گئے اور انھوں نے کعبۃ اللہ جانے کا عزم کر لیا۔

جلد ہی وہ دہلی سے اس طرح روانہ ہو گئے کہ کوئی سامان سفر ساتھ نہ تھا، غرض کسی نہ کسی طرح گجرات پہنچ گئے۔ وہاں مرزا نظام الدین احمد نے ان کے لیے سفر کا سامان مہیا کر

دیا اور ہر طرح سے مدد کر کے جہاز پر چڑھا دیا اور وہ حجاز پہنچ گئے۔ بعض قدرتی موانعات کی وجہ سے وہ مدینہ کی زیارت نہیں کر سکے۔ چند روز مکہ معظمہ میں رہے اور شیخ عبد الوہاب ہندی خادم شیخ محدث رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث کی اجازت حاصل کر لی اور وطن واپس ہو گئے۔ یہ شیخ عبد الوہاب حاجی کے ساتھ حج سے جب آگرہ واپس آئے تھے تو میں(84) نے ان کے ہاتھ سے آب زمزم پیا تھا اور برکت کے لیے حدیث کا درس پڑھا تھا۔

شیخ عبد الحق اب اپنے حال و کیفیت کو چھپائے ہوئے علوم رسمی پڑھانے میں مشغول ہیں۔ نہایت عالی ہمت آدمی ہیں، اس لیے وہ اپنے راستہ پر استقامت و کامیابی سے بڑھتے رہیں گے۔

جن دنوں وہ مکہ شریف سے دہلی تشریف لائے تھے میں(84) حسب طلب بڑی تشویش و عجلت میں بدایوں سے بادشاہی لشکر کی طرف جا رہا تھا۔ ان سے بس ایک مختصر سی ملاقات ہوئی۔ جب میں(84) لاہور پہنچ گیا تو انھوں نے ایک خط بھیجا جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

''بندگی و نیاز کے بعد جس زمانہ میں آپ دہلی تشریف لائے تھے تو مجھے کچھ دیر کے لیے ملاقات سے نوازا تھا لیکن یہ ملاقات اتنی مختصر تھی کہ شوق و اشتیاق کی پیاس بجھی نہیں بلکہ اور بڑھ گئی، بہت سی باتیں کہنے سننے سے رہ گئیں۔ آج اس دنیا میں دوستوں سے ملاقات و گفتگو کی مہلت ہی نہیں ملتی، اگر دوستی سچی ہے تو انشاء اللہ عالم مستقبل میں اطمینان سے باتیں ہونگی۔

آج تو بس تعلقات کو درست رکھنے اور نیتوں کو پاک رکھنے کی سعی ہی کی جا سکتی ہے ہم نشینی بس کل کے روز ہی نصیب ہوگی جبکہ جدائی اور وصال کے سارے حجاب اٹھ جائیں گے۔ بہر حال آپ مجھے فراموش نہ کریں۔ میں تو ہمیشہ آپ ہی کے خیال میں رہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ آپ کے دل میں محبت و حقیقت پسندی جاگزیں ہے۔ اہل حرمین میں سے ایک بزرگ یہ دعا ہمیشہ پڑھا کرتے تھے ''**الھم کما انعمت فزد کما زوت خادم کما ادمت تبارک**'' اللہ تعالی محبت و دوستی کی نعمت کو بڑھائے، برقرار رکھے اور مبارک بنائے۔ اگر کبھی آپ اپنے عنایت نامہ سے نوازیں تو حضرت شیخ کلیم اللہ کے حالات سے ضرور مطلع فرمائیں۔ چند باتیں آپ سے عرض کی تھیں، اس سلسلہ میں بھی کچھ

نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کیا لیکن قلم نہیں چلا۔ اب اس کی ضرورت بھی کیا ہے۔ جب ان کا ذکر میرزا سے آیا تو اس نے اسی مطلب کے شعر کہے بلکہ صراحتاً لکھ دیا کہ یہ تکلّف سے بعید ہے کہ اس خط کے پہنچانے کی ذمہ داری آپ بجا لائیں گے۔ والدعا۔''

شیخ فیضی دکن سے واپس آنے کے بعد حسب معمول احباب نوازی اور مجلس آرائی میں مصروف رہتا تھا اور دوستوں پر جان چھڑکتا رہتا تھا لیکن نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ سخت پریشان اور رنجیدہ رہتا تھا۔ اس نے لاہور سے شیخ عبدالحق کو بلاوے کے چند خط لکھے لیکن ان کے دل میں فیضی کی طرف سے بڑا رنج تھا اس لیے وہ نہ آئے اور معذرت کے جواب لکھ دیئے۔ شیخ فیضی نے اس سلسلہ میں انھیں جو رقعہ لکھا تھا اس کا خلاصہ یہ ہے:

''آپ سے ملاقات کا شوق محض رسمی اور ظاہری نہیں ہے، نہ احاطۂ بیان میں آسکتا ہے۔ پہلے میں آپ کی مرضی و منشاء سے واقف نہ ہو سکا یہی گمان رہا کہ آپ بھی ملنے کے خواہش مند ہونگے۔ لیکن بعد میں یہ پتہ چلا کہ آپ نے دوستی کی یہ راہ ہی سرے سے بند کر رکھی ہے تو میں نے بھی آپ کی مرضی کو اپنی مرضی پر ترجیح دے دی۔ خدا کرے یہ صورت حال گوارا ہو جائے۔ بس اتنا ہی کہنا ہے کہ آپ نے اپنے ''خلوت کدہ تنگ'' پر کسی ہنگامہ کو پسند نہیں فرمایا۔ آج سے دو تین دن پہلے نقارۃ الاولیاء میاں شیخ موسیٰ میرے ویرانے پر تشریف لائے تھے۔ ان سے معلوم ہوا کہ بعید نہیں کہ جناب انہی دنوں آجائیں، ان سے میں نے اس کا سبب بہت کچھ دریافت کیا، لیکن گول مول جواب دے کر ٹال گئے۔ خدا کی قسم اس میں میری جانب سے کوئی اشارہ نہیں اور نہ کبھی ہوگا۔

''وقت گویا چہ حاجت طومار!''

اگر وہاں رہیں تو بھی منظور ہے اگر آجائیں تو نُور علیٰ نُور۔ خدا کی قسم کہ میں نے اب یہ خواہش بالکل ہی دل سے نکال دی ہے، نہ اپنی یاد کا ذکر کیا ہے نہ اس کی طرف کوئی اشارہ اور نہ میں ایسا کرونگا، اس لیے اس بارے میں آپ زحمت نہ اٹھائیں، لیکن مجھے بال و پر ہوتے تو میں پرواز کر کے اس حجرہ کی چھت پر آبیٹھتا اور نکات محبت کی ریزہ چینی کرتا اور والہانہ گیت گاتا۔ اب اور کیا لکھوں؟ آپ کی طرف سے ہی ساری تاخیر اور رکاوٹ

ہے۔ خدارا مجھ پر اپنے اسرار کے قافلہ کی راہ تو بند نہ کیجیے۔ واضح رہے اگر یہ راستہ اس طرف سے بند ہوگا بھی تو ادھر سے بند نہیں کیا جائے گا، کھلا ہی رہے گا۔ اسکندر فقر میاں پھول کو نیاز مندی پہنچا دیجیے۔ انہی 2 دنوں میں کسی بہانہ یہ رباعی ہوگئی تھی:

رباعی

فیض دم پیری ست قدم دیدہ بنہ　　　ہر گام کہ می نہی پسند دیدہ بنہ
از عینک شیشہ ہیچ نکشاید ہیچ　　　لختی بتراش ازدل وبردیدہ بنہ"

خدا کی عجیب شان کہ آج وہ شیخ فیضی نہیں رہا۔ اب تو ان گزر جانے والوں کی صرف باتیں اور یادیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی کب تک، کیونکہ ہمارا[85] بھی کچھ ٹھکانہ نہیں کہ کب کوچ کر جائیں۔

عنقریب است کہ از ما اثری باقی نیست
شیشہ بشکستۂ وی ریختہ وساقی نیست

مولانا الہداد سلطان پوری

سندھ میں وہ قریۂ بنودہ کے رہنے والے تھے۔ مخدوم الملک کے شاگرد رہے۔ شرافت اور حسب ونسب میں نہایت ممتاز و اعلی ہیں۔ ابتدا میں علم کی غرور اور جوانی کی ترنگ میں نہایت متکبر تھے لیکن اب جب کہ دنیا کا اچھا خاصا تجربہ ہو چکا ہے ان کا تکبر، فقر و انکسار میں تبدیل ہوگیا ہے۔

کچھ عرصے تک پنجاب کی صدارت کے عہدے پر فائز رہے، اب کافی عرصہ سے الہٰ آباد کے نئے شہر کی تعمیر کے کاموں کے عہدے پر مقرر ہیں اور اسی پر قناعت کر لی ہے۔ دنیا والوں کے گھروں پر دوڑ دھوپ نہیں کرتے۔ بڑے نیک اور عبادت گزار ہیں۔

مولانا عثمان سامانہ

عقلیات میں حکیم الملک کے شاگرد ہیں، نقلیات دوسرے اساتذہ سے حاصل کیے۔ مولانا

بڑے مستعد آدمی ہیں۔ کیف و حال سے خالی نہیں، بڑے سمجھ دار اور نیک عالم ہیں، اکثر اوقات عبادت ہی میں صرف کرتے ہیں۔ شاہی دربار کے خادموں میں شامل ہیں۔

چند سال تک وہ قلیچ خان کے وسیلہ سے دوآبہ میں پرگنوں کے انتظام و بندوبست پر مقرر کیے گئے تھے اب دربار میں بلا لیے گئے ہیں اور منصب داروں میں داخل کر لیے گئے ہیں۔

حاجی سلطان تھانیسری

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی زیارت سے فارغ ہو چکے ہیں۔ علوم نقلی میں بڑی مہارت پیدا کی ہے۔ عرصۂ تک شاہی خدمات پر مقرر رہے۔ 4 سال تک مہا بھارت کے ترجمہ میں جو ''رزمنامہ'' کے نام سے موسوم ہے تنہا بڑی مستقل مزاجی سے مصروف ہیں۔ اس کا آغاز نقیب خاں سے ہوا تھا اور مکمل انھوں نے کیا۔

ان کے پرگنہ کے ہندوؤں نے چغلی کھائی کہ حاجی سلطان گاؤکشی کے جرم میں مبتلا ہیں۔ بس بادشاہ نے ان کو جلاوطن کر کے بھکر کی طرف بھیج دیا۔ اس زمانہ میں صوبہ بھکر کا نظم ونسق خان خانان کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بڑی مہربانی اور شفقت سے کام لیا اور جلے دل پر مرہم رکھنے کی کوشش کی۔ جب وہاں کی فتوحات سے فارغ ہوا تو ان کو اپنے ساتھ دربار لایا اور معافی و رہائی کے لیے بادشاہ سے کہا جو قبول کر لی گئی اور حاجی کا معاملہ اللہ نے ٹھیک کر دیا۔ شیخ ابوالفضل کو بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کو تھانیسر و کرنال کا کروڑی بنا دیا جائے، اب بھی وہ اسی خدمت پر مقرر ہیں۔

جس زمانہ میں وہ مہابھارت کا ترجمہ کر رہے تھے، کسی نے پوچھا یہ تم کیا لکھ رہے ہو؟ انھوں نے کہا: ''10 ہزار سال پرانی خرافات کو مروجہ زبان کے پیکر میں اتار رہا ہوں''۔

سید شاہ میر سامانہ

صحیح النسب سید ہیں۔ فضائل علمی سے آراستہ اور تقویٰ و زہد سے آراستہ، نہایت متوکل و قانع عالم تھے۔ دریائے جمنا آگرہ کے اس پار طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے

تھے۔ شیخ بہاء الدین مفتی مرحوم کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی خانقاہ میں بہت سے عالم اور صوفی رہتے ہیں اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان کا ایک خادم مولانا فرید نامی، کاتا تھا اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے کبھی علم حاصل نہیں کیا تھا لیکن اس سے کوئی بھی مشکل مسئلہ یا دقیق و گہری بحث کسی بھی بڑی سے بڑی کتاب میں سے دریافت کی جائے تو وہ گھڑی بھر میں دوات و قلم لے کر اس مسئلہ کو تحریری صورت میں حل کر کے رکھ دیتا تھا اور عجیب بات یہ ہے وہ جو کچھ لکھتا تھا خود اسے پڑھ نہیں سکتا تھا یا زبانی طور پر اس کو بیان نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ ضیاء اللہ جن کا تعلق سلسلہ غوثیہ سے تھا اُن کے معتقد تھے تو پھر سید مشار الیہ کا کیا ذکر؟ اس کے متعلق یہ بھی سننے میں آیا کہ اس نے ایک رات مشرق یا مغرب میں ہونے والے کسی واقعہ کی اطلاع سید شاہ کو دی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ کوئی جن اس نے مسخر کر رکھا ہے بعض کچھ اور کہتے تھے۔

جس سال بادشاہ نے شیخ ضیاء اللہ کو آگرہ بلا کر عبادت خانہ میں ٹھہرایا تھا اور علماء و مشائخین کا کافی بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ میں[86] نے ایک رات خلوت میں شیخ سے فرید کاتب کے متعلق دریافت کیا اور اس کے متعلق جو باتیں مشہور تھیں بیان کیں اور ان سے پوچھا کہ کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟ شیخ نے پہلے تو اپنے مفردات، مولفات اور فضائل و کمالات اور ذاتی حالات بیان کیے، پھر کہا کہ اللہ تعالی نے مجھے یہ جو ساری نعمتیں عطا کر رکھی ہیں ان سب کے باوجود میں شیخ فرید کی خوشہ چینی کے بھی لائق نہیں ہوں اور جو کچھ تم نے اس کے بارے میں سنا ہے وہ عشر عشیر بھی نہیں ہے اس کا درجہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے اور یہ سب اس کو حضرت میر مشار الیہ کے آستانہ کی جاروب کشی کی بدولت نصیب ہوا ہے۔

اس واقعہ سے پہلے میں[86] نے سید شاہ میر کو بدایوں میں جہاں وہ مدد معاش کے سلسلہ میں آئے تھے، دیکھا تھا۔ کتاب ''مشارق الانوار'' سامنے رکھی ہوئی تھی اور علمی مذاکرہ گرم تھا۔ بلا شبہ وہ جدت پسند طبیعت اور ذہین شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن جس قدر کہ شیخ ضیاء اللہ اور دوسرے آدمی ان کی تعریف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو اس درجہ کا نہیں

پایا۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے، غالبًا انھوں نے اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کی ہوگی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس چیز سے کسی کو محروم رکھا گیا ہو وہ کسی اور کو بھی نہ ملے۔

سید یٰسین

سید شاہ میر کے چچیرے بھائی ہیں۔ اکثر درسی کتابیں گجرات میں میاں وجیہ الدین سے پڑھی تھیں۔ علوم رسمی کی تحصیل کے بعد میاں صاحب کے مرید ہو گئے اور حج کے لیے چلے گئے۔ وہاں حدیث کا علم حاصل کیا اور اجازت حاصل کر کے ہندستان واپس آئے۔ کچھ عرصہ تک لاہور میں امراء اور حکام کی صحبت میں رہے۔ پھر انھوں نے یہ تعلقات ترک کر دیے اور درویشی کا لباس پہن کر سرہند میں بقیہ عمر گزار دی۔ اپنے چند نیلے پوشاک والے خادموں کی بڑی اچھی تربیت کی، وہ پیشوائی میں صاحب اِدّعا تھے۔

ہمیشہ گجرات اور پھر وہاں سے حرمین شریفین جانے کی آرزو کرتے رہتے تھے۔ سرہند میں بھی زیادہ عرصہ ٹھہر نہ سکے اور بنگالہ چلے گئے۔ اب وہیں سیر و سیاحت میں لگے ہوئے ہیں نہ معلوم ان کا کیا انجام ہونا ہے اور وہ کس سرزمین کا پیوند بننے والے ہیں؟

شیخ ضیاء اللہ

شیخ محمد غوث کے جانشین ہیں۔ تصوف میں جو انداز بیان ان کا ہے صوفیاء میں کم ہی کسی کا رہا ہوگا۔ ان کی محفل میں ہمیشہ معرفت و حقیقت کی ہی باتیں کرتے تھے۔ ان باتوں کا موضوع ہمیشہ توحید اور وحدت ہی کا مسئلہ ہوتا تھا۔ ان کے باطن کا حال اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ آخر کون سا داعیہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھے؟

پہلے پہل جب ان کے فضائل کا شہرہ بلند ہوا تو میرے سننے میں آیا کہ شیخ اپنے والد کی مسند فقر و ارشاد پر جانشین ہو گئے ہیں بلکہ بعض پہلوؤں سے وہ ان پر بھی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن شریف کے بھی حافظ تھے اور اس کی تشریح و توضیح کرتے تو کسی تفسیر سے مدد لینے کی ان کو ضرورت نہیں پڑتی تھی۔

970ھ/1562ء میں ان سے ملاقات کے لیے میں[86] آگرہ گیا اور کسی واقف کار کو وسیلہ اور ذریعہ بنائے بغیر بے تکلفی اور سادگی سے جس کا میں مدت سے عادی تھا سلام علیک کہہ کر مصافحہ کیا: کیونکہ میرا یہ خیال ہے کہ بزرگوں سے ملاقات کے لیے دنیاوی تکلفات برتے جائیں تو یہ حصول مقصد میں آڑ بن جاتے ہیں۔ شیخ کی محفل میں بھی تعظیم وتکریم کے مراسم کا لحاظ رکھا جاتا تھا اس لیے ان کو میری[86] بے تکلفی کچھ پسند نہ آئی۔ اہل محفل نے مجھ سے پوچھا: ''آپ کہاں سے آرہے ہیں؟'' میں نے جواب دیا: ''سہسوان سے''۔ پھر پوچھا گیا: ''تم نے کچھ پڑھا لکھا بھی ہے؟'' میں نے جواب دیا: ''عرصہ پہلے ہر فن کی کچھ نہ کچھ تحصیل کی ہے''۔

سہسوان ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اس وقت وہاں ان کے باپ کا مرید قلیج چوگان بیگ جاگیردار تھا، اس لیے شیخ نے مجھے کوئی اہمیت نہ دی اور طنز و استہزا کرنے لگے۔ ایک مسخرے کو اشارہ کیا کہ مجھے تنگ کر کے محفل سے اُٹھا دے۔ میں مشائخ کی ایسی اداؤں کو خوب جانتا تھا اور بارہا ایسے مواقع پیش آئے تھے۔ میں[86] ان باتوں سے انجان بنا رہا۔

وہ مسخرہ ہزل کرنے لگا کہ: ''کہیں سے عطر کی مہک آرہی ہے جس سے میرا دماغ جوش کھانے لگا ہے۔ اہل محفل ہوشیار رہیں تا کہ کسی کو میرے ہاتھوں کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے''۔ یہ کہتے ہوئے اپنے منھ سے کُتے کی آواز نکالنے لگا۔ ان کے ایک صوفی نما مصاحب نے مجھ سے پوچھا: ''یہ عمدہ عطر کیا تم نے لگا رکھا ہے؟'' میں[86] نے کہا: ''ہاں لیکن بات کیا ہے؟'' اس نے کہا: ''یہ جو باؤلا شخص ہے اس کو کسی وقت کتے نے کاٹ کھایا تھا جس وقت بھی وہ خوشبو سونگھ لیتا ہے کتّے کی آواز منھ سے نکالنے لگتا ہے اور کتے کی طرح بھونکتے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتا ہے۔ آپ ذرا ہوشیار رہیے''۔ یہ سن کر حاضرین پریشان سے ہو گئے۔ شیخ بھی مجھے ڈرانے کے لیے اس سے ڈرنے کا دکھاوا کرنے لگے۔ اور اس طرف ہٹ گئے جدھر نئی عمارت بن رہی تھی۔ اس طرح انھوں نے ان انسان نما شیطانوں کی حوصلہ افزائی کی۔

اس موقع پر میں[86] نے کہا: ''بڑی حیرت ہے کہ اس بارگاہ عالی پر لوگ بڑی دور

دور سے اپنی ضرورت پوری کرانے آتے ہیں اور یہاں ایک کُتّے کے کاٹے انسان کا علاج نہیں ہوسکتا۔" انھوں نے کہا: "کیا تم اس کا علاج جانتے ہو؟" میں[86] نے کہا: "ہاں" وہ کیا علاج ہے؟" میں نے کہا: "اس کے سر پر پتھر اور جوتے مارے جائیں تو اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے:

سگ دیوانہ را دارو کلوخ است

(پاگل کتے کا علاج ڈھیلا ہے)

میری[86] بات سن کر سب فق سے ہوکر رہ گئے۔ پھر میں نے کہا: "ڈھیلا پتھر، ایک بوٹی کا نام بھی ہے جو کتے کاٹنے کی موثر دوا ہے"۔ شیخ نے جب دیکھا کہ یہ حیلہ کارگر نہیں ہوا تو کہا: "آؤ اللہ رسول کے ذکر میں مشغول ہوجائیں"۔ پھر انھوں نے کلام پاک کھولا اور سورۂ بقرہ کی ایک آیت کی تفسیر شروع کردی اور طرح طرح کی لچھے دار باتیں بیان کرنے لگے۔

شیخ جو بھی الٹی سیدھی بکواس کرتے جاہل شاگرد اس پر ہاں کہہ دیتے۔ میرا دل تو ان کی طرف سے بھرا ہوا تھا اس لیے میں نے قصداً ٹوک دیا اور ان سے پوچھا: "یہ مطلب جو آپ بیان کر رہے ہیں کسی اور تفسیر میں بھی ہے؟" کہنے لگے: "میں تو یہ تاویل و اشارہ کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ مضمون بہت وسیع ہے"۔ میں نے کہا: "اچھا تو پھر یہ بتائیے یہ مطلب حقیقی ہے مجازی؟ انھوں نے جواب دیا "مجازی" میں[86] نے کہا ان دو حقیقی اور مجازی، مطلبوں میں کونسا علاقہ ہے؟ اس طرح میں نے ان کو علم بیان کی بحث میں الجھا لیا۔ انھوں نے کچھ الٹی سیدھی باتیں کیں اور ہر طرف دوڑ لگانے لگے اور جب میں نے ان کو کس کر گھیرا تو بس اکھڑ گئے۔ قرآن کو پٹک کر کہنے لگے: "میں نے علم جدل نہیں پڑھا ہے"۔ میں نے کہا: "آپ قرآن کا ایک ایسا مطلب بیان کرتے ہیں جو کسی اور جگہ منقول نہیں ہے، لامحالہ آپ سے حقیقی اور مجازی مطالب کا باہمی رابطہ و علاقہ دریافت کیا جائے گا۔" شیخ نے دیکھا کہ کسی طرح بات بنانا مشکل ہے تو بات کو ادھر اُدھر پھیر کر میرا حال احوال پوچھنے لگے۔ میں[86] نے انہی دنوں قصیدہ بردہ ـ لکھی تھی، اس کا

ایک باب میں نے شیخ کے سامنے رکھ دیا اور قصیدہ کے مطلع کے سلسلہ میں جو نکتے میرے ذہن میں آئے تھے، بیان کیے، بڑی تعریف کی اور خود بھی اس بارے میں چند نکات بتائے۔ ان سے پہلی ملاقات کا تو یہ رنگ تھا۔ دوسری ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ میں[86] اکبر بادشاہ کی ملازمت میں تھا اور شیخ حسب طلب حیران و پریشان تنہا عبادت خانہ شاہی میں آ کر ٹھہرے ہوئے تھے۔

جمعہ کا دن تھا کہ بادشاہ پہلے ایک دو آدمیوں کے ساتھ وہاں تشریف لے گئے۔ میرزا غیاث الدین، علی آخوند، میرزا آخوند اور میرزا علی آصف خان کو کہہ رکھا تھا کہ شیخ کو بحث میں الجھا کر تصوف کا مطلب دریافت کرو، دیکھیں وہ کتنے پانی میں ہے؟ چنانچہ آصف خان نے گفتگو شروع کی اور ''لوائح'' کی یہ رباعی پیش کی:

گر در دل تو گلی گزر د وگل باشی در بلبل بیقرار بلبل باشی
تو جزئی وحق کل است اگر روزی چند اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

اور پوچھا کہ: '' اللہ تعالی کو کل کس طرح کہا جا سکتا ہے جب کہ وہ جز اور کل ہونے سے برتر و اعلیٰ ہے''۔

شیخ تباہ حالی کے بعد دربار میں آئے تھے، ان کا سارا غرور پندار خاک میں مل چکا تھا اور بڑی مصیبتیں جھیل چکے تھے، نہایت عاجز و شرمندہ تھے اس لیے انھوں نے ایسے دھیمے لہجے میں کچھ باتیں کہیں جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئیں مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے جسارت کر کے کہا مولوی جامیؒ نے اگر چہ اس رباعی میں اللہ تعالی پر ''کل'' ہونے ہی کا اتفاق کیا ہے، لیکن ایک اور رباعی میں جزئیت بھی بیان کی ہے:

این عشق کہ ھست جزء لاینفک ما حاشا کہ شود بہ عقل ادرک ما
خوش آنکہ دمد پرتوی از نور یقین مارا برہا ند از ظلام شک ما

لیکن اس کل ہونے اور جز ہونے کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ جز ہو یا کل سب کچھ وہی ہے اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی وجود حقیقت میں نہیں ہے۔ دراصل اس کی اصل حقیقت کو عبارت میں نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس کی تعبیر کبھی کل سے کبھی جز سے کی

جاتی ہے۔ پھر میں[86] نے وحدت وجود کو ثابت کرنے کے لیے اور چند مسائل جن پر میں[86] نے ان دنوں عبور حاصل کیا شیخ کی طرف سے تائیداً بیان کیے۔ میری[86] اس تقریر پر بادشاہ بہت خوش ہوئے۔

انہی دنوں شیخ کے سوتیلے بھائی شیخ اسمٰعیل نے جو فتح پور کے محلہ خواجہ جہان میں میری قیام گاہ سے قریب ہی رہتا تھا اور ہماری آپس میں جان پہچان اور ملاقات تھی اس نے عبادت خانہ میں تخلیہ کرا کے میری اس ملاقات کو یاد دلایا جو 11 سال پہلے شیخ سے ہوئی تھی اور جس کا ذکر اس نے میری زبانی سن لیا تھا۔ یہ سن کر شیخ حیران رہ گئے اور کہا ''مجھے یاد نہیں کہ ایسا کبھی ہوا ہوگا''۔

شیخ اب آگرہ میں اپنے باپ کی طرح مشائخانہ وضع میں عیش و آرام سے بسر کر رہے ہیں، ان کی محفلوں میں مذہبی دکانداری کا رنگ ہے، اپنی پرانی حالت پر قائم ہیں۔ ان کی عام فریب سادہ لوحی کے بڑے قصے مشہور ہیں جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔

میر ابو الغیث بخاری کہا کرتے تھے وہ جیسا کچھ بھی ہوا کرے لیکن وہ درویشانہ لباس، فقیرانہ مجلس اور تصوف کی باتیں کرنے کا اہتمام کرتا ہے اور اپنی روش پر استقامت سے قائم ہے بس اس کی ان اداؤں پر ہم دل و جان سے نثار ہیں۔ جس سال کہ خان زمان کی مہم میں کامیابی حاصل ہوئی وہ لشکر کے ہمراہ امیٹھی گئے تھے وہاں حضرت میاں شیخ نظام الدین سے ملاقات کی، وہ آیت کریمہ۔ ''وسیقول فیھا کاء سأ کان مزاجھا زنجبیلا عینا فیھا تسمی سلسبیلاً'' کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ شیخ نے اپنی حیثیت ظاہر کی اور مداخلت کر کے کہا۔ ''اس آیت میں اور ایک دوسری آیت فرق ہے''۔ حضرت نے فرمایا: ''سبحان اللہ باپ تو وہاں غوطے کھا رکھا ہے، شفاعت کامل کا محتاج ہے اور بیٹا یہاں اللہ تعالیٰ کے کلام میں تناقض ثابت کر رہا ہے''۔

''درس بنود ہر آنچہ در سینہ بود''

میر ابو الغیث بخاریؒ

یہ بڑے پاک مشرب، عالی ہمت بزرگ تھے۔ انکے اخلاق، فرشتوں کے اخلاق کے مانند

تھے۔ غنا کے پردے میں فقر کی جھلک صاف دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے بہت سے علماء و مشائخین سے استفادہ کیا تھا۔ سخاوت، بخشش، آزادہ روی، حسن معاشرت، صدق معاملت اور میل ملاپ میں اللہ کی کھلی نشانی تھے۔ احکام شریعت کی پابندی اور صوفیائے سلف و خلف کی پیروی پوری طرح کیا کرتے تھے۔ سنت اور نماز باجماعت سے ایسا شغف تھا کہ جب وہ موت کے قریب تھے اس وقت بھی تکبیر تحریمہ ان سے چھوٹنے نہ پائی۔ ان کی مجلس کبھی اللہ اور رسول ﷺ کے ذکر نیز بزرگوں کی باتوں سے خالی نہیں رہی۔

ان کی تاریخ وفات "میر ستودہ سیر" ہے۔

میاں کمال الدین حسین شیرازی

احباب کے تذکرے نے میرے دل کو کھول دیا ہے۔ ان کے ذکر میں اگر طوالت ہو تو عزیز قارئین تنگ دل نہ ہوں۔

میاں کمال الدین حسین مولانا حسن شیرازی کے لڑکے ہیں۔ جس وقت شاہ اسمٰعیل نے نکال باہر کیا تھا تو وہ شیراز سے مکہ معظمہ چلے گئے تھے پھر وہاں سے گجرات پہنچے اور سلطان سکندر لودی کے زمانہ میں سید رفیع الدین محدث اور میاں ابو الفتح خراسانی کے قافلہ کے ساتھ آگرہ آئے اور اس جگہ بس گئے۔ شیخ زین الدین خوافی مشہور شاعر نے مولانا حسن کی شان میں کہا ہے:

ھست شعر من زعقل ونقل خواہم بشنود
جامع المعقول والمنقول مولانا حسن

مولانا حسن کے صاحبزادے میاں کمال الدین حسین نہایت فرشتہ خصلت انسان ہیں۔ ان کے اخلاق حمیدہ اور صفات پسندیدہ کا ذکر تحریر وتقریر سے بالاتر ہے۔ اکبر ان کی بزرگی اور بڑائی کے پیش نظر اس بات کا خواہاں تھا کہ وہ بادشاہی ملازمت میں رہیں۔ لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور دنیاوی اعزازت سے منھ پھیر کر مختصری مدد معاش کی زمین پر صبر کرلیا۔ فقر و ایمان کو اپنا سرمایہ بنا لیا۔ وہ ہمیشہ عبادت و اطاعت میں مصروف رہتے تھے

اور بڑے اطمینان و بے فکری کے ساتھ کبھی دہلی میں اور کبھی آگرہ میں رہا کرتے تھے۔

لڑکپن سے بڑھاپے تک عبادت،، ذکر الٰہی، تلاوت کلام پاک برابر ان کا معمول رہا، کبھی اس میں فرق نہیں آیا۔ ان فضائل و کمالات کے علاوہ علمی استعداد بھی بہت اچھی تھی۔ شاعری، خوش خطی، حسن املاء اور انشاء پردازی میں بھی باکمال تھے۔ ابتدائی عمر میں جب میں بیرم خاں کے عہد میں آگرہ آیا تھا تو میرا سب سے پہلا قیام مسجد فیض بخش میں انہی کے مکان پر رہا تھا۔ اس دوران میں نے ان کے آستانے سے بڑی سعادتیں حاصل کیں اس وقت سے اب تک کہ میں[86] یہ سطریں لکھ رہا ہوں پورے 40 سال گزر چکے ہیں۔ اس طویل مدت میں انھوں نے تعارف و آشنائی کی ہمیشہ رعایت برتی اور میرے ساتھ برابر مہربانی اور دلسوزی سے پیش آتے رہے۔ ان کی اتنی مہربانی ہے کہ اب مزید اضافہ کی گنجائش ہی نہیں رہی:

بس عشق کہ آن کم شد وبس حسن کہ آن کاست
عشق من و حسن تو ھمان بلکہ فزون ہم

انھوں نے مجھے لکھا تھا:

''ان دنوں جب کہ بندوں کی خدائی کا دور دورہ ہے، محبت و دوستی اٹھ چکی ہے، میں تنہائی اور جدائی کے غم میں مضطرب و بے چین رہا۔ بے قراری میں کبھی دہلی چلا جاتا اور وہاں کے مزاروں کی زیارت میں لگا رہتا۔ کبھی اپنے بے سہارا بچوں کو دیکھنے کے لیے آگرہ چلا آتا۔ اسی افراتفری میں تھا کہ تمہارے متعدد خط یکے بعد دیگرے پہنچے۔ خدا گواہ ہے کہ تمہارے خطوط سے بڑی تسلی اور تسکین حاصل ہوئی۔ چند دن تک ان خطوط کو بار بار پڑھتا رہا اور صبح و شام تمہارے لیے دعائیں کیں:

الٰہی تا قیامت زندہ باشی

مکرم و محترم میرزا نظام الدین احمد کی رحلت کی خبر سن کر نہایت ملال اور رنج ہوا۔ ''انا للہ و انا الیہ راجعون'' مرحوم خوبیوں کا مجموعہ اور نادر روزگار تھے۔ بس کیا کہا جا سکتا ہے یہ جو صدمے مسلسل اور متواتر پہنچ رہے ہیں ان کا ذکر ہم آخر کس سے کریں۔ اب ہم

اپنی موت کے منتظر بیٹھے ہیں کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں۔ ہمیشہ یہ دعا زبان پر رہتی تھی۔

"اللٰھم ارحمنا ازا عرق الجبین و کثر الانین وئیس منا الطبیب ویکی علینا الحبیب اللٰھم ارحمنا اذا ادارنا التراب و رعنا الاحباب و فارق النعیم وانقطع عنا النیھم"

امید ہے کہ آخرت اچھی ہوگی اور دنیا سے ایمان سلامت لے جائیں گے۔ خط کی روانگی میں عجلت تھی اس لیے میں نے رات بڑی جلدی میں یہ چند سطریں لکھی ہیں۔ تمہارے ساتھ جو دلی اشتیاق ہے وہ بہرحال حد بیان سے باہر ہے بس اس کو تم اپنے دل ہی سے محسوس کر سکتے ہو الفاظ سے اسے محسوس نہیں کرایا جا سکتا۔''

شیخ ابوالفتح تھانیسری

اپنے زمانہ کے بڑے تبحر اور بلند مرتبت عالم تھے۔ حدیث کا علم مولانا سید رفیع الدین محدث سے حاصل کیا تھا۔ میر صاحب ہی کے محلّہ میں، آگرہ میں تقریباً 50 سال تک عقلی و نقلی علوم کا درس دیتے رہے۔ ان کے درس کی بدولت بڑے ہی ذہین اور صاحب علم پیدا ہوئے ہیں۔ میں(86) اور میاں کمال الدین حسین نے بھی ان بزرگوار کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔

ان کا لڑکا شیخ عیسیٰ اب آگرہ میں مفتی کے عہدے پر مقرر ہے۔

مولانا عثمان بنگالی

پُرانے بزرگوں میں سے تھے، سنبھل میں آکر مقیم ہو گئے تھے۔ میاں حاتم سنبھلی نے بھی ان سے پڑھا ہے۔ کبھی کبھی وہ مولانا عثمان کی خدمت میں جا کر ان سے دعا کی درخواست کرتے تھے۔

میں(86) بھی لڑکپن میں میاں مرحوم کے ساتھ مولانا مذکور کی خدمت میں حاضر ہو کر سعادت اندوز ہوا کرتا تھا۔ بڑے خدا ترس بزرگ تھے۔

شیخ حسین بزھری

بڑے درجہ کے عالم تھے۔ دہلی کے مدرسہ میں طالب علموں کو پڑھانے میں مصروف رہتے تھے۔ ہندستان میں جو علوم نقلی مروج و مشہور ہیں ان میں ان کے مقابلہ کا کوئی نہیں تھا۔ وہ سب سے ممتاز و سر برآوردہ تھے ساتھ ہی نہایت با اخلاق آدمی تھے، علم و اخلاق کے سارے محاسن ان کی شخصیت میں جمع تھے۔

مولانا اسمٰعیل عرب

شیخ حسین کے ہم عصر اور ان کے ہم پلّہ عالم تھے۔ خاص طور سے علم ہیئت، حکمت اور طب میں تو ان کا کوئی نظیر نہیں تھا۔ شیخ حسین کے ساتھ درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے فیوض سے طالب علم پوری طرح استفادہ کرتے رہتے تھے۔

مولانا کافی مالدار آدمی تھے۔ شہر کے بعض شریر لوگوں کے اشارہ پر چوروں نے ان کے گھر ڈاکہ ڈالا اور انھیں شہید کر دیا۔

قاضی مبارک گوپامئوی

علم کے اونچے مدارج پر ان کا مقام تھا۔ قضاوت کے عہدہ میں بڑی دیانتداری اور نکتہ رسی سے کام لیتے تھے۔ علوم کی تحصیل اور اخلاقی تربیت میاں شیخ نظام الدین انیٹھی وال کی خدمت میں حاصل کی تھی۔ میاں صاحب نے انھیں اپنی نگرانی میں رکھ کر تربیت دی تھی۔

جب کبھی قاضی مبارک میاں صاحب سے کہتے کہ: ''اگر مسلک ولایت میں سے بھی کچھ برکتیں مجھے عنایت ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟'' میاں صاحب ان کو جواب دیتے: ''قاضی مبارک! تجھے تو دنیا بھی ملے گی اور آخرت بھی!''

قاضی مبارک آخر عمر تک بڑی عزت و تکریم کے ساتھ بسر کرتے رہے اور دنیا سے محترم و معزز ہی اٹھے۔ قاضی مبارک سے استفادہ کے لیے دور دراز سے لوگ گوپامئو آتے تھے، بہت سے لوگوں نے تو اسی جگہ زندگی بسر کرنا شروع کر دیا تھا اور ان کے فیض

سے درجۂ کمال تک پہنچے تھے۔ ان کے دامن تربیت سے فیض یاب ہونے والوں میں مخدوم بدھ بھی ہیں جو اکثر درسی کتابوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک دوسرے معلم سیدمحی الدین بھی ان کے شاگرد ہیں۔ ان کے شاگردوں کا یہ قافلہ اپنے ٹھکانے پہنچ چکا ہے۔ اب ان کا کوئی قائم مقام نہیں رہا۔

علم کا میدان تو اب روز بروز شیروں سے خالی ہوتا جا رہا ہے اور ان کی جگہ روباہ (لومڑی) صفت لوگوں نے لے لی ہے۔ ''مشارق الانوار'' کے مصنف نے بھی یہ فریاد اپنے زمانہ میں کی تھی کہ **''لولا تخلی الغاب عن رسامة ذی الشبین لما صبح بها ثقالة ابو لحصین''**۔

همین ناقه ماند مسکین حسن را
ازان روز ترسم که این هم نماند

مولانا ویس گوالیاری

بڑے دانشور اور مناظرہ ومجادلہ کرنے والے عالم تھے۔ اصول وفرع کے مباحث میں ان کی ٹکر کا کوئی نہ تھا۔ حافظہ کا یہ عالم تھا کہ بحث مباحثہ کے وقت جب کسی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت ہوتی تو کتاب کے صفحوں کے صفحے زبانی پڑھتے چلے جاتے اور کہتے یہ عبارت فلاں کتاب میں ہے کھول کر دیکھ لو۔ اس کے بعد وہ اپنے حریف کے سر ہو جاتے اور اسے الزامات کی زد پر رکھ لیتے، لیکن اکثر ایسا ہوا کہ جب کتابوں میں حوالے کی کھوج کی گئی تو وہ عبارت کہیں نہیں ملی۔ اسی طرح انھوں نے ایک دن بادشاہ کے سامنے مولانا الیاس منجم کو بھی جو ہمایوں بادشاہ کے استاد اور رصد ونجوم کے ماہر تھے۔ الزام لگا لگا کر نیچا دکھا دیا۔ مولانا الیاس کو اس بات کا اتنا رنج ہوا کہ لکھنؤ کی سرکار میں مویان کے قصبہ میں ان کی جاگیر تھی، اس جاگیر کو چھوڑ دیا۔ سپاہ گری پر دوحرف بھیجے اور کوچ پر کوچ کر کے گجرات چلے گئے اور وہاں سے مکہ معظمہ پہنچے۔ جب وہ عراق، آذربائیجان، اردبیل کے سفر میں پہنچے جہاں ان کا وطن بھی تھا تو شاہ اسمٰعیل ثانی کے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا جو

بہت مشہور ہے۔ مولانا الیاس جب اردبیل پہنچے تو اس وقت شاہ طہماسپ نے اسمٰعیل کو قہقہہ کے قلعہ میں قید کر رکھا تھا۔ مولانا نے اس کے نام ایک رقعہ لکھا کہ سیاروں کے حساب سے مجھے اس کا علم ہوا ہے کہ تمھیں فلاں مہینے رہائی مل جائے گی اور اس چاہ ندامت سے نکل کر مسند عزت پر قدم رکھو گے اور تخت سلطنت پر جلوس کرو گے۔ جیسا انھوں نے کہا تھا ویسا ہی ہوا۔ کچھ ہی عرصہ بعد شاہ طہماسپ کو زہر دے کر مار ڈالا گیا اور عراق میں بڑا انقلاب رونما ہو گیا۔ امیروں اور وزیروں نے شاہ اسمٰعیل کو قید خانہ سے نکال کر اردبیل کے راستے تخت نشینی کے لیے لے گئے۔ مولوی الیاس نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ جب تم قہقہہ سے اردبیل پہنچو تو مجھ سے لازماً ملنا تاکہ بالمشافہ بعض ضروری امور طے کر لیے جائیں اور اسمائے عظمیہ کا عمل رو برو انجام دیا جائے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شاہ اسمٰعیل کو وہاں سے عجلت میں گزرنا پڑا اور وہ مولوی موصوف کے گھر پر نہ جا سکا۔ اردبیل سے روانہ ہونے کے بعد وہ لوٹ کر آیا اور مولوی الیاس سے ملنا چاہا لیکن انھوں نے مکان کا دروازہ بند کر لیا اور ملاقات کی اجازت نہیں دی۔ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد بادشاہ نے مجبورا دروازہ توڑ دیا اور زبردستی ان کے حجرہ میں گھس کر ملاقات کی۔ بادشاہ کے آنے پرا نھوں نے اپنا چہرہ چھپا لیا اور دیوار کی طرف رُخ کر کے کہا وہ مقررہ گھڑی گزر گئی اور تو نہیں آیا، اب میں تیرا چہرہ دیکھنا نہیں چاہتا۔ شاہ اسمٰعیل مایوس لوٹ آیا۔ اگرچہ سلطنت اس کی جم جما گئی لیکن ایک ہی سال بعد امیروں نے متفق ہو کر اس کی بہن پری جان خانم کو اس کے قتل پر مقرر کیا، اسے بھی اس کا پتہ چل گیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ کوئی تدبیر کرتا پری جان خانم نے اس کو بیہوش کر دیا اور دروازہ بند کر دیا۔

شیخ محمد شامی

نسلاً عرب ہیں اور شیعوں کے بڑے مجتہد شیخ زین الدین جبل عاملی کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ شیخ زین الدین کو خلیفہ روم نے بڑے حلیہ و تدبر سے مکہ معظمہ میں گرفتار کرا کے استنبول بلوایا اور قتل کرا دیا تھا۔

شیخ محمد منصب داروں میں شامل ہیں۔ بہادر اور شجیع آدمی ہیں، عربوں کی روایتی سخاوت بھی ان میں موجود ہے۔ نہایت متواضع اور با اخلاق بزرگ ہیں۔ عربی اور ادبی علوم میں ان کو ایسی مہارت حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کو ہو۔

شیخ حسن علی موصلی

یہ شاہ فتح اللہ کے شاگرد ہیں، لیکن نہایت مخلص سنّی۔ جس سال کابل فتح ہوا یہ صاحب شاہی ملازمت میں داخل ہوئے تھے۔ انھیں بڑے شاہزادہ کی تعلیم پر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ شاہزادہ کو فارسی کے رسالے اور علم حکمت کی کتابیں پڑھایا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ تک شیخ ابوالفضل نے بھی خفیہ طور پر ان سے ریاضی اور طبیعیات اور حکمت کے فنون کی تعلیم حاصل کی اور ان علوم کے نکات و رموز سیکھے۔ اس استادی کے حق کے باوجود وہ کبھی ان کی تعظیم نہیں کرتا تھا۔ خود تو اوپر بیٹھتا تھا اور استاد زمین پر۔ اس جیسے لوگوں کے طور طریق ان کو ایک آنکھ نہ بھاتے تھے چنانچہ وہ ایسے بیزار ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر گجرات چلے گئے۔ وہاں کچھ عرصہ تک مرزا نظام الدین احمد کی صحبت میں رہے۔ مرزا اور ان کے لڑکے محمد شریف نے عقلی علوم میں ان سے استفادہ کیا اور بڑی دسترس و کمال حاصل کر لیا۔

شاہ فتح اللہ کے انتقال پر ابوالفضل اور دوسرے مصاحبوں نے دربار میں شیخ حسن علی کے علم و فضل کا ذکر کر کے بادشاہ کو بخوبی سمجھا دیا کہ آج شاہ فتح اللہ کے جانشین صرف وہی ہیں۔ چنانچہ ان کے بلانے کے لیے شاہی فرمان جاری کیا گیا اور وہ حسب الطلب لاہور آئے۔ کورنش کے موقع پر نظام الدین احمد نے ان کو زبردستی سجدہ کرایا۔ اس بات کا انھیں سخت صدمہ ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے اور اپنی ماں سے ملنے کا بہانہ کر کے وطن جانے کی رخصت حاصل کر لی اور 998ھ/1589ء میں خان خاناں کے دور حکومت میں سہسنہ پہنچے اور خدا کے بھروسے پر اپنے ملک کی سمت چل پڑے جب ھرمز پہنچے تو وہاں سے اکبر کے درباریوں کو پیغام بھیجا۔

''الحمد للہ میں نے منافق دوستوں سے چھٹکارا پا لیا، انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جاؤں گا''۔

قاضی نوراللہ شوستری

شیعہ مذہب کے پیرو کار تھے اور نہایت منصف مزاج، عادل، نیک نفس، حیادار متقی تھے۔ شرفاء کی تمام خوبیاں ان میں موجود تھیں۔علم و فن، جدت طبع، تیزی فہم اور ذہانت و ذکاوت جیسی تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی بڑی اچھی اچھی تصانیف ہیں۔ شیخ فیضی کی مہمل بے نقط تفسیر پر انھوں نے ''سر نامہ'' لکھا جو حد تعریف سے ماورا ہے۔شعر گوئی کا طبعی ملکہ ہے، نہایت دلکش اشعار کہتے ہیں۔ شیخ ابوالفتح کے توسط سے بادشاہ کی بارگاہ میں رسائی ہوئی تھی۔

جس زمانہ میں شاہی لشکر لاہور پہنچا تھا تو شیخ معین قاضی لاہور حاضری کے لیے آئے۔ بڑھاپے کے ضعف اور کمزوری کے سبب دربار میں بیہوش ہوگئے۔ بادشاہ کو ان کے بڑھاپے پر بڑا ترس آیا اور فرمایا: ''شیخ اب کام کے قابل نہیں رہے اس لیے ان کی جگہ قاضی نوراللہ کو مقرر کردیا جائے''۔

انھوں نے لاہور کے شرپسند مفتیوں اور مکار محتسبوں کو جو معلم الملکوت شیطان کے بھی کان کاٹتے تھے، سیدھا کردیا اور رشوت کے دروازے بخوبی بند کر دیے اور ان پر کڑی نگرانی رکھی کہ اس سے بڑھ کر ان کا انتظام نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے:

توئی آن کس کہ نکردی ہمہ عمر قبول
در قضا ہیچ زکس جز کہ شہادت زگواہ

ایک مرتبہ شیخ فیضی کے مکان پر محفل جمی ہوئی تھی اور قاضی موصوف تفسیر نیشا پوری سامنے رکھے آیت کریمہ ''اذ یقول لصاحبہ لا تحزن ان اللہ معنا'' کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ اس آیت کریمہ کے متعلق سبھی نے اتفاق کیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی شان میں نازل ہوئی ہے، ''اگر یہاں صحبت لغوی مراد ہے تو یہ کوئی مدح کی بات نہیں اور اگر اصطلاحی ہے جیسا کہ اہل حدیث کا مسلک ہے تو ہم کو یہ تسلیم نہیں'' میں[86] نے کہا: ''اگر ایک بچے سے بھی جو عربی زبان جانتا ہو پوچھا جائے تو وہ یہی کہے گا یہ آیت مدح پر

صریحاً دلالت کرتی ہے، ذم کا کوئی پہلو نہیں۔ اسی طرح کوئی کافر، حبشی، یہودی اور ہندستانی جو عربی زبان جانتا ہو یہی کہے گا"۔

غرض قاضی سے اس موضوع پر بڑی گرما گرم بحث رہی اور شیخ فیضی نے اپنی عادت کے مطابق قاضی کا ساتھ دیا، حالانکہ وہ اپنے عقیدہ کے لحاظ سے دونوں جانب سے بے تعلق سا تھا۔ اتفاق کی بات کہ نیشاپوری کی تفسیر سے بھی میری[86] تائید ہوگئی بلکہ یہ اضافہ بھی تھا کہ "اگر اس وقت حضور اکرم داعی حق سے جا ملتے تو ان کے وصایا کے لیے صدیق اکبرؓ ہی نمائندہ ہوتے کوئی اور نہیں"۔

حاجی ابراہیم محدث

آگرہ میں زہد وتقویٰ کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ علوم دینی خاص طور پر درس حدیث ان کا مشغلہ تھا۔ شریعت کی پابندی پر سختی کی وجہ سے لوگ ان سے ملتے ہوئے جھجکتے تھے۔ کیونکہ وہ امر معروف اور نہی عن المنکر سے کبھی نہیں چوکتے تھے۔ جب حسب طلب عبادت خانہ شاہی میں آئے تو شاہی مراسم اور تکلفات کی پابندی نہیں کی اور بے خوف وعظ ونصیحت کرنے لگے۔ خواجہ عبد الصمد شیرازی جو قدیم آرائشی سامان کرایہ پر چلانے کی وجہ سے خواجہ عبد اللہ کے نام سے مشہور تھے اور نماز، روزہ اور عبادتوں میں بہت مشغول رہتے تھے، حاجی سے بڑی عقیدت رکھتے تھے وہ ان سے کہا کرتے تھے

"خواجہ جب تک دل میں خلفائے راشدین کی محبت نہ ہو یہ نماز اور روزہ کچھ فائدہ نہیں دیتا"۔

شیخ جلال واصل کالپی والے

یہ شیخ محمد غوث کے خلفاء میں سے ہیں۔ پہلے جو علوم حاصل کیے تھے بعد میں وہ سب بھلا بیٹھے۔ سماع وجد و حال ہی کا ذوق اور مشغلہ تھا، بادشاہ سلامت ان سے خاص تعلق رکھتے تھے۔

شیخ غوث کے خلفاء میں شیخ سلیم کے خلفاء کی نسبت تصنع اور بناوٹ بہت کم تھی۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے بڑے مخالف تھے، بعد میں چل کر تو وہی معاملہ پیش آیا کہ جب حضرت علیؓ کے سامنے آیت کریمہ۔ "**وقالت الیهود لیست النصاریٰ علیٰ شیء و قالت النصاریٰ لیست الیهود علیٰ شیء**". پڑھی گئی تو آپ نے فرمایا **صدقنا و الحمد لله** کہ اب ان دونوں کا کوئی نشان باقی نہیں رہا"۔

ملک محمود پیارو

عربی، علوم تفسیر، حدیث اور فارسی نظم و نثر کے اچھے عالم تھے۔ نہایت صالح مزاج اور ذوق وحال سے مناسبت رکھتے تھے۔ نسلاً وہ سلاطین گجرات کے خاندان سے ہیں۔ والد کا نام ملک پیارو تھا۔

ملک محمود نہایت فصیح زبان دانشور اور مدبر تھے۔ چنانچہ بادشاہی محفلوں میں اکبر کی میزبانی کا انھیں شرف حاصل تھا۔ اولیاء اللہ سے بڑا اعتقاد تھا اس لیے اکبر نے انھیں چند روز کے لیے حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کے روضہ مبارک کا متولی بنا دیا تھا۔

ملک محمود کو مخدوم جہانیاں بخاری کے جانشین مخدوم شاہ عالم بخاری سے ایسی عقیدت ہوگئی تھی کہ انھوں نے بادشاہ سے اس درگاہ کی مجاورت کی درخواست کی جو بڑے پس و پیش اور ردو بدل کے بعد قبول کرلی گئی اور وہ احمد آباد جاکر اس آستانہ کے مجاور بن بیٹھے۔

توکل و قناعت کا گوشہ اختیار کرلیا اور اسی مجاورت میں انتقال ہوا۔ میں[86] نے اجمیر اور فتح پور دونوں جگہوں پر ان سے ملاقات کی تھی۔ شعر سے بھی ان کو بڑا ذوق تھا۔ چنانچہ یہ مطلع انہی کا ہے:

دارم دلی گردان کہ من قبلہ نمامی خوانمش
روسوی ابر ویش کند ہر چندمی گردانمش

صدر جہاں پہانی

پہانی، قنوج کے ماتحت ایک گاؤں ہے۔ صدر جہاں سید اور خوش مزاج عالم ہیں ان کی

ساری عمر لشکر ہی میں گزری۔ علوم و کمالات شیخ عبد النبی سے حاصل کیے اور شیخ موصوف ہی کی سعی و کوشش سے اتنے سال تک ممالک محروسہ کے مفتی رہے۔

جب ہندستان کے ائمہ پر زوال آیا تو انھوں نے اپنی خدمات، زمانہ سازی اور دنیا داری کی بدولت بہت جلد اپنی عزت و احترام کو بحال کر لیا۔

جب وہ حکیم ہمام کے ساتھ حاکم توران کے پاس سفارت پر گیے، پھر وہاں سے واپس آئے تو ان کو صدارت کے عہدے پر مقرر کیا گیا۔ جن دنوں لاہور میں بچے کچھے علماء کو مکہ معظمہ بھجوا دینے کی افواہیں گرم تھیں اور ایک طویل فہرست مرتب کی گئی تھی، ایک دن صدر جہاں کہنے لگے: ''مجھے ڈر ہے کہ کہیں اس فہرست میں میرا بھی نام درج نہ کرا دیا گیا ہو'' میرزا نظام الدین احمد، جنھوں نے اس فہرست کو ترتیب دیا تھا کہا: ''تم کو بادشاہ کیوں بھیجنے لگے؟'' صدر جہاں نے کہا: ''آخر کیوں نہیں''۔ میرزا نے جواب دیا: ''تمہاری زبان سے کبھی کلمہ حق نکلا نہیں جو تیرے اخراج کا سبب بنتا''۔

طبیعت شاعرانہ ہے اور شعر و سخن سے بڑی اچھی مناسبت ہے، لیکن وہ شعر گوئی سے الگ ہی ہیں۔ یہ مطلع انہی کا ہے:

هر تار زلف یار خدایا بلا شود
وانگه بهر بلا دل ما مبتلا شود

جس طرح شعر گوئی سے توبہ کر لی ہے، توقع ہے بے مزہ بحثوں، ریا کاری، خود نمائی خود پسندی، بیہودہ گوئی اور جھوٹ بولنے سے بھی توبہ کی توفیق انھیں نصیب ہو جائے۔

شیخ یعقوب کشمیری

صرفی تخلص کرتے تھے۔ فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے شیخ حسین خوارزمی کے خلیفہ ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہو چکے ہیں۔ شیخ ابن حجر سے حدیث کا درس حاصل کیا تھا۔ درویشی کے لباس میں بڑے بڑے سفر کیے اور بڑی دنیا دیکھی اور عرب و عجم کے اکثر شیوخ کی صحبت سے استفادہ کیا اور ارشاد و ہدایت کی اجازت حاصل کی۔ ہندستان اور

کشمیر میں ان کے مرید بکثرت ہیں۔

شیخ یعقوب بڑی اچھی کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے اپنا خمسۂ پورا کر لیا ہے۔ متعدد رسالے فن معما پر لکھے ہیں۔ صوفیانہ رنگ میں رباعیات کہی ہیں اور ان کی شرح بھی لکھی ہے۔ انھیں صوفیاء کی حالت ذوق سے لگاؤ نہیں ہے لیکن اس سے قطع نظر وہ تمام عربی علوم، تفسیر، حدیث اور تصوف میں قابل اعتماد مستند عالم ہیں۔ کچھ ہی عرصہ قبل وہ تفسیر لکھ رہے تھے جو ان کے کمالات علم وفضل کا واضح ثبوت ہے۔

ہمایوں بادشاہ اور خود شہنشاہ کو ان سے بڑی عقیدت تھی۔ گفتگو اور مصاحبت کا اعزاز حاصل تھا، وہ بادشاہ کے منظور نظر اور بڑے مکرم ومحترم تھے۔ طبعاً نہایت فیاض اور صاحب ایثار تھے۔

ان کے مرتبہ کے لحاظ سے شعر گوئی مناسبت نہیں رکھتی تھی لیکن اس وادی میں بھی ان کا عمل دخل تھا۔ یہ چند شعر ان کے ہیں:

در ہر چہ بینم آن رخ نیکوست جلوہ گر　　　در صد ہزار آئینہ یکروست جلوہ گر
خلقی بہر طرف شدہ سرگشتہ بہر دوست　　　دین طرفہ ترکہ دوست بہر سوست جلوہ گر

خالت از مکر بران گوشۂ ابرو بنشست
ہر کجا گوشہ نشینی است در و مکری ھست

مشکن ای غم دل مارا او مبین کان دل کیست
دل ما ھست ولی بین کہ درو منزل کیست

گر بکویش گزری پائی زسر باید کرد
قصہ کوتہ زسر خویش گزر باید کرد

اسم شیدا پر یہ معما انہی کا ہے:

ماہ من از رخ نقاب انداختہ

دہ کہ عمداً روز راشب ساختہ

جس زمانہ میں لاہور سے اسے اپنے وطن جانے کی اجازت ملی تھی، انھوں نے راوی کے اس پار سے یہ خط میرے نام لکھا تھا:

''قادری! مخلصانہ دعا و نیاز

سفر کے وقت مشایعت سنت ہے۔آپ جیسے مخلص حقیقی سے یہ سنت محض مجبوریوں کی وجہ سے ہی ترک ہوئی ہوگی۔ امید ہے جناب فراموش نہیں کریں گے۔ اگر آپ کو مسودات کے لیے کشمیری کاغذ کی ضرورت ہو تو مطلع فرمایئے تاکہ میں کشمیر سے اپنی تفسیر کے مسودات بھیج دوں۔ اگر آپ کاغذ کو دھودیں تو اس کی تحریر اس طرح اڑ جاتی ہے کہ سیاہی کا کوئی نشان باقی نہیں رہتا، جیسا کہ آپ نے بھی تجربہ کیا ہوگا۔ والسلام''

جب وہ کشمیر گئے تو ایک اور رقعہ وہاں سے بھیجا جو بس آخری خط تھا۔ مولانا شیخ عبدالقادر کے نام

قطعہ

از دوانی بداؤنی بیشک درفنون فضیلت است فزون

پس دلیل زیادت معنیش کہ نبایش بصورت ست فزون

''آپ کے خطوط وصول ہوئے، کوتاہی لیاقت کی وجہ سے ان کے جواب سے قلم قاصر تھا، لیکن خلوص و بندگی کے جذبات بے اختیار زبان قلم پر آگئے۔ امید ہے کہ جس وقت آپ نواب فیاض کے خسخانہ میں دوپہر کے وقت کشمیر کی ہواؤں سے زیادہ سرد چٹائی پر بیٹھے برفاب کے گھونٹ مزے مزے سے لیتے ہوئے دلچسپ گفتگو میں مشغول ہوں گے، ہم اسیران غم محروموں کو بھی ضرور یاد کریں گے۔

ای بہ بزم وصل حاضر غائبان را دستگیر

زانکہ دست حاضران از غائبان کوتاہ نیست

شیخ محی الدین محمد آپکی خدمت میں نیاز مندی عرض کرتا ہے قبول فرمایئے۔ آپ نے ضرور سنا ہوگا کہ میران سید قطب الدین نے میرے نیاز نامہ کا جواب نہیں دینا چاہا اور غالباً آپ حق ہمسائگی کی وجہ سے اس بات کا یقین کر لیں گے لیکن حق بات کہیے کہ یہ حق اس حق پر ترجیح رکھتا ہے یانہیں؟

آپ جناب میران کے اظہار محبت و دوستی پر قطعاً بھروسانہ کریں کیونکہ وہ پائیدار نہیں ہے۔

''اظہار مضمر'' پر جدید آصف خانی طرز پر میں نے جو اشعار کہے تھے، ان کا مسودہ میرے پاس سے گم ہوگیا ہے۔ غالباً آپ نے اس مسودہ کی ایک نقل اتارلی تھی، براہ کرم اپنے نسخہ میں سے اس کی نقل بھیج دیجیے۔

جواب

''آپ کی تعریف کیا کروں، کیونکہ عبد القادر کے الفاظ کوزہ ہیں اور آپکی تعریف سمندر۔ آپکے لئے دعا کیا کروں:

بسوئی سدرہ زمن مرغ طاعتی نپرد
کہ نامۂ بزد از دعات در منقار

اپنے شوق و اشتیاق کا کیسے اظہار کروں:

یا ممن با یا دن یدہ طوقنی   من صحۃ الزمان قد عوقنی
الاقدر ان لکتب شوقی لکم   ما اشوقتی الیک ما اشوقنی

اس وقت سے جب سے کہ آپ اس طرف گئے ہیں نو روز سے پہلے اور اس کے چند دن بعد آپ کے دو خط پہنچے:

مردی در از نیکو در شہر خویش امروز
با خواستہ نشستہ از بخت خویش فیروز

جن میں سے ایک خط میں لکھا ہوا تھا:

(از دوانی بداؤنی بیشک)

اس کے جواب میں عرض ہے:

مثنوی

ای زبانت کلید نامۂ غیب　　دل پاکت نتیجۂ لاریب
داده اعجاز کلک تو بیرون　　گنجہائی نہان کن فیکون
گفتی از منطق گہر پرور　　کز دوانی بداوَنی خوشتر
گر دوانی دگر بداوَن بیند　　ہمہ از گنج فضل تو بیند
دلم آئینہ جمال تو شد　　مظہر فیض لا یزال تو شد
چہ عجب گرزروی حق بینی　　خویشتن را درد ھمی بینی

اگر خود نمائی کا تقاضا ہے تو بس اتنا ہی کافی ہے، ورنہ پھیکا پھیکا جواب لکھنے سے فائدہ! لیکن مخلصانہ خطوط کے لکھنے میں کوتاہی خواص کا طریقہ نہیں، اس لیے معذرت خواہی کے لیے لکھ رہا ہوں کہ اس رقعہ کو سابقہ جرموں کا کفارہ تصور فرمایئے اور وہ جو آپ نے ہوائی خسخانہ اور برفاب کے متعلق لکھا:

از عمر برف ست و آفتاب تموز

کافی دن ہوئے کہ میں اس ٹھنڈی آب و ہوا سے محروم ہی ہوگیا ہوں:

گرگ دھن آلودہ و یوسف ندریدہ

والا مضمون ہے۔

بادشاہ سلامت نے اجمیر کی تولیت کے سلسلے میں میرا نام لیا تھا لیکن ابھی تک اس کی منظوری نہیں ہوئی۔ میری انتہائی آرزو ہے کہ یہ معاملہ جلد طے پا جائے، تاکہ مجھے ملک کی آب و ہوا سے نجات ملے اور دل کو یقین کی ٹھنڈک نصیب ہو۔ اس دنیا کا خس خانہ تو بس برف کی طرح گھل جانے والا ہے:

ای عجب دلستان نگرفت ونشد جانستان ملول
زین ہوا ھائی عفن زین آب ھائی ناگوار

آپ بھی اس معاملہ میں ممکنہ سعی فرمایئے۔ انشاء اللہ اجمیر جانے کے بعد اجمیر اور کشمیر کو ہم قافیہ سمجھتے ہوئے ''جھالرہ'' کا پانی پیوں گا جس طرح آپ وہاں ''برفتن'' کا پانی نوش جان فرماتے ہیں۔

یہ رمضان کا مہینہ 1003ھ/1594ء ہے۔ بندہ زادہ بداؤں چلا گیا ہے اور دعا میں مشغول ہے''۔

یہ غزل بھی شیخ یعقوب کشمیری کی ہے جو انھوں نے کسی سفر میں لکھ کر میرے پاس بھیجی تھی۔

دردی کین نامہ میکردم رقم	کان یجری الدمع لزوجا بدم
ہر رقم کز خامہ ام ظاہر شدی	کار یمحوا معنی ذرک الرقم
محو حرف اشتیاق از لوح دل	لیس فی وسعیٰ وقد جف القلم
در بلائی ھجر حکمت ھا بود	لیتنی کوشفت عن تلک الحکم
صرفی از دریای اشکم نہ محیط	لیس الامثل اشف من دیم

مختصر یہ کہ شیخ یعقوب کشمیری کی تعریف و توصیف میری عاجز زبان سے ادا نہیں ہو سکتی۔ ان کے اوصاف و کمالات کی نشانیاں ان کے حالات سے بخوبی نمایاں ہیں۔

شیخ نے 12 ذی قعدہ 1003 ھ/1594ء کو انتقال کیا۔ ان کی تاریخ وفات ''شیخ ام بود'' کہی گئی ہے:

سلام علی الدنیا و طیب نعیمها	کان لم یکن یعقوب فیها بجالس
درین خرابہ فجورہ بسوئی گنج مراد	کہ جای محنت و رنج ست این خراب آباد

مولانا میرزا سمرقندی

مولانا انسانی شکل میں فرشتہ تھے۔ حرمین شریفین کی زیارت کر آئے تھے۔ بیرم خان خانان کے عہد میں آگرہ میں مقیم تھے۔ ایک ایک مخلوق ان سے فیضیاب ہوئی تھی۔ منطق میں ''شرح شمسیہ'' امیر سید محمد کی تصنیف ہے۔ جن کے والد امیر سید علی ہمدانی تھے۔ یہ وہی

بزرگ ہیں جن کی کوششوں سے کشمیر میں اسلام کی اشاعت ہوئی تھی۔ میں[86] نے ''شرح شمسیہ'' کا کچھ حصہ اور پوری کی پوری ''مختصرات'' مولانا میرزا کے پاس پڑھی تھی۔ حضور اکرمؐ کی یہ مستند حدیث۔ **"قال النبی ﷺ من تری غیرہ ثم قتلہ ومہ ھدر"**۔ ان کی زبان سے سنی اور اس کی روایت کی اجازت حاصل کی جو 6 واسطوں سے حضور اکرمؐ تک پہنچی ہے اور اس حدیث کی سند کا قصہ ''نجات الرشید'' میں تفصیل سے درج ہے۔ مولانا خان زمان کی بغاوت کے زمانہ میں آگرہ سے دہلی آگئے تھے۔ اس کے بعد ان کا کچھ پتہ نہیں چلا کہ کہاں گئے۔

قاضی ابو المعالی

عزیز بخاری کے داماد، شاگرد اور خلیفہ ہیں۔ عزیز بخاری کو فقہ پر ایسا عبور تھا کہ اگر تمام حنفی فقہ کی کتابیں دنیا سے اٹھالی جائیں تو وہ ازسر نو ان سب کو لکھوا دیتے۔

انھوں نے عبد اللہ خان بادشاہ توران کو فن منطق اور علم جدل کو ملیامیٹ کرنے پر آمادہ کیا، ماوراء النہر سے ملا عصام الدین اسفرائینی اور اس کے خبیث طالب علم ان کی ہی وجہ سے شہر بدر کئے گئے تھے۔ اس ہنگامہ کا سبب یہ ہوا کہ جب یہ علم بخارااور سمرقند میں پھیلا تو خبیث اور شریر لونڈے جہاں بھی کسی سلیم الطبع صالح آدمی کو دیکھتے، کہنے لگتے ''یہ گدھا ہے'' کیونکہ ''لاحیوان'' اس سے منسوب ہے۔ چونکہ ''انتفائی عام''مستلزم انتفائی خاص ہے۔ اس لیے انسانیت کا سلب ہونا لازم آتا ہے۔ اس قسم کے منطقی مغالطے جب بکثرت پھیل گئے تو قاضی نے عبد اللہ خاں کو اس کے سد باب پر آمادہ کیا اور اس گروہ کو نکال باہر کرا دیا اور منطق و فلسفہ کی تعلیم پر پابندی عائد کردی۔

ایک روایت یہ بھی نکالی کہ اگر اس کاغذ سے جس پر منطق لکھی ہوئی ہو، استنجا کیا جائے تو کوئی حرج نہیں۔ قاضی ہمیشہ ہر نماز کے بعد حلقہ میں ذکر کیا کرتے اورمرید بناتے تھے 969ھ/1561ء میں آگرہ میں آئے۔ میں[86] نے ''شرح وقایہ'' سے پہلے کے چند سبق ان سے پڑھے۔ بلاشبہ وہ اس فن میں بحر بے پایاں تھے۔

مولانا میر کلاں

ملا خواجہ کے پوتے ہیں۔ خراسان کے بڑے مشائخین میں سے تھے۔ ظاہری اور باطنی کمالات سے آراستہ، نہایت تبحر دانشور اور عالم تھے، خاص طور سے علم حدیث میں تو اپنے زمانہ میں یکتا تھے۔ حدیث کی اجازت انھوں نے سید میرک شاہ سے لی تھی اور مولانا زین الدین محمود کمان گر بہرائی کے منظور نظر تھے اور نیکی ان کی سرشت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے محفوظ رکھا تھا۔ ہمیشہ دینی تعلیم و تدریس میں مصروف رہتے تھے اور ہمیشہ سر جھکائے مراقبہ میں بیٹھے رہتے تھے۔

عقیدت و مریدی کا تعلق شیخ جلال ہروی سے تھا جو سربرآوردہ مشائخین اور مشاہیر میں سے ہیں۔ مولانا میر کلاں بلاشبہ فرشتہ خصلت انسان تھے۔ ان کی شخصیت اسمائے حسنیٰ کی مظہر تھی۔ 80 سال کی عمر پائی۔ ان کی والدہ سیدہ تھیں اور زندہ تھیں۔ اس اندیشہ سے کہ کہیں انکی بیوی ان کی والدہ کی نافرمان نہ نکلے۔ انھوں نے شادی ہی نہیں کی اور والدہ کی زندگی ہی میں انتقال فرما گئے۔ جس وقت مولانا کا انتقال ہوا ان کی والدہ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف تھیں جب انھیں ایسے عزیز و سعادت مند بیٹے کی وفات کی اطلاع دی گئی اور لوگ ان سے تجہیز و تکفین کی اجازت مانگنے لگے تو اس نیک بی بی نے "انا للہ و انا الیہ راجعون" پڑھا، اجازت دی اور پھر تلاوت میں مشغول ہو گئیں اور اس سیدہ نے کسی طرح کی بے قراری اور صدمے کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا میر کلاں کی وفات 981ھ/1573 میں آگرہ میں ہوئی اور آگرہ ہی میں دفن کیے گیے۔ ان کے ایک سال بعد ہی ان کی والدہ کا بھی انتقال ہو گیا۔

میں[86] ان بزرگ سے ملنے کی سعادت حاصل کر چکا ہوں، لیکن ان سے کوئی استفادہ نہیں کر سکا۔

مولانا سعید ترکستانی

اپنے زمانہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ ملا احمد جنید سے انھوں نے پڑھا ہے۔ ملا محمد سرخ

سے بھی کچھ استفادہ کیا اور کچھ عرصہ تک ملا عصام الدین ابراہیم کے بھی شاگرد رہے۔

ہندستان آنے کے بعد اکبر سے ملاقات ہوئی تو اکبر کو ان کی مصاحبت نہایت پسند آئی۔ ان پر درویشی اور انکساری کا بڑا غلبہ تھا لیکن وہ نہایت خوش مزاج اور ذھین تھے۔ چنانچہ عہد حاضر میں ان جیسے فہم اور علمیت والا عالم شاید ہی پیدا ہوا ہو۔گفتگو اور بیان نہایت فصیح اور دلکش ہوتا تھا۔ شاگردوں پر نہایت مہربان رہتے تھے۔

ہندستان سے کابل لوٹ کر گئے اور 970 ھ/ 1562 ء میں وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔

حافظ کومکی

حافظ تاشقندی کے نام سے مشہور ہیں۔ نہایت متبحر عالم تھے، خاص طور سے عربی میں بڑا کمال حاصل تھا۔ مولانا عصام الدین کے شاگرد ہیں۔ تمام علوم بخوبی جانتے تھے اور لوگوں کو اپنے علم سے فائدہ بھی بہت پہنچایا۔ ماوراء النہر میں تمام علماء ان کو اپنا بڑا مانتے تھے۔ بظاہر وہ فوجی وضع قطع میں رہتے تھے، ہمیشہ ترکوں کی طرح ترکش کمر سے باندھے ہوئے سوار رہا کرتے تھے۔ 977ھ/1569ء میں ہندستان تشریف لائے۔ اکبر سے ملاقات کی اور بھاری انعامات سے سرفراز کیے گئے۔ پھر براہ گجرات حرمین شریفین کے لیے روانہ ہوگئے۔ وہاں سے روم گئے اور شاہ روم سے ملاقات کی۔ ہندستان سے 10 گنا زیادہ وہاں ان کی تعظیم وتکریم کی گئی یہاں تک کہ وزارت کی پیش کش کی گئی لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا اور ماوراء النہر لوٹ آئے اور وہیں انتقال فرمایا۔ میں[86] ان سے اور مولانا سعید ترکستانی سے نہیں مل سکا۔

قاضی نظام بدخشی

قاضی خاں لقب تھا، بدخشاں کے رہنے والے ہیں ان کا مقام اس پہاڑ سے قریب تھا جس میں لعل کی کان ہے۔ نصابی علوم میں مولانا عصام الدین ابراہیم کے شاگرد ہیں۔ ملا سعید سے بھی استفادہ کیا تھا۔ تصوف سے بڑی وابستگی تھی۔ چنانچہ علم تصوف پر بھی پورا عبور

حاصل تھا۔ طریقت میں شیخ حسین خوارزمی کے مرید تھے۔ خدا والوں کی صحبت کے طفیل دنیاوی اعزاز بھی حاصل ہوا۔ چنانچہ وہ بدخشاں میں امرائے شاہی میں داخل تھے۔ ہندستان آئے تو اکبر بادشاہ نے اندازہ سے بڑھ کر پذیرائی کی۔ پہلے تو قاضی خاں کا پھر غازی خاں کا خطاب ملا۔

قاضی نظام نہایت فصیح زبان اور خوش بیان عالم تھے۔ معتبر تصانیف کے مصنف ہیں۔ ایک رسالہ کلام و بیان، ایمان تحقیق و تصدیق کے موضوعات پر لکھا۔ شرح عقائد پر حاشیہ لکھا ہے۔ تصوف میں بھی بہت سے رسالے تصنیف کئے ہیں۔ اودھ میں بعمر 70 سال 992ھ/1584ء میں انتقال فرمایا۔ فتح پور میں پہلا وہ شخص جس نے فتح پور میں بادشاہ کے سامنے سجدہ کرنے کی رسم ایجاد کی وہ قاضی نظام بدخشی تھے۔ ملا عالم کابلی بڑی حسرت سے کہا کرتے تھے افسوس اس کی ابتداء واختراع میرے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

مولانا الہداد لنگر خانی

لنگر خان لاہور کا ایک محلّہ ہے۔ مولانا اکثر علوم متداولہ میں ماہر اور متبحر عالم ہیں۔ شریعت کے بڑے پابند، نہایت متقی اور پرہیز کار بزرگ ہیں۔ اب بھی درس و تدریس میں مشغول رہتے ہیں۔ بے مروت دنیاداروں کے گھر کبھی نہیں جاتے۔ بادشاہوں اور امیروں سے کبھی کچھ طلب نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سرکاری مدد معاش بھی قبول نہیں کی۔ اب ان کی عمر 80 سال ہے۔

مولانا محمد مفتی

لاہور کے معتبر اساتذہ میں سے ہیں۔ بڑے صاحب کمال عالم ہیں، مفتی کے عہدہ پر فائز ہیں۔ صحیح بخاری اور مشکوٰۃ کا جب بھی ختم ہوتا ہے تو وہ ایک بڑی محفل منعقد کرتے ہیں جس میں بغرا[87] اور حلوؤں سے ضیافت کی جاتی ہے۔

ان کا گھر علماء وفضلاء کا مرکز ہے۔ اس زمانہ میں ان کی عمر 90 سال کی ہوچکی ہے

اور نہایت کمزور وضعیف ہوگئے ہیں اس لیے درس دینا چھوڑ دیا ہے۔ چار پانچ لڑکے ہیں جو سب کے سب علم وکمال میں اپنے باپ کا نمونہ اور جانشین ہیں۔

میر فتح اللہ شیرازی

شیراز کے سیدزادے اور اپنے زمانہ کے بے مثل عالم تھے، مدتوں فارس کے حکام و اکابر کے مشیر و راہنمار ہے۔ تمام علوم عقلی جیسے حکمت، ہیئت، ہندسہ، نجوم و رمل، حساب، طلسمات و جرثقیل وغیرہ کے عالم د ماہر تھے۔ اس فن میں ایسی مہارت و دسترس تھی کہ اگر بادشاہ تیار ہو جاتا تو وہ رصد گاہ تیار کر دیتے۔ علوم عقلی کی طرح عربی علوم، حدیث، تفسیر اور کلام میں بھی بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان کی بڑی اچھی تصانیف ہیں۔ لیکن بلحاظ علم و تصنیف وہ میرزا جان شیرازی کی برابری نہیں کر سکے جو ماوراء النہر کے یگانہء روزگار عالم گزرے ہیں۔

میر فتح اللہ مجلسوں میں نہایت با اخلاق، منکسرالمزاج اور نیک نفس تھے۔ لیکن خدا کی پناہ جس وقت وہ پڑھانے بیٹھتے تو اپنے شاگردوں کو گالیوں اور فحش الفاظ سے نوازتے رہتے۔ اسی وجہ سے ان کے درس میں زیادہ لوگ نہیں جاتے تھے اور کوئی اچھا شاگرد ان کے حلقہ سے نہیں نکلا۔

چند سال وہ دکن میں رہے۔ وہاں کے حاکم عادل خاں کو میر سے بڑی عقیدت تھی۔ جب اکبر کی خدمت میں آئے تو عضد الملک کا خطاب پایا۔ کشمیر میں 997ھ/1588ء میں ان کا انتقال ہوا۔ اس مقام پر جو تخت سلیمان کے نام سے مشہور ہے، مدفون ہیں۔

ان کی تاریخ وفات ''فرشتہ بود'' سے نکلتی ہے۔

شیخ منصور لاہوری

شیخ اسحاق کاکوی کے شاگردوں میں سے ہیں لیکن زیادہ تر علم انھوں نے مولانا سعد اللہ سے حاصل کیا ہے اور وہ ان کے داماد بھی تھے۔ ہندستان میں جتنے عقلی علوم رائج ہیں ان سب میں وہ پوری مہارت رکھتے ہیں۔ نہایت خوش طبع، سمجھدار اور چھا جانے والے آدمی

ہیں۔امراء وسلاطین سے تعلقات رکھنے کا خوب ملکہ آتا ہے۔

کچھ عرصہ تک تو مالوہ کے قاضی القضاۃ رہے۔جس زمانہ میں لاہور میں اکبر کا قیام تھا مالودہ سے اکثر حاضر ہوئے اور اسی تاریخ سے پرگنہ بجوارہ اور پہاڑی سرحدوں کے نظم و نسق پر مامور ہیں۔ ان کے لڑکے ملا علاء الدین مشہور دانشمند اور مدرس ہیں۔ عرصہ تک خان خانان کی صحبت میں عزت واکرام سے رہے۔ جب بادشاہ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو وہاں بھی بڑی عزت پائی۔ بادشاہ نے فوجی ملازمت کی پیش کش کی لیکن انھوں نے قبول نہ کیا اور درس و تدریس میں مصروف رہے۔ جو کچھ انھیں جاگیر سے ملا کرتا تھا وہ طلباء پر صرف کر دیتے تھے۔ ہندستان کے عالموں میں پیر محمد خان کے بعد ان جیسا اور ملا نور محمد خان جیسا کوئی اور شخص سخی، فیاض اور ایثار پیشہ نہیں گزرا۔

انھوں نے شرح عقائد پر جو حاشیہ لکھا ہے وہ بہت مشہور ہے۔ حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہیں رحلت فرمائی۔ میں ان سے ملاقات نہیں کر سکا۔

ملا پیر محمد شیروانی

نہایت عقل مند، خوش اخلاق اور میٹھی باتیں کرنے والے عالم تھے، لیکن طبیعت میں سنگ دلی اور بے رحمی بہت تھی۔ شریعت کی پابندی بھی نہیں کیا کرتے۔ شیروانی جب قندھار پہنچا اور بیرم خان خاں خاناں کے یہاں ملازمت کرلی اور بہت جلد ترقی کے مدارج طے کئے۔ ہندوستان فتح ہوگیا تو اسے خان کا خطاب دیا گیا۔ اس کے بعد ناصر الملک کا خطاب ملا اور تین چار سال اس نے نہایت شان وشوکت سے بسر کیے۔لیکن ظالم کو کبھی فروغ نہیں ہوتا چنانچہ وہ بھی کچھ ہی عرصہ بعد مالوہ ندی میں ڈوب کر مر گیااور فرعون اورنیل ندی کی یاد تازہ کردی۔

میں نے بس اسے دور ہی سے دیکھا تھا، خدا کا شکر ہے کہ اس کی مجلس میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا۔

میرزا مفلس اوزبک

ملا احمد جند کے شاگرد ہیں۔ مناظرہ ومجادلہ کے فن میں نہایت تیز تھے۔ لیکن ان کی تقریر فصیح نہیں ہوتی تھی۔ درس دیتے ہوئے بڑی مضحکہ خیز حرکتیں کرتے تھے۔ شکل وصورت بھی اچھی نہ تھی، لیکن نہایت نیک اور متقی آدمی تھے۔

ماوراء النہر سے ہندستان آئے تو 4 سال تک آگرہ میں جامعہ خواجہ معین الدین فرنخودی میں سبق دیتے رہے۔ پھر حرمین شریفین کی زیارت کی اور مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا اس وقت ان کی عمر 70 سال تھی۔

مولانا نور الدین محمد ترخان

تمام علوم، حکمت وکلام پر مستند عالم تھے۔ علوم عالیہ کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی لگاؤ تھا، چنانچہ نہایت خوش طبع شاعر سمجھے جاتے تھے۔ آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کرلی تھی اور حضرت غفران پناہ ہمایوں بادشاہ کے روضہ کے متولی بنا دیئے گئے تھے۔ دہلی میں ان کا انتقال ہوا۔

مولانا الہداد امروہہ

نہایت خوش طبع، آزاد مزاج، محنتی عالم، شیریں کلام، خوش باش اور ندیم پیشہ شخص تھے۔ مزاح وظرافت کا بڑا اچھا ملکہ تھا۔ غرض اہل مجلس کے لیے ''مایۂ حضور اور مایۂ سرور'' سمجھے جاتے تھے۔

شاہی فوجی ملازمت میں انھوں نے کچھ روپیہ بچا رکھا تھا اور اسی پر ان کی گزر بسر کا دارو مدار تھا۔ ساری عمر میرے ساتھ بڑی محبت اور خلوص سے پیش آتے رہے۔

990ھ/1582 میں جب کہ لشکر سیالکوٹ کے علاقے میں اٹک گنگ کی طرف جا رہا تھا، ان کا انتقال ہوگیا۔ لاش امروہہ میں ایک مقام پر جہاں انھوں نے آخری ٹھکانے کی پہلے سے تیاری کر رکھی تھی لے جا کر دفن کی گئی۔ اس عہد کے جو مشائخ اور علماء تھے ان کا

ذکر ہم نے کر دیا ہے۔ میں نے ان میں سے اکثر کی صحبت پائی ہے اور ان کے دیدار سے فیضیاب ہوا ہوں!

ان تمام بزرگوں میں سے جن کا ذکر کیا گیا اس قحط الرجال کے دور میں بس چند رہ گئے ہیں۔ بعض لوگوں کی نظروں سے اوجھل گوشہ نشین ہو گئے، ذہنوں سے ان کی یاد بھی جاتی رہی ہے۔ باقی بچے کھچے لوگ اپنی آخری سانس گنتے ہوئے بے چینی سے اس کوچ کا انتظار کر رہے ہیں جس کے بعد لوٹنا نہیں ہوتا۔ ان کے کانوں میں برابر الرحیل الرحیل کی صدا گونج رہی ہے۔ جانے کب اس آواز پر اٹھ کر چلے جائیں.

تاریخ جہان کہ قصۂ خرد و کلان درج ست درو چہ شیر مردان یلان

درہر ورقش بخوان کہ فی عام کذا قد مات فلان ابن فلان ابن فلان

تمام ممالک محروسہ ہندستان کے طول و عرض میں علماء و مشائخ اتنے ہیں کہ ان کا شمار خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی جو شرارت، باطنی خباثت، دین فروشی، کنجوشی اور رذالت، بے راہ روی اور بے اعتدالی میں مشہور و معروف ہیں کچھ کم نہیں۔ ہم نے ایسے پس ہمت لوگوں کے تذکرے میں اپنے قلم کو الجھانا مناسب نہیں جانا، کیوں کہ ایک بڑا کام پیش نظر ہے اور زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔

میرا اپنا حال اس نیشاپور کے برف فروش سے کچھ مختلف نہیں جو گرم ہوا میں برف بیچ رہا تھا۔ جب سورج نکلا تو کہنے لگا اے مسلمانوں خدا را! رحم کی نگاہ سے مجھ نقصان کے مارے کو دیکھو کہ اس کی پونجی پگھل پگھل کر اس کے ہاتھوں سے بہتی جا رہی ہے.

عمر برف است و آفتاب تموز

اند کی ماندو خواجہ غرہ ہنوز

اور میں یہ جو مرنے والوں کی تاریخ وفات لکھتا رہتا ہوں، اس کی مثال اس درزی کی ہے جو قبرستان کے دروازے پر اپنی دکان لگائے ہوئے تھا اور ایک کوزے کو کھونٹی پر لٹکا رکھا تھا۔ جب بھی کوئی جنازہ شہر سے نکلتا وہ اس کوزہ میں ایک کنکر ڈال دیتا اور ہر مہینہ ان کنکریوں کو گن کر حساب لگا لیتا کہ کتنے جنازے اٹھائے گئے۔ پھر وہ کوزہ خالی کر

کے دوبارہ اسے ٹانگ دیتا اور اسی طرح کنکریاں ڈالتا رہتا۔ یہاں تک کہ دوسرا مہینہ آجاتا۔ کافی عرصہ تک وہ اسی طرح کرتا رہا۔ اتفاق سے ایک درزی مرگیا۔ ایک شخص جسے اس کی وفات کی خبر نہ تھی اس سے ملنے آیا۔ دکان بند پاکر اس نے ہمسایہ سے دریافت کیا کہ ''درزی کہاں ہے؟''

ہمسایہ نے کہا'' وہ اسی کوزہ میں گر پڑا ہے'':

بنگر کہ بدیگری کشاید
کز وی چو گزشت بر تو آید

سبحان اللہ ہماری زندگی بھی کیا زندگی؟ بس ایک عذاب ہے حلق میں جاکر پھنس گئے ہیں کہ ہلنے اور تڑپنے کی بھی مجال نہیں چھٹکارنے کی امید کہاں؟

قطعہ

چو غنچہ خون خوردودل تنگ باش و لب بکشا — کہ نیست غنچہ ٔ این باغ را امید کشاد
نشان ز سرو قدی می دہد کہ خاک شدہ است — بہر زمین کہ فتادہ است سایۂ شمشاد
چو ہر نفس ز چمن میرود بیاد گلی — مدام جامہ کبوداست سوسن آزاد

غرض میں نے ان 2 محترم گروہوں یعنی صوفیاؑ علماء کا تذکرہ تقدیم و تاخیر کا لحاظ کیے بغیر درج کردیا ہے۔ سخن شناس قارئین اعتراض نہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ انتخاب نہایت پریشان حالی میں بڑی عجلت میں لکھا گیا ہے۔ نیز میرے پاس یادداشت بھی نہیں تھی کیونکہ بیاض رکھنے کی کبھی فرصت ہی نہیں ملی۔

میں تو وہ بخیہ گر ہوں جس کی سوئی ہر وقت کھو جاتی تھی اور وہ کہا کرتا تھا: ''مجھے کیا سمجھتے ہو، اگر میرا وقت سوئی کے ڈھونڈنے میں ضائع نہ ہوتا تو ہر روز میں ڈھیروں کام کرکے رکھ دیتا''۔ میں نے جن لوگوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں سے بعض تو اس قبیل کے ہیں کہ میری خواہش کے مطابق تو ان کا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا، کیونکہ بہت سے ایسے صدیق ہیں جو بعد میں زندیق ہی ثابت ہوتے ہیں۔ اگر ان تمام میں سے کوئی ایک شخصیت بھی

ایسی ہو جو اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہو تو بس میری نجات اور شفاعت کے لیے وہی ایک شخص کافی ہوگا۔ ویسے یہ سارا گروہ ولایت کے اعزاز سے موصوف ہے اور ان میں سے اکثر میں ولایت خاصہ جلوہ گر رہی ہے۔

میں نے بے دینوں اور دنیاداروں کا ذکر ان کے ساتھ شامل نہیں کیا ہے۔ اس معاملہ میں میں نے عارف بسطامیؒ کے قول پر عمل کیا ہے۔ وہ اپنے ایک معتقد کو نصیحت کر رہے تھے کہ اگر تم اس زمانہ میں کسی ایسے شخص کو دیکھو جو مشائخین کی باتوں پر ایمان رکھتا ہو تو میرے لیے اور خود کے لیے اس سے دعا کرانا، کیونکہ وہ شخص یقیناً خدا کے نزدیک مقبول ہے:

الٰہی نمی برم و چارہ نمی دانم
بجز محبت مردان مستقیم الاحوال

یہ بھی ایک حسن اتفاق ہے کہ ان صاحب دل اہل اللہ حضرات کی تعداد ۱۱۱ ہے۔ اسی لفظ سے ''قطب'' کے بھی اعداد نکلتے ہیں اور لفظ ''الف'' کے بھی کہ اس مسودہ کو لکھتے وقت ہزارواں ہی سن چل رہا ہے۔

ان بدبختوں کی طرف سے جنھوں نے دین اسلام پر صریحا طعنہ زنی کی ہے جو نہایت بے حیا اور بے دین ہیں، جن کی وجہ سے ملک وملت میں فتنہ وفساد برپا ہوگیا ہے اور ان کو بجا طور پر ''فتنۂ آخر زمان'' کہا جاتا ہے، میرا دل سخت نالاں ہے، پھر بھی حکماء کا ذکر کرتے ہوئے ان میں سے چند کا ذکر کردیا جاتا ہے۔

عہد اکبری کے حکماء

ان حکیموں میں سے بعض حکمت علمی و عملی میں ایسے طاق تھے جیسے ان کے ہاتھوں میں ید بیضائے موسوی آ گیا ہو۔ اپنی مہارت فنی کے لحاظ سے اعجاز مسیحی کی یاد دلاتے تھے۔ بعض کی اہمیت بس اس حد تک ہے کہ انھوں نے طب کو ایک شریف فن سمجھ کر حاصل کر لیا اور اپنی مشق سے اس کو پیشہ بنا لیا ہے۔ یہ ہوں یا وہ ہوں ایک بات سب میں مشترک ہے اور وہ ہے ''دنیا پرستی اور اقتدار پرستی''۔

حکیم الملک گیلانی

اس کا اصل نام شمس الدین ہے۔ حکمت و طب میں جالینوس زماں اور مسیح دوراں تھا۔ طب کے علاوہ دوسرے مروجہ نقلی علوم میں بھی سب سے نمایاں و ممتاز تھا۔ مجھے اس سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ جب میں نیا نیا شاہی ملازمت میں داخل ہوا تھا تو ''نامہ خرد افزا'' کو پیش کرتے وقت اس نے بلا کسی سبب کے میرے ساتھ کچھ اچھا رویہ نہیں رکھا۔ جب بادشاہ نے مذکورہ کتاب کے متعلق اس سے پوچھا کہ فلاں کی تحریر و انشا کیسی ہے؟ تو اس نے کہا اس کی عبارت فصیح تو ہے لیکن پڑھنے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتی۔

میرے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ خدا کے بندے کا نہایت خیرخواہ اور لوگوں کے کام بنانے والا بامروت اور آشنا پرور شخص تھا۔ دین وعقیدہ

میں بھی نہایت ثابت قدم اور راسخ العقیدہ رہا۔ ہمیشہ طالب علموں کو سبق پڑھانے میں مصروف رہتا۔ ان طالب علموں کے اخراجات کی کفالت اور ان کی سر پرستی بھی وہی کرتا تھا۔ کسی وقت بھی ان کو لیے بغیر دسترخوان پر نہیں بیٹھتا تھا اور محض انہی شاگردوں کے خیال سے لوگوں کے گھروں پر دعوتوں میں بہت کم شرکت کرتا تھا۔

ایک دن شیخ سلیم چشتی کی محفل میں بیٹھے ہوئے فقہ، نصاب اور فقیہوں کا حال اور حکماء کے طریقہ کی تعریف و توصیف اور شیخ بوعلی سینا کی خوبیاں گنا رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ علماء اور حکماء ایک دوسرے سے الجھ کر اپنے اپنے مسلک کی بڑائی جتانے کے لیے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ میں نیا نیا گیا تھا کسی کو پہچانتا نہ تھا، اصل بحث کیا تھی، اس کا بھی علم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اس وقت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کے یہ شعر پڑھ دیے:

وکم قلت للقوم انتم علیٰ   شفا حضرة من کتاب الشفاء

فلما استھا نو بتو بیخنا   فرغنا الی اللہ حسبی کفا

فما تو علی دین اسطاطلیس   وغشنا علی ملة المصطفا

مزید تائید کے لیے میں نے مولانا جامی کا یہ شعر ''تحفۃ الاحرار'' سے سنایا:

نور دل از سینہ سینا مجوی
روشنی از چشم نابینا مجوی

میرے شعر سنانے پر حکیم بری طرح بگڑ گیا۔ شیخ سلیم نے کہا: ''ان لوگوں میں پہلے ہی سے آگ لگی ہوئی تھی، تو نے آکر اسے اور بھی بھڑکا دیا''۔

مشائخین اور علماء کا جب تختہ الٹ گیا تو حکیم دین کے مخالفوں اور مرتدوں کی بہ حد امکان خوب خبر لیتا رہتا تھا۔ آخر جب حالات بہت بگڑ گئے تو اس نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت طلب کی اور 988 یا 989ھ/1585ء میں حج پر چلا گیا، اور وہیں وفات پائی۔

حکیم سیف الملوک دماوندی

ایک طرف تو بڑا عالم و حکیم تھا، دوسری طرف شعر گوئی اور ہجو نویسی بھی کرتا رہتا تھا۔ اپنا

تخلص شجاعی رکھے ہوئے تھا۔ اتفاق کے بھی عجیب کرشمے ہوتے ہیں، چنانچہ اکثر ایسا ہوا کہ حکیم جیسے ہی کسی بیمار کے سرہانے پہنچا، بیمار ملک الموت کا ہاتھ تھام کر رخصت ہو گیا۔ مسخروں نے اس کا نام ہی ''سیف الحکماء'' مشہور کر دیا تھا۔

حضرت شیخ جامی محمد خبوشانی کے ایک پوتے تھے جو مخدوم زادے کے لقب سے مشہور تھے۔ حکیم نے ان کا علاج کیا اور بیچارے کا بیڑہ اس پار پہنچا دیا۔ لوگوں نے ان کی وفات کی تاریخ کے لیے دلچسپ فقرہ تراش لیا۔ ''سیف الحکماء کشت'' (سیف الحکماء نے مار ڈالا) ایک جلال طبیب تھے۔ ان کے بارے میں کسی نے یہ قطعہ کہا تھا جو حکیم سیف الملوک پر پوری طرح ٹھیک بیٹھتا ہے:

ملک الموت از جلال طبیب — شکوہ برد دوش پیش خدا
بندۂ عاجز شدم زدست طبیب — میکشم من یکی و او صدہا
یاورا عزل کن ازین منصب — یا مرا خدمت دگر فرما

ہندستان میں چند سال تک وہ بیرم خاں کی سرکار میں نہایت معزز و مکرم رہا، لیکن جیسی خواہش تھی ایسی ترقی نہ ملی تو ناراض ہو کر ایران چلا گیا اور وہاں سے ایک ہجو لکھ کر بھیج دی کہ اس عہد میں شیرینی اور مزاح کے ساتھ شاید ہی کسی نے ایسی عمدہ واقعہ نگاری کی ہوگی۔ اس ہجو کے چند شعر جو مجھے یاد رہ گئے ہیں، تفریح طبع کے لیے درج کیے جاتے ہیں:

صالح بز غالۂ بی وقت برای بربری — گاھی اورا گربہ گاھی موش پیران گفتہ ام
ہمنی بی قشقہ و زنار یعنی شیخ ہند — تا مسلما نم اگر او رامسلمان گفتہ ام
ای شفیع الدین محمد بسکہ می جاوی سخن — آن سخن جاویت رانشخو ارانسان گفتہ ام
ای فریدون در تعرض روی بی شرم ترا — نی بہواری کہ در سختی چو سندان گفتہ ام

میر فریدون نے اس کے جواب میں کہا:

اشک حکمت باف لاف ای شک آقائی اجل
آنکہ او را در مصیبت خانہ دربان گفتہ ام

جس زمانہ میں میر مغز الملک سپاہ گری کو چھوڑ کر دہلی میں روپوش ہوگیا تھا، اس نے کہا تھا:

شاہ درویشان مغز الملک از من درہم است
بندہ اوراکی ز درویشی پشیمان گفتہ ام

حکیم زنبل شیرازی

علم و دانش میں ممتاز حکیم تھا اور بادشاہ کے مصاحبوں میں داخل تھا۔

حکیم عین الملک شیرازی

اپنا تخلص دوائی کرتا تھا۔ علم و کمال میں نہایت بلند مرتبہ تھا۔ اچھے اخلاق و عادات کا مالک تھا۔ بندیہ نامی شہر میں انتقال فرمایا۔

یہ اشعار اسی کے ہیں۔ خواجہ نظام الدین احمد مرحوم کے باغ سے رخصت ہوتے وقت اس نے اپنے ہاتھ سے لکھ کر بطور یادگار مجھے دیے تھے۔ وداع ہونے کے بعد وہ لاہور سے راجہ علی خان حکمران برہانپور کے پاس سفیر بن کر چلا گیا۔ بس یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ شعر مندرجہ ذیل ہیں

چنان از عشق برگشتم کہ در دنیا نمی گنجم — ہمہ جا پر عشقم گشت ومن در جانمی گنجم
اگر باغیر عشق الفت نمی گیرم عجب نمود — مثال عصمتم میدان کہ در صہبا نمی گنجم
نشان از من چہ می پرسی کہ من خود ہم نمیدانم — ہمانا سر توحیدم کہ در آنجانمی گنجم

ہیچ ویرانی نشد پیدا کہ تعمیری نداشت — درد بی درمان عشق است اینکہ تدبیری نداشت
صید آہوی شدم کز ہر طرف کردم نگاہ — غیر جانی پاک در فتراک نخچیری نداشت

حکیم مسیح الملک شیرازی

حکیم نجم الدین عبد اللہ بن شرف الدین حسن کا تربیت یافتہ تھا۔ نہایت درویش صفت پاک

اعتقاد آدمی تھا۔ فن طبابت میں اسے ید بیضا حاصل تھا۔ دکن سے ہندستان آیا، پھر شہزادہ سلطان مراد کے ہمراہ گجرات اور دکن کی مہم پر معین کیا گیا۔ لیکن مالوہ ہی میں فرشتہ اجل نے آگھیرا۔

حکیم مصری

طب میں نظری اور عملی طور پر نہایت دور رس اور ماہر شخص تھا۔ علوم نقلی پر بھی اچھا عبور حاصل تھا۔ عجب عجب علوم سیکھ رکھے تھے۔ جیسے دعوت اسما، علم حروف اور علم تکسیر وغیرہ۔

ہمیشہ مسکراتا نظر آتا، خندہ پیشانی سے ملتا اور گفتگو کرتا، لوگ اسے مبارک قدم کہا کرتے تھے۔ شیخ فیضی کے علاج میں اس نے بڑی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ بھی کہا کرتا کہ موت کے معاملہ میں تو سب عاجز و بے بس ہیں۔ اگر علم طب سے عمر میں اضافہ ہوتا تو حکیم لوگ دنیا سے جاتے ہی نہیں۔

وہ کبھی کبھی مزاحیہ فارسی شعر بھی کہتا تھا۔ یہ اسی کا شعر ہے کہ خواجہ شمس الدین دیوان خوافی کے متعلق کہا تھا:

خواجہ شمس الدین چہ ظلمی کند
در طبابت باش دفلی می کند

ایک دن اس نے کنیر کے پھول جس کو عربی میں دفلی کہتے ہیں کو دیکھ کر فی الفور کہا:

چو آتش جست کاکل از سر دفلی

بادشاہ نے لاہور میں بادشاہی محل کے صحن میں ایک چبوترہ بنوایا اور حکم دیا کہ ہر شخص اس جگہ ہمارے ساتھ نماز پڑھ سکتا ہے۔

اس موقع پر حکیم مصری نے شعر کہا:

شاہ ماکرد مسجدی بنیاد — ایہا المومنین مبارک باد
اندرین نیز مصلحت دارد — تا نماز ان گذار بشمارد

حکیم مصری نہایت سادہ لوح، بے غرض آدمی تھا۔ کسی سے کچھ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ برھانپور، خاندیش میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں دفن کیا گیا۔

حکیم علی

حکیم الملک کا بھانجہ اور حکمت میں اپنے ماموں اور شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے۔ شیخ عبد النبی سے علوم نقلی کی تحصیل کی ہے۔ علوم شرعی پر اس کی اچھی نگاہ ہے لیکن اس کے باوجود ''زیدیہ'' مذہب کا کٹر معتقد اور اس زمانہ کے بیشتر حکماء کی طرح متعصب شیعہ ہے۔

اکتسابی فنون خاص طور سے علم طب میں اچھی مہارت ہے۔ مریضوں کا علاج بھی کرتا رہتا ہے، لیکن نوجوان اور خود پسند ہے۔ ابھی عملی تجربہ بھی کچھ زیادہ نہیں، اس لیے اکثر بیمار اس کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے اپنے دکھوں سے رہائی پا جاتے ہیں۔

شاہ فتح اللہ شیرازی کا شاگرد ہے، لیکن جب شاہ صاحب بیمار ہوئے تو حکیم علی نے تپ محرقہ میں ''ہریسہ'' کھانے کے لیے تجویز کیا جس کے بعد وہ جانبر نہ ہو سکے۔

''مرگ ہوش است شربت بہ او''

حکیم ابو الفتح گیلانی

بادشاہ کا چہیتا مصاحب تھا۔ اس نے مزاج شاہانہ پر ایسا قابو پالیا تھا کہ دوسرے تمام درباری اس سے حسد کرتے تھے۔ نہایت ہوشیار، ذہین اور تمام ہنروں میں یکتا تھا۔ نظم و نثر میں بھی باکمال ادیب تھا۔ اسی طرح بے دینی اور تمام بداخلاقیوں میں بھی اس کی شخصیت ضرب المثل تھی۔

میں نے ان دنوں جبکہ حکیم نیا نیا آیا تھا خود اس سے سنا، کہتا تھا: ''خسرو کیا ہے بس 12 شعر کا شاعر، انوری کو خوشامدی انوری کہا کرتا تھا اور اس کو میر بادنجان سے تشبیہ دیتا تھا جو ایک مسخرا تھا۔ خاقانی کے متعلق کہتا تھا اگر اس زمانہ میں ہوتا تو بڑی ترقی کرتا۔ اس طرح کہ جب وہ، خاقانی میرے گھر آتا تو میں تھپڑ مار کر اس کی سستی اور کاہلی کو دور کر دیتا

اور یہاں سے ابوالفضل کے گھر جاتا وہ اسے طمانچہ لگاتا۔ اس طرح ہم اس کے اشعار میں اصلاح کرتے رہتے"۔

حکیم حسن گیلانی

طبیب حاذق تھا۔ معالجہ میں اچھی شہرت تھی۔ عالم تو اتنا بڑا نہیں تھا، لیکن نہایت با اخلاق اور خوش کردار آدمی تھا۔

حکیم ہمام

حکیم ابوالفتح کا چھوٹا بھائی، اخلاق میں اپنے بھائی سے بہتر تھا۔ اگر چہ نیک نہیں تھا لیکن عملاً شر پسند بھی نہیں تھا۔

حکیم حسن، شیخ فیضی، کمالائی صدر اور حکیم ہمام حسب ترتیب ایک مہینہ کے اندر اندر فوت ہو گئے۔ ان کا مدتوں سے جمع کیا ہوا مال و اندوختہ ایک ہی گھڑی میں کہاں سے کہاں نکل گیا اور یہ حسرت و محرومی لیے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے:

جان بجانان دہ وگرنہ از تو بستاند اجل
خود بدہ انصاف جان من کہ این یا آن نکوست

حکیم ہمام کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس کی لاش بعد میں حسن ابدال لاکر اس کے بھائی کے پہلو میں دفن کی گئی۔

حکیم احمد ٹھٹھوی

عالم تو بہت اچھا تھا، طب نہیں جانتا تھا، بس حکیم بنا ہوا تھا، ویسے تمام علوم کا جامع تھا۔ عرب اور عجم کی سیاحت کی تھی۔ نہایت خوش مزاج آدمی تھا لیکن بہت سے فضول خبط لگے ہوئے تھے۔ طبیعت کا لالچی بھی تھا۔ اہل بیت ہونے کا دعویٰ کرتا تھا۔ میں نے اس سے اکثر کہا کہ تجھ میں یہ استعداد نہیں کہ تو اہل بیت میں سے ہونے کا دعوے کرے کیونکہ

ہندوستان میں ایسے دعوے نہیں چل سکتے۔ اگر تو واقعی دیندار ہے تو دین اسلام کی دعوت دے کہ اس زمانہ میں اسلام کا بس نام ہی رہ گیا ہے، لیکن میرے۔ کہنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوا۔ آخر اس نے اپنے اعمال کو بھگت لیا اور مرزا فولاد نے خنجر مار کر ہلاک کر دیا۔

مرنے پر میں نے اسے دیکھا دوسروں نے بھی دیکھا تھا۔ خدا کی قسم اس کی خدائی بے شک و لاریب ہے وہ عین سور کی شکل کا نظر آرہا تھا چنانچہ لوگوں نے اس کی تاریخ نکالی ''خوک سقری'' شیخ فیضی نے اس کی تاریخ ''بیست و پنج ماہ صفر'' نکالی ہے۔

میں نے حدیقہ کے اس شعر میں تھوڑا سا تغیر کر کے قاتل اور مقتول دونوں کی مناسبت سے دو تاریخیں نکالی ہیں:

فرضینا بقرائن صادق
وخسنا بوصف وی لایق

دوسری تاریخ ہے ''زھی خنجر فولاد''۔

حکیم لطف اللہ گیلانی

بڑا حاذق طبیب تھا۔ وہ اچھے علم کا مالک تھا۔

حکیم مظفر اردستانی

کم عمری ہی میں شاہ طہماسپ کے طبیبوں میں شامل تھا۔ ہندستان آیا تو بڑی ترقی کی۔ بڑا با صلاحیت نوجوان ہے۔ اخلاق نہایت عمدہ اور کردار پاکیزہ ہے۔ بیماروں کو اس کی آمد ہی بڑی با برکت معلوم ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ بلحاظ علم اتنا اونچا نہیں لیکن اس کا تجربہ بلا شبہ بہت اچھا ہے۔

حکیم فتح اللہ گیلانی

طب کی کتابیں بہت پڑھی ہیں۔ علم ہیئت سے بھی بخوبی واقف ہے ''قانون'' پر فارسی میں ایک شرح لکھی ہے۔ ان دنوں کابل میں قلیچ خاں کے علاج کے لیے گیا ہوا ہے۔

شیخ بینا

یہ سرہند کے شیخ حسن طبیب کا لڑکا ہے۔ جراحی میں بڑا ماہر ہے۔ ہاتھیوں کے علاج میں تو اسے مہارت حاصل ہے۔ آج کل بے قید اور بے حیا ہو گیا ہے۔

اب تک ہم نے جتنے حکیموں کا ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلمان اور ہندو حکیم ہیں، لیکن ان جاہلوں اور ملعونوں کے تذکرہ پر دل آمادہ نہیں ہوتا۔

عہد اکبری کے شعراء

پیش نظر انتخاب میں جن شاعروں کے حالات بیان کیے گئے ہیں، ان کا ماخذ میر علاء الدولہ کا مشہور تذکرہ ''نفایس الاثر'' ہے ان میں سے بعض صاحب دیوان شاعر ہیں۔ میں نے ان میں سے بعض کے ساتھ ملاقات کی ہے، بعض کو دور یا نزدیک سے دیکھا ہے یا ان کی شہرت کی وجہ سے ان کا ذکر کیا ہے۔

غزالی مشہدی

ملحدانہ خیالات اور بے راہ روی کی وجہ سے جب عراق میں اسے لوگوں نے قتل کر دینا چاہا تو وہ وہاں سے بھاگ کر دکن چلا گیا۔ پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ خان زمان نے اس کو خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ بھجوایا تھا۔ اس نے جونپور سے یہ قطعہ بطور لطیفہ کے لکھ کر بھیجا تھا۔ اس میں صفت معما بھی موجود ہے:

قطعہ

ای غزالی بحق شاہ نجف — کہ سوی بندگان بی چون آن
چونکہ بی قدر بودۂ آن جا — سرخود را بگیرد بیرون آن

چندسال خان زمان کے پاس رہا، بعد میں بادشاہی ملازمت میں پہنچا۔ دربار میں اسے ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ اس کے اشعار کے چند دیوان اور ایک مثنوی ہے۔ کہتے ہیں اس نے چالیس پچاس ہزار شعر کہے ہیں۔ مگر اس کا کلام کچھ زیادہ بلند نہیں، لیکن کمیت و کیفیت کے لحاظ سے اس کے اشعار اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ ہیں، تصوف کی زبان پر بھی بڑا عبور حاصل ہے۔

اس کی وفات جمعہ کی شب 27 رجب 980ھ/1572ء احمد آباد میں اچانک اور دفعتًا ہوئی اور اکبر کے حکم سے اس کو ''سر گنج'' (سرکھیچ) میں جہاں بڑے بڑے مشائخین اور سلاطین دفن ہیں، دفنایا گیا۔

قاسم ارسلان نے قاسم کاہی کی زبان سے یہ تاریخ کہی:

قطعہ

دوش غزالی آن سگِ ملعون مست جنت شد بسوی جہنم
کاہی سال وفاتش بنوشت ملحد دونی رفت زعالم

دیگر

بود گنجی غزالی از معنی مدفنش خاک پاک سرگنج است
بعد یک سال تاریخش احمد آباد و خاک سرگنج است

یہ مطلع اسی کے نام سے مشہور ہے لیکن میں نے غزالی کے دیوان میں اسے نہیں پایا:

شوری شد واز خواب عدم دیدہ کشودیم
دیدم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

غزالی کے کلام کا نمونہ:

درکعبہ اگر دل سوئی غیر است ترا طاعت ہمہ فسق وکعبہ دیر است ترا

در دل بحق است و ساکن میکدۂ   می نوش کہ عاقبت بخیر است ترا

ماز گرگ خود نمی ترسیم اما این بلا است
کز تماشای بتان محروم می باید شدن

خفتگان خاک یکسر کشتۂ تیغ تواند
ہیچ دملی نیست شمشیر اجل را در میان

چون فانوس خیال و عالمی حیران درد
مردمان چون صورت فانوس سرگردان درد

شدہ زہ بر کمان قامت زاہد روائی او
ولی زندان نمی ترسند از تیر دعائی او

رباعی

بحر یست ضمیر من کہ گوہر دارد   تیغی است زبان من کہ جوہر دارد
صور قلم نغمۂ محشر دارد   مرغ ملکو تم سخنم پر دارد

اس نے ایک قصیدہ میں صنعت ''سیاق العدد'' ایک تا سو کے اعداد میں بیان کی ہے جس کا مطلع ہے:

بہ یک سخن ز دولعلت بہ فیض یافت مسیحا
حیات باقی و نطق و نشاۃ احیا

غزالی کا ایک شعر ہے:

ما بادہ ایم وگرد گریبان ما خم ست
داریم نشاۃ کہ دو عالم درو گم است

قاسم کاہی

اصل نام میاں کالی کابلی ہے۔ اس کے اشعار میں پختگی نہیں۔ ان کا سارا مضمون دوسروں سے لیا ہوا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی کوئی شخص اس کی برابری نہیں کر سکتا تھا۔ علم تفسیر، ہیئت، کلام اور تصوف پر اس کو بڑا عبور حاصل تھا۔ علم موسیقی میں بھی اس کی ایک کتاب ہے۔ تصوف، معما گوئی، تاریخ اور حسن ادا میں وہ اپنے زمانہ کا بے مثل شخص تھا۔

اگر چہ اس نے متقدمین اور معاصرین اکثر مشائخ کی صحبت سے فیض اٹھایا ہے اور مولوی جامی اور دوسرے بزرگوں کا زمانہ دیکھا ہے لیکن ساری عمر وہ الحاد و زندقہ میں مبتلا رہا۔ آزادی، سخاوت، ایثار پسندی اس میں بہت زیادہ تھی۔ ہمیشہ اس کے پاس قلندروں، آوارہ لڑکوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کتوں سے اسے بڑا پیار تھا۔ غالباً کتے ملک الشعرائی کے لیے لازم وملزوم ہیں۔

ایک قطعہ میں اس نے لڑکیوں کے ساتھ شیفتگی کو اس طرح بیان کیا ہے۔

قطعہ

این نصیحت بشنواز سیفی　　　تاہمہ عمر ترا بس باشد

شعر خوب وپسر زیبارا　　　معتقد باش زہر کس باشد

ہم کو اس کے مذہب و مسلک سے کیا کام اس کے چند شعر نقل کیے جاتے ہیں:

چون سایہ ہمرا ہم بہر سوروان شوی　　　باشد کہ رفتہ رفتہ بما مہربان شوی

ای پیر عشق صحبت یوسف رخی طلب　　　نبود عجب کہ ہمچو زلیخا جوان شوی

چون تار عنکبوت زہجر تو شد تنم

در گوشۂ خرابہ ازان ھست مکنم

اس کی دو غزلیں صوفیانہ لحاظ سے بہت عمدہ ہیں اور کافی مشہور ہوئی ہیں۔ انھیں مجلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور بادشاہوں وصوفیوں کی محفلوں میں بڑی پسند کی جاتی ہیں:

مطلع

مرغ تا بر فرق مجنون پر زدن انگیز کرد
آتش سودای لیلیٰ بر سر او تیز کرد

چون زعکس عارضش آئینہ پر گل شود
گرد ران آئینہ طوطی بنگرد بلبل شود

اسم اللہ پر اس کا مُعمہ ہے:

نیست از ہستیش کسی آگہ
ابدا کان لا نها منها یته له

اسم نبی ﷺ کا مُعمہ:

تارہ شرح را شتافتہ ام
از محمد نبیؐ شگافتہ ام

اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہوا ہے۔ بوستان کے جواب میں قافیہ بہ قافیہ ''گل افشان'' نامی مثنوی لکھی ہے، جس کا مطلع ہے:

جہان آفریدہ بجان آفرین
بجان آفرین صد جہان آفرین

اس کے چند شعر:

بنا زکشت جہانی بت ستمگر من
ہنوز بر سر ناز است ناز پر در من

ریخت باران بلا برتن غم پرورا
چہ بلاہا کہ نیا ورد فلک برما

نہ نرگس ست عیان بر سر مزار مرا
سفید شد برہت چشم انتظار مرا

ایک جوگی کے لڑکے کے متعلق کہا:

آتشین رویت زخاکستر چو نیلوفر شدہ
یا نقاب از آتش روی تو خاکستر شدہ

کاہی کے اس مطلع کا مضمون ملا وصفی کابلی کے مطلع سے ملتا جلتا ہے۔ وصفی کا مطلع ہے:

از تپ ہجران نہ خاکستر مرا بستر شدہ
بستر از سوز من بیمار خاکستر شدہ

لوگوں نے جب ملا قاسم سے کہا کہ تمہارے اکثر اشعار میں دوسرے شاعروں کا مضمون ملتا ہے۔ اس نے جواب دیا: ''اس معاملہ میں میں نے کوئی خاص التزام نہیں کیا اگر تمہیں پسند نہیں ہیں تو قلم تراش لو اور ایسے اشعار میرے دیوان سے نکال دو''۔ اس نے ''اصطرلاب'' کے متعلق ایک بڑا اچھا قصیدہ کہا ہے۔ جس میں ہمایوں بادشاہ کی مدح ہے۔ بلا شبہ اس قصیدہ میں کمال کر دکھایا ہے۔

جب خواجہ معظم خاں پاؤں میں تکلیف ہونے کے باوجود خیر آباد سے ملا قاسم کاہی کی عیادت کے لیے آیا تو اس نے فی البدیہہ یہ غزل اور اس کا ترنم بھی بنا دیا:

ماندی قدم زنانہ بر دل نیاز من — درون مباد پای ترا سرو ناز من
ہر چند وصف وصل تو کردم شب فراق — کوتہ نگشت قصۂ دردِ دراز من

ایک دن ملا بادشاہی باغ میں نہر کے کنارے سیر کر رہا تھا، صبوحی شاعر وہاں آنکلا اور

کہا: ''استاد آپ نے سنا ایک پرانا مومن عراق میں مر گیا''۔ ملا کاہی نے کہا: ''خدا تم کو بحفاظت زندہ رکھے''۔

گجرات کے پہلے سفر میں ملا غزالی لشکر کے ہمراہ تھا۔ اس وقت وہاں ملا قاسم کاہی کے فوت ہوجانے کی خبر اڑ گئی تھی۔ غزالی نے اس وقت یہ تاریخ کہی تھی۔ قاسم کاہی تو مرے نہیں لیکن یہ قطع تاریخ خوب ہوگیا:

قطعہ

رفت بی چارہ کاہی از دنیا سال تاریخ او اگر خواہی
چون بنا چار رفت شد نا چار از جہان رفت قاسم کاہی

اس سے پہلے کہ اس افواہ کا جھوٹ سچ ظاہر ہو جاتا، ملا قاسم کاہی نے غزالی کی وفات کی ایک تاریخ اور پھر اس کی تلافی میں دوسری تاریخ کہی تھی۔

بہر حال جھوٹ جھوٹے کے آگے آکر ہی رہتا ہے، اس شعر کے مطابق کہ:

شاعران دیدم زروی تجربت
بی تعاقب بی عقب بی عاقبت

اس زمانہ کے سارے ہی چھوٹے بڑے شاعر بجز تین چار معمر قدما کے حیدر مشرب بے قید اور آزاد ہیں۔ یہ دونوں غزالی اور کاہی تو ان آوارہ مشرب شاعروں کے پیشوا اور مقتدا تھے کہ انھوں نے اپنی خباثتوں کو اپنے شاگردوں اور ماننے والوں میں خوب جی کھول کر تقسیم کیا۔ میں جب ان شاعروں کو دیکھتا ہوں تو اس فکر میں پڑ جاتا ہوں کہ کہیں شعرائے متقدمین ایسے ہی نہ گزرے ہوں۔

خواجہ حسین مروی

یہ حضرت شیخ ربانی رکن الدین علاء الدولہ سمنانی کے فرزند ہیں۔ معقولات کا علم مولانا عصام الدین اور ملا حنفی سے حاصل کیا اور شرعی علوم میں خاتم العلماء محدثین شیخ ابن حجر مکیؒ

کی شاگردی کی۔

شعرگوئی، انشاء پردازی، صنائع بدائع، حسن بیان، فصاحت وبلاغت، مزاح ولطافت میں بے نظیر شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان مکمل ہوگیا ہے۔ اس کے شعر اوسط درجہ کے ہوتے ہیں۔ نمونہ کلام:

ای از مژہ بی تو آب رفتہ　　وزدیدہ خیال و خواب رفتہ

خود را بما چنان کہ بنودی نمودۂ
افسوس آن چنان کہ نمودی نبودۂ

اس شعر کا ماخذ غالباً یہ رباعی ہے:

گویم مگو زاہل و فایم نہ ایم　　واندر صفت صدق وصفایم نہ ایم
آراستہ ظاہریم و باطن نہ چنان　　افسوس کہ آنچہ می نمایم نہ ایم

یہ اسی کے اشعار ہیں:

یا ما گرہ چو غنچہ در ابر و فگندۂ
با غیر لب چو پستہ خندان کشودۂ

محبتی کہ مرا با تو ھست می خواہم
ھمین تو دانی ومن دانم و خداوند

اکبر بادشاہ نے کتاب ''سنگھاسن بتیسی'' کا ترجمہ کرنے کا اسے حکم دیا تھا جسے وہ پورا نہیں کرسکا۔ اس ترجمہ پر اس نے جو نعت لکھی تھی اس کے چند شعر یہ ہیں:

خوش الحان عندلیب باغ ابلاغ　　کحل نرگسش از کحل مازاغ
کشیدہ در زبور نسخ بی قیل　　قلم بر نسخۂ توریت و انجیل
نبوت را بدر گاھش حوالہ　　امام الانبیاء ختم الرسالہ

رباعی

آنم کہ ممالک سخن ملک من است　　صراف خرد صیرفیٔ سلک من است
دیباچۂ کن از دفتر من ورقیست　　اسرار دوکون بر سر کلک من است

979ھ/1571ء میں اس نے ہندوستان سے وطن واپس جانے کی رخصت حاصل کی۔ شیخ فیضی نے جو اس کا تربیت یافتہ تھا اس کی تاریخ ''دام ظلہٗ'' نکالی وہ کابل چلا گیا۔ میرزا محمد حکیم نے اس کی عزت و تکریم کی۔ میرزا کو اس نے ہندستان کے نفیس کپڑے اور قیمتی سامان کی پیشکش کی۔ دربار میں ایک محرر اِن تحفوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ خواجہ حسین نے جلد بازی کر کے وہ کاغذ محرر کے ہاتھ سے چھین لیا اور ہر کپڑے کی قسم اور نام تفصیل و وضاحت سے لکھنے لگا اور خود ہی اس کی قیمت بھی مقرر کر دی میرزا کو یہ جلد بازی اور اوچھا پن اچھا نہ لگا اور وہ مکدر ہو کر محفل سے اٹھ گیا، اٹھتے ہوئے کہہ گیا کہ یہ سارے تحفے لوگ لوٹ لیں ہم کو نہیں چاہئیں۔ خواجہ حسن کا جلد ہی کابل میں انتقال ہو گیا۔

قاسم ارسلان

اس کا باپ اپنے آپ کو ارسلان جاذب کی نسل سے بتاتا تھا۔ یہ ارسلان سلطان محمود غزنوی کا ایک مشہور امیر گزرا ہے۔ قاسم نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص ارسلان رکھا تھا۔ اس کا اصلی وطن طوس ہے۔ ماداء النہر میں نشو و نما ہوئی۔ قاسم ارسلان صاحب دیوان، شیرین کلام شاعر اور اچھا خطاط تھا۔ خوش طبع اور خاص وعام میں ہر دلعزیز تھا۔ بڑا ہنس مکھ اور بے تکلف آدمی تھا۔ تاریخ گوئی میں تو اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

خواہم کہ سر بر آرم در حشر از زمینی
کانجا بناز بگرہ پا ماندہ نازنینی

ای نیم جان آمدہ بر لب ترا چہ قدر
جای کہ یک نگاہ بصد جان برابرست

مجھے یاد ہے کہ یہ آخری مصرع ایک اور غزل میں اس طرح ہے جس کے کہنے والے نامعلوم نہیں ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

بآنکہ ہست خلوت وصل توبی رقیب
شرم تو با ہزار نگہبان برابرست

اسی کا شعر ہے:

لفظ و معنی مجال من گرینند
بی تو چون روی درکتاب کنم

گریان چو بسر منزل احباب گزشتیم
صد مرتبہ در ہر قدم از آب گزشتیم

اس نے اجمیر کے پہاڑ کی تعریف میں جو حضرت خواجہ اجمیری کے مزار کے پاس ہے، مثنوی کہی ہے:

زہی کوہ اجمیر غیر سرشت — مقام سر مقتدایان چشت
چہ کوہی کہ چون سود براوج سر — محیط سپہرش بود تا کمر
نماید جرم مہ و آفتاب — براہ کوہ مانند چشم عقاب
چہ خورشید دروی عیان چشمہا — کواکب بود رنگ آن چشمہا
بی نسر طائر بگردون شتافت — کہ بر قلہ اش راہ باید نیافت
شود گر ازان قلعہ تنگی رہا — بز یر فلک رازہم قلعہ ہا
نہ برقست ہر سو درخشان زمیغ — کہ آن کوہ را سود بر چرخ تیغ
زبالائی آن قلعہ گاہ نگاہ — فلک چشمہ وچشم ماہی است ماہ
بر وبیل آن قلعۂ پر شکوہ — ہزاران چو الوند و البرز کوہ
چو برخیزد از دامن آن عقاب — فتد سایہ اش برہمہ و آفتاب
بین ارسلان رفعت پا یہ اش — کہ جا کردہ خورشید در سایہ اش

ملا نے اس سال جب کہ بادشاہ نے اٹک سے آکر لاہور میں قیام کیا تھا، 995ھ/1587ء میں وفات پائی۔

یہاں تک میں نے بلا ترتیب ان چار شاعروں کا اس لیے تذکرہ کر دیا کہ یہ شاعری میں بڑے مشہور اور نامور ہیں۔ اس کے بعد میں جن شاعروں کا تذکرہ کر رہا ہوں ان کو حروف تہجی کی ترتیب سے بیان کرونگا۔

آتشی قندھاری

بابر بادشاہ کے ساتھ ہندستان آیا تھا۔لشکر میں واقعہ نویس تھا، ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں بھی وہ اچھے عہدوں پر فائز رہا۔ 973ھ/1565ء میں لاہور میں فوت ہوا۔

نمونہ کلام:

سرشکم رفتہ رفتہ بی تو دریا شد تماشا کن
بیا در کشتی چشم نشین و سیر دریا کن

اسی کا شعر ہے:

خنجر بمیان تیغ بکف چین بہ جبین باش
خونریز و جفا پیشہ کن و بر سر کین باش
ازلعل وفابی خبری را چکند کس　　　مائل بہ جفا سیمبری را چکند کس
در شفق گشت شب عید نمایان مہ نو
تا کنیم از پئی جام می گلگون تک ودو

ہمایوں بادشاہ کی محفل میں ظفر کے قلعہ میں اس نے یہ رباعی کہی تھی۔

رباعی

صد شکر کہ شاہ ازغم بیماری است　　　برخاست و بر مسند اقبال بنشست

از صحت زاتش خبری می گفتند   المنۃ للہ کہ بہ صحت پیوست

اشرف خان میر منشی

مشہد مقدس کے حسینی سیدوں میں سے ہے۔ خوش نویسی میں بڑا ماہر اور 7 قلم کا استاد تھا۔ بادشاہ کے امیروں میں شامل تھا۔ شعر کہتا تھا لیکن شاعری تو اس کے لیے بس ایک تہمت ہی تھی۔ بس طبیعت موزوں تھی، چند شعر یہ ہیں:

نارسیدہ زلف ساقی دوران جامی
میرسد سنگ ملامت بسویم چکنم

مائیم بعالم کہ دل شاد نداریم   ناشاد ولی چون دل خود یاد نداریم

رباعی

یارب تو مرا بآتش قہر مسوز   در خانۂ دل چراغ ایمان افروز
این خلعت زندگی کہ شد پارہ بجرم   از راہ کرم برشتۂ عفو بدوز

رباعی

بیغش نمود چون زر خالص عیار عشق   آن بہ کہ نقد عمر کنم صرف کار عشق
تا صفحۂ جمال تو گل گل شگفتہ است   بلبل صفت مراست بدل خار خار عشق

امیر قاضی اسیری

صاحب فضل وکمال شاعر، حکیم الملک کا ممتاز و پسندیدہ شاگرد تھا۔ اپنے زمانہ کا خوش کلام شاعر گزرا ہے۔ چونکہ ہندستان کی آب وہوا اس کے موافق نہ تھی اور بادشاہ کی محفل میں شناسائی کے باوجود کوئی امتیاز حاصل نہ ہو سکا تھا اس لیے ولایت چلا گیا اور اپنے آبائی وطن رَیّ میں انتقال کر گیا۔ یہ اشعار اس کی بلاغت فکر کا نمونہ ہیں:

قاصد رقیب بوده و من غافل از فریب
بی درد مدعائی خود اندر میانہ ساخت

ولی کہ بر حال من دل شده خندیدن درشت
اضطراب من و خندیدن او دیدن درشت

امروز اضطراب دل من زیاده است   گویا شده بکشتن من گرم خوئی تو

دل خستہ ام ز نازک طفلی کہ روزگار
در دست او ندادہ ببازی کمال ہنوز

امید وصل تو نگذاشت تا دہم جان را   وگر نہ روز فراق تو مردن آسان بود

از غیر کنم شکوہ چون آن سیم تن آید
شاید بہوا داریٔ او در سخن آید

ہرگز نروداز دل من ذوق وصالی   کز ناز بمن در سخن و چشم براہ داشت

میر امامی ہنجویہ

یہ کابل کے سید ہیں 981ھ/1573ء میں گھوڑے سے گرکر جونپور میں انتقال کیا۔ صاحب دیوان شاعر گزرے ہیں۔ انھوں نے ایک نازک اندام محبوب چغتائی سلطان کے مرنے پر ایک تاریخ کہی ہے جو بہت مشہور ہوئی:

سلطان چغتا بود گل گلشن خوبی   لیکن سوی رضوان اجلش راہنمون شد

در موسم گل عزم سفر کرد ازین باغ　　دلہا زغمش تہ بتہ آغشتہ بخون شد
تاریخ ولی از بلبل ماتم زدہ جستم　　درنالہ شد و گفت گل از باغ برون شد

یہ شعر بھی میر امامی کے ہیں:

وصف قدت بالف چون کنم ای نخل حیات　　کہ الف ساکن وقد تو بود در حرکات

دل بہ فکر آن دہان در تنگنائی حیرت است
حیرتش روداده از جائی کہ جای حیرت است

غافل از یاد تو ای شیرین شمائل نیستم　　گر تو از من غافلی من از تو غافل نیستم

رباعی

اثبات وجود را چہ حاجت بہ بیان　　چون خود ہمہ اوست آشکار و زنہان
گویند نہ نفی غیر بکشائی زبان　　نفی چہ کنم کجا ست از غیر نشان

رباعی

سجادہ نشین مشعبد چرخ کبود　　سیمائی صلاح صبح از رخ نبود
شد بہر قیام راست در نیمۂ روز　　پیشین بہ رکوع رفت ودیگر بسجود

میر شرف امان اصفہانی

نہایت باسلیقہ شاعر تھا۔ بیس سال تک ہندستان میں درویشانہ حال میں رہا۔

نمونۂ کلام:

روبہ سیل سرشکم بسوئی خانہ او
کہ گرد غیر بشوید ز آستانۂ او

لعلت کہ آب زندگی ازوی نشان دہد
کو حضرتابہ بیند واز ذوق جان دہد

تابہ تیغت چو امانی سرخود در بازم
جان سپر ساختہ در وصف سپاہ آمدہ ام

بزم وصل تو زان غیر اضطراب ندارم
کہ سوی غیر نظرمی کنی و تاب ندارم

قاضی احمد غفاری قزوینی

قاضی احمد امام نجم الدین عبد الغفار کی اولاد میں سے ہیں۔ امام موصوف شافعی مذہب کی کتاب ''حاوی'' کے مصنف تھے۔ قاضی احمد بڑے صاحب علم انشاء پر داز مورخ اور خوش طبع بزرگ تھے۔ ان کی ایک کتاب ''نگارستان'' مشہور ہے، جس میں نہایت عجیب و غریب حالات لکھے ہیں۔ بلا شبہ ایسا دلکش و نادر مجموعہ اس دور میں کسی اور نے پیش نہیں کیا۔ تاریخ پر ان کی تصنیف ''نسخ جہان آراء'' ہے جس میں حضرت آدم سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کے حالات اجمالاً بیان کیے ہیں۔

آخر عمر میں سلاطین عراق کی وزارت سے استعفیٰ دے کر بیت الحرام کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے اور حج کی سعادت حاصل کر کے بندرگاہ دابل سے ہندستان آنا چاہتے تھے کہ اجل نے گریباں پکڑ لیا۔ 975ھ/1567ء میں فوت ہوئے۔

یہ شعر ان کا ہے:

پس از عمری نشیند گردمی در چشم آن بدخو
تپد دل در برم ترسم کہ ناگہ زود برخیزد

میر اشکی قمی

اس کے اشعار میں خیال آفرینی نہایت بلند ہے۔ آصفی کی پیروی کرتا ہے۔ آگرہ میں وفات پائی۔

نمونۂ کلام:

از بس کہ سنگ بر سرز دبی تو سینہ چاکی
آن سنگ درکف او گردید مشت خاکی

بی سنگ ازغمت بر سرمن دل تنگ خواہم زد   اگر دستم رود ازکار بر سنگ خواہم زد

شمعت نصیر دار شہا بندہ می شود
صد بار اگر سرش ببری زندہ می شود

مستانہ کشتگان تو ہر سو فتادہ اند   تیغ ترا مگر کہ بہ می آب دادہ اند

بسکہ تن بگداخت بی روز آتش سودا مرا
گرہنی زنجیر بر گردن فتد درپا مرا

کہتے ہیں جب مندرجہ بالا مطلع کو میر اشکی نے قندھار میں مولانا صادق کے سامنے پڑھا تو انھوں نے کہا: ''تم نے یہ مضمون امیر خسرو سے اڑایا ہے''۔

خسرو نے کہا ہے:

بسکہ بگداخت ز ہجرت تن پرور سودایم
گرہنی طوق بگردن فتد اندر پایم

اشکی کا ایک اور شعر ہے

اگر خواہم کہ در راہ تو از سنگ بلا رفتم

زہر مو برمن آید سنگ و نگذار در یار فتم

اس نے ''سنگ'' پر اتنے مضمون باندھے ہیں کہ کسی اور کے لیے گنجائش نہیں رہی

اا غرتم میان ۔گان بین بکوی خود

این ایک بسوی خود کشد آن یک بسوی خود

موی ژولیده کہ آید ز سر من تاپا   زان میان موئی سفید یست تن من پیدا

یول قلی انیسی

شاملو ترکمانوں سے تعلق رکھتا ہے۔ خان خاناں کے یہاں ملازم ہے۔ نہایت نرم وملائم اشعار کہتا ہے۔ ایک مثنوی بھی لکھی ہے۔

کلام کا نمونہ یہ ہے

آتش کدہ است دل ز خیال تو د برو

داغ تو ہندوی کہ نگہبان آتش است

چو بینی شعلۂ را مطرب آتش پرستی دان   کہ روحش رفتۂ وجسمش در آتش خانہ میر قصد

عشق و مقناطیس یک جنس اند کز دل ناوکش

تا برون می شد محبت جذب پیکان کردہ بود

ملا غنی امنی

نورسیدہ جوان ہے۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پہلے خوفی تخلص رکھا تھا۔ خواجہ مرحوم نے بدل کر ''امنی'' رکھوادیا۔ اب بڑے شاہزادے کی خدمت میں رہتا ہے۔

نہایت خوش طبع شاعر ہے۔ یہ رباعی اسی کی ہے

منم کہ غیر غم اندوختن نمی دانم
تمام اشکم و واسوختن نمی دانم
ہنوز خاطر اگر روشناس خورشیدم
چراغ بخت خود افروختن نمی دانم

اختری بدخشی

اسم بامسمّٰی ہے ''فتوحات'' اور ''فصوص الحکم'' کی چند گمراہ کن باتیں یاد کرلی ہیں۔ چونکہ فرعون کے ایمان کے بارے میں ہر ایک سے بحث کیا کرتا تھا، اس لیے لوگوں نے اس کو ''وکیل فرعون'' کا خطاب دے دیا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

گفتی و فاکنیم باحباب یا جفا
ای شوخ بندۂ سخن اولیم ما

الفتی قلیج خان

''جان قربانی'' نامی گروہ سے متعلق ہے۔ علمی اور حکمی ہنر سے آراستہ ہے۔ اس وقت پنج ہزاری امیر ہے۔ دین کے بارے میں اس کا اعتقاد درست ہے۔ کچھ عرصہ تک ''جملۃ الملک'' کے عہدہ پر بھی فائز رہا۔ ان دنوں کابل کی حکومت پر مقرر ہے۔ طبیعت میں شعر و نظم کا اچھا سلیقہ اور ملکہ ہے۔

نمونۂ کلام:

تازہ عارض آفتاب من نقاب انداختہ
ذرہ سان خورشید را در اضطراب انداختہ

کشتۂ آن نرگس مستم کہ در عین خمار

عالی راکشتہ و خود را بخواب انداختہ

دو ترک مست تو آشوب عقل و دین ستند
کمان کشیدہ زہر گوشہ در کمین ستند

نیست در دل غنچۂ پیکان آن قاتل مرا   بی لبش خونی کہ خوردم شد گرہ در دل مرا

الفتی یزدی

علوم ریاضی میں بڑا ماہر تھا۔ خان زمان کے ساتھیوں میں شامل تھا۔ انہی ہنگاموں میں گرفتار ہوا۔ اگر چہ قتل ہونے سے بچ گیا لیکن موت سے جان نہ بچا سکا۔
اسی کا ایک مطلع ہے.

تا گرد صفت دامن یاری نگرفتیم
از پانہ نشستیم و قراری نگرفتیم

اسی مطلع پر خان زمان نے ایک ہزار روپیہ بطور انعام کے دیا تھا۔

مشت خاشاکیم و داریم آتشی ہمراہ خویش
دور نبود گر بسوزیم از شرارہ آہ خویش

الفتی عراقی

کچھ عرصہ تو وہ کشمیر میں میرزا یوسف خان کے پاس رہا، وہاں اس نے ایک ''شہر آشوب'' کہا تھا جس کا شعر یہ ہے.

سر موی موشک پر ان درخت شعراست
قد جوزا و بروت سرطان را عشق است

اسی شہر آشوب میں میرزا یوسف خان کے ایک محبوب کے متعلق کہا تھا:

مرزا یوسف خاقان زمان را عشق مست
عشق پاک تو وخط دگران را عشق مست

بیرم خاں خان خاناں

بیرم خاں مرزا جہاں شاہ کی اولاد میں سے ہے۔ دانائی، سخاوت، خلوص، حسن اخلاق، نیازمندی و انکساری میں کوئی اس کی مثال نہ تھا۔ ابتدا میں وہ بابر بادشاہ کے ساتھ رہا۔ پھر ہمایوں بادشاہ کی خدمت میں ترقی کی اور خان خاناں کا خطاب پایا۔ اکبر بادشاہ نے اس کے القاب میں ''بابا ام'' کا اضافہ کر دیا۔

بیرم خاں فقرا اور درویشوں کا معتقد، خود صاحب حال اور خوش خیال آدمی تھا۔ یہ اس کی کوشش، بہادری اور حسن تدبیر تھی کہ ہندستان دوسری بار مغلوں کے ہاتھوں فتح ہوا اور ایک مضبوط سلطنت قائم ہو سکی۔

اس کی فیاضی کا ایسا شہرہ تھا کہ دور دراز سے اہل علم وفضل آتے تھے اور اس کی بارگاہ سے مالا مال ہو کر جاتے تھے۔ ایک دنیا اس کی شخصیت پر ناز کرتی تھی۔ آخر زمانہ میں دشمنوں نے اکبر کو اس سے بدظن کر دیا۔ پھر اس کا جو حشر ہوا وہ ہم بیان کر آئے ہیں۔

نمونۂ کلام:

رباعی

ارباب فنا بلند و پست ایشا نند — وز جام بقا مدام مست ایشا نند
ای کوی تو کعبہ سعادت مارا — روی روئی تو قبلہ ارادت مارا
خوش آنکہ بجذبۂ عنایت سازی — وارستہ زقید رسم و عادت مارا

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے جس کا مطلع ہے:

شہی کہ بگذرداز نہ سپہر افسراو — اگر غلام علی نیست خاک بر سر او
محبت شہ مردان مجوز بی پدری — کہ دست غیر گرفت است پای مادر او

ایک اور قصیدہ اضطراب کے بارے میں کہا ہے:

آن چرخ چیست کامدہ بر محورش مدار — آن بدر کز میانہ شہا بش کند گزار
با آنکہ می کند بہ مہ وخور برابری — آمد بجان زحلقہ بگوشان شہر یار
نادر بہ چشم کوکبہ آفتاب را — چون مہچہ لوای شہنشاہ نامدار
پیوستہ آسمان و زمین زیر حکم اوست — ہمچون نگین خاتم شاہ جم اقتدار
بر کف نہادہ خوان زری پر ز اشرفی — تابر قدوم اشرف شاہان کند نثار
شاہ بلند قدر ہمایون کہ از شرف — بر درگہش سپہر نہد روی افتقار

کہتے ہیں ایک رات ہمایوں بیرم خان سے گفتگو کر رہا تھا۔ بات کرتے کرتے بیرم خان پر غنودگی طاری ہوگئی۔ بادشاہ نے ہوشیار کرنے کے لیے ''او بیرم میں تجھ سے کہہ رہا ہوں کہا''۔ بیرم چونک اٹھا اور کہا: ''ہاں بادشاہ سلامت میں حاضر ہوں''۔ لیکن میں نے سنا ہے کہ بادشاہوں کے سامنے آنکھوں کی، درویشوں کے سامنے دل کی اور عالموں کے سامنے زبان کی حفاظت و احتیاط رکھنی چاہیے، میں اس فکر میں گم تھا کہ حضرت والا بادشاہ بھی ہیں، درویش بھی اور عالم بھی۔ میں آخر کن کن چیزوں کی حفاظت کروں۔ ہمایوں کو اس کا یہ جواب بہت پسند آیا اور بڑی تعریف کی۔

بیرم خان 968ھ/1550ء میں پٹن، گجرات میں شہید ہوگیا۔ اس کی ہڈیاں، وصیت کے مطابق مشہد میں لے جا کر دفن کی گئیں۔

بیکسی غزنوی

نہایت فاضل و کامل شخص تھا۔ حرمین کی زیارت سے فارغ ہو کر ہندستان آیا۔ عرب میں حدیث کی بعض کتابیں ''مشکوٰۃ'' وغیرہ پڑھیں اور میر مرتضٰی شریفی سے سیرت و شمائل نبیؐ کا درس لیا۔ بڑھاپے کی وجہ سے اپنے وطن لوٹ آیا لیکن بمقام پشاور 973ھ/1565ء کو انتقال ہوگیا۔

نمونۂ کلام:

در دیر و کعبہ جز بتو مائل بنودہ ام — ہر جا کہ بودہ ام ز تو غافل بنودہ ام
فلک را رسم بی مہری نہ در دوران مابودہ — کہ دوران فلک تا بودہ بی مہر و وفابودہ

قطعہ

بی کسی گر شنود طعنۂ دشمن صد بار — لائق آنست کہ آشفتہ و در ہم نشود
زآنکہ این بیت کمال است بعالم مشہور — این چنین بیت چرا شہرہ عالم نشود
سنگ بدگوہر اگر کاسۂ زرین شکند — قیمت سنگ نی فزائد و زرکم نشود

رباعی

ای دل تو عنان بہ غصہ وغم ندہی — یک لحظہ خوشی بہ مملکت جم ندہی
یاری اگرت بدست افتد زنہار — خاک قدمش بہر دو عالم ندہی

مولانا بیکسی نے لکھا ہے کہ'' ایک دن غفران پناہ ہمایوں بادشاہ نے دار الخلافہ دہلی میں ایک محل کے طاق پر شیخ آذری کا یہ مطلع اپنے خاص خط میں لکھا تھا:

شنیدہ ام کہ برین طارم زر اندود است
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است

اتفاق کہ ہمایوں کا کچھ ہی دن بعد انتقال ہوگیا اور اسے اسی محل میں دفن کیا گیا۔ یہ ہمایوں کی کرامت ہی کہی جاسکتی ہے۔

مولانا بیکسی پر کسی نے یہ واقعہ لکھ کر حسب ذیل قطعہ بھی درج کر دیا جو لکھتے ہوئے موزوں ہوگیا تھا۔

قطعہ

درین کہ شاہ ہمایون بوقت رحلت خویش — نوشت بر در سر منزلی کہ ساکن بود
خطی کہ عاقبت کار جملہ محمود است — بحسن کہ عاقبت خود اشارتی فرمود

چو شد بحکم قضا مدفنش ہمان منزل　　　کہ بود قبلۂ حاجات و کعبۂ مقصود
بناء برین پی تاریخ رحلتش گفتم
بنای منزل سلطان عاقبت محمود

باقی کولابی

شاعرانہ طبیعت رکھتا تھا۔ یہ اشعار اسی کے ہیں:

زفرقت تو گرفتار صد الم شدہ ام
توشاد باش کہ من مبتلای غم شدہ ام

خوبان اگرندانند امروز قدر مارا　　　دانند قدر مارا فردا کہ ما نباشیم

بچشم گاہ خون دل گہی خون جگر بستہ
من غم دیدہ راہی روی او راہ نظر بستہ
نگردد ہچو سرو آزاد در باغ جہان ہرگز
چونرگس ہر کہ او چشم طمع درسیم وزر بستہ

باقی کافی عرصہ تک ہندستان میں رہا۔ معصوم کابلی کی بغاوت میں مارا گیا

بیاضی

یہ آگرہ میں ایک آزادمشرب وارفتہ شخص تھا۔ اس کا مطلع ہے:

ہر کہ براز وصل آن سروسمن بر خورد
از خوشی طالعست طالع خوش بر خورد

اس نے ایک رباعی میں کاہی اورغزالی کا محاکمہ کیا ہے:

کاہی وغزالی آن دولا یعقل مست　　　در غیبت جامی و نوائی زدہ دست
در دہر کسی بے مثل لینہا نگذشت　　　کامی چہ خس است وہم غزالی چہ مگست

پیروی

خواجہ آصفی کا پیرو ہے۔ مصوری میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ صورت سے حقیقت کی طرف کھینچ لے جانا اس کا فن ہے۔ اس نے ایک رسالہ ''صورت و معنی'' بھی لکھا ہے۔ اس کا مطلع ہے:

خدا وند از معنی تنگ وستم — بہ بخشای کہ بس صورت پرستم
زلطف خویشتن ای ایزد پاک — چنان سازی بصورت خانۂ خاک
کہ ہر صورت مرا کز دیدہ آید — بسوی معنیم روی نماید

پیروی کے اور شعر یہ ہیں:

بی درد را شراب محبت کجا دہند
کیفیتی است عشق بتان تا کرا دہند

خواب دیدم یار قیبش در دل افتاد اضطراب — مردہ بودم دید اگر بیدار می گشتم ز خواب
نظر چون افکنم وقت تماشا برمہ رویش — عتاب آلودہ بیند سوی من تا نگرم سویش
دزدیدہ چون نگاہ بان نازنین کنم — چون ننگرد ز شرم نظر بر زمین کنم
طفل اشکم برہ یار سر خویش نہاد — خوش یتیمانہ درین رہ قدمی پیش نہاد
ناز پروردہ چو تاب ستم عشق نداشت — یار را نام جفا پیشہ وبد کیش نہاد
رفتم در اضطراب چو از من جدا شود — کان مہ مباد باد گری آشنا شود

اس کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ہندستان میں فوت ہوا۔

بقائی

ولایت، ایران سے نیا نیا آیا ہوا ہے۔ دکن میں ملک قمی شاعر کے ساتھ رہتا تھا۔ وہاں سے گجرات پہنچا اور میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہنے لگا۔ پہلے اس کا تخلص مشغولی تھا، مرزا نے بدل کر بقائی رکھ دیا۔

اس کے اشعار میں ایک کیفیت پائی جاتی ہے اور اس کے حالات با وضع و متوازن ہیں:

تا عشق ز مژگان بتان نیشتر آورد　　خون ازرگ و از ریشہ من جوش بر آورد
فریادکہ تا چشم زدن تیر خیالش　　در دیدہ فرو رفت و سر از دل بر آورد

بجای اشک از چشم دل افگار می بارد
ہمہ خون جگر زین ابر آتش بار می بارد

مرغ دل تا صید چشم او شکار انداز بود　　ہر سر مو بر سرم چون مرغ در پرواز بود

اس نے اب خان خاناں کی ملازمت ترک کردی ہے۔ کہتے ہیں آگرہ آیا ہوا ہے اور لاہور جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ملا نورالدین محمد ترخان

پہلے نوری تخلص کرتا تھا۔ چند سال تک سرہند کے علاقے میں سفیدون نامی پرگنہ کا جاگیر دار رہا اس لیے سفیدونی کے نام سے مشہور ہوا۔

علوم ہندسہ، ریاضی، نجوم اور حکمت میں بڑا ماہر و ممتاز تھا۔ ہمایوں کا ہم راز اور ہم سخن مصاحب تھا۔ اسی دربار سے اسے ترخان کا خطاب ملا۔ سخاوت و فیاضی اور مجلس آرائی میں بے مثل آدمی تھا۔ شعر کہنے کا بڑا اچھا سلیقہ حاصل تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے۔

ایک دن فتح پور میں چوگان بازی کے میدان میں ایک ہاتھی نے اسے زخمی کر دیا۔ کہا کرتا تھا: ''گواہ رہو کہ میں نے اس اذیت و پریشانی میں بعض باتوں سے توبہ کر لی ہے''۔ لوگوں نے بہت کچھ معلوم کرنا چاہا کہ آخر کن باتوں سے توبہ کی؟ لیکن کسی خاص بات کا ذکر نہ کیا۔ اس وقت میں نے کہا: ''پہلی وہ چیز جس سے توبہ کرنی چاہیے۔ وہ شعر ہی ہے مگر اس کو یہ پتہ نہیں میرا فقرہ پسند آیا یا نہیں لیکن دوسرے بہت خوش ہوئے۔

اس نے اپنے عہد حکومت میں جمنا سے ایک نہر کھدوائی تھی جو پچاس کوس تک کرنال بلکہ اس سے بھی آگے تک جاتی تھی۔ اس نہر سے اس علاقہ میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوش حال ہوگئی۔ یہ نہر اس نے شہزادہ سلیم کے نام پر بنائی تھی۔ اس نہر سے اس علاقے میں زراعت کو بڑا فائدہ ہوا اور رعایا خوشحال ہوگئی۔

بعد میں اس کے حالات بہت ابتر ہو گئے اور اس نے بڑی مصیبتیں اور غم برداشت کیے۔ جس وقت اکبر بادشاہ 994ھ/1586ء میں اٹک تشریف لے گئے تھے تو اسے دہلی میں ہمایوں کے مقبرہ کا متولی بنا دیا تھا۔ اسی جگہ اس نے انتقال کیا۔

نمونۂ کلام:

دل تنگ دور ازان لب خندان نشستہ ام
مانند غنچہ سر بگریبان نشستہ ام

زروی مکرمت وز راہ احسان   بہ ترخاں داد خانی شاہ عادل
ازین خانی ہمین نامیت بروی   ازین نام شگرف او را چہ حاصل
زتر خانی ہم او را شکوہ هست   بہ نزد خسرو دانای کامل
کہ غیر از خان خشکی می نماند   ز تر خانی تری گردد چو زائل

جس زمانہ میں اکبر بادشاہ نے حکیم مرزا پر لشکر کشی کی تھی خان مذکور حکم عدولی کر کے 989ھ/1581ء میں پنجاب سے لوٹ کر اپنی جاگیر پر چلا گیا۔ بس یہ بات بادشاہ کی بد گمانی کا سبب بن گئی۔ جب اکبر اس سفر سے واپس آیا تو فتح پور میں شاہی عتاب میں رہا اور حساب کتاب کے سلسلہ میں چند سال تک سزائیں بھگتتا رہا۔

واقف کار لوگ اس کے زوال کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ تاتار خان جو دہلی کے حاکم تھے، سے ان کی مخالفت تھی۔ اس نے تاتار خان پر ایک ہجو کہی اس ہجو میں دہلی کے بزرگوں کی شان میں بھی بے ادبی کر گیا۔ بس اسی بے ادبی کی وبا اس پر پڑی تھی۔

اس نے یہ ہجو قاسم کاہی کے نام سے منسوب کر کے مشہور کرادی تھی۔ جس کے شعر یہ ہیں:

مفتی دہلی ست میان خان جہان　　مفت نداده است فتاوات
حاکم شہرست ز تاتار خان　　خادم او چہرہ حمارات

اسی ہجو کا مطلع:

آہ زدہلی و مزارات　　دادہ ز خرابی عمارات

اسی ہجو میں 250 شعر ہیں۔ دہلی کے ایک فاضل بزرگ جن کا نام شیخ محمد کنبو تھا ان تمام شعروں کا جواب بس ایک ہی شعر میں دے دیا۔

قطعہ

نورالدین لادہ پدر او ازین
زادہ چنین لادہ زلادات
چک ازدہ آن ابلہ بیہودہ گوئی
لیس جواب بخرافات

اسی زمین میں مولوی نور الدین عبد الرحمٰن جامی کا قطعہ ہے:

آہ من العشق و حالات
احرق قلبی بحرارات
ما نظر العین الی غیر کم
اقسم باللہ و آیات

کہاں مولانا نورالدین جامی اور یہ نورالدین جو اپنے آپ کو جامی سمجھنے لگا تھا:

گرچہ ہمکار بانیان زہم نامی چہ سود
یک مسیح ابرای اکمہ کرد و دیگر اعور است

بہر حال آدمی لائق تھا، ممکن ہے اپنے کیے پر پشیمان ہوا ہو اوراللہ تعالیٰ اس کی ان مصیبتوں اور دکھوں کو اس کی غلطیوں کا کفارہ بنا دے۔

جب نورالدین اپنے عہدہ سے معزول ہو کر آگرہ آیا ہوا تھا۔ ایک دن میں بازار جا رہا تھا کہ وہ اچانک سامنے سے نمودار ہوا۔ میرے ساتھیوں میں سے میاں کمال الدین حسین شیرازی نے جو نہایت خوش مزاج ظریف آدمی تھا اور آگرہ کے ایک بڑے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا، نور الدین سے کہا: ''نواب خان دہلی کے بزرگوں کا نام تو آپ نے لے لیا، اب اگر آگرہ کے بزرگوں پر بھی جناب مہربانی فرمائیں تو کیا حرج ہے؟ میں نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ وہ آگرہ کے بزرگوں میں کوئی قابلیت نہیں پاتے کہ ان کا تذکرہ کریں'' میری بات پر وہ ہنس دیا اور کہا: '' وہ ایک بہتان ہے جو مجھ پر باندھا گیا ہے''۔

تروی اودھ

ماوراء النہر کا رہنے والا ہے۔ لطیف الطبع آدمی ہے۔ پہلے اُلغ میرزا کے مصاحبوں میں تھا۔ جس زمانہ میں ان میرزاؤں نے بھڑوچ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا تھا اس نے یہ رباعی کہی تھی.

اولاد ثمر کہ در شجاعت فردند
شد فتح بہر کجا کہ رو آور دند
کردند چو فتح بھڑوچ از روی ستیز
تاریخ شد این کہ فتح بھڑوچ کردند

توسنی

اس کا نام منوہر ہے۔ سانبھر کے راجہ لون کرن کا بیٹا ہے۔ سانبھر کا نمک زار مشہور ہے توسنی کے کلام میں بھی بڑی ملاحت پائی جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہاں کا سارا نمک بس اسی کے کلام میں بس گیا ہے۔

توسنی نہایت خوب صورت اور ذہین شاعر ہے۔ پہلے اس کا نام محمد منوہر تھا بعد میں بادشاہ نے اسے میرزا منوہر کا خطاب دیا لیکن اس کا باپ باوجود ہندو ہونے کے اسی نام محمد منوہر پر فخر کرتا تھا۔ اگرچہ ''محمد'' جیسے ناموں سے نسبت اکبر کو پسند نہ تھی۔ توسنی نہایت

موزوں طبع تھا جس کا اندازہ اس کے اشعار سے بخوبی ہوتا ہے:

شیخ مستغنی بدین و برہمن مغرور کفر
مست حسن دوست را با کفر و ایمان کار نیست

رباعی

بی عشق تو در جگر لبالب ناراست　　　بی درد تو در سرم سراسر خاراست
بت خانہ و کعبہ ہر دو نزدم کفر است　　　مارا بہ یگانگیٔ ایزد کار است

جس وقت بادشاہ نے اس کا تخلص رکھا تھا اس نے چند شعر کہے تھے:

شربت آشنا ماميا در بزم ماردری نشان
کز جگر درکف کباب و خون دل در ساغر است
ننگ مردان است حرف از جان و دل گفتن بعشق
دل چو خون سخت بستہ جان چو باد صر صراست
توسنی سردہ سمند شوق در میدان عشق
می رسی ایمن بمقصد رہبرت چون اکبر است

ایک ہندو سے یہ جودت طبع اور کمال شعر کا ظاہر ہونا ایک حیرت انگیز بات ہے

تدروئی ابھری

مولانا نرگس کا بھانجہ ہے۔ لطافت طبع او ر ذہانت میں ممتاز تھا۔ بیرم خان کے عہد اقتدار میں روم سے ہندستان آیا اور اسی کے یہاں تربیت و ترقی پائی۔ ایک پہاڑی لڑائی میں اتکہ خان نے اسے قید کرلیا اور اکبر خان کے ساز و سامان و ساتویں امام علی رضا کے جھنڈے کے ساتھ اسے بھی مال غنیمت میں پیش کیا۔ بادشاہ کو اس کا کلام نہایت ہی پسند آیا۔

اس نے ''حسن و یوسف'' کے نام سے ایک رسالہ اتکہ خان کے لڑکے یوسف محمد

خان کے نام پر لکھا تھا جس کا مطلع ہے:

بنام آنکہ روی دشمن و دوست
بہر جانب کہ باشد جانب اوست

محبوب کے حسن کی تعریف اس مثنوی میں اس طرح سے کی ہے:

رخش آئینہ گردن دستۂ عاج　　پری رویان بان آئینہ محتاج
کفش چون آفتاب آئینہ نور　　شعاع آفتاب انگشت آن حور

اس نے عماد کے ''دہ نامہ'' کا بھی جواب کہا تھا، جس کے چند شعر ہیں:

از حسرت لعل آید ارت　　وز فرقت زلف تا بدارت
موئی شدہ جسم ناتوانش　　در جسم نماندہ جای جانش

صبح کی تعریف میں لکھتا ہے:

خاکستر صبح رفت برباد
در پنبۂ صبح آتش افتاد

چند اور شعر:

سر بزانو چونہم در ہجر آن پیان گسل
تو دۂ خاکستری گردد تنم از سوز دل

بادشاہ کے حکم سے اس نے ہاتھی کی تعریف کی تھی:

زخاک رہ شاہ گردون سریر　　پی عطر بر خود فشاند عبیر
عقاب فلک بر سرش بی گزاف　　بود پشۂ قلعۂ کوہ قاف

975ھ/1567ء میں چوروں نے اسے تلوار مار کر شہید کر دیا اور آگرہ میں دفن ہوا۔

تشبیہی کاشی

دو تین مرتبہ ہندوستان آکر چلا گیا۔ اس زمانہ میں آیا ہوا ہے اور بے دینی کو بڑھاوا دینے میں مصروف ہے۔ پسی خانی مسلک کا داعی ہے۔ اپنے آپ کو شیخ ابوالفضل سے بڑا مجتہد

سمجھتا ہے۔ توسل و سفارش سے دربار میں باریابی حاصل کرلی ہے اور اکبر کی شان میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا ہے جس میں بادشاہ کو اس طرف توجہ دلائی ہے کہ یک سو ہو کر تقلید پرستوں کو بالکل ختم کردو تاکہ حق اپنے مرکز پر پوری طرح استوار ہو جائے اور خاص توحید فروغ پائے۔ اس نے ایک رسالہ شیخ ابو الفضل کے نام سے منسوب کیا ہے جو حروف و نقطوں کی کرتب بازی کا نمونہ ہے اور اس میں عددی مناسبتیں پیدا کی ہیں۔

حکیم عین الملک نے اس کے تخلص ''تشبیہی'' کے اعداد لفظ تزریقی، کے مطابق نکالے ہیں جو اس کے مکرو زرق سے پوری مناسبت رکھتا ہے۔ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کی بکواس کا نمونہ یہ ہے:

یکی برخود ببال آن خاک گورستان زشادابی
کہ چون من کشتۂ زان دست وخنجر در لحد داری
توہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوش
کہ من آن جلوہ قدمی شناسم

در دست این جہان وآن جہان پوچ
کہ چہ در دست تست این پوچ و آن پوچ

اس نے شیخ ابو الفضل کی محفل میں محمود بسی خوانی کا رسالہ مجھے دیا تھا، جس کا دیباچہ یہ تھا:

"یا اللہ المحمود فی کل مغالہ استعین بنفسک الذی لا الہ الا ھو الحمد للہ الذی وجد نعمہ بوجود کلیاتہ و اظہر وجود الکلیات من نفسہ سھوبھم کلیا و ھو یعلم نفسہ ولا نعلم نفو سنا د لاھو وھو کون لایکن الایہ و مکان لا بغیرہ وھو ارحم الراحمین"۔

سوال: یہ جو ''خلق'' کہا جاتا ہے وہ کون ہے؟
جواب: یہ جو ''خلق'' کہا جاتا ہے وہ اللہ ہے۔

اس کے منہ میں خاک دیکھو کیسی بکواس کی ہے۔ اس کے مذہبی جعل کا چار لفظوں پر

انحصار ہے، جنھیں اس نے رسالہ کے آخر میں اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا ہے۔ ''کتب مکرالکرار بجانب عجمی مجتہدی طبارع ای کرب لت ش ب ی، ی انوی اخروی صاحب مقام'' بقیہ رسالہ کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے۔

تقی الدین شوستری

ابھی ابھی شاہی دربار میں شامل ہوا ہے۔ علوم عقلی و نقلی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ شعر بھی اچھے کہہ لیتا ہے۔ طبیعت موزوں اور شاعرانہ ہے۔

نمونۂ کلام:

گردست ندھدم کہ بردیم نظر کنم
باری دھان بیادلبت پر شکر کنم
باآنکہ ہمچو سبزہ بخاکم نشاندۂ
دست ودلی کجاست کہ خاکی بسر کنم

ان دنوں وہ پادشاہ کے حکم سے شاہنامہ کو نثر کا جامع پہنا رہا ہے، گویا مخمل کو ٹاٹ میں بدلنے میں مصروف ہے۔

ثانی خان ہروی

بڑے قدیم امیروں میں سے ہے۔ دانائی، تدبّر اور حسن ذوق میں مشہور ہیں۔ اس کے پاس جب کسی شخص کے علم و فضل کی تعریف کر کے پیش کیا جاتا ہے تو وہ پہلی ہی ملاقات میں اس سے کہتا تھا کہ: ''ہمارے ساتھ دوستی اور محبت کی شرط یہ ہے کہ ہمارے متعلق کمینوں اور اوباشوں کی کہی ہوئی باتوں پر کان نہ دھرو، کیونکہ یہ لوگ خلوص کے دشمن اور نفاق کے بانی ہوتے ہیں، تاہم اس نے اپنا دیوان مکمل کر لیا ہے''۔

نمونہ کلام یہ ہے:

ای رسم تو آزار من و قاعدہ بیداد
بیداد ازین رسم و ازین قاعدہ فریاد

بگذر زنا خوش کہ درین دَیر دِیر
نیکی ندید ہر کہ بدی کرد با فقیر

رباعی

دیدم ز فراق آنکہ یعقوب ندید
در عشق کشیدم آنچہ مجنون نکشید
این واقعہ کز هجر تو آمدہ بسرم
فرہاد گمان بزد و وامق نشنید

ثانی خان کا اصل نام علی اکبر ہے، شاید یہی نام کی مناسبت سے کہ اس نے بھی الحاد و بے دینی کی تائید میں رسالے لکھے ہیں اور فن نقط کی مناسبتیں پیدا کر کے بادشاہ کو اور شاید خود کو وہ شخصیت سمجھتا ہے جو لفظ ''شخص'' کے اعداد کے مطابق 990ھ/ 1582ء میں آنے والی ہے۔ محمود پسی خوانی کے عقائد بھی ان رسالوں میں بیان کیے ہیں، انھوں نے تصوف پر بھی ایک رسالہ لکھا ہے۔ یہ مزاحیہ مصرع اسی کا ہے:

احسر نجم بحر نجم احر نجاما مصدر

غالباً آخر عمر میں شعر گوئی سے توبہ کر لی۔

ثنائی مشہدی

اس کا نام خواجہ حسین ہے۔ ابھی وہ ہندوستان نہیں آیا تھا لیکن اس کی شہرت یہاں پہنچ چکی تھی، چنانچہ یہاں کے اکابر اس کے کسی شعر کو مصرع طرح بنا کر محفل سخن منعقد کیا کرتے

تھے اور ہر مشاعرہ میں اس کے لیے دعائیں کرتے تھے۔ بلااختلاف سب اس کی استادی کے قائل تھے، لیکن جب وہ یہاں آگیا تو حسد کی آگ نے عقیدت کوجھلسا کر رکھ دیا اور وہ بے چارہ گمنامی کے ایک گوشے میں لوگوں کے اعتراضات کا ہدف بنا رہا۔

اس کا دیوان مشہور ہے۔ ایک بہت اچھی مثنوی بھی لکھی ہے۔ کوئی بڑا عالم نہیں ہے۔ چنانچہ اس کی نثر اس کے قصیدوں کی طرح شاندار نہیں، شاعرانہ ذوق نہایت بلند ہے۔ بجز توحید و منقبت کے تمام اصناف سخن میں بڑی مہارت حاصل ہے، اسی کا شعر ہے:

چنان ناز بارد زپاتا سرش
کہ رفتن توان ناز از بسترش

مگر اس کے استاد کے اس شعر کے مضمون سے ملتا جلتا ہے:

عشوہ دم انداز زمین ناز فشانداز ھوا
طرز خرام کردن و پا بزمین نہادش

نمونہ کلام:

گرمثل جا کند درپیش آئینہ شخص   بیند تمثال خویش تافتہ روبر قضا
بسکہ از خانہ غم برون ریزم   تنگی خانہ از برون در است

جدائی

نام میر سید علی ہے، یہ مصور بھی ہے اور کئی حیثیتوں کا مالک ہے۔ اس کی ہر تصویر شاہکار ہے۔ ہندستان میں وہ اپنے دور کا مانی ہے۔ داستان امیر حمزہ جو مصور 16 جلدوں میں ہے اس کے سرپرستی میں مکمل ہوئی۔ اس کی ہر جلد ایک گنجینہ اور ہر ورق ایک مرقع اور صفحہ صفحہ منقش ہے۔

شاعری میں اس کا ایک دیوان بھی مکمل ہو چکا ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

صبح دم خاردم از ھمدمی گل میزد   ناخنی در دل صد پارۂ بلبل میزد

حسن بتان کعبہ ایست عشق بیابان او   سرزنش ناکسان خار مغیلان او

جذبی

نام بادشاہ قلی ہے۔ شاہ قلی خان نارنجی کا بیٹا ہے۔ موزوں طبع شاعر ہے۔

نمونہ کلام یہ ہے:

این چاشنی کہ حسن ازل با بتان دھد
جائی رسید عشق کہ بی درد جان دھد

اس کے باپ شاہ قلی خان کی رباعی ہے:

گاہ توبہ و گاہ کوزۂ می شکنم
یکبار دوبارنی پیاپی شکنم
یارب زھد آموزی نفسم برہان
تاچندکنم توبہ و تا کی شکنم

پٹنہ کے سفر سے واپسی پر ایک دن راستہ میں جذبی، قاضی شمس الدین قزوینی اور بعض نئے نئے شاعر حسین ثنائی کہ اس شعر پر:

گر بمثل جائی در پس آئینہ شخص
بیند تمثال خویش تافتہ روبر قضا

بحث کر رہے تھے، میں وہاں پہنچا تو ان لوگوں نے اس شعر کا جس پر اختلاف تھا مجھ سے مطلب دریافت کیا۔ میں نے کہا ''اب تو یہ معاملہ ہوگیا ہے کہ یار لوگ شعر اور ''تیتال'' میں فرق نہیں کر پاتے''۔

یہ تیتال، سلطان حسین مرزا کے زمانہ میں ایک مسخرہ تھا جو بڑا باتونی اور زبان دراز تھا۔ عالموں کا لباس پہن کر یعنی عبا اور عمامہ پہن کر علما کی محفلوں اور مدرسوں میں طالب علموں کی ایک جماعت کو ساتھ لے کر جاتا اور پہلے نہایت معقول عالمانہ انداز میں مناظرہ اور مباحثہ شروع کر دیتا۔ جب لوگ اس کی تقریر سے متاثر ہوتے، پھر وہ بحث میں مہمل اور بیہودہ باتیں غلط کر دیتا جس سے عالم اور شبہ میں پڑ جاتے۔

جمیلی کالپی وال

اس کے والد شیخ جلال واصل تھے جو شیخ محمد غوث کے خلیفہ ہیں اور سرود و سماع کا بڑا ذوق رکھتے تھے۔ جمیلی کو اپنے باپ کی یہ کیفیت و حال تو نصیب نہ ہوا لیکن وہ حصول علم اور ذوق شعر سے محروم نہ رہا۔ اگرچہ اس کے اکثر اشعار مضحکہ خیز ہیں یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

گر شادیٔ وصل تو مرادست نداد
باری بہ غمت خاطر خود شاد کنم

اس نے حاکم کالپی قاسم علی خان کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا ایک شعر یہ ہے:

بود نسبت تو بہ خیل خوانین
بسی ناملایم بسی نامناسب

اس کا بڑا بھائی شیخ فضیل ہے جسے عربی پر بڑا عبور حاصل ہے۔ اس نے عربی میں بڑے فصیح شعر بھی کہے ہیں۔ اس نے معین الدین طنطرانی کے جواب میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کا مطلع ہے:

یا جمیل الوجه وجهی عن قدیم الحال حال
راح روحی بالنوی والدمع کا کسلسل سال

ایک دن اس نے یہ مطلع پڑھ کر سنایا۔ چونکہ یہ دونوں بھائی سبز فام ہیں، میں نے کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے آپ نے اس مطلع میں اپنے چھوٹے بھائی کو مخاطب کیا ہے'' اس جملہ پر وہ بہت ہنسا۔

طنطرانی کے قصیدہ کا مطلع ہے:

یا خلی البال قد بلبلت با بلبال بال
بالنوی زلزلت قلبی فهو با لزلزال زال

شیخ فضیل نے شیخ فیضی کی تفسیر پر عربی نثر و نظم میں جو ''توقیع'' لکھی ہے وہ اس کے علم و کمال کا واضح ثبوت ہے۔ ان دنوں دونوں بھائی لاہور سے اپنے وطن کے لیے رخصت ہو گئے ہیں۔

چشتی

شیخ حسین صوفی نام ہے، وطن دہلی ہے۔ چونکہ وہ شیخ سلیم چشتی کا مرید تھا، اس لیے یہ تخلص رکھا تھا۔ فتح پور عرف سیکری کی خانقاہ کے صوفیوں میں شامل تھا۔ اس کا ایک دیوان ہے اور چند دوسری تصانیف بھی ہیں۔ جن میں ایک کتاب ''دل و جان'' کے نام سے نظم میں لکھی ہے، مگر اس میں ہندستانی رنگ ہے اور مضمون بھی اس کا اپنا نہیں بلکہ تقاحی استاد میر علی کی کتاب ''حسن و دل'' سے لیا ہوا ہے جس میں تقاحی نے خوب دادِ سخن دی ہے۔اس کے ہوتے ہوئے چشتی کی ''حسن و دل'' مزید ذکر بے فائدہ ہے۔ اس کے کئی ہزار اشعار ہیں، اگر کوئی شعر قابل ذکر ہے تو بس یہ مطلع ہے:

چنین کہ با پر طاؤس قیس رامیلی است
مگر کہ از اثر پائی ناقہ لیلی است

جعفر

ہرات کے سیدوں میں سے ہیں۔ شعر اور فن مُعمّہ گوئی میں خاصا سلیقہ رکھتا ہے۔ اتکہ خان کا میر بخشی تھا۔ اس نے میرزا عزیز کے نام پر ایک غزل مُعمّہ میں لکھی ہے۔

نمونہ کلام:

شانہ برہم زدہ آن سلسلۂ مشکین را
آہ اگر باد بگوش تو رساند این را

غبار مشک نخواہم بران عذار نشیند
ازین مبادکہ با خاطرت غبار نشیند

سبزۂ را درباغ باشد جای زیر پای گل
باغ جنت را فتادہ سبزہ بر بالای گل

جعفر بیگ

آصف خان قزوینی کے لقب سے مشہور ہے۔ سابق میر بخشی آصف خان میرزا غیاث الدین علی کا بھتیجا ہوتا ہے۔ اب وہ دربار کے اعلیٰ مرتبہ کے بخشیوں میں شامل ہے۔ اس کو اپنے چچا سے بڑی شکایت تھی کیونکہ اس نے اپنے عہد میں اسے ترقی کا موقع نہیں دیا۔ اب بھی وہ اپنے مرحوم چچا کے خلاف بغض وعناد ظاہر کرتا رہتا ہے۔

اپنے ہم عصروں میں اس کی شعری صلاحیتیں سب سے بڑھ چڑھ کر ہیں لیکن عیش و آرام اور گونا گون مصروفیات کی وجہ سے شعر گوئی کی مشق کچھ زیادہ نہیں علم سے بھی بے بہرہ نہیں۔ اگر وہ صرف شاعری کی طرف متوجہ رہتا تو زمانے کو اپنا مداح بنا لیتا۔

کلام کا نمونہ یہ ہے.

کارم امروز بہ بیداد گری افتادہ است
کہ بہر جا کہ نہد پای سری افتادہ است

گر گرد شمع سرکشت سرگشتہ چون پروانہ ام   آخر بکشتن میدہد پرواز گستاخانہ ام

گل ہر کس دبتاراج خزان رفت
مراہم گلبن و ہم گلستان رفت

بآتش کارت افتادہ ست جعفر
دو صد بلبل باین جا یک سمندر

حیدری تبریزی

یہ حاجی تھا، لسانی کا شاگرد ہے۔ شریف تبریزی بھی اس کا استاد تھا، جس نے لسانی کی

تعریف کرتے ہوئے اسے ''لسان الغیب'' کہا ہے۔ حیدری ہندستان میں عرصہ تک رہا۔ایک بار جا کر پھر واپس آ گیا۔ دوسری مرتبہ جو گیا تو لوٹ کر نہیں آیا۔ اس کا دیوان 14 ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اگر چہ اس میں اچھے شعر بہت کم ہیں۔

وہ شاہی ہاتھیوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے:

نمود پشت ہای ریگ روان　　فیلہایش کہ در ھیجا ہست

کز پی غرق کردن اعدا　　ہر طرف موجہای بحر بلا ست

حزنی

یہ عراق کے عالموں میں سے تھا۔ جب ھرات میں شورشیں برپا ہوئیں تو وہ وہاں کے خطرات سے بچ کر ہندستان چلا آیا، لیکن یہاں بھی وہ محروم ومہجور رہا اور انتقال کر گیا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

مرا بر سادہ لوحیہای حزنی خندہ می آید　　کہ عاشق گشتہ وچشم وفا از یار ہم دارد

ز نادانی بہر او کرد ہمدم کار من ضائع　　عجیب تر آنکہ برمن منت بسیار ہم دارد

خرقہ بر آتش نہم تا بوی ایمان بشنوی

از کہن دلقی کز و یکتا ز بی زنار نیست

حیاتی گیلانی

بڑا دردمند اور مخلص دوست ہے۔ شاعری کی تمام اصناف میں تعریف وتوصیف سے بالا ہے۔ حکیم ابو الفتح کے وسیلے سے بادشاہی ملازمت میں داخل ہوا اور ترقی کی وہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ اس کے کلام میں اکابر شعراء کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگر چہ وہ کچھ زیادہ پڑھا لکھا نہیں مگر ذکاوت وذہانت فطری ہے۔

کلام کا نمونہ:

به هر سخن که کنی خویش رانگهبان باش　　　زگفتن که دلی نشگفد پشیمان باش
چه بال مرغ که گرشغل روزگاراین است　　　زمور هم قدمی دام کن گریزان باش

خدا به شکوه زبان من آشنا نکند
من و شکایت. و انکه زتو خدا نکند

رباعی

دایم تو ستم نمودهٔ معذوری　　　نامی زوفا شنوده معذوری
گفتی که بمن جفا بهتان است　　　خود راتو نیازمودهٔ معذوری

حیائی

یہ گجرات میں میرزا نظام الدین کے ساتھ تھا۔
ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

پیغام دوست داغ جگر تازه می کند
درد و داغ ورنج سفر تازه می کند

رباعی

عاشق رخ خویش بردرت سود و برفت
وان مهر که باتو داشت بنمود و برفت
یکشب به هزار حیله در بزم وصال
پروانه به شمع دیده بکشود و برفت

حالتی

اس کا اصل نام یادگار ہے۔ خود سلطان سنجر ماضی کی اولاد بتاتا ہے لیکن میرزا احمد نے تاریخ نظامی میں اسے چغتائی نسل کا بتایا ہے۔ بڑا نیک اور خوش عقیدہ آدمی ہے اور صاحب دیوان شاعر ہے۔

ان کے کلام کا نمونہ:

نماند آ نقدر از گریہ آب در جگرم
کہ مرغ تیر تو منقار تر تو اند کرد

بر صفحۂ عذار تو آن خط مشک شود
مضمون تازہ ایست کہ از غیب رونمود

حالتی کے باپ کا تخلص والہی تھا۔ یہ مطلع اسی کا ہے:

ماہ عید ابر ونمود و خاطرم ارشاد کرد
شکر للہ کزغم سی روزہ ام آزاد کرد

حالتی کے لڑکے کا تخلص بقائی تھا۔ اس نے اپنے باپ کو زہر دے کر مار ڈالا۔ بادشاہ کے حکم سے اسے کشمیر سے لاہور لایا گیا اور یہاں کوتوال نے قصاص میں قتل کرادیا۔ وہ بھی موزوں طبع تھا اس کا شعر ہے:

تا غمزۂ خون ریز تو غارت گر جان ست
چشم اجل از دور بحسرت نگران ست

خان اعظم

اصل خطاب اتکہ خان ہے۔ جس وقت چوسہ پر ہمایوں کو شکست ہوئی تو وہ گنگا پار کر کے فرار ہونا چاہتا تھا لیکن دریا میں غوطے کھانے لگا، اس وقت خان اعظم نے سہارا دیا اور مدد

دے کر کنارے پر لے آیا۔ یہ خدمت اس کی آئندہ ترقیوں کا ذریعہ ہوگئی۔ اس کا مرتبہ شعر وشاعری کے مقام سے بالا تر ہے لیکن وہ نہایت موزوں طبیعت کا مالک تھا۔

ان کے کلام کا نمونہ:

منہ ای طفل اشک از خانۂ چشم قدم بیرون
کہ می آیند مردم زادھا از خانہ کم بیرون

گر بخو رشید رخت لاف زند بدر منیر
آخر از گنبد فیروزہ نگون خواہد شد

خنجر بیگ

چغتائی امیروں میں سے ہے۔ تردی بیگ خان کا داماد ہے۔ اس نے اپنے حالات اور بادشاہ کی مدح میں ایک مثنوی کہی ہے جس میں 300 شعر ہیں۔ وہ مختلف صلاحیتوں کا مالک ہے۔ سپاہ گری، خوش خطی، شعر ومُعمّہ، اسطرلاب ونجوم اور تطابق اعداد، غرض تمام علوم وفنون کا جامع ہے۔ صاحب تصنیف ہے۔ اپنی مثنوی میں اس نے اپنے ان تمام اوصاف کو گنایا ہے۔ اس کے علاوہ وہ فارسی اور ہندی راگ، راگنیوں میں بھی بڑا ماہر تھا۔ اس کو ایسے راگوں کا علم تھا جو بجز بلند مرتبہ سلاطین وامراء کے کسی کی محفل میں سننے میں نہیں آئی اور اس زمانہ میں تو ان کا نام ونشان بھی نہیں رہا۔ موسیقی میں اس کا مقابل کوئی نہیں تھا۔

اس نے بادشاہ کی نصیحت کے لیے جو مثنوی کہی تھی اس کے چند اشعار یہ ہیں:

شہر یارا جہان عجب جائی است — ہر زمان اندر و تماشائی است
چرخ نیرنگ ساز شعبدہ باز — ہر زمان بازئی کند آغاز
پیش ازین بودہ اند در عالم — تاجداران با سپاہ و حشم
زان دلیران پر ھوا و ہوس — ماند تاریخ ہائی کہنہ و بس

خنجر بیگ نے جب یہ مثنوی بادشاہ کے سامنے پڑھی تو انعام واکرام سے نوازا گیا۔

اس کا ایک مکمل دیوان بھی ہے جس کے شعر بہت مشہور ہیں۔ اس کے چند شعر یہ ہیں:

آہم از دل چند درکویش نہان آید برون
بعد ازان چندان کنم افغان کہ جان آید برون

آہم گزشت از سرو پا باد رفت جان
تن خاک گشت و آتش دل شعلہ زن ہنوز

جس زمانہ میں خان زمان اور بہادر خان نے سرکشی و بغاوت کی تھی۔ خنجر بیگ بھی ان کے ساتھ ہوگیا تھا اور بنگالہ چلا گیا تھا۔ غالبا اسی فتنے میں وہ ہلاک ہوگیا!

خسروی

یہ مرزا قاسم جنابدی کا بھانجہ ہے۔ حجاز کے سفر کے بعد ہندستان آیا اور بڑے شاہزادہ کے یہاں ملازم ہوگیا۔ یہ بھی بہر حال قابل ذکر شخص ہے:

زنور عشق باشد خسروی را دل چنان روشن
کہ شمع مرقد او میتوان کرد استخوانش را

میر دوری

اس کا نام سلطان بایزید اورخطاب کاتب الملک ہے۔ ہندستان میں خط نستعلیق کو اس سے بہتر کوئی لکھ نہیں سکا۔ شعر گوئی میں بھی خاصہ ملکہ حاصل تھا۔ آخری عمر میں حج سے بھی بہرہ مند ہوا۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

گہ در درون جانی گہ در دل حزینی
از شوخی کہ داری یک جانمی نشینی

رباعی

تا از نظر آن یار پسندیدہ برفت
خون دلم از دیدۂ غمدیدہ برفت
رفت از نظر و ز دل نرفت این غلطست
کز دل برود ہر آنچہ از دیدہ برفت

خوش خطی میں میر موصوف کا ایک شاگرد خواجہ ابراہیم حسین احدی میرا ہم سبق تھا یہ شہر بلوط کے بزرگوں کی اولاد میں سے اور شیخ عبد الرحمٰن لاہوری بلوطی کے قریبی لوگوں میں سے ہے۔ بزرگی اور ولایت میں اپنے زمانہ کا شہرہ آفاق شخص تھا۔ عین جوانی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہی سال میں تھوڑے سے فرق سے مجھے اس کی اور میرزا نظام الدین احمد کی جدائی کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ دل کے داغ ہرے ہوگئے اور قدیم دوستوں کا غم روز بروز بڑھتا ہی جاتا ہے:

دریغا درد را مرہم ندیدم
امید وصل بود آن ہم ندیدم

اب تو افسوس کرنے کی بھی طاقت نہیں رہی۔ افسوس بھی کیا کریں، ہم سب ایک گنبد کے نیچے سردھن رہے ہیں اور جد و جہد کر رہے ہیں۔ یہاں سے نکل کر ہی ایک دوسرے سے ملنے کا موقع ملے گا۔ میں نے خواجہ ابراہیم کی تاریخ وفات کہی ہے:

بر موجب حکم بادشاہ کونین
در ماہ صفر خواجہ ابراہیم حسین
چون کرد سفر ز عالم پُر ستروشین
تاریخ شدش خواجہ ابراہیم حسین

وہ اسی قریبی زمانہ میں عراق سے آکر احدیوں میں شامل ہوا تھا۔ ابھی وہ کسی عہدے پر فائز نہیں ہوا تھا کہ اس نے شریف سرمدی چوکی نویس کے لیے جو احدیوں کا داروغہ تھا اور اس کی پلی ہوئی مونچھیں تھیں یہ رباعی کہی تھی:

این سادہ دل آخر احدی خواہد شد	محتاج کلاہ غولی خواہد شد
از غایت اضطرار روزی صد یار	قربان بروت سرمدی خواہد شد

دانہی

دانہ نیشا پور کا ایک گاؤں ہے۔ وہاں وہ کھیتی باڑی میں توکل وقناعت سے بسر کیا کرتا تھا۔ دل میں سیاحت کی سمائی اور ہندوستان کا رخ کیا۔

اس کے اکثر اشعار اسی دہقانی زبان میں ہیں لیکن فصیح زبان میں اس نے بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں۔ اس کا دہقانی کلام پڑھنے لکھنے میں دشوار تھا اس لیے وہ زبان زد نہ ہوسکا:

الفتی بسکہ شعربد می گفت
نیک زوباطن لو ندانش
چرخ چوگانی ازقضا بشکت
پست بنی بجائی دندانش

دوائی

یہ حکیم عین الملک کا تخلص ہے۔ ماں کی طرف سے علامہ جلال الدین دوانی کی اولاد میں سے ہے۔ بڑی خوبیوں کا مالک اورممتاز شخصیت رکھتا تھا۔ آنکھ کے علاج میں اس کا کوئی ہمسر نہیں۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

ترا برغم نہ ژالہ برمن دل تنگ می بارد	زتاثیر حوادث بر سرمن سنگ می بارد
چنان تندرست با اہل دل آن شوخ جفا پیشہ	کہ گاہ آشتی از غمزۂ او جنگ می بارد
دوائی از در احسان او کفر است نومیدی	کہ ابر فیض او فرسنگ درفرسنگ می بارد

اسد ہر شب بگردون نالہ ام با آہ و زاری ھا
سینہ روزی چومن یارب چہ سازد با چنین شب ھا

رفیعی

اصل نام میر حیدر معمائی اور ان کا وطن کا شان ہے۔ نہایت سمجھ دار، ذہین اور ہنر مند آدمی ہے۔ خاص طور سے فن معمہ اور تاریخ کہنے میں اس کا کوئی جواب نہیں۔ ان دونوں کے سوا وہ کسی اور فن کو اہمیت نہیں دیتا۔ ایک دن شیخ فیضی نے اس سے کہا کہ ہندوستان میں مُعمہ متروک ہوگیا ہے اور اب اسے عیب سمجھتے ہیں۔ اس نے کہا: ''میں نے ولایت میں برسوں اسی مُعمہ گوئی میں اپنی جان کھپائی ہے۔ اب جب کہ اس فن میں بوڑھا ہو گیا ہوں اسے کس طرح چھوڑ سکتا ہوں؟''

خواجہ حبیب اللہ کے ساتھ گجرات سے لاہور آ گیا۔ شاہی سرکار اور دوسرے عہدہ داروں سے تھوڑی بہت رقم لے کر وطن کے لیے رخصت ہوا لیکن ہرمز پہنچنے، پر کچھ دن مکران کے قریب اس کا جہاز ٹوٹ گیا اور اس کی ساری پونجی دریا میں بہہ گئی۔ اس کے سامان میں شیخ فیضی کی بے نقط تفسیر کے چند جزو بھی تھے جو علماء کی توقیعات سے آراستہ تھے۔ یہ جزو اور فیضی کا دیوان جو اس نے ولایت میں شہرت کی خاطر روانہ کیا تھا، سب طوفان کی نذر ہو گیا۔

رفیعی کے اشعار کا نمونہ:

نازک دلم ای شوخ علاجم چہ توان کرد
من عاشق معشوق مزاجم چہ توان کرد
من بتابوت رفیعی اشکہا بردم کہ تو
ھمرھش گریان ترا از اہل عزامی آید

رہائی

یہ شیخ زین الدین خوافی کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا دیوان بھی بہت مشہور ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

کردی امید وارم از لطف خویش یارا
بر تافتی زہر سو روی امید مارا

سفر کردم کہ شاید خاطرم ازغم بیا ساید چہ دانستم کہ صد کوہ غم در راہ پیش آید

روغنی

یہ ایک مسخرہ تھا، بے حیائی اسکا پیشہ تھا۔ اس کی بے شمار ہزلیات ہیں۔ برسوں بادشاہی ملازمت میں رہا۔ اس کے دیوان میں تقریباً 3 ہزار شعر ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے:

حیات جاودان دارد شہید تیغ بیدادش
مگر در آبگیری آب حیوان دادہ استادش

از جفای او نمی نالم می ترسم کہ رقیب
یا بد از تاثیر فریادم کہ از بیداد کیست

اس نے 980ھ/1572ء میں جبکہ شاہی لشکر گجرات جارہا تھا، آبوگڑھ کے قلعے کے قریب اُس کا انتقال ہوگیا اور اسی جگہ دفن بھی ہوا۔ قاسم ارسلان نے اس کی تاریخ وفات کہی ہے۔

''دادہ چو سگی بکافرستان جان''

زین خان کوکہ

ہندی ساز اور دف کے بجانے اور موسیقی کی تمام قسموں میں بے مثل ماہر اور یکتائے روزگار ہے۔ خوش خطی کے سوا دوسری اور خوبیاں نہیں رکھتا ہے لیکن کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے۔ اس کا شعر ہے:

آرام من نمی دہد این چرخ کج خرام
تا رشتۂ مراد بسوزن در آورم

سلطان سپلکی

سپلک قندھار کا ایک گاؤں ہے۔ ہندوستان کے لوگ اسے سپلکی کہتے تھے۔ سپلک ایک گھناؤنا جانور ہے۔ وہ بڑا تنگ ہوتا تھا اور کہتا تھا کہ عجیب مصیبت ہے لوگ مجھے ایسے گندے جانور کے نام سے پکارتے ہیں۔

نہایت آزاد خیال قلندر آدمی تھا۔ ایک دن ملا قاسم کاہی سے اس نے پوچھا آپ کی عمر کیا ہے؟ انھوں نے کہا'' خدا سے 2 سال چھوٹا ہوں'' سلطان نے کہا: ''محترم ہم تو سمجھتے تھے آپ 2 سال بڑے ہیں آپ اپنی عمر گھٹا کر بتا رہے ہیں'' مولانا قاسم ہنس پڑے اور کہا تم ہماری صحبت کے قابل ہو۔ واضح رہے کہ ملا قاسم کاہی دوسروں کی باتیں نقل کرنے کے عادی تھے۔ یہ بات بھی شیخ بایزید بسطامی کی تھی جو اس موقع پر جڑ دی۔ شیخ نے کہا تھا ''انا اقل من ربی سنتین'' اور یہ بس ایک صوفیانہ ترنگ تھی۔ ان کے اس قول کی عارفوں نے یہ تاویل کی ہے کہ خدا سے دو سال کم ہونے کا مطلب دو صفتوں میں کم ہونا ہے کیونکہ بندہ اللہ کی تمام صفات کا مظہر بن سکتا ہے بجز وجوب و قدرت کے۔ ظاہر ہے بندہ حدوث و عجز سے بچ نہیں سکتا۔ بہر حال خدا اس قسم کی صوفیانہ حشویات اور شطحیات سے بچائے رکھے۔

سلطان نہایت موزوں طبع آدمی تھا۔ خان زمان کا تخلص بھی سلطان تھا۔ جب سلطان نے اس کی شان میں ایک قصیدہ کہا اور پیش کیا تو خان زمان نے ایک ہزار روپیہ اور خلعت بطور صلہ اس کے پاس بھجوایا اور اس سے درخواست کی کہ اپنا تخلص ہماری خاطر بدل لو۔ اس نے صلہ واپس کر دیا اور کہا میرا نام سلطان محمد باپ کا رکھا ہوا ہے۔ اسے میں کیسے ترک کر سکتا ہوں۔ نیز میں تم سے کئی سال پہلے اس تخلص پر شعر کہتا رہا ہوں اور اسی تخلص سے مشہور بھی ہوں۔ خان زمان کو بڑا غصہ آیا اور اس نے کہا اگر تم یہ تخلص نہیں چھوڑو گے تو میں ہاتھی کے پیر سے بندھوا دونگا نہ صرف یہ بلکہ وہ اس غرض کے لیے ہاتھی کو لے آیا۔ سلطان نے کہا: ''میری بڑی خوش نصیبی ہے کہ میں شہادت کا درجہ پاؤں''۔ خان زمان نے

بہت ڈرایا دھمکایا۔ آخر مولانا علاؤالدین لاری خان زمان کے استاد نے کہا کہ جامی کی کوئی غزل محفل میں پڑھی جائے۔ اگر سلطان فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہہ دے تو پھر اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے وگرنہ تم جو چاہتے ہو اس طرح سے سلوک کرو۔ چنانچہ جامؔی کی یہ غزل پیش کی گئی:

دل خطت را رقم صنع الٰہی دانست
بر سر ساد رخان حجت شاہی دانست

سلطان محمد نے فی البدیہہ اس کے جواب میں غزل کہی جس کا مطلع ہے:

ہر کہ دل را صدف سر الٰہی دانست
قیمت گوہر خود را بکماہی دانست

اگر چہ یہ غزل اتنی زیادہ اچھی نہ تھی، لیکن خان زمان سن کر بھڑک اٹھا۔ بڑی تعریف وتوصیف کی اور بہت سارے تحفہ وتحائف دے کر رخصت کیا۔ اس واقعہ کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکا اور خان زمان سے اجازت لیے بغیر بدایوں چلا گیا۔ اس کے بعد جگہ جگہ کی سیر کرتا رہا اور آخر دکن چلا گیا۔

جس سال دکن کے چاروں حکمرانوں نے متحد ہو کر بیجانگر پر چڑھائی کی تھی اور ایک سخت لڑائی کے بعد اسے فتح کرلیا تھا اور اس قدیم اورمشہور بُت کدے کو ڈھا دیا تھا۔ اسی سال سلطان دکن میں تھا اور اس لشکر کے ہمراہ جنگ میں شریک تھا چنانچہ اسے بڑا مال غنیمت بھی ہاتھ لگا تھا۔ اس کے بعد پھر اس کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا، کیا ہوا؟۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے بڑی بے مروتی کا ثبوت دیا تھا کہ خان زمان جیسے قدردان آدمی کی درخواست ٹھکرادی اور بزرگوں کے منہ آنے کی کوشش کی۔

ان کی غزل کا مطلع ہے:

زاھدا عرفان بدلق وسبحہ ومسواک نیست
عشق پیدا کن کہ اینہا داخل ادراک نیست

سلطان

یہ خان زمان کا تخلص ہے۔ اس کے حالات ہم نے اس منتخب میں تفصیل سے بیان کیے ہیں، بلکہ ہندوستان کی ساری تاریخوں میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ اس لیے مزید تفصیل کی ضرورت نہیں۔

اس کا شعر یہ ہے:

باریک چو موئیت میانی کہ تو داری
گویا سران موست دہانی کہ تو داری

اس کا بھائی بہادر بھی شعر کہتا تھا۔ ملا آصفی کی مدح میں اس نے اچھے شعر کہے ہیں۔

مُلاّ آصفی کا مطلع ہے۔

بر ماشب غم کاربسی تنگ گرفتہ   کو صبح کہ آئینہ مازنگ گرفتہ

بہادر خاں نے کہا ہے:

آن شوخ جفا پیشہ بکف سنگ گرفتہ   گویا بمن خستہ رہ جنگ گرفتہ

سیرؔی

قاضی اور فقیہ ہونے کے باوجود خوش طبع شاعر تھا۔ علم عروض، قافیہ اور مُعمّہ میں بے مثل مہارت رکھتا تھا۔ ہندوستان آنے کے بعد حج کے لیے چلا گیا۔

رباعی

سیری بحریم جان و دل منزل کن
قطع نظر از صورت آب و گل کن

جز معرفست خدائی ہیچ است ہمہ
بگذر ز ہمہ معرفتی حاصل کن

سپہری

خواجہ بینا کے بھتیجے میرزا بیگ کا تخلص ہے، یہ صاحب دیوان شاعر ہے۔ یہ اشعار اس کی روشنی طبع کا نمونہ ہیں:

از تبسم دفع زہر چشم خشم آلود کن
کز نمک سازند شیرین چون بود بادام تلخ

سیاقی

یہ بیرم خان کے یہاں ملازم تھا۔ بیرم خان نے اس کے ذریعہ حضرت امام رضا کے آستانہ کے لیے 7 ہزار روپیہ کی نذر بھجوائی تھی۔ اس نے یہ ساری رقم خرچ کردی۔ جس کے لیے شاہ طہماسپ نے اسے قید کردیا۔ 974ھ/1566ء میں وہ قید سے رہا ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رخسارۂ زردم چو در آئینہ عیان شد
آئینہ زعکس رخ من برگ خزان شد

مہتی

اس کا باپ تیر ساز تھا۔ اس پیشہ کی مناسبت سے اس نے یہ تخلص رکھا تھا۔ مرزا عزیز کوکہ کی خدمت میں تربیت پائی تھی۔ 12 سال کی عمر سے ہی شعر کہنے لگا تھا۔ اس لیے اس کی مشق بڑی اچھی تھی اور جلدی ہی انھوں نے شہرت پائی۔

ای تو سلطان ملک زیبائی
ما گدا پیشگان تماشائی

لشکر خان میر بخشی نے جو خراسانی اور کٹر رافضی تھا اور اپنا رفض چھپائے رہتا تھا، اس

سے پوچھا ''ملا کیا سنی ناپاک بھی ہوتا ہے''۔؟ میرزا عزیز کوکا نے ترکی بہ ترکی کہا ''ہاں، جیسے تم!''

قاسم ارسلان نے مہمی کے بارے میں کہا ہے:

مہمی و ظریفی و فریدون وزدند
چون گربہ و چون شغال ومیمون وزدند

سقا

شیخ جامی کے مریدوں میں سے ہے۔ یہ ایک فانی مشرب درویش تھے۔ جذب و حال طاری رہتا تھا۔ آگرہ کے گلی کوچوں میں چند شاگردوں کے ساتھ لیے لوگوں کو پانی پلایا کرتے تھے۔ ان کے اشعار بھی پانی کی طرح رواں دواں تھے۔

ان کے ایک پیرزادہ ہندوستان آئے تو جو کچھ ان کے پاس تھا انھوں نے پیرزادہ کی نذر کردیا اور خود سراندیپ[87] کی طرف چلے گئے۔ سیلون[88] کے راستہ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں اس کفرستان میں ایک شخص نے جسے حضور اکرم ﷺ نے خواب میں اشارہ کیا تھا غیب سے ظاہر ہوا اور سقا کی تجہیز وتکفین کی۔

انھوں نے اپنے کلام کے چند دیوان مرتب کر لیے تھے، لیکن جب بھی ان پر جذب طاری ہوتا تھا اپنے دیوان کو دھو ڈالتے تھے۔ جو کلام بچ رہاوہ بھی اچھا خاصہ دیوان ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بخال عارضش در ہرنظر حیرانی دارم
بدور نقطہ چون پرکار سرگردانی دارم

سپاہی

خواجہ کلاں بیگ کا پوتا ہے۔ یہ رباعی اس کی ہے:

افسوس کہ وقت گل یزدی بگذشت
فریاد کہ تا چشم کشودی بگذشت
بی چشم و خطت بنفشہ نرگس را
ایام بکوری و کبودی بگذشت

978ھ/1570ء میں آگرہ میں ان کا انتقال ہوا۔

سرمدی اصفہانی

کچھ عرصہ تک شاہی چوکی نویس رہا، اب شریف آملی کے ساتھ بنگالہ میں مقرر ہے۔ پہلے فیضی تخلص کرتا تھا جب بادشاہ کی مجلس میں شیخ فیضی کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوا اس نے اپنا تخلص سرمدی رکھ لیا۔ موزوں طبع آدمی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

تا تیغ ناز آن بت مغرور شد بلند   صد گردن نظارگی از دور شد بلند
می در سرو گل دربغل آئی چو در کاشانہ ام
بہر تماشا بشگفد خاشاک محنت خانہ ام

ساقی جزائری

یہ عرب ہے۔اس کا باپ شیخ ابراہیم بڑا فاضل فقیہہ تھا۔ شیعہ اس کو اپنے مسلک کا مجتہد سمجھتے تھے۔ مشہد کا رہنے والا تھا۔ ساقی بھی مشہد میں پیدا ہوا۔ کچھ علم حاصل کرنے کے بعد دکن پھر وہاں سے ہندوستان آیا۔ اب وہ بنگالہ میں رہتا ہے۔ نہایت خوش طبع اور شیرین کلام شاعر ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

زجانم گاہ گریہ آہ درد آلود می خیزد
بلی چون آب بر آتش فشانی دود می خیزد

سیدی

اس کا اصل نام سید شاہی ہے، جس کا تذکرہ ہم(89) کر چکے ہیں۔ یہ گرمسیر کے سیدوں میں سے ہے۔ جو کالپی میں متوطن ہوگئے تھے۔ سیدی خوش کلام شاعر ہے، تصوف سے بھی بہرہ مند ہے اور شیخ اسلام چشتی کا مرید ہے۔ کچھ عرصے تک بادشاہی ملازمت میں رہا۔ مختلف امراء کے ساتھ بسر کرتا رہا۔ اب کابل میں قلیچ محمد خان کے پاس ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے۔

اول سرگرمی عشقست و دل در اضطراب
ھمچو طفلی کہ تپد ہنگام بیداری ز خواب

گل حمائل کرد تا سروسہی بالای من　　من زگل در رشک وگل در غیرت از پیراھنش

نیافت از دل گم گشتہ ام نشان کہ چہ شد
نسیم اگر چہ دو زلف تو تار تار کشاد

شاہ ابو المعالی

ان کا ذکر ہم کر آئے ہیں۔ یہ بھی نہایت خوش طبع شاعر تھے اور شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ رکھتے تھے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

جان من ہم محبت اغیار بودن نیک نیست　　جز من بیکس بہر یک یا بودن نیک نیست
خوش بود آزردن عاشق گہی کہ لطف نیز　　دائماً بر مسند آزار بودن نیک نیست
بر امید وصل خوش می باش در کنج فراق　　نا امید از دولت بیدار بودن نیک نیست

جُدا ز وصل توای دلبر یگانہ شدم
اسیر بند فراقت بہر بہانہ شدم

شیری

پنجاب کے ایک گاؤں کوکووالا کا رہنے والا ہے۔ اس کا باپ ایک بہت بڑے اور مشہور قبیلے ماجیانؔ کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اپنی ماں کے متعلق کہا کرتا تھا کہ سیدزادی ہے۔ شیری نے فطرت عالی اور طبع رسا پائی ہے اور وضع کا پابند ہے۔ اس کے باپ مولانا یحییٰ کی تربیت سے بہت سی خوبیاں پیدا ہوگئیں۔ اس کے والد کا مطلع ہے:

ھست ازباران لطف ای کریم کارساز
در دل دانا ہر یک قطرہ صد دریای راز

شیری کو شعر کہنے پر پوری قدرت حاصل تھی، چنانچہ اس کا دعوی تھا کہ اس نے ایک رات میں 3 غزلیں کہی ہیں۔ ایک دن وہ محفل میں اپنے دیوان کا ایک قطعہ پڑھ رہا تھا۔ اس میں یہ مصرع بھی تھا:

''چار دفتر در آب چناب انداختم''

شیری نہایت خوددار، دردمند اور فقیر منش آدمی تھا۔ اس بات کی طرف اس نے اپنے اشعار میں اشارہ کیا ہے:

صاحب خوان فقیرم و ہرگز
ھمت من نخواہد از جانان
قرض ہندو بشرط دہ پنجاہ
بہ کہ انعام این مسلمانان

خاص طور سے ''شکوہ و شکایت'' کا مضمون اس سے بہتر کسی ہم عصر نے نہیں باندھا۔

گذشتگان ہمہ عشرت کنید کا سودید
ازان کہ عیش بر افتاد از میانۂ ما
ایا کسان کہ پس از ما رسید فاتحۂ
بشکر آنکہ نبودید در زمانۂ ما

بلا شبہ قصیدہ اور قطعہ گوئی میں وہ اپنے تمام معاصرین پر سبقت لے گیا ہے۔ دوسروں کی فصاحت اس کے سامنے ماند پڑ گئی اور اس کے کلام نے سب کے لبوں پر مہر لگادی۔ جیسا کہ خود اس نے اس قطعہ میں کہا ہے:

اگر از شعر شیریم پرسی　　گویم از درمیانہ انصاف است
نہ ہمہ شعر شاعری سرہ است　　نہ ہمہ بادہ کسان صاف است

اس کا دیوان بہت مشہور ہے۔ جس زمانہ میں وہ مہابھارت کے ترجمہ کے لئے مقرر کیا گیا تھا تو کہا کرتا تھا کہ یہ فرسودہ داستانیں بخار میں مبتلا مریض کے خواب ہیں۔ ملا شیری نے 994ھ/1586ء میں یوسف زئی کی پہاڑی میں وفات پائی۔

شکیبی اصفہانی

وہ حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ بیرم خان کے لڑکے خان خانان کے ساتھ رہتا ہے۔ سلیقۂ شعر سے بہرہ مند ہے:

هنوز نالہ شب ھای من اثر دارد　　کمان شکستۂ من تیر کارگر دارد
دلم بہ ھجر در آویخت رحمتی ای بخت　　کہ دست عربدہ باکوہ در کمر دارد
تو گل بدامن یاران فشان کہ خستۂ ھجر　　بنوک ہرمژہ صد پارۂ جگر دارد

اے خدا جنس مرا از غیب بازاری بدہ
می فروشم دل بدیداری خریداری بدہ

شجاعی

یہ سیف الملک حکیم کا تخلص ہے۔ وہ میر سید محمد جامہ باف کا علاج کررہا تھا۔ میر نے اس کے بارے میں کہا تھا:

سیف قاطع بندگان مولوی سیف الملوک　　آنکہ طرح نو بحکمت درعمل آوردہ بود

دی اجل میگفت بهر بران جان مریض　　　　هر کجا رفیتم پیش از ماعلاجی کرده بود

یہ اشعار مولانا شجاعی کے کلام کا نمونہ ہیں:

زسودائی بتان داری سری باموئی ژولیده
مسرت گردم کہ باعاشق سری داری و سودائی
تازلف افتادہ بر رخسار جانان من است
یا مگر بر روی آتش رشتہ ٴ جان من است

شعوری تربتی

یہ ایک طالب علم ہے:

اس کے مشق سخن کا نمونہ یہ شعر ہیں:

ای کہ زبیم ھجر او در سکرات مردنی　　　　مژدہ کہ آن مسیح دم میرسدو رسیدہ است
مراز خانہ بردن ھر دم آرزوی تو آرد　　　　گرفتہ شوق گریبان من بسوی تو آرد

ملا صادق حلوانی سمرقندی

نہایت بلند مرتبہ عالم تھا۔ نہایت خوش کلام او ر صاحب فضل، ان کا مرتبہ اس سے کہیں زیادہ بلند ہے کہ اس کا ذکر شاعروں کے ذیل میں کیا جائے۔ لیکن افسوس ہم پر اور اس پر بھی کہ ایسا کرنا پڑا۔

سنتے ہیں وہ بڑی کوششوں سے ہندستان آیا، پھر یہاں سے بیت اللہ کی زیارت کے لیے گیا۔ وہاں سے 978ھ/1571ء میں لوٹ کر آیا ور اپنے وطن چلا گیا۔ مرزا محمد حکیم نے اس سے کابل میں ٹھہرنے کی فرمائش کی تھی اور اس سے درس لینے لگا تھا۔ ان دنوں وہ ما وراء النہر میں درس وتدریس میں مصروف ہے۔ شعر کا بڑا اچھا سلیقہ ہے، اس کا ذوق نہایت بلند ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

دل گم شد و نمی دھدم کس نشان ازو
در خندہ است لعل تو دارم گمان ازو

جز درت جای دل آوارہ را منزل نشد　　از درت گفتم شوم آوارہ اما دل نشد

ھمچو خورشید از سفرای ماہ سیما آمدی
خوب رفتی جان من بسیار زیبا آمدی

صبوحی

چغتائی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ نہایت بے قید اور لا ابالی شخص تھا، شعر خوب کہہ لیتا تھا۔

دلم کہ مہر تو دارد ہمین تو میدانی
نگفتہ ام بکس این راز خدادانا ست

اس نے آگرہ میں 973ھ/1565 میں وفات پائی۔ تاریخ وفات ''صبوحی میخوار'' سے نکلتی ہے۔

صالحی

ہرات کا رہنے والا ہے، شعر و انشاء میں بڑا اچھا سلیقہ ہے۔ علم سے بھی بے بہرہ نہیں، اچھا خوش نویس ہے۔ عرصے تک منشیوں کا کام کرتا رہا، پھر اپنے وطن واپس چلا گیا۔
اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شب فراق تو در خانہای دیدہ مرا
نبستہ خون جگر آن چنان کہ خواب در آید

صادقی

قندھار میں پیدا ہوا، اصل تعلق ہرات سے ہے۔ کچھ عرصے تک ہندستان میں رہا، پھر واپس وطن چلا گیا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

مرا از بسکہ از تیغ تو در تن چاک می افتد
بہر پہلو کہ می رفتم دلم بر خاک می افتد

صرفی

یہ شیخ یعقوب کشمیری کا تخلص ہے۔ اس کا ہم کچھ حد تک ذکر کر آئے ہیں۔ شیخ بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ تھے۔ اس نے تصوف اور دوسرے علوم وفنون میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ اس کی طبیعت بڑی شاعرانہ تھی۔

بر رخ فگند چاشت گہ آن مہ نقاب را
پیش از زوال شام رسید آفتاب را

آخری عمر میں اس نے تفسیر کبیر کی طرح ایک تفسیر لکھنے کا ارادہ کیا تھا، کچھ لکھ بھی لیتا تھا، لیکن اپنے وطن میں انتقال کر گیا۔

صرفی ساؤجی

کچھ عرصہ گجرات میں خواجہ نظام الدین احمد کے ساتھ رہا تھا۔ پھر لاہور چلا آیا درویشانہ وضع میں رہتا تھا۔ جس زمانہ میں شیخ فیضی دکن میں مقرر ہوکر چلا گیا تھا تو یہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ دکن ہی میں فوت ہوگیا۔ مگر یادگار ایک دیوان چھوڑ گیا۔ قصیدہ وغزل میں خاص رنگ اور طرز کا مالک تھا۔

زراہ کعبہ ممنوعم و گرنہ میغر ستادم
کف پای بزحمت چینی خار مغیلانش

صبوری ہمدانی

خان زمان کے قتل کے دن یہ قید ہوا تھا۔ قتل ہونے سے تو بچ گیا مگر موت سے جان نہ بچا سکا۔ اس کے اشعار اوسط درجہ کے ہیں۔

سپردم جان من بی صبر و دل از داغ ہجرانش   چہ در دست این کہ غیر از جان سپردن نیست درمانش
چو سوز آشکارا پیش او ظاہر نمی گردد   جہان آگاہ سازم از جراحتہای پنہانش
چو در شبگون لباس آن مہ بسیر شب بزون آید   فروغ صبح ظاہر گردد از چاک گریبانش

کاش از خنجر من سینۂ او چاک شود
تا ببیند دل پاکم دل او چاک شود

صالح دیوانہ

تھا تو دیوانہ لیکن دربار سے عاقل کا خطاب ملا ہوا تھا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ جب تک خضر علیہ السلام کے نام پر کھانے کے 5 تھال کسی دریا یا چشمہ پر نہیں بھجوا دیتا، کھانا نہیں کھاتا تھا۔ یہ کام قاسم ہندی کے سپرد تھا جو ایک مہاوت کا لڑکا ہے۔ یہ بھی شاعر ہے لیکن نہایت کمینہ آدمی ہے۔ قاسم ہندی یہ تھال اٹھوا کر باہر لاتا اور شہدوں اور قلندروں سے کہتا، کھاؤ اور مزے اڑاؤ۔ صالح دیوانہ اس سے پوچھتا تھا۔ ''تم نے خواجہ خضر کو بھی کھانے پر دیکھا؟'' وہ بے حیا جواب دیتا: ''ہاں ہاں حضرت خواجہ نے تو بڑے شوق سے کھانا تناول کیا''۔ اسی طرح اور بھی جھوٹی سچی باتیں لگا دیتا۔ دیوانہ ان باتوں پر یقین کر لیتا۔

بہر حال دیوانہ موزوں طبع آدمی تھا، بس وہی مثل تھی کہ:

شعر رنگا رنگ از طبع کج حیدر کلج
ہمچنان سر میزند کز تو دۂ انبار گل

دیوانہ کا شعر ہے:

چو سودای سر زلفش بیا افگندہ زنجیرم

درین سودا بغیر از جان سپردن نیست تدبیرم

کچھ عرصے تک تو وہ بارگاہ شاہی میں مقرب و معزز رہا، پھر معتوب ہو کر کابل چلا گیا۔ دوبارہ ہندستان آیا۔ حضرت سلطان المشائخ کا متولی بنایا گیا، لیکن اس نے اس منصب کو قبول نہ کیا اور اجازت لے کر کابل لوٹ گیا۔

طارمی

نام ملا علی محدث ہے۔ مشہور ہے کہ یہ ملا صادق کا بھائی ہے۔ اس نے عرب میں حدیث کا علم حاصل کیا تھا۔ نہایت متقی اور پرہیز گار آدمی تھا۔ ہندستان دو مرتبہ آیا تھا۔ 981ھ/1573ء میں وفات پائی۔ ملا عالم کابلی نے تاریخ وفات کہی:

دریغا کہ ناگاہ ملا علی را　　ربود از میان دستبرد حوادث
پی سال تاریخ او سال دیگر　　بگو مردہ ملا علی محدث

شعر کہنے کا سلیقہ تھا، کبھی کبھی اس کی شوخ طبعی اشعار کا جامہ پہن لیتی تھی۔

تن خاکی چنان افسردہ شد از داغ ھجرانم
رود بیرون چو گرد از جامہ گردامن برافشانم

طریقی ساوجی

بڈھا کھوسٹ اور مسخرہ تھا۔ اپنی بے حیائی کی وجہ سے دربار میں سارے شاعروں کو تنگ کرتا رہتا تھا۔ آخر حج کی توفیق ہوئی۔ گیا اور وہیں پیوند خاک ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

عشق بازی را بغیر از جان سپردی پیشہ چیست
من کہ از مردن نیندیشم دگر اندیشہ چیست

کسی را جان زدست محنت هجران نمی ماند　　　اگر این است هجران هیچ کس را جان نمی ماند

درین دیار بخون خوارۂ کہ دل بستم
بدام زلف پری چہرۂ کہ افتادم

طالب اصفہانی

8 سال سے کشمیر میں مقیم ہے۔ پہلے ایک قلندر نما آدمی تھا، آخر میں ملازمت کر لی اور بادشاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اکبر نے اسے کشمیر سے چھوٹا تبت کے حاکم علی رائے کے پاس سفیر بنا کر بھیجا تھا، وہاں سے لوٹ کر آیا تو وہاں کے حیرت انگیز حالات اور نوادرات کے متعلق ایک رسالہ لکھا اور شیخ ابو الفضل کو دیا۔ اس نے رسالہ کو اکبر نامہ میں شامل کرلیا۔ نہایت دردمند اور غم گسار آدمی ہے۔ شعر و انشا میں بڑا اچھا ملکہ رکھتا ہے۔

رباعی

زهردم بفراق خود چشانی کہ چہ شد
خون ریزی و آستین فشانی کہ چہ شد
ای غافل از آنکہ تیغ هجر تو چہ کرد
خاکم بفشار تا بدانی کہ چہ شد

طالعی یزدی

خوش خط نستعلیق نویس ہے۔ کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ آگرہ میں جلد سازی کا کام کرتا تھا۔

ساقیان چند تو ان خورد غم عالم را
بادۂ پیش از کہ بیرون کنم از دل را

طفلی

ملا درویش فتح پوری کا لڑکا ہے۔ اس کا چچا ملا صالح اب خانقاہ فتح پور میں مدرس ہے۔ طفلی 13 سال کی عمر میں ہی ''شرح شمسیہ'' پڑھنے لگا تھا۔ نہایت فیاض طبع آدمی ہے۔ شعر کا ذوق بھی بڑی حد تک مناسب و عمدہ ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں رہتا ہے یہ تخلص اسی کے دربار سے اسے ملا ہے۔ بڑے شاہزادے کی ملازمت میں جو قصیدہ ان کی تعریف میں کہا ہے اس کے چند شعر یہ ہیں:

ایا شہی کہ جہان را زرہزنان خلل　　بدور معدلتت فتنہ پاسبان آمد
امید لطف تو ہست آنچنا نکہ عاصی را　　گناہ از آتش دوزخ نگاہبان آمد
تو ئی کہ مرکب عزم ترا بروز دغا　　ظفر علم کش و اقبال ہم نمان آمد
رساند نامۂ اقبال دوش مرغ شرف　　کہ صیت شہپرش از اوج لا مکان آمد
نوشتہ کاتب قدرت عبارتی کان را　　امید ترجمۂ و شوق ترجمان آمد

اس عمر میں فارسی کہنا اور سمجھنا ہی بڑی بات ہے۔ کہاں شعر گوئی اور وہ بھی اس قدر عمدہ، آثار تو یہ ہیں کہ اپنے زمانہ کے بڑے بوڑھوں کو بھی پیچھے چھوڑ جائے گا۔

ظہوری

دکن میں رہتا تھا۔ نہایت آزاد خیال اور بے قید لیکن درد مند آدمی تھا۔ امیروں کے گھر پر کم ہی آیا جایا کرتا تھا۔ شیخ فیضی اس کی اور ملک قمی کی جو ملک الکلام کے لقب سے مشہور تھا، بہت تعریف کیا کرتا تھا۔ یہ دونوں فیضی کے ساتھ پا یتخت لاہور آنا چاہتے تھے لیکن برہان الملک راضی نہ ہوا۔ ان دنوں سننے میں آیا کہ دکن میں غدر ہوا تو وہاں کے لوگوں نے ان دونوں کو قتل کر دیا۔ مولانا ظہوری صاحب طرز اور صاحب دیوان شاعر گزرا ہے۔ یہ شعر اس کی یادگار ہے:

ظہوری شکوہ ات از یاربی جاست
تو بی طالع فتادی جرم او چیست

عالم کابلی

عارف تخلص تھا۔ نہایت دلچسپ، خوش مزاج، خوش اطوار مُلّا تھا۔ بحث کے دوران اور دوسرے مواقع پر ایسی باتیں کہہ جاتا تھا کہ سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ اپنی بیاض میں ''شرح مقاصد'' کی بحث پر ایک مضمون لکھ رکھا تھا۔ جگہ جگہ اشعار بھی دیے تھے۔ لکھا تھا کہ یہ عبارت میری کتاب ''قصد'' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح اس نے ''شرح تجدید'' کے جواب میں ''تجدید'' کے نام سے اور ''مطول'' پر بھی ایک دو حاشیے لکھ رکھے تھے کہ عبارت کتاب ''طول'' سے لئے گئے ہیں جو ''مطول'' اور ''اطول'' کے مقابلے کی کتاب ہے۔ اس نے ہندستان کے مشائخین کے حالات میں بھی ایک تذکرہ لکھا تھا۔ اس میں جس مجاور اور فقیر سے بھی کوئی بات سنی درج کر لی اور کچھ تو بس اندازہ پر اضافہ کر دیا۔ اس کا نام رکھا'' وفتح الولایہ'' لوگوں نے کہا: ''بھائی اس واؤ عطف کا معطوف کہاں ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''معطوف معطوف علیہ میں چھپا ہوا ہے جس کا نکالنا ممکن نہیں۔ اگر تم ''ولایہ'' کے واؤ کو زبر سے پڑھو تو پتہ چلے گا''۔ مُلّا ہمیشہ قاضی خان بدخشی پر اس وجہ سے رشک کیا کرتا تھا کہ سجدۂ تعظیمی ایجاد کرنے کا سہرا اس کے سر بندھ گیا تھا۔

ایک دن فتح پور میں مجھے[90] اور نظام الدین احمد کو صبح صبح بڑا اصرار کر کے اپنے گھر لے گیا۔ اشتہا بڑھانے والے معجون اور اپنی کتابوں کا بستہ لے کر بیٹھ گیا۔ ہم صبح سے دوپہر تک بھوکے بیٹھے رہے، کہنے سننے کا کوئی موقع نہیں ملا تھا۔ آخر میرزا سے رہا نہیں گیا اور وہ بول اٹھے: ''کچھ کھانے کے لیے بھی ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''میں تو اس خیال میں تھا کہ تم لوگ کھانا کھا کر آئے ہو، میرے پاس ایک بکری کا بچہ ہے اگر فرمائیں تو ابھی ذبح کردوں''۔ ناچار ہم[91] اٹھ کر اپنے گھر چلے آئے۔ اس کی ان حرکتوں پر آخر اسے کیا سمجھا جائے؟

اس نے جب دیکھا کہ شیخ ابو الفضل اور قاضی خان اور دوسرے اس کے برابر کے لوگ ملاگیری سے امارت کے منصب پر پہنچ گئے ہیں تو وہ بھی ہر وقت بادشاہ سے یہ عرض

کرنے کی فکر میں رہتا تھا کہ اسے بھی فوج میں داخل کر لیا جائے۔ جب اس کی درخواست قبول نہ ہوئی تو ایک دن شام کو چوکی کی سلامی کے موقع پر مانگی ہوئی ایک تلوار کمر سے باندھے فوجی وضع بنائے نہایت مضحکہ خیز حالت میں صف سے باہر نکل کر بادشاہ سلامت کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور خلاف قاعدہ کسی واسطہ کے بغیر براہ راست اکبر سے پوچھنے لگا، ہمیں کس منصب دار کے ساتھ کھڑا ہونا چاہئے اور ہم کس جگہ سے تسلیمات بجالائیں''؟ بادشاہ اس کا مطلب بھانپ گئے اور کہا: ''تم جس جگہ ہو وہیں سے تسلیمات بجالاؤ''۔ جب یہ تدبیر بھی بے نتیجہ رہی تو ایک دن اپنی شان دکھانے کے لیے، تاکہ فوجیوں میں داخلہ مل جائے۔ عین دوپہر کے وقت گرمی میں روئی کا لبادہ جو میل سے بھرا تھا کسی کا بخشا ہوا یا مانگے کا تھا۔ پہن کر دربار میں آیا۔ مرزا کوکہ نے اس لبادہ پر بڑی پر مذاق باتیں کیں وہ بھی ان کا اسی طرح جواب دیتا رہا۔

اس کی جائے پیدائش کابل کے علاقہ میں گل بہار نامی ایک گاؤں تھا۔ اسی مناسبت سے عرصہ تک اپنا تخلص بہاری رکھے ہوئے تھا۔ جب اسے خیال آیا کہ یہ تخلص کنیزوں کے نام جیسا ہے تو بدل کر ربیعی رکھ لیا۔ اپنی مہر کے لیے اسی کا سجع بھی بنوالیا۔ بہر حال عالم کابلی موزوں طبع شاعر تھا۔ یہ چند شعر اس کے یادگار ہیں:

می پرد چشمی کہ می گشتم ازو ہر لحظہ شاد
غالباً کاہی ز دیوارش برو خواہم نہاد

چند شعر اس نے ''سلسلۃ الذہب'' کی زمین میں بھی کہے تھے اور اپنے اس مہمل مجموعہ کا نام ''سلسلۃ الجرس'' رکھا تھا۔ اس میں اُس نے اپنی بہت سی ان تصانیف کے نام دیے ہیں جو ابھی اس کے ذہن ہی میں مستور ہیں اور خارج میں نمودار نہیں ہوئے ہیں۔ ان کے نام بھی بڑے عجیب عجیب گنائے ہیں، مثلاً:

دیدہ باشی بہ نسخۂ تجدید   کہ مجدد رسید فیض جدید
کاندرو صد مواقف است نہاد   واز بیانش مقاصد است عیان

اس مسخرے پن سے قطع نظر، ملا عالم بڑا اچھا دوست تھا۔ لائق فاضل، ہمدرد، بے غرض انسان تھا۔ ہزل گو، مگر دلچسپ اور ہر دلعزیز آدمی تھا۔ امید ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے فضل وکرم سے بہشت جاودانی عطا فرمائے گا۔

میر عبدالحی مشہدی

یہ کچھ عرصے تک ہمایوں کے زمانہ میں صدر کے عہدے پر رہے۔ ان کا بھائی میر عبداللہ قانونی خاص مصاحبوں میں سے تھا۔ یہ دونوں بھائی نہایت متقی و پرہیز گار تھے۔ میر عبدالحی خط بابری سے بھی واقف تھے۔ یہ خط بابر بادشاہ نے ایجاد کیا تھا۔ اس خط میں قرآن کا ایک نسخہ لکھ کر مکہ معظمہ بھی بھجوایا تھا، اب اس خط کا نام ونشان بھی نہیں ملتا۔

میر علاء الدولہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ میر مذکور بہت سی حیثیتوں کے مالک تھے۔ خط بابری جو نہایت مشکل خط ہے ان کے سوا کسی اور نے اس قدر جلدی اور خوبی کے ساتھ نہیں سیکھا تھا۔ اس کے حاشیہ پر میرزا عزیز کوکہ نے لکھا ہے: ''میر کسی علم سے واقف نہیں تھا بس ایک ہنر جانتا تھا بس ایک خط بابری اچھا لکھ لیتا تھا، عجب سادہ لوح ہے کہ ایسی بے سر و پا حکایتیں جنھیں کوئی بچہ بھی باور نہیں کرے گا، بے سوچے سمجھے، بے موقع مجلسوں میں بیان کرنے لگتا ہے''۔ چونکہ میرزا اس سے بہت پہلے سے واقف تھا اس لیے اس کی رائے زیادہ صحیح اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ میر علاء الدولہ کے تذکرہ میں بڑی شتر گرکی پائی جاتی ہے۔

میر عبدالحی شعر سے پوری مناسبت رکھتا تھا۔ اس نے اس موضوع پر رباعی کا جواب بھی کہا تھا جسے کسی فاضل شاعر نے میرزا ہندال کے نام مربع کی طرز میں کہا تھا۔ یہ رباعی بہت مشہور ہے۔ بچے بھی پہلی جو چیز یاد کرتے ہیں وہ یہی رباعی ہے۔

رباعی

ای تاج بدرگاہ تو صدر ستم زماں
مداح تو باشند ہمہ اہل کمال

هند از قدمت مسخر برتو
القلب تو شد شاہ محمد ھندال

میر عبدالحی کے مزاج میں بھی بچکانہ پن تھا۔ اس نے اس کے جواب میں رباعی لکھی۔

ای تاج درت ھزار ھمچو قیصر
مدح تو بود وردِ زبان شام و سحر
القاب جہان تمام شد یارب
در حکم شاہ جہان محمد اکبر

عتابی

سید محمد نجفی نام تھا۔ دکن میں نہایت معتبر و معزز تھا۔ ہندستان آیا تو الہ آباد میں بادشاہ کے حضور رسائی ہوئی۔ وہ اکبر کو نہایت ہی لا اُبالی، بے باک اور اکھڑا اکھڑا سا آدمی نظر آیا۔ یہ بھی بات عرض میں پہنچی کہ اس نے دکن میں شاہ فتح اللہ کی ہجو کہی تھی۔ جب بادشاہ نے اس بارے میں دریافت کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا اور کہا: ''وہاں دکن میں شاہ جیسے لوگوں کو کہاں لایق توجہ سمجھتا تھا''۔ یہ بات اکبر کی بدگمانی کو اور بڑھا گئی اور اس نے اسے قید کروا دیا۔ فتح پور پہنچنے پر حکم دیا گیا کہ اس کے مسودات کی تلاشی لیں اور دیکھیں کہ اس نے اس عرصہ میں کس کس کی ہجو کہی ہے۔ بعض چیزیں بر آمد ہوئیں اور وہ 10 سال تک گوالیار کے قلعے میں قید رہا۔ آخر بڑے شاہزادے اور دوسرے مقربوں کی سفارش پر اس کو معافی دی گی اور اسے لاہور بلالیا گیا۔ رسی جل گئی تھی مگر بل نہیں گیا تھا۔ وہی بدمزاجی اب بھی موجود تھی۔

ایک دن قاضی حسن قزوینی جس کو خان کا خطاب حاصل تھا اس سے ملنے گیا، دربان نے اسے روک دیا، دربان سے لڑ بھڑ کر قاضی کی محفل میں جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا پہنچ گیا اور قاضی حسن سے کہنے لگا کہ: ''اچھا تو یہ کھانا ہے جس کی وجہ سے اہل علم کو دروازہ پر روکا جاتا ہے''۔ صاحب خانہ اور حاضرین نے بہت معذرت کی کہ

دربان نے آپ کو پہچانا نہیں لیکن عتابی نے مان کر بھی نہ مانا اور کھانے میں شرکت نہ کی۔ عربی فارسی شعر کہنے میں اچھی مہارت رکھتا ہے۔ ایک دیوان بھی مکمل کیا ہے۔ اس کے کلام کا نمونہ ہے:

در گلخن ھوا دل فرزانہ سوختم
قندیل کعبہ بہر در بت خانہ سوختم

رہائی کے بعد بادشاہ نے اسے ایک ہزار روپیہ نقد دے کر قلیچ خان کے حوالے کر دیا کہ اسے سورت سے حجاز روانہ کر دیا جائے، لیکن وہ راستہ سے بھاگ کر دکن چلا گیا اور وہاں کے حکام کے پاس پہلے کی طرح اعزاز واکرام سے رہنے لگا۔

عبیدی

نورسیدہ جوان ہے، اس کا شعر ہے:

متاع دل کہ پر سیدنم نمی ارزد
کرشمہ کہ بپرسیدنش نمی ارزم

اس کے اس شعر نے لاہور میں ہلچل مچا دی اور اسی لیے حکیم ابوالفتح نے بڑی تعریف کر کے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نے جب اس سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو اس نے اس شعر کے بجائے ایک اور شعر جس میں زمانہ کی شکایت بیان کی تھی پڑھا، جو بادشاہ کو پسند نہ آیا۔ اس کے بعد وہ اپنے شعر کے اثر کی طرح ہمیشہ کے لیے غائب ہوگیا۔

عشقی خان

یہ ترک پیرزادوں میں سے ہے۔ ''علم سیاق'' سے واقف ہے۔ کچھ عرصے تک سرکار اعلیٰ میں میر بخشی بھی رہا۔ قصیدوں اور غزلوں کا ایک دیوان جمع کیا ہے۔ ایک دن اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ میں حضور میں کلیات پیش کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت ایک نیا قصیدہ اور غزل سنانے لگ گیا۔ اس کے مضحکہ انگیز شعر جیسے بھی ہوتے تھے سب کو معلوم تھا۔ اس

لیے بادشاہ نے اسے روک دیا اور کہا ابھی رہنے دو جس وقت تم اپنی کلیات پیش کرنا ان اشعار کو بھی اس میں شامل کر لینا ہم سب کچھ ایک ہی بار سن لیں گے۔ خنجر بیگ کی مثنوی کی طرح طویل مثنوی بھی کہی ہے:

خواروبی اعتبار وزشتم من
چہ بلا مردک یاشتم من

علمی

اس کا لقب میر مرتضیٰ ہے۔ دوغلباد کے سیدوں میں سے ہے۔ خان زمان کا معتبر امیر رہا ہے۔ ایک وقت بدایوں اس کے ما تحت تھا۔ صاحب علم و فضل اور نہایت خوش طبع آدمی تھا۔ بدایوں کے اکابرین میں سے جھجھار خان نامی ایک شخص نے جس کا تخلص زاہد تھا، اپنی مثنوی کا ایک شعر جو بسم اللہ کی تعریف میں تھا اس کے سامنے پڑھا:

کنگرۂ یسین چو خندان شدہ
خندۂ او ازبُنِ دندان شدہ

میر کا شعر ہے:

ای دل ہمہ آن سگ کو خواب ندارد
از نالہ و فریاد و فغان کہ تو داری

میر عزیز اللہ

قزوین کے سیفی سیدوں میں سے ہے۔ فن سیاق اور منشی گری میں بہت ماہر تھا۔ دوسرے علوم سے بھی واقف تھا۔ کچھ عرصہ تک شاہی دیوان بھی رہا۔ جب ہندستان میں کروڑیوں کا تقرر ہوا تو وہ 5 کروڑ کی تحصیل پر سنبھل میں مقرر کیا گیا تھا اور اس صوبہ کا نظم ونسق اور مالیات کا انتظام کرتا رہا، آخر دنوں میں بادشاہی دفتر کے محاسبہ کی زد میں آگیا جو کچھ پونجی جمع کی تھی وہ سب سرکاری خزانہ میں جمع کرنی پڑی اور اسی مصیبت میں فوت ہوگیا۔ اس

کی غزلیات کا ایک دیوان ہے، ایک نظم ''شہر آشوب'' اور ایک ''منظوم نامہ'' اور ایک ''گل و مُل'' کے نام سے رسالہ ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

سبزہ خط رستہ زلعلش بسی با آب و تاب
زانکہ دایم می خورد از چشمۂ خورشید آب

چنین کا فتادہ در راہ غم و محنت چو خاشاکم
نسیم ولطف واحسانت مگر بر دارد از خاکم

میرزا عزیز کوکہ

اعظم خان کے لقب سے مشہور ہے۔ نہایت با اخلاق، نیک، صاحب علم و فضل ہے۔ امرائے شاہی میں اس جیسا سمجھ دار اور مدبر کوئی اور نہیں ہے۔ وہ پہلے کبھی شعر و شاعری میں بھی طبع آزمائی کرتا تھا۔ ان صفحات کو ہم اس کے کلام سے خالی نہیں رکھنا چاہتے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

چون نشد حاصل مرا کام دل از ناموس و ننگ
بعد ازین خواہم زدن بر شیشۂ ناموس سنگ

ای زلف چلیپائی تو زنجیر دل من
دمی عشق تو آمیختہ با آب و گل من

آگرہ میں ایک باغ ''جہاں آرا'' کے نام سے بنوایا تھا اور اس باغ میں ایک مکان نقش و نگار سے آراستہ کیا۔ کتبہ پر یہ رباعی لکھوائی تھی:

یارب بہ صفائی دل ارباب تمیز   کان نزدتو ھست خوب تر ازھمہ چیز
چون گشت بتوفیق تو این خانہ تمام   از راہ کرم فرمست مہمان عزیز

اس کے جو کارنامے ہیں وہ رہتی دنیا تک یادگار رہیں گے ان میں سب سے بڑا تو

اس کا وہ دلیرانہ حج پر جانا ہے لیکن آہ اس کا وہ لوٹ کر آنا۔

عہدی شیرازی

قصیدہ اور غزل ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ تھا۔ جب دہلی آیا تو قاضی محمد کی معزولی کے بعد جو ایک کٹر شیعہ اور بد معاش آدمی تھا حکیم عین الملک مرحوم نے لاہور میں اس عہدے پر مقرر کرانے کی بڑی کوشش کی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا بس شیخ چلی کا خواب دیکھ کر رہ گیا اور حکیم کے ساتھ دکن چلا گیا۔ حکیم کے مرنے کے بعد اس کے حالات کا پتہ نہیں چلا کہ کہاں گیا اور اس کا کیا ہوا؟

از خون لب شکوہ ام اگر ترمی شد   از روزن دیدۂ دوردل برمی شد
اشکم ہمہ شعلہ ریز آتش می ریخت   آھم ہمہ تاب دادہ اخگری شد

حکیم عین الملک جس وقت لاہور سے، بلکہ کہنا چاہیے کہ اس دنیا سے رخصت ہو رہا تھا حکیم سنائی کی یہ رباعی محفل میں پڑھی گئی:

می زن نفس کہ ہم نفس نزدیکست   وین مرغ مراد از قفس نزدیکست
تا کی گوئی کہ دورم از دلبر خویش   در خود بنگر کہ یاربس نزدیکست

عہدی کے اشعار ہیں:

آزادیٔ این مرغ قفس نزدیکست   وین شعلہ بکار خاروخس نزدیکست
از من بہزاد بال و پر بگر یزد   گرغم داند کہ باچہ کس نزدیکست

عنایت اللہ کاتب

شیراز کا رہنے والا ہے۔ ان دنوں شاہی کتب خانہ میں منتظم ہے۔ نہایت خوش طبع اور ذہین ہے۔ کبھی کبھی شعر کہہ لیتا ہے:

رباعی

افتادہ چو مرغ بی نوا در قفسم
بی ساز صدا چو دل شکستہ جرسم
با آنکہ حقیر تر ز مور و مگسم
بگرفت زتنگی دو عالم نفسم

وہ گھوڑے کی تعریف میں کہتا ہے:

کہ پویہ اعضا از بس شتاب
بہم در رود ہمچو اجزای آب

عرفی شیرازی

بلند فطرت، صاحب فہم نوجوان تھا۔ ہر طرح کے شعر بہت اچھے کہے ہیں، لیکن کچھ اتنا متکبر اور مغرور تھا کہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ بڑھاپے سے پہلے ہی فوت ہوگیا۔

جب ولایت سے فتح پور آیا تو سب سے پہلے شیخ فیضی سے اس کی دوستی ہوئی۔ شیخ نے بھی اس کے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس آخری سفر میں اٹک کے قریب فیضی کے مکان پر ہی رہتا تھا اور اس کی ضروریات شیخ کے گھر سے پوری ہوتی تھیں لیکن جیسا کہ فیضی کی عادت تھی وہ ہر شخص کے ساتھ بس ہفتہ دو ہفتہ کی دوستی کرتا تھا پھر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتا تھا۔ دونوں میں رنجش پیدا ہوگئی اور عرفی نے حکیم ابو الفتح سے دوستی کرلی اور اس کی سفارش سے خان خانان کی خدمت میں چلا گیا اور وہاں اپنے فن و ہنر کے جوہر کھلائے۔ روز بروز اس کی شعر گوئی اور مراتب میں ترقی ہونے لگی۔

ایک دن شیخ فیضی کے گھر آیا ہوا تھا،فیضی ایک کتے کے پلّے سے کھیل رہا تھا۔ عرفی نے پوچھا ''اس صاحبزادہ کا کیا نام ہے'' ؟ فیضی نے کہا: ''عرفی'' اس نے برجستہ جواب دیا ''مبارک ہو'' اس چوٹ سے فیضی، تلملا اٹھا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، چپ رہا۔ عرفی اور

حسین ثنائی نے شاعری میں بڑا نصیب پایا ہے۔ کوئی گلی کوچہ ایسا نہیں جس میں کتب فروش ان دونوں کے دیوان کو لیے ہوئے کھڑے نظر نہ آئیں۔ ان کے دیوان عراق اور ہندستان میں سب تبرکاً خریدتے ہیں اس کے برعکس شیخ فیضی اپنی کتابوں کولکھوانے، ان کو سونے چاندی کی نقاشی سے سجانے اور سنوارنے میں بے انتہا پیسے خرچ کرتے ہیں۔ لیکن کوئی اس کی کتاب کو جھوٹے منھ تک نہیں پوچھتا ہے۔ سوائے اس مسودے کہ جو وہ خود ادھر ادھر بطور ہدیہ روانہ کرتا رہتا ہے:

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

عرفی کے اشعار کا ایک دیوان ہے'' مخزن اسرار'' کی بحر میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جو بہت مشہور ہوئی ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

رباعی

فردا کہ معاملان ہر فن طلبند
حسن عمل از شیخ و برہمن طلبند
آنہا کہ دروۂ جوئی نستانند
و آنہا کہ نکشتۂ بخر من طلبند

غزنوی

یہ میر محمد خان کلال کا تخلص ہے جو بڑا عالی مرتبہ اور مشہور امیر تھا۔ اس کی محفل کبھی اہل علم اور شعرا سے خالی نہ رہتی تھی۔ سرکاری مصروفیات کے باوجود وہ شعر کہنے کا وقت نکال ہی لیتا تھا۔اس نے ایک بڑا دیوان مرتب کرلیا تھا اور بادشاہ سے کہتا تھا کہ تمہارے عہد کی بڑائی یہی ہے کہ مجھ جیسا آدمی اس عہد میں موجود ہے:

درجوانی حاصل عمرم بنادانی گذشت
آنچہ باقی بود آن ہم درپشیمانی گذشت
ای جوان جزتخم نومیدی نکشتی درجہان
موسم پیری رسید و وقت دھقانی گذشت

جس زمانے میں وہ سنبھل کا حاکم تھا اس نے شیخ سعدیؔ کی اس غزل کو طبع آزمائی کے لیے پیش کیا:

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است

اور خود اس نے اس پر یہ شعر کہا:

دمی کہ چہرۂ ساقی زیادہ گلرنگ است
بنوش بادہ برآواز نی کہ دل تنگ است

میر اماؔنی اور دوسرے شاعروں نے اپنے اپنے قرینے اور سلیقے و ہنر کے مطابق اور اس زمانہ کی زبان کے مطابق جواب دئے۔ جمال خان مرحوم بدایونی، خان موصوف کے مقرب و مصاحب تھے اور بڑے لطیف طبع آدمی تھے۔ انھوں نے جو غزل کہی تھی اس کا مطلع ہے:

ترا رخ از می عشرت مدام گل رنگ است
مرا بہ فکر و دھانت چو غنچۂ دل تنگ است

اس زمانہ میں میں[92] کانت وکولہ میں حسین خان کی خدمت میں تھا کہ رات کے وقت یہ غزل میاں جمال خان کے خط کے ہمراہ موصول ہوئی۔ دوسری صبح کو ہی خبر ملی کہ وہ سنبھل کی عیدگاہ میں عید قربان کے دن بیہوش ہوگیا اور عین جوانی میں محبوب حقیقی سے جا ملا۔ اس کی لاش بدایوں بھیجی گئی۔ اس کی تاریخ وفات ''آہ جمال خان بمرد'' نکالی گئی:

گردون در آفتاب سلامت کر انشاند
کو را چو صبح روشن اندک بقا نکرد

غباری

یہ قاسم علی ولد حیدر بقال کا تخلص ہے جو بڑا بد مزاج، مغرور اور متکبر مشہور تھا۔ اپنے آپ کو قریشی جتلاتا تھا لیکن یہ بات طے شدہ تھی کہ جس کا نسب اونچا نہیں ہوتا وہ اپنے آپ کو قریشی سے منسوب کردیتا ہے۔اس کی محفل میں اگر اس کا باپ چلا آتا تو اسے بڑی شرم معلوم ہوتی تھی اور بگڑنے لگتا تھا اس کا باپ اس سے کہا کرتا تھا تو چاہے کتنی شیخی کرلے، میں تو اپنے آگرہ والی دکان پر بیٹھتا ہوں پھل اور معجون وغیرہ بیچتا ہوں اور ہر آنے والے سے چاہے وہ پوچھے یا نہ پوچھے میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ قاسم علی خان میرا حقیقی بیٹا ہے۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟ کہنے لگے 8 اور ان کی تفصیل یہ ہے:

دو از من است و دو بی بی و دو از ہر دو
دوئی دگر کہ نہ از بی بی است و نی از من

قاسم پہلے بڑا حسین جوان تھا اور مجلس شاہی میں شعر پڑھا کرتا تھا۔ پھر ترقی کر کے بادشاہ کا نائب بن گیا اور خان کا خطاب و منصب پایا۔ وہی مثل ہے کہ ایک نے دوسرے سے کہا تونے سنا فلاں کو خان بنا دیا گیا ہے۔ اس نے جواب میں کہا اچھا ہوا وہ کمینہ اسی قابل تھا۔

میں[92] اُسے 21 سال سے دیکھ رہا ہوں کہ ہمیشہ ''متوسط'' کا سبق پڑھتا رہتا ہے اور اپنے استادوں سے زبردستی تسلیمات کراتا ہے۔ اگر کوئی تسلیم نہ کرے تو پھر اس کے ساتھ نباہ نہیں ہوسکتا۔ اس کی مار ہے کہ اس کا سبق کبھی تک ''وضع لمعنی منفرد'' کے قاعدہ سے آگے نہیں بڑھا۔ اِس کے شاعرانہ ذوق کا اندازہ اس کے اشعار سے کیا جا سکتا ہے:

ما سوای آب مائل وحمام جائی ماست
حمام خانہ ایست کہ خاص از برای ماست

1000ھ/1591ء میں ہزار حسرت اس دنیا سے چل بسا۔ اس کی تاریخ ''قاسم خاں ابلہ'' سے نکلتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق اس کی وفات 1001ھ/1592ء ہے۔ اس کے مطابق بجائے ''ابلہ'' کے جاہل کا لفظ پورا اترتا ہے۔

غربتی حصاری

صاحب دیوان شاعر ہے، کچھ پڑھا لکھا بھی ہے۔ کہا کرتا تھا کہ '' میں ایک دن ماورالنہر میں سلطان الاولیاء شیخ حسین خوارزمی کی محفل سماع میں حاضر تھا اور قوال یہ رباعی گا رہے تھے۔

عمریست کہ من زپوست پوستان تو اُم　　　در دائیرہ حلقہ بگوشان تو اُم

گر بنوازی من از خروشان تو اُم　　　ور ننوازی من ا زخموشان تو اُم

حضرت شیخ آخری بیت پر سر دھن رہے تھے۔ اس وقت اچانک ان کی صحبت کی برکت سے مجھ پر بھی ایک کیفیت طاری ہوگئی۔ میں اپنے ہوش میں نہ رہا اور میری زبان سے یہ شعر نکل گیا:

گر بنوازی مرا و گر ننوازی　　　در دائرہ حلقہ بگوشان تو اُم

یہ سن کر حضرت شیخ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ مجھے بھی وجد میں گھمانے لگے۔ اس وقت جو لذت نصیب ہوئی وہ میرے دل سے جاتی نہیں۔ 966ھ/1558ء میں آگرہ میں شیخ فرید کے مدرسہ کے قریب انتقال ہوا۔ اس کا یہ مطلع مشہور ہے:

دھان یار با من دوش رمزی گفت پنہانی

کہ من سر چشمۂ آب حیاتم ہیچ می دانی

غیرتی شیرازی

عرصہ تک ہندستان میں رہا، پھر شیراز چلا گیا۔

بقتل غیر راضی نیم زیرا کہ می دانم
اجل زہر ہلاک از خنجر جلادمن بردہ

فارغی شیرازی

یہ شاہ فتح اللہ کا بھائی ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ ایک مرتبہ ہندستان آیا تھا۔ بیرم خان خانان نے اس سے درخواست کی کہ: ''فارغی شیخ ابو الواجد خوانی کا تخلص ہے اور مجھے ان سے بڑی عقیدت ہے، اس لیے تم اپنا تخلص فایقی رکھ لو''۔ کچھ عرصہ تک تو اس نے فایقی ہی تخلص رکھا لیکن جب عراق گیا تو اپنا پہلا تخلص اختیار کر لیا۔ دوسری بار ہندستان آیا اور یہیں پیوند خاک ہو گیا۔ اس کا لڑکا میر تقی علم ہیئت اور نجوم میں شاہ فتح اللہ کا قائم مقام تھا۔ میں[92] نے اصطرلاب کے 20 باب اسے پیش کیے تھے۔ نہایت بلند فطرت اور با ہمت آدمی تھا۔ اس کا بھائی میر شریف بھی بڑا عالم و فاضل تھا۔ میر تقی کہا کرتا تھا میرے خاندان میں ہم دو بھائی اور شاہ فتح اللہ سنی مذہب کے پیروکار ہیں۔ باقی سب کٹر شیعہ ہیں۔

یہ شعر میر فارغی کے ہیں

خوش آن کز وعدہ ات خوش حال درمحنت سرای خود
نشینم منتظر ساعت بہ ساعت سوی در بینم

بجای میر ساند عشق آخر آشنائی ھا — کہ عاشق خویش را بیگانہ باید از جدائی ھا
برتن خاکی مجنون نبود داغ عیان — کز پی قافلہ لیلی است برد ماندہ نشان

فہمی طہرانی

بڑا جہان نورد سیاح تھا۔ ہندستان آنے کے بعد ولایت چلا گیا۔ موزوں طبع آدمی تھا۔

زعشق آن شعلہ خواہم در تن غم پرور افتد
کہ تا گریم زسوزش آب در خاکسترم افتد

دل را باحتمال پیامش و ہم قرار   ہر چند این محال میسر نمی شود

فہمی سمرقندی

یہ خوش طبع معمہ گو شاعر نادری سمرقندی کا بیٹا ہے۔ ہندستان آیا تھا لیکن واپس چلا گیا۔

تا خاصیت می کن پیر مغان گفت
از تو بہ پشیمان نہ چنانم کہ توان گفت

فکری

انکا اصل نام سید محمد جامہ باف ہے اور میر رباعی کے نام سے مشہور ہے۔ رباعیات میں وہ اپنے زمانہ کا خیام تھا۔ جونپور کے سفر میں 973 ھ/1565 ء میں فوت ہوا۔ اس کی تاریخ ''میر رباعی سفر نمود'' سے نکالی گئی ہے:

رباعی

دارد فکری سری کہ سامانش نیست   دردیست بدل نہان کہ درمانش نیست
عمریست کہ پا کردہ ز سر حد رہ عشق   سر کردہ رھی کہ ہیچ پایانش نیست

فنائی

چغتائی کنیز زادہ ہے۔ بہت زیادہ سفر کیے ہیں۔ حرمین کی زیارت سے بھی مشرف ہوئے۔ لڑائی میں بہادری کی وجہ سے خان کا خطاب حاصل کیا ہے بعض وجوہ کی بنا پر اس منصب سے معزول کر دیا گیا۔ کہتا تھا 3 شین یعنی شمشیر، شعر اور شطرنج کوئی مجھ سے جیت کر نہ جا سکا ہے۔ اس کی بات پر اکبر نے برجستہ کہا: '' شیطنت کا شین بھی''۔ کچھ عرصہ تک قید میں رہا۔ رہائی پائی تو دیوانہ ہو گیا اور جنگلوں کی طرف نکل گیا پھر اس کا پتہ نہ چل سکا۔ اس کا ایک دیوان اس کی یادگار ہے۔ اس کے شعر بھی بگڑے ہوئے چغتائی امیر زادوں کے رنگ میں ہیں۔

رسد ہر کس بمقصودی زیارب یارب شبہا　　چرا مقصود من حاصل نشد یارب زیارب ھا

اس کا ایک مطلع مجھے[93] پچاس سال سے برابر یاد ہے۔ یہ تاریخ نظامی میں بھی لکھا ہوا ہے:

نگویم بہر تشریف قدومت خانۂ دارم
غریبم خاکسارم گوشۂ ویرانۂ دارم

تاگل روی تو از بادۂ گلفام شگفت　　بادہ از عکس گل روئی تو در جام شگفت

فسونی یزدی

سید اور قصہ گو ہے۔ شعر سے مناسبت رکھتا ہے۔ ٹھٹھہ سے آکر شاہی ملازمت میں داخل ہوگیا ہے:

بی جہت از پیش ناجنسی گذر کردن چہ بود　　گر گذر افتادہ سوئی او نظر کردن چہ بود
در سخن بودی بغیر از دور چون دیدی مرا　　گر حجاب از من نہ کردی مختصر کردن چہ بود

فیروزہ کابلی

میرزا محمد حکیم کا خانہ زاد ہے۔ اس کا تعلق سنگا قبیلہ سے ہے، غالباً ہندستان کے جنگلوں میں فوج کے ہاتھ آگیا اور ہمایوں بادشاہ کی ملازمت میں رہا اور میرزا محمد حکیم کے ساتھ پرورش پائی۔ نہ تو پڑھا لکھا ہے اور نہ اس کا خط ہی اچھا ہے، البتہ موسیقی میں دخل رکھتا ہے اور طنبورہ کو ایک خاص انداز میں بجاتا ہے۔ پٹنہ کے سفر سے واپسی کے وقت قاضی خان بدخشی کے ہمراہ جونپور سے آکر شاہی ملازمت اختیار کی۔ علم تو اسے نصیب نہ ہوا لیکن اس کے اشعار اثر و شوخی سے خالی نہیں ہیں۔

غیر منظور نظر ساختہ یعنی چہ؟　　بندہ را از نظر انداختۂ یعنی چہ؟
کس ندیدیم بدور تو باین حسن و جمال　　قیمت حسن بر انداختۂ یعنی چہ؟

سنا ہے کہ اب وہ اکثر متقدمین و متاخرین کے دیوان کے جواب کہنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

فہمی استرآبادی

بڑا مستعد آدمی تھا، دہلی میں فوت ہوا۔

رباعی

ای روی تو در عرق گل آب زدہ   زلف تو درد بنفشۂ تاب زدہ
چشمان تو چون دوست در یک بالین   سر بر سر ہم نہادۂ و خواب زدہ

ملک الشعراء شیخ فیضی

مختلف فنون شعر، مُعمّہ گوئی، عروض و قافیہ، تاریخ، لغت، طب اور انشاء میں بے مثل شخص گزرا ہے۔ پہلے پہل اس نے اپنا تخلص مشہور رکھا تھا۔ لیکن اس کے چھوٹے بھائی کو علامی کا خطاب ملا تو اس نے بھی اپنی شان بڑھانے کے لیے اسی وزن پر فیاضی تخلص رکھ لیا، لیکن یہ تخلص سازگار نہ ہوا۔ ایک دو ماہ بعد ہی دنیا سے رخصت ہونا پڑا۔ فیضی بڑا جدت پسند ھزل گو، متکبر اور مغرور تھا۔ نفاق، خباثت، ریاکاری، حسب جاہ اور رعونت تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ مسلمانوں سے تو اسے دلی عناد تھا۔ اصول دین کی اہانت کرتا رہتا تھا۔ صحابہ کرام متقدمین اور متاخرین اہل علم اور مشائخین زندہ یامرحوم ہر ایک کی مذمت اور بے ادبی کرنے میں اسے باک نہیں ہوتا تھا۔ تمام علما، صلحا اور فضلا کی رات دن توہین کرتا رہتا تھا۔ اس سے تو یہودی، نصرانی ہندو اور مجوسی لاکھ درجہ بہتر تھے۔ ایسا بدعقیدہ تھا کہ تمام حرام باتوں کو شریعت کی ضد میں حلال اور فرائض کو حرام سمجھتا تھا۔ اس نے جو بے نقط تفسیر لکھی تھی وہ بھی بس اپنی بدنامی پر پردہ ڈالنے کے لیے تھی۔ کم بخت نے تفسیر بھی مستی اور ناپاکی کی حالت ہی میں لکھی۔ اس کے پالے ہوئے کتے بھی اس کے مسودوں کو

ناپاک کرتے رہے۔ اس کا عُجب وغرور، ہٹ دھرمی اور بے دینی دھری کی دھری رہ گئی اور اسے اس دنیا سے اس حالت میں رخصت ہونا پڑا کہ خدا نہ کسی کو دکھائے نہ سنوائے۔

جس وقت بادشاہ اس کے آخری دم پر پہنچے تو ان کو دیکھ کر کتوں کی طرح بھونکنے لگا۔ یہ بات خود بادشاہ نے اس کے دیوان پر لکھی ہے۔ مرتے وقت اس کا چہرہ سوج گیا تھا اورلب سیاہ پڑ گئے تھے۔ چنانچہ بادشاہ نے شیخ ابوالفضل سے پوچھا: ''اس کے لبوں پر اس قدر سیاہی کیوں ہے؟ کیا شیخ نے اپنے ہونٹوں پر مسّی لگائی ہوئی ہے؟'' ابوالفضل نے کہا: ''نہیں یہ خون جم گیا ہے جو قے میں نکلا تھا''۔ ناپاک، بدبخت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر طعنے کرنے والے کاایسا حشر ہونا چاہئے تھا اور یہ بھی کم تھا۔ اس کی مذمت میں لوگوں نے بہت سی تاریخیں کہی ہیں۔

فیضیِ بی دین چو مرد سال وفاتش　　گفت سگی از جہان رفتہ بحال قبیح

ایک اور تاریخ ہے:

سال تاریخ فیضی مردار　　شد مقرر بچارمذہب نار

کسی اور نے کہا:

فیضی نجس دشمن نبویؐ　　رفت وبا خویش داغ لعنت برد
سگکی بود و دوزخی زان شد　　سال فوتش چہ سگ پرستی مرد

پورے 40 سال تک شعر کہتا رہا لیکن اس کے سب شعر بس عجیب ہی ہیں۔ ہڈیاں خوب جمع کیں مگر مغز کسی میں نہیں ملتا۔ سارے شعر بے مزہ ہیں، البتہ مہمل باتوں کے بیان کرنے، فخر و شان دکھانے اور کفر بکنے میں سب سے آگے تھا۔ اس کے کلام میں نہ ذوق عشق کا پتہ چلتا ہے، نہ معرفت ملتی ہے اور نہ درد کی لذت، حالانکہ اس کے دیوان اور مثنویوں میں 20 ہزار سے زاید ہی شعر ہوں گے۔ اس کے کسی شعر نے کبھی کسی کی افسردہ دلی دور نہیں کی اور یہ بدبختی کہ اس کا کوئی شعر کسی نے خواہش سے پڑھا نہ یاد کیا۔ اس سے تو معمولی اور ادنیٰ شاعر زیادہ خوش نصیب رہے:

شعری کہ بود زنکتہ سادہ

ماند ھمہ عمر یک سوادہ

لطف یہ کہ اپنی جاگیر کا سارا روپیہ اپنے جھوٹے خیالات کی تشہیر میں صرف کرتا رہتا تھا۔ اشعار اور تحریریں لکھوا لکھوا کر دور و نزدیک کے شناساؤں کو بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن کوئی شخص دوبارہ ان کو چھونے کا بھی روادار نہیں ہوتا تھا

شعر تو مگر از حرمت ستر آموخت

کز گوشۂ خانہ میل بیرون کند

اس کے خود منتخب کردہ شعر جو بطور یادگار اس نے لکھ کر میرزا نظام الدین وغیرہ کو دیئے تھے ان میں سے چند شعر یہ ہیں

مژگان مبند چون قدم از دیدہ میکنی   مردان رہ برہنہ نہادند پائی را

چہ دست می بری ای تیغ عشق اگر داداست   ببر زبان ملامت گر زلیخا را

نظر فیض چو برخاک نشینان فلکیم   مور را مغز سلیمان رسد از قسمت ما

مشکل کہ سیل دیدہ بگردش در آورد   طوفان نوع می طلبد آسیائی تو

لطفی منجم

بادشاہ کا مصاحب تھا مگر بڑا نیک دل انسان تھا۔ اسے اساتذہ کے شعر بہت یاد تھے۔ کسی بھی موضوع پر وہ رات بھر میں ایک ہزار شعر سنا سکتا تھا۔ کچھ عرصہ تک گجرات میں میرزا نظام الدین احمد کے ساتھ رہا اور ان کی مدد سے زاد راہ حاصل کر کے سفر پر چلا گیا۔

گلگل از تاب شراب آن روی چون گلنار شد

گلفروشان مژدہ تان بادا کہ گل بسیار شد

دلم گر شعلۂ آتش شود افسردگی دارد   گل بختم گراز جنت رود پژمردگی دارد

بر آہ کہ درحسرت بالای تو کردم
نخل چمن آرای پشیمانی من شد

میر مرتضیٰ شریفی شیرازی

یہ میر سید شریف جرجانی کے پوتے ہیں۔ ریاضی، حکمت، منطق، کلام اور دوسرے علوم میں تمام علمائے زمانہ سے لایق و فایق تھے۔ شیراز سے مکہ معظمہ جاکر ابن حجر سے علم حدیث کا درس لیا تھا اور تدریس کی اجازت حاصل کی تھی۔ وہاں سے دکن اوردکن سے آگرہ آئے اور قدیم وجدید بیشتر علماء سے آگے بڑھ گئے۔ پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ 974ھ/1566ء میں انتقال کیا۔ انھیں امیر خسروؒ کے قریب دفن کیا گیا۔ میر محسن رضوی نے یہ تاریخ لکھی ہے۔

رفت تا میر مرتضیٰ از دھر   علم گویا زنسل آدم رفت
بہر تاریخ رفتنش محسن   گفت علامۂ زعالم رفت

یہ شعر ان کی یادگار ہے:

خاطر جمع ز اسباب میسر نشد
تخم جمعیت دل تفرقۂ اسباب است

محوی

یہ میر محمود منشی کا تخلص ہے جو تقریباً 25 سال ممالک محروسہ ہندستان کا منشی رہا۔ نقیب خان اس کا داماد ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا۔ منشیانہ اشعار کہتا تھا۔ یہ رباعی اسی کی ہے جو بیرم خان کے دیوان کے دیباچہ میں لکھی ہوئی ہے:

از کون ومکان نخست آثار نبود   کاشیا ہمہ از دو حرف کن شد موجود
آمد چو ہمین دو حرف مفتاح وجود   شد مطلع دیباچہ دیوان شہود

منشی نے یہ رباعی ہمایوں بادشاہ کے عطا کئے ہوئے گھوڑے کی تعریف میں کہی تھی:

ای خسرو جم سپاہ عالی مقدار | دارم اسپی کہ ہست بس لاغر و زار
بروی چو شوم سوار در ہر دوسہ گام | افتد کہ تو ہم یک دوسہ گامی بردار

اس انتخاب کی تصنیف کے دنوں میں فیضی نے ایک دن میرے (94) ہاتھ میں علاو الدولہ کا تذکرہ دیکھ کر لے لیا اور اس ورق کو جس میں اس کا ذکر تھا لے کر پھاڑ ڈالا تھا۔

میر محسن رضوی

کبھی کبھی شعر کہتا ہے۔ میر محمود منشی کے انداز کا آدمی ہے بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی ہے:

آن مہ کہ بدیدہ جایگا ہش نیکوست
منظور نظر رخی چو ماہش نیکوست
بحسن سر خود نہادہ بر پایش
چون مر صفت عارض ماہش نیکوست

موجی

یہ قاسم خان بدخشی کا تخلص ہے جو ہمایوں کے نامی گرامی امیروں میں سے تھا۔ اصناف شعر کو بخوبی جانتا تھا اور اچھے شعر کہتا تھا۔ یوسف زلیخا کے طرز میں ایک مثنوی بھی کہی ہے جس میں 6 ہزار اشعار ہیں۔ اس مثنوی میں محبوب کی تعریف یوں کرتا ہے:

مرصع موئی بندی بی بہائیش | .زبی قدری فتادہ در تفائیش
نکرد از لعل ناب آویزۂ گوش | کہ بود آویختۂ دلہای مدہوش

آخر عمر میں سپاہ گری کا پیشہ ترک کر کے گوشۂ عزلت اختیار کر لیا۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شاعری سے بھی استعفیٰ دے دیتا۔ اس کی وفات آگرہ میں 979ھ/1571ء میں ہوئی۔

میرزادہ علی خان

محترم بیگ کا لڑکا جو ہمایوں کا مشہور امیر تھا۔ میرزادہ نہایت با اخلاق اور موزوں طبع آدمی

تھا۔ کبھی کبھی شعر بھی کہہ لیتا تھا:

شام چو از چہرہ فگندی نقاب
تاب نیاورد و نشست آفتاب

996ھ/1588ء میں کشمیر میں جب کہ یعقوب ولد یوسف خاں کشمیری نے محمد قاسم خان میر بحر پر رات میں چھپ کر حملہ کیا تو یہ لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔

معزیؔ ہروی

طباطبائی سیدوں میں سے ہے۔ بچپن میں کامران مرزا کا ہم سبق تھا۔ ہندستان میں 50 سال تک رہا 982ھ/1574ء میں اسی جگہ فوت ہوا۔ یہ دو شعر اسی کے ہیں:

چند داری ای فلک چون ذرہ سرگردان مرا
تا بکی داری بغربت بی سر و سامان مرا

گفتم بآہ درد دل خود برون کنم
دردم بآہ کم نشود آہ چون کنم

مرادیؔ استر آبادی

استر آباد کے سیدوں میں سے تھا۔ 979ھ/1571ء میں فوت ہوا۔ اس کے اشعار مشہور رہے ہیں۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بہ نمود رخ ز پردہ کہ صبح صفاست این — یعنی کمال قدرت صنع خداست این
طالع نشد شبی زرخت کوکب مراد — بی طالعی و تیرگی بخت ماست این

کفر زلفش کہ بود مایۂ ایمانم ازو
نا مسلمانم اگر روئی بگر دانم ازو

مشفقی بخاری

مرو کا رہنے والا ہے۔ بعض تو اسے قصیدہ میں اپنے زمانہ کا سلیمان سمجھتے ہیں لیکن یہ ان کی بڑی غلطی ہے۔ وہ ماوراء النہری رنگ میں شعر کہہ لیتا تھا اس کا کلام سرد اور بے سوز تھا۔ دو مرتبہ ہندستان آکر واپس چلا گیا:

چون نقد ہستی مجنون غم نگاری بود
خدا بہ نقد بیا مرزدش کہ یاری بود

اس کی ہجو نہایت رکیک زبان میں ہے۔ اس کی ہجو ملیح اس قطعہ سے نمایاں ہے جو اس نے آخری بار ہندستان آنے پر کہا تھا۔

کشور ہند شکر ستانی است
طوطیا نش شکر فردوس ہمہ
ہند وان سیاہ چو مگسان
چیرہ بندونکوچہ پوش ہمہ

میلی ہروی

نام میر زاقلی تھا۔ صاحب دیوان شاعر گزار ہے۔ اس کی شعر گوئی کا ملکہ اس درجہ پر تھا کہ اگر وہ اس زمانہ تک زندہ ہوتا تو اس زمانہ کے اکثر خام کار شعر گوئی سے دستبردار ہو جاتے۔ متاخرین میں سے کوئی اس کے ہم پلہ نہ تھا۔ برسوں نورنگ خان کی خدمت میں رہا اور اس کی مدح میں بڑے عمدہ قصیدہ کہے ہیں۔ کہتے ہیں نورنگ خان نے بدگمانی کی وجہ سے اسے زہر دے کر مرواڈالا تھا۔اس کی وفات مالوہ میں ہوئی تھی۔

دانستۂ کہ مہر تو با جہان نمیرود
کز خاک کشتگان گذری سرگردان ھنوز

نہ آشنا ونہ بیگانہ نمی دانم　　　کہ اختلاط چنین راکسی چہ نام کند

بی قرار است دل اندر بدن کشتۂ عشق
دیگر از یار ندانم چہ تمنا دارد
امتحان نام نہد دل ستمی کز تو کشد
خویش را چند باین حیلہ شکیبا دارد

ملک قمی

اسے ملک الکلام بھی کہتے ہیں۔ درویشانہ وضع قطع تھی۔ دکن میں رہتا تھا۔ نہایت درد مند آدمی تھا۔ ہمیشہ اس کی آنکھیں نم رہتی تھیں۔ اہلِ دکن نے ایک فساد میں اسے ملک عدم پہنچا دیا تھا

آب شمشیر شہادت شست گرد اختلاف
گبر وتر ساو مسلمان کشتۂ یک خنجر اند

سازند لخت لخت درون فسردگا ن　　　وانگاہ بر جراحت دلہا نمک زنند

تو مرہم دل ریشی بخندۂ نمکین
ولی بان مژہ تلخ نشتر جگری
بقدر حوصلہ عشق نیست بادہ عشق
تو شیر بیشۂ مانیستی کہ باخبری

سحاب چشم کہ دادہ است نرگست درآب　　　کہ از نگاہ تو بوئی ستم نمی آید

مدامی بدخشی

شعر گوئی کا بڑا اچھا سلیقہ تھا۔ میرزا عزیز کوکہ کے یہاں ملازم تھا۔
اس کا شعر ہے:

دلا صد فتنہ بر بازان قد و بالاست می گوئی
ازان بالا بلا بسیار دیدم راست می گوئی

اس زمین میں بہتوں نے طبع آزمائی کی اور ایک دوسرے کے مضمون کو پامال کرتے رہے جس کی وجہ سے یہ زمین بالکل ہی بے جان ہوگئی۔ انہی میں سے یہ شعر بھی ہیں:

بلا و فتنہ در عالم ز قدم خاست می گوئی
بلی می آید از بالا بلا ہا راست می گوئی
بہ شہر از قامتم ہر سو قیامت خاست می گوئی
قیامت قامتی داری مہ من راست می گوئی

ملا مقصود قزوینی

اپنے زمانہ کا نہایت خوش طبع شاعر تھا۔ اس کا ایک دیوان بھی ہے:

در عالم و فاسگ کوئی تو رام ماست
اقبال رام گشتہ و عالم بکام ماست
عشاق را تمام نظر بر جمال تست
ای شاہ حسن روئی تو ماہ تمام ماست

اس نے یہ قصیدہ نقیب خان کے داماد قاضی یحییٰ قزوینی کے نام پر کہا ہے اور خواجہ سلمان مذبل کے رنگ میں:

دگر ز سردی دی رفت آسمان در تاب — زتاب صاعقہ خورشید ماند زیر نقاب
نہنگ بحر زبیم سہام صرصروی — نہاد بر سر خود خود آھنین زحباب
دگر زکثرت برف در شدت سرما — زمین بلرزہ در آمد چو قلزم سیماب
سفید گشت سواد زمین زلشکر برف — سیاہی از دل آفاق شد چنان نایاب

ملا مقصود نے 977ھ/1569ء میں آگرہ میں وفات پائی۔ اس کا باپ ملا فضل اللہ بھی بڑا نیک اور معزز شخص تھا۔ یہ قطعہ اسی کا ہے:

فضلی چو غنچہ خلعت ہستی بخود مپیچ — بر چہرہ چین می فگن و دامن بخون مکش

چون گل شگفتہ باش و چو سرو ازغم جہان — آزاد باش و منت این چرخ دون مکش

مختتی حصاری

کچھ پڑھا لکھا تھا، ٹی ے مدرسہ میں رہتا تھا، بعد میں حسب الحکم اسے سرہند کی قضاوت پر مقرر کیا گیا تھا۔ اسے شاہی دربار سے مختتی کا تخلص عطا ہوا تھا۔ اس نے سرہند میں وفات پائی۔

یافتم درگند ی جائی کف پایش را — چون تمالم رخ خود یافتہ ام جایش را

بفکر موئی میانت دل کسان گم شد

دل شکستہ ماہم در ان میان گم شد

موسوی مشہدی

اس کی نسبت اس کے تخلص سے ظاہر ہے۔ موزوں طبع آدمی تھا

ترا پنہان نظر سوئی من راز است میدانم

تغافل کردنت از بیمِ اغیار است میدانم

خواجہ معظم

یہ اکبر کا ماموں اور حضرت شیخ جام کی اولاد میں سے تھا۔ خبطی اور پاگل سا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کو بے وجہ قتل کر دیا اور قصاص میں 971ھ/ 56! ء قتل کیا گیا۔

خواجہ اعظم معظم نام کہ ازو بود دہر را زیور

زن خود را بکشت و کشت اورا　　از غضب شہ جلال الدین اکبر

موزوںؔ

شیخ پیر آگرہ کا لڑکا ہے۔ سات طریقوں پر خوش نویسی کرتا تھا۔ میں (1) نے اسے سلیم شاہ کے عہد میں پشاور میں دیکھا تھا۔ اس کا لڑکا بھی نوجوان اور قابل تھا۔ معما اور خوش خطی میں ماہر تھا۔ چھوٹی بڑی شطرنج خوب کھیلتا تھا۔ یہ چند شعر اس کی یادگار ہیں:

مرا چہ سود ز گلہای رنگ رنگ بہار　　چو نیست بی تو دلم را بہ ہیچ رنگ قرار

گواہ درد من محز و شد　　سرشک سرخ و رخ زرد و دیدۂ بیدار

ای یافتہ زعارض تو ماہتاب تاب　　دلی سوختہ زرشک جمال تو آفتاب

ہر ناوک تو ای مہ ابرو کمان ما
چون مغز جا گرفتہ بہر استخوان ما

ایک ہندستانی سے اس سے زیادہ موزوں طبعی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

محمؔد یوسف

بڑا حسین نوجوان تھا۔ کابل میں پیدا ہوا اور ہندستان میں نشو و نما پائی۔ خوش خطی میں اشرف خان کا شاگرد تھا۔ عین عالم شباب میں 980 ھ/1582 ء میں سورت کے قلعہ کے محاصرے میں گجرات میں فوت ہوا۔ اشرف خان نے اس کے لیے مصرع تاریخ کہا اور اس پر میر علاء الدولہؔ نے قطعہ مکمل کیا:

محمد یوسف آن مصر ملاحت　　برفت از دہر اشک از دیدہ ریزان
پی تاریخ اوگفتا عزیزی　　کجا شد یوسف مصرای عزیزاں

یہ غزل بھی محمد یوسف کی ہے:

خوش وقت آنکہ جای بہ میخانہ ساختہ　　درپائی خم بہ ساغر و پیمانہ ساختہ

آن کس کہ دادہ شیوۂ مستی بچشم یار　　　　مستم ازان دو نرگس مستانہ ساختہ

منظری سمرقندی

خوش کلام شاعر تھا۔ آگرہ میں بیرم خاں کی سرکار میں ملازم تھا۔ ایک شاہنامہ لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ چند داستانیں بھی لکھ لی تھیں۔ جن میں ایک قصہ سکندر سور کی داستان سے متعلق تھا اور اس میں محمد حسین خان کی بہادری کا ذکر کیا تھا نیز پٹیالی میں اس نے یہ نظم پیش کی۔ حسین خان نے اس سے اس واقعہ کو شروع سے آخر تک بیان کیا۔ اس نے رات بھر بیٹھ کر 304 شعروں کی خاطر خواہ تصحیح و اصلاح کی اور صبح صبح مجلس میں آ کر نظم سنائی۔ خان نے بڑا اچھا صلہ دیا۔ اس نظم کا ایک شعر ہے:

زفر نفیرش فلک گشت کر
ملک شد سرا سیمہ زان کر و فر

یہ آخری شعر ہی اس کے اپنے خاص رنگ میں ہے، بقیہ کا مضمون پا مال اور کافی سنا ہوا ہے۔

ہمیشہ ما ز فراق تو بی سر و پائیم　　　　ترا کس کہ بخاطر نمی رسد مائیم
خط گرد ماہ عارض آن سیم برنگر　　　　ہر دو نشان فتنۂ دور قمر نگر
بر روئی ماہ سلسلہ عنبرین ببین　　　　جعد بنفشہ بر رخ گلبرگ ترنگر
بین چشم رہزن و مژدہ ناوک افگنش　　　　در رہگذار عشق خطر در خطر نگر

مدامی ہمدانی

ہندستان میں حیدری کے نام سے مشہور تھا۔ میر محمد خان کلال کی تعریف میں بڑے اچھے قصیدے لکھے ہیں۔ بد مزاج ایسا تھا کہ ہر ایک سے جھگڑا کر لیتا تھا، ہمیشہ اپنی اسی عادت سے مصیبتوں میں مبتلا رہا:

نمی دانست مجنون عاشقی رسوائی عالم شد
منم رسوائی عشق و عاشقی بر من مسلم شد

مقیمی سبزواری

خان اعظم کے سلسلہ کا شاعر تھا۔ خوش طبع آدمی تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد اپنے وطن واپس چلا گیا۔

خوش آنکہ چون شمار سگ خویشتن کند
هر چند در شمار نیم یاد من کند

اس کا لڑکا قاضی ابو المعالی ایک شکستہ دل، فانی مشرب نوجوان ہے۔ اپنے باپ کے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ بواسیر کے عارضہ میں لاہور میں فوت ہو گیا۔ شیخ سعدی کا مطلع ہے

کافران از بت بی جان چہ تمتع دارد
یاری آن بت پرستید کہ جانی دارد

اس نے اسی زمین میں کہا ہے

مردہ حسرت برد آن دم کہ بری دست بہ تیغ
کین عطا روزی آنست کہ جانی دارد

محوی

حال ہی میں ہندستان آیا ہے۔ خان خاناں بیرم خاں کی ملازمت میں تھا۔ اب مکہ معظمہ کی زیارت کے لیے چلا گیا ہے رباعی کہنے میں بے مثل تھا.

تازلف برون ہم چو مہ خواہد بود
تا خط شہ حسن را سپہ خواہد بود
گر خانہ زخشت آفتابم سازد
روز من بی چارہ سہ خواہد بود

مظہری کشمیری

صاحب دیوان شاعر ہے۔ اپنے وطن میں سرکاری خدمت پر مقرر ہے۔ یہ شعر اس کے

ذوق شعری کا پتہ دیتا ہے:

اقبال حسن کار ترا پیش می برد
ورنہ صلاح کار ندانستہ کہ چیست

شیخ محمد دہلوی

کیا حسب نسب، کیا علم و فضل ہر لحاظ سے یگانۂ روزگار تھا۔ مدتوں کی شناسائی کے بعد اس سال جبکہ شاہی لشکر چتوڑ کے قلعہ کی فتح کے لیے جا رہا تھا، اتفاقاً باری کے قصبہ کے قریب میری[96] اس سے ملاقات ہوگئی، لیکن وقت اتنا تنگ تھا کہ وہ محفل گھڑی بھر سے زیادہ نہ رہی۔ وہ ایک طرف اور میں[97] دوسری طرف رخصت ہوگئے۔ اس پہلی ملاقات ہی میں اس کے قابل قدر احوال کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا ذکر شاعروں کے طور پر کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا ہے۔ لیکن وہ بھی کبھی کبھی شعر کہتا تھا اس لیے اس کی یاد میں یہ مطلع نقل کیا جاتا ہے:

اگر بروز غمت صبر اختیار کنم
چو اختیار نماند بگو چہ کار کنم

نویدی تربتی

صاحب دیوان شاعر ہے۔ بیرم خان کے بخشی کچک بیگ کی ہجو میں اس نے ایک ترجیع بند کہا ہے جو رہتی دنیا تک لوح زمانہ سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ چند شعر اسی کے ہیں:

ای بدوران شریف تو مباہی ایام　　خان بن خان سرو سرخیل سلاطین بیرام
عاجز از و ادنی فہم سمند ادراک　　قاصر از قصر جلال تو کمند اوہام
سختی ہست مرا شرح کنم بر نواب　　مشکلی ہست مرا عرض کنم بر خدام

اس کی ہجو میں اس کا ایک جملہ بھی مشہور ہے۔ خود اس کا بیان ہے کہ ''ایک دن کچک بیگ کچہری میں ایک پرانی مسند پر ٹیک لگائے بیٹھا تھا''۔ مجھ سے کہنے لگا: ''اے کتے میرے

سامنے تو پاخانہ کھاتا ہے"۔ میں نے اسے جواب دیا: "کون کتا ہے جو تمہارے سامنے پاخانہ کھا سکے؟"

نویدی کانا تھا۔ اصل تذکرہ کے مصنف میر علاء الدولہ نے چشم پوشی سے کام نہیں لیا اور قصہ لکھ دیا ہے۔

نشانی

مولانا علی احمد کا تخلص ہے۔ مولانا حسین نقشی مہر کن کے لڑکے ہیں۔ بڑے عالم، فاضل، ولی مشرب آدمی تھے۔ بڑے شاہزادہ کے استاد تھے۔ باپ بیٹے دونوں نے مہر کنی کے فن کو بڑا فروغ دیا۔ خاص طور سے مولانا مذکور کے نگینہ پر نقش سازی میں ان کے کارنامے بے مثل ہیں۔ عراق، خراسان اور ماوراء النہر تک ان کے نقش و سکہ کو تبرکاً لے جاتے ہیں۔

علم وکمال میں بھی ان کا بڑا اونچا مقام ہے لیکن نقش سازی کے فن نے ان کے سارے کمالات پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اسی لیے سپاہ گری اور ملازمت میں جیسا کہ چاہیے تھا ترقی نہیں پاسکے، پھر بھی قابل عزت عہدہ پر فائز ہوئے۔ امرائے نامدار سے ان کا مرتبہ کسی طرح کم نہیں رہا۔

علم ہیئت اور طبعیات کے ماہر ہیں۔ علم کے مدارج اعلیٰ تک رسائی ہے، ہر طرز کی خوش نویسی جانتے ہیں۔ املاء او رانشاء میں بے مثل آدمی ہیں۔ اگر وہ صرف شاعر ہوتے تو بلاشبہ ان کے شعر صفحہ یادداشت پر یادگار رہتے۔ شعر بس کبھی کبھی کہتے ہیں تخلص اپنے پیشہ کے مطابق رکھا ہے۔

عین عنفوان شباب سے اس منتخب کے لکھنے کے وقت تک کہ میرے بڑھاپے کا زمانہ ہے، ان کے دوستوں میں رہا ہوں۔ ان کے ساتھ میرے [98] گہرے مراسم رہے ہیں۔

ان کے کلام کا نمونہ ہے:

ترا تا سبزۂ خط برلب جان بخش پیدا شد
مسیحا بود تنہا خضر ہمراہ مسیحا شد

محتسب ولی خم شکست و آب آتشناک ریخت
خاک من برباد داد وخون من بر خاک ریخت

باد از یار خبر بر دل ناشاد آورد
اعتمادی نتوان بر سخن یاد آورد

جس زمانہ میں گجرات فتح ہوا، انھوں نے بادشاہ کے نام کا سکہ کندہ کر کے پیش کیا اور تاریخ میں یہ شعر پیش کیے:

خسرواسکّہ گجرات بنام تو زدند ملک را سایۂ عدل تو تبارک بادا
ای خوش آن دم کہ چوتاریخ ولی زمن پری گویمت سکۂ گجرات مبارک بادا

جس ز مانہ میں شاہی لشکر پہلی مرتبہ کشمیر کی طرف گیا تھا میں[99] اجازت لے کر پیاور کو جو میری جائے ولادت ہے، چلا گیا تھا۔ انھوں نے کشمیر سے یہ اشعار لکھ کر میرے پاس بھجوائے تھے۔ خدا کو بہتر معلوم ہے کہ انھوں نے دوسروں کو بھی اسی شوق و محبت میں اشعار لکھے ہونگے لیکن ان اشعار سے اپنی نسبت کو خاص سمجھتا ہوں تا کہ دوسرا دعوی نہ کرے۔

مرا دور از تو ای ماہ دل افروز نہ شب خوابست ونی آرام در روز
چکیدہ اشک گلگونم بر خسار شگفتہ لالہ اندر زعفران زار

جس زمانہ میں میں[99] یہ تذکرہ لکھ رہا تھا، ان کے چند شعر میں نے منگوائے تھے۔ جواب میں انھوں نے یہ رقعہ لکھا تھا:

''وقت یہ آن پڑا ہے کہ اپنی متفرق خرافات کو جمع کروں۔ بہر حال آپ کے احسان پر آفریں ہے۔ 2 جزو لکھے ہیں، ایک نثر ہے اور دوسری مثنوی، جو ادھوری رہ گئی ہے۔ انشاء اللہ کل یا پرسوں تک اکٹھا دے دونگا، فی الحال مثنوی کے چند شعر'' سامریم سامریم سامری'' روانہ کررہا ہوں اصلاح فرمادیں اور جو کچھ لکھنے کے قابل ہوں علیحدہ کرلیں''۔

ایک اور رقعہ میں اولگون بادشاہ اور اکبر کے بزرگوں کے سکے صاحب قران تک لکھ کر میرے[100] پاس بھیجے تھے۔

ناصحی

یہ جمال خان ولد میاں منکن بدایونی کا تخلص ہے جس کا ذکر آچکا ہے۔ نہایت قابل، بااخلاق نوجوان تھا۔ اسی کی محبت تھی کہ میں نے بدایوں کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ شعر گوئی کے عمدہ نمونے چھوڑ گیا۔ اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو علم وفضل میں بڑی ترقی کر لیتا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

بشنو این نکتہ سنجیدہ ز پر وردۂ عشق
کہ بہ از زندۂ بی عشق بود مردۂ عشق

ترک من زخم بہ ہنگام سواری زدہٗ
لذتی دارم ازین عشق کہ کاری زدہٗ

ملا نویدی

تازہ تازہ خان خانان کی خدمت میں شامل ہوا تھا:

قضا کہ نامۂ جرم شراب خوارہ نوشت
نوید عفو خداوند بر کنارہ نوشت

نہانی

یہ آگرہ میں ایک بوڑھی شاعرہ تھی۔ غالباً ہرات کی رہنے والی تھی۔ یہ اس کا مطلع ہے:

روز غم شب درد بی آرام پیدا کردہ ام
دردمندیہا درین ایام پیدا کردہ ام

بہت سے شاعروں نے اس کے جواب میں شعر کہے لیکن کوئی اس کے برابر کا نہیں:

چہ مردی بو دی کز زنی کم بود

اس کا لڑکا جعفر اب کشمیر میں احدی ہے۔ یہ ایک قابل نوجوان ہے اور میر بحر معین کی سرکار میں ملازم ہے۔

نجاتی گیلانی

ہندستان آنے کے بعد فوت ہو گیا۔ شعر و مُعمّہ خوب کہتا تھا:

ای دلم دور از تو در آتش دو دیدہ خون فشان
بی تو ام در آب و آتش آشکارا و نہان

حل نشد از دل تو مشکل ما
از دلت دہ کہ آب شد دل ما

نوعی خبوشانی

اپنے آپ کو شیخ جامی محمد خبوشانی کا پوتا بتاتا تھا۔ لیکن اس کے اعمال ایسے تھے جو اس کے دعویٰ کو جھٹلاتے تھے۔ نہایت شوخ طبع آدمی تھا۔ اب چھوٹے شاہزادہ کی ملازمت میں ہے:

نوعی سبو کش میم وبعد مردنم
خورشید وار آبلہ ام جوش می زند

غم نوعی نہ زبسیاری درد والم است   غم از آنست کہ در حوصلہ گنجائی نیست

نیازی

بخارا کا رہنے والا ہے۔ نہایت بدمست اور بے حیا آدمی ہے، لیکن صحیح معنوں میں شاعر تھا۔

شعر، عروض، مُعمہ، تاریخ اور دوسری تمام اصناف میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ ان موضوعات پر اس کی تصانیف ہیں۔

جب ہمایوں کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجلس میں اس نے بایاں پیر آگے بڑھا دیا۔ ہمایوں ادب و آداب کا نہایت پابند تھا، اس لیے کہا مُلاّ یہ بایاں پیر ہے۔ پھر حکم دیا کہ اس کو باہر لے جاکر دوبارہ مجلس میں لاؤ۔ جب اسے بیٹھنے کا حکم ملا تو اس نے بیہودہ باتیں شروع کردیں۔ بیکسی سے بحث کرنے لگا اور میر عبدالحی صدر سے جو بیکسی کی تائید کر رہا تھا کہا بیکسی کے چہرہ سے ظاہر ہے کہ ہم بھی بے کس بنے ہوئے ہیں۔ اس وقت خواجہ حسین مروی نے جو منفعل مزاج آدمی تھا، میر عبدالحی کی تائید میں کچھ کہا تو اس نے ان سے کہا. ''خواجہ تم کیوں پشتی لے کر آگئے''۔

ہمایوں کو اس کی یہ حرکتیں سخت ناگوار گزریں اور وہ محفل سے اٹھ گیا، اسے سزا ملتی لیکن ہمایوں کی بردباری اور علم ایسا تھا کہ کچھ نہ کہا۔ ماوراء النہر کو چھوڑنے کا سبب اس کی غزل کا یہ مقطع تھا:

بر فلک نیست شفق بادۂ گلفام من است
رند دردی کشم و طاس فلک جام من است
تا نیازی شدہ درملک سخن خسرو عہد
نامی جامی شدہ منسوخ کنون نام من است

کہتے ہیں ٹھٹھہ میں ایک دن وہ اپنی یہ غزل سنا رہا تھا۔ مولانا جامی کا دیوان بھی موجود تھا۔ جب اسے کھولا گیا تو اس کے حسب حال یہ شعر نکل آیا:

چرخ را جام نگون دان کز می عشرت تہی است
بادہ از جام نگون جستن نشان ابلہی است

نامیؔ

یہ میر محمد معصوم صفوی ولد میر سید صفائی کا تخلص ہے جو بھکر کے اکابر سادات میں سے ہے۔

میر محمد شاہی امرا میں شامل ہے اور کسی خدمت پر سندھ اور قندھار کے علاقے میں مقرر ہے۔ نہایت درویش مزاج، با اخلاق، دیانت دار، بہادر اور سخی ہے۔ تقویٰ، پرہیز گاری، نماز اور تلاوت کا بڑا پابند ہے۔

کسی نے اس سے کہا اس راستہ میں رہنمائی کے بغیر کام نہیں چلتا، کسی مرشد سے تلقین حاصل کرو۔ اس نے جواب دیا کہ فی الحال دو تین مرشد ہیں اب کسی اور کی کیا حاجت میں جس وقت وطن سے دار الخلافہ میں پہنچا تو ہوا و ہوس کا یہ زور تھا کہ ہزاری دو ہزاری منصب نظروں میں نہیں جچتا تھا لیکن جب دربار میں پہنچ کر چوبداروں اور دربانوں کے ڈنڈے کھائے اور خوب ذلتیں اٹھائیں تو اپنی حیثیت معلوم ہوگئی۔ پھر بڑے انتظار کے بعد بیستی کا عہدہ نصیب ہوا اور جوانی کے وہ سارے دعوے ہوا بن کر اڑ گئے، ناچار راضی برضا تسلیم کی خو پیدا کرلی اور مطمئن ہوکر بیٹھ رہے۔ مثال اس طرح سے ہے کہ: ''میں نے کچھ بن جانا چاہا کچھ بھی نہ رہا اپنے آپ کو چھوڑ دیا تو سب کچھ بن گیا''۔

نیم ملول کہ کارم نکو نشد بد شد
شود شود نشود گو مشو چہ خواہد شد

اگر کوئی مرشد بھی ہوتا تو وہ اس سے بڑھ کر کیا تعلیم دیتا۔

ہمارا دوسرا مرشد میر ابو الغیث بخاری ہے۔ جو عہدے اور مرتبے میں ہم سے کئی درجہ بڑا تھا۔ جب تک اس سے شناسائی نہیں ہوئی تھی ہمارا یہ حال تھا کہ اگر کسی دن ہمارے گھوڑوں کو دانہ چارہ نہیں ملتا تھا تو غم وغصہ کے مارے کسی سے بولتے نہیں تھے، لیکن جب میر کی صحبت نصیب ہوئی تو ہم نے ان کا یہ رویہ دیکھا کہ کبھی کبھی دو چار روز اچھے گزر جاتے تھے ورنہ ان کے طویلہ میں گھانس کا ایک تنکہ رہتا تھا نہ مطبخ سے دھواں اٹھتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود بھی وہ خوش اور ہنستے بولتے رہتے تھے کہ کسی پر ان کی تنگ دستی کا حال نہیں کھلتا تھا، نہ وہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ بولتے تھے اور نہ سنتے تھے۔

ان کے نزدیک خوشحالی اور بدحالی دونوں بس ایک جیسے ہی تھے:

از حادثات درصف آن صوفیان گریز
کز بود غم کنند وز نا بود شادمان

اس وقت ہم نے اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ جب ایسے بڑے آدمی پر بھی یہ وقت گزرتے رہتے ہیں اور وہ حالات کی ان تبدیلیوں سے متاثر نہیں ہوتا تو ہمارے لیے تو بے فکر رہنا کہیں زیادہ ضروری ہے کیونکہ ہم اس کے دولت و مرتبہ کا دسواں حصہ بھی نہیں رکھتے۔

ہماری تیسری مرشد ایک کنیز ہے جو بادشاہ سلامت نے عطا فرمائی تھی جس وقت بھی شیطان بہکاتا ہے اور ہوا و ہوس زور کرتے ہیں اور طبیعت نظر بازی اور شہوت پرستی کی طرف جھکنے لگتی ہے تو ہم فوراً جاکر اس کی صحبت میں آسودگی حاصل کر لیتے ہیں اور پاک و صاف ہوکر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ مرشد کا کام اس سے بڑھ کر کیا ہے کہ وہ ناشائستہ کاموں سے بچالے۔

میر طلب علم میں بھی بڑے کوشاں رہے۔ شعر گوئی اور مُعمّہ کہنے میں بڑا اچھا ذوق ملا ہے۔ نہایت بلند فطرت آدمی ہے۔ یوسف زلیخا کی بحر میں ایک مثنوی کہی ہے۔ ایک دیوان بھی ان کا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ یہ ہے۔

چہ خوش است آنکہ از خود روم و تو حال پرسی
بتو شرح حالی گویم بزبان بی زبانی

چون گریہ من دید نہان کرد تبسم
پیدا ست کہ این گریہ من بی اثری نیست
در عشق نشہ ایست کہ عشاق خستہ را
ذوقی ست در فراق کہ اندر وصال نیست

نظیری نیشاپوری

شعراء کے سلسلۂ میں شامل ہے۔

نظیری کا قصیدہ ہے:

زهغر بہ خود نگنجم چو بہ خم می مغانی   بدرد لباس برتن چو بجو شدم معانی

بہ فسانہ ام مزن رہ کہ ز آتش عزیمت   بدماغ و دیدہ خواہم ہمہ شب کند و خانی

نوائی

میر محمد شریف نام تھا۔ میر قدسی کربلائی اس کا بھائی ہے، جس کا یہ شعر مشہور ہے:

گرزوق خرمی نہ شناسم عجب مدان   قدسی بہ عمر خویش چو خرم نبودہ ام

نوائی ہندستان میں بادشاہ کی خدمت میں رہتا تھا۔ حال ہی میں اس کا انتقال ہوا ہے۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

منم نشستہ بکنجی زبی و فائی تو   قرار دادہ بخود محنت جدائی تو
بگرم خوئیت از جانمی روم چکنم   کہ اعتماد ندارم برآشنائی تو
تو در طریقۂ مہر و فانہ آن شمعی   کہ نور دیدہ فروزد زروشنائی تو

بہ ہیچ جا نرسیدم بہ ہیچ رہ نگذشتم
کہ در دلم نگذشتی بہ خاطرم نرسیدی

نویدی نیشاپوری

خاصا پڑھا لکھا تھا۔ شعر گوئی میں صاحب مرتبہ شاعر ہے۔ اس کا انتقال 973ھ/1565ء میں حج کو جاتے ہوئے مالوہ، اجین میں ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ:

اگرم ز اشک گلگون شدہ لالہ گون زینہا
نتوان شدن پریشان گل عاشقیت لہنہا

نظمی بتریزی

جوہر شناس شاعر تھا۔ طبیعت شعر میں خوب لڑتی تھی۔ ایک دیوان مرتب کر چکا تھا، جو بہت مشہور ہوا۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

شوخی کہ بولب بہ فنون آلودہ
اہل نظر ند ازو جنون آلودہ
بر بستہ بسر چہرۂ سرخ است اورا
یا رشتہ جان ماست خون آلودہ

وقوعی نیشاپوری

شہاب الدین احمد خان کا داماد ہے۔ اس کا نام محمد شریف ہے لیکن اعمال ایسے کثیف ہیں کہ اس کے نام کی مٹی پلید ہوگئی۔ بے دینی اور الحاد میں وہ ہر ملحد بدنام سے آگے ہیں۔

اعتقاد میں نہ تو پسی خانی تھا نہ صباحی بلکہ ان دونوں کے بین بین تھا۔ ادوار و تناسخ کا قائل بلکہ اس عقیدہ کا پکا پیرو تھا۔

ایک دن بھمبر میں جو کشمیر کا سرحدی شہر ہے، وہ میرے پاس کشمیر جانے کے لیے کچھ ہمراہیوں کی تلاش میں آیا وہاں پتھر کی بھاری بھاری سلیں پڑی ہوئی تھیں۔ انھیں دیکھ کر بڑی حیرت کے ساتھ کہنے لگا: ''آہ یہ'' بیچارے انسانی قالب میں آنے کا انتظار کر رہے ہیں''۔

اس بد اعتقادی کے باوجود اس نے ائمہ علیہ السلام کی شان میں منقبت بھی کہی ہے شاید اس کے ابتدائی زمانہ کی چیز ہو۔ خوش نویسی اور انشاپردازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ علم تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن عربی تاریخیں پڑھنے کی مہارت از خود پیدا کر لی تھی۔

اس کے کلام کا نمونہ ہے:

نالہ تا از تو جدا فاش نسازد رازم
بر نیاید شب غم کاش زصغف آوازم

امام حسینؓ کی منقبت میں کہتا ہے:

ہر گہ از طغیانی سوز عشق در گیرم چو شمع — شعلہ خود را ہر زمان بر من زند پروانہ سان
گر زفیض خاطرت گردد طبیعت بہرہ ور — میتوان پرداختن در یک سخن صد داستان

شاہدان بکر معنی چو شود فکرم بلند   عرض حسین خود کنند از غرفہای آسمان

گر جور آید از تو دلم تن دران دہد   شاید ترا خدائی دل مہربان دہد

دارد ہلاک غیرت اینم کہ عشق تو   در دی بجان ہر کہ دہد جاودان دہد

شبہا کہ بر فروزم از اندیشۂ تو دل   سوز دلم چراغ بہ ہفت آسمان دہد

یہ اس قصیدہ کے شعر ہیں جو حضرت خاتون جنت بی بی زہرا کی منقبت میں کہے ہیں، لیکن یہ طرز مجھے بے ادبانہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میں[101] نے مدح کے شعر درج نہیں کیے۔

شریف وقوعی نے 1003ھ/1594ء میں انتقال کیا۔ اس کے ترکہ میں نفیس کتابیں تھیں جو شاہی کتب خانہ کے پیٹ میں سماگئیں۔

وداعی ہروی

تھوڑا بہت پڑھا لکھا ہے۔ ہندستان میں آنے کے بعد انتقال ہوا:

سواد ہند کہ پر ظلمت ست چون شب ہجران
کسی کہ آمدہ این جا بہ حسرت ست و ندامت
ز ملک ہند و داعی مجو غنیمت و بگذر
غنیمت است اگر جان بروی ز ہند سلامت

اس مطلع کے رنگ میں :

خوش آن زمان کہ برویت نظر کنان روم از خود
زمان زمان بخود آیم زمان زمان روم از خود

اس نے کہا ہے:

نہ از شراب بہ بزم تو ہر زمان روم از خود   پیالہ لعل تو بوسد ز رشک آن روم از خود

واقعی ہروی

ابن علی نام تھا۔ بادشاہی ملازمت میں تھا:

نہ بر جبین تو از روئی ناز چین پیدا ست — کہ بحر حسن تو زموج واین چنین پیداست
ہنوزت از می ناز است نشۂ در سر — ز سرگرانیت ای ترک نازنین پیدا ست
چو شمع سوز دل خود چہ آورم بہ زبان — کہ سوز را اثر از آہ آتشین پیدا ست
چہ احتیاج بہ ماہ تو است در شب عید — ترا کہ ماہ نو از چاک آستین پیداست

در لعل او بہم دارند آب زندگانی را
بلی جان درمیان باشد بہم یاران جانی را

وصفی

میر عبد اللہ نام ہے۔ بڑا اچھا خوش نویس ہے۔ 7 قلم میں خوش نویسی کرتا ہے، شاہ غیاث او رمولانا راقمی کا شاگرد ہے۔ احدیوں کے زمرہ میں داخل ہے۔ اپنی والدہ کی طرف سے میر نظام الدین احمد کا رشتہ دار ہوتا ہے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتا ہے:

کنون کہ لذت اندوہ عشق دانستم
ہزار رنگ بہر خندہ گریہا دارم

وصلی

بڑا زبان آور، خوش طبع شاعر ہے۔ عراق سے حجاز گیا، پھر وہاں سے بحری سفر کرتا ہوا ہندستان آیا۔ جہاز والے طوفان میں بہہ گئے۔ وہ بھی بہتا بہتا قطب شاہ دکن کے ساحل کے قریب پہنچ گیا اور اس کے دربار میں آگیا۔

ایک موقع پر اس نے ایک پہلوان کو کشتی میں پچھاڑ دیا تھا۔ پہلوان نے حسد کے مارے اس زہر دلوادیا اور وہ 977ھ/1569ء میں فوت ہوگیا۔ یہ اشعار اس کی یادگار ہے:

دل فریبانہ برہ میرود ومی ترسم
کہ مبادا بودش دل نگرانی از پی

وقوعی ہروی

میر واعظ کے نام سے مشہور ہے۔ بدخشاں اس کا وطن ہے۔ اس کی وعظ کی مجلس میں بڑی رونق رہتی تھی۔

گر سرم خاک رہت گردد و برباد رود
نیست ممکن کہ خیال رخت از یاد رود

چون سر زلف تو گردید پریشان دل من
یک سر مونکشادی گرہ از مشکل من

وفائی اصفہانی

کچھ عرصہ تک کشمیر میں رہا پھر لاہور آ کر زین خان کوکہ کے یہاں رہنے لگا۔

در دل نیم شبان کوب کہ چون روز شود
ہمہ در ہا بکشایند و درش بر بندند
قحط و فاست اینکہ نکویان روزگار
خوانی نہند و خون دل میہمان خورند

ہمدمی

یہ میرزا برخوردار خان عالم ولد ہمدم بیگ کا تخلص ہے جو ہمایوں بادشاہ کا مشہور امیر تھا۔ بہادری اور نیکی میں اس کی بہت شہرت رہی ہے۔ یہ اس کے اشعار ہیں:

دل من بین و ہر سو تازہ داغی از جنون دروی
محیط محنت است و ہر طرف گرداب خون دروی

ہجریؔ

یہ شیخ جامی کی اولاد میں سے ہیں۔ نہایت متقی اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ان کا ایک دیوان پانچ ہزار اشعار پر مشتمل ہے:

رباعی

ای گل کہ نمیرسد بدامان تو دست
بر نام تو عاشقیم و بر بوئی تو مست
این طرفہ کہ حاضری و غایب زمیان
پنہانی و ظاہر از تو ہر چیز کہ ہست

خوش است موسم ولی خاصہ در بہار شباب
گل نشاط اگر بشگفد ز جام شراب

ہاشم

محمد ہاشم کا ذکر بیرم خان خانان کے تذکرہ میں آچکا ہے۔ یہ مولانا شاہ محمد انسی کا بھتیجہ ہے۔ کبھی سمائیؔ اور کبھی دائیؔ تخلص کرتا تھا۔ آخر اسی تخلص پر وفات پائی۔ شعر گوئی کا بڑا اچھا ملکہ تھا:

قمری بباغ بیرچہ فریاد می کنی
گویاز سرو قامت او یادمی کنی
کنجشک وار بستۂ دام تو گشتہ ام
نی میکشی مرا و نہ آزادمی کنی

رباعی

ای زلف تو زنجیر دل شیدایم
شیدائی آن دو زلف عنبر سایم

گفتی کہ ہلاک شو بسودائی غم
عمر یست کہ من ہلاک این سودایم

ہم[102] بیان کر آئے ہیں کہ اس کی ایک غزل خان خانان بیرم خاں نے ایک لاکھ تنکہ میں خریدی تھی۔ اس غزل کا مطلع ہے:

من کیستم عنان دل از دست دادۂ
وز دست دل براہ غم از پا فتادۂ

اس کا انتقال لاہور میں 972ھ/1564ء میں ہوا۔

خاتمہ

یہ ان چند شاعروں کا تذکرہ تھا جن میں سے اکثر مؤلف کے ہم عصر ہیں اور ان کے اشعار و دیوان مشہور اور زبان زدِ عام ہیں۔

جن شاعروں کا ذکر اس انتخاب میں نہیں آیا ان کے تذکرہ کی ذمہ داری بعد میں آنے والوں پر ہے۔ کیونکہ یہ سلسلہ بہت طویل ہے اور کسی ایک زمانہ میں اس کا احاطہ کر لینا محال ہے

در بیستم جگر کرد روزی کباب　　　　که می گفت گویندۂ بار باب
بسا تیرودی ماہ و اردی بہشت　　　　بیاید کہ ما خاک باشیم و خشت
کسا نیکہ از ما غیب اندر اند　　　　بیایند وبر خاک ما بگذرند

میرے[103] اس سودائی قلم نے دیوانہ وار ہر آشنا اور بیگانے کے دامن کو تھامنے کی کوشش کی ہے اور اپنے جنون کے ہر قطرہ کو صفحہ قرطاس پر ثبت کر دیا۔ نہ معلوم میرے ساتھ بھی لوگ وہی سلوک کریں گے جو میں نے دوسروں کے ساتھ کیا۔

مرا تو عہد شکن خوا ندۂ و می ترسم
کہ باتو روز قیامت ہمین عتاب رود

لیکن مجھے[104] توقع ہے کہ نکتہ شناس اس بات کو نظر انداز نہیں کرینگے کہ میری یہ ساری آفرین اور نفرین شرح مبین کی حمایت اور دین متین کی طرفداری میں ہے۔ میرا حال اس شخص کے بالکل مشابہ ہے کہ ایک گنوار آدمی ایک محفل میں پہنچا وہاں دسترخوان بچھا ہوا

دیکھا تو بے ساختہ ٹوٹ پڑا او رکھانے لگا۔ سارے تھال اپنے سامنے سمیٹ کر رکھ لیے۔ کسی نے پوچھا: ''بابا تم کون ہو اور اس زیادتی کا کیا مطلب؟'' کہنے لگا: ''میں ترک ہوں اور داروغہ کا نوکر اور بھوکا ہوں'' اگر دوسروں کو بھی دینی خدمت کا درد اسی طرح دامن گیر ہو جائے اور وہ میرا احتساب کرنا چاہیں تو بسم اللہ، میں تو ان لوگوں پر فدا ہو جاؤں جو مجھے میرے عیوب سے آگاہ کردیں ورنہ وہ شرم سے اپنے گریبان میں اپنا منہ چھپالیں۔

اصل میں دیکھا جائے تو میرا یہ بلند پرواز تیز منقار قلم تو قیامت کے ''دابۃ الارض'' کی طرح ہے جو اس آخری زمانہ کے لوگوں کی پیشانی پر یہ مسلم وہ کافر کا نشان لگاتا گیا اور کسی کو رحمت سے کسی کو لعنت سے سرفراز کرتا رہا۔ حضور اکرم ﷺ نے بھی عرب کے مشرکوں اور قریش کے سرداروں پر لعنت بھیجی ہے۔ صاحب ''مرصا العباد'' نے 400 سال پہلے ہی بڑے درد سے کہا تھا:

شاہان جہان بجملگی بشتابید
تابوکہ بقیۂ ز دین در یابید
اسلام ز دست رفت پس بی خبرید
بگرفت جہان کفر وشما در خوابید

ارباب تصنیف و تالیف کی بدقسمتی ہے کہ وہ اپنی اچھی بری کاوشوں کو قلم بند کر کے اہل زمانہ پر بڑا احسان جتاتے ہیں اور کسی نہ کسی کے نام اپنی تصنیف کو منسوب کر کے اپنے اغراض و منافع کی راہ نکال لیتے ہیں۔ میں اس روایت کے خلاف کسی لالچ کے بغیر اپنے پیچھے آنے والوں کے لیے ایک تحفہ چھوڑ نا چاہتا ہوں تاکہ وہ لوگ جو ہمارے زمانہ کے حالات وحقائق کے طالب ہوں اس سے استفادہ کرسکیں:

اگر شراب خوری جرعۂ فشان بر خاک
ازان گناہ کہ نفعی رسد بغیر چہ باک

اس انتخاب کی ترتیب کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ اس زمانے میں احکام دین میں

جس طرح تغیر و تبدل کیا جارہا ہے اس کی ان ہزار سالوں میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ہر وہ املا وانشاء کرنے والا جو دو کلمے جوڑ لینے کی استطاعت رکھتا ہے۔ صاحبان اقتدار کی خوشامد یا دین سے ناواقفیت یا اصل حالات سے لاعلمی کے باعث باطل کو حق بنا کر پیش کرنے اور کفریات اور حشویات کو خیرات وحسنات جتلانے میں باک نہیں رکھتا۔

یقین ہے کہ مستقبل کے لوگ اگر ان باطل خرافات اور حشویات کو دیکھیں گے تو بڑے تذبذب اور تردد میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اس لیے میں ان معاملات سے بخوبی واقف بلکہ اس گورکھ دھندے میں مبتلا رہا ہوں، یہ ضروری سمجھا کہ اپنے مشاہدات اور روایات کو جو آنکھوں دیکھے حقایق ہیں ظن وتخمین کا نتیجہ نہیں، قلمبند کردوں:

شنیدہ کی بود مانند دیدہ

تاکہ میری سابقہ بیہودہ نگاری کا کفارہ ہوجائے اور اہل اسلام پر میری اس خدمت کا حق ثابت ہوجائے:

مگر صاحب دلی روزی برحمت
کند درکار این مسکین دعائی

مجھے اس کا بخوبی احساس ہے کہ یہ مسودہ ایک بیاض کی حیثیت رکھتا ہے جس میں چند معلومات درج کردی گئی ہیں۔ اس لیے اس پر تصنیف یا تالیف جیسے بھاری نام کو تھوپا نہیں جا سکتا۔ لاف وگزاف شرفا کی سیرت کے معارض ہے، مجھے تو اپنی نگارش پر شرم آرہی ہے۔ فخر ومباہات کا کیا موقع اور اگر میں بلند پروازی سے بھی کام لیتا تو کیا ہوتا؟ یہ کھوٹی اور بے قیمت متاع میرے دعوے کے جھٹلانے کے لیے کافی ہے:

روبہی گفت با شتر کہ عمو ... از کجا میرسی تو راست بگو
میر سم گفت اینکہ از حمام ... شستہ ام ز آب گرم و سرد اندام
گفت آری کہ شاید اینت ... بس بود دست و پای چرکنیت

مناجات

اب بس دعا اور مناجات کا موقع ہے اور بس :

ہرچہ بخشی بہ بندہ دینی بخشی
با رضای خودش قرینی بخشی

سراپا ز عصیان مرا پیش بین مبین جرم مارحمت خویش بین

نگہدار از من بہ روزگار زبر بہ کہ باشد مرا درد دار

خدای جہان را ہزاران سپاس
کہ گوہر سپردم بگوہر شناس

میرے[106] پیش نظر تھا کہ اس شیرازہ میں کشمیر کی تاریخ، سلاطین گجرات، بنگالہ اور سندھ کے حالات اور ہندستان کے عجائب وغرائب کا ذکر بھی شامل کر دیتا لیکن کہاں وہ تذکرے اور کہاں یہ مجموعہ؟ دونوں میں کوئی نسبت نہیں جیسے ''قالین میں ٹاٹ کا پیوند'' ریشم میں ریشم ہی کا بخیہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بروز جمعہ 23 ماہ جمادی الثانی 1004ھ/ 1595ء کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھ گیا اس پر اکتفا کرلیا۔ بطور تعمیہ یہ قطعۂ تاریخ کہا گیا ہے

شکر اللہ کہ با تمام رسید
منتخب از کرم ربانی
سال تاریخ ز دل جستم، گفت
انتخابی کہ ندارد ثانی

ترجمہ اردو:

خدا کا شکر ہے کہ یہ کام اپنے اختتام کو پہنچا۔ خدا کے کرم سے یہ انتخاب (منتخب) ہوا۔ جب میں نے اپنے دل سے اس کی سال تاریخ ڈھونڈی تو دل نے یہ کہا۔ یہ وہ انتخاب ہے کہ جس کی کوئی دوسری مثال نہیں۔

حواشی

1۔ میں، سے مراد یہاں صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
2۔ میں، ہم، میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
3۔ ہم سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی اور مہر علی سلدوزی ہیں۔
4۔ میں، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
5۔ مجھ، سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں
6۔ میں، یہ سب الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔
7۔ مجھ، ملا عبدالقادر کے لیے آیا ہے۔
8۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
9۔ میں، سے مراد مؤلف تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
10۔ میں سے مراد صاحب تصنیف منتخب التواریخ، ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
11۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔
12۔ میں، مجھے، میری، میں، ہم، مجھ، الفاظ ملا عبدالقادر بدایونی خود اپنے لیے استعمال کیے ہیں۔
13۔ کاکری کا موجودہ نام کاکوری ہے۔
14۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔
15۔ ولایتی سے مراد ایران و عرب کے طالب علم ہیں۔

16۔ ان کا ذکر ''نجات الرشید'' میں آیا ہے۔

17۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

18۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

19۔ والد مرحوم، یعنی ملا عبدالقادر بدایونی کے والد۔

20۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی۔

21۔ میں، میرا اور مجھے، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہے۔

22۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

23۔ میں دراصل اس غیبی آدمی کے لیے آیا ہے جس سے ملا عبدالقادر بدایونی نے کرتا خریدا تھا۔

24۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

25۔ میں، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہیں۔

26۔ میری، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

27۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

28۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

29۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

30۔ ہم سے مراد یہاں ملا عبدالقادر بدایونی اور مولانا عبداللہ قندھاری ہیں۔

31۔ میں، یعنی مؤلف منتخب التواریخ۔

32۔ میں یعنی ملا عبدالقادر بدایونی۔

33۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

34۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

35۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

36۔ سبھی میں ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

37۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

38۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

39۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی

40۔ میرا سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی صاحب تصنیف منتخب التواریخ ہیں۔

41۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

42۔ دریائے کودی متن میں آیا ہے اصلی نام دریائے گومتی ہے۔

43۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

44۔ میرے ساتھی سے مراد عبدالرحمٰن ہے۔

45۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

46۔ میری، سے مراد عبدالقادر بدایونی ہیں۔

47۔ میں اور میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

48۔ محاضرات یعنی یادداشت، سخن موافق حال، تذکرہ سلف، حکایات، تاریخ اور معلومات وغیرہ۔

49۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

50۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

51۔ میں اور مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

52۔ میں، سے مراد یہاں مخدوم الملک عبداللہ سلطانپوری ہے۔

53۔ میرا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

54۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں

55۔ میرا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

56۔ [illegible] والد سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی کے والد ہیں۔

57۔ ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

58۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

59۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

60۔ میرا، سے مفہوم ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

61۔ مجھ، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

62۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

63۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

64۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

65۔ مجھ، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

67۔ ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

68۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

69۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

70۔ یہاں میں وہی مکار شخص ہے جس نے قاضی صدرالدین سے کہا تھا کہ ہمیشہ خضر میرے ساتھ رہتے ہیں۔

71۔ میرا یعنی ملا عبد القادر بدایونی کا نام۔

72۔ مجھے یعنی ملا عبد القادر بدایونی کو۔

73۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

74۔ مجھ، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

75۔ مجھے یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

77۔ میں، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

78۔ مجھے، عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

79۔ میرا وطن، یعنی ملا عبد القادر بدایونی کا وطن۔

80۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

81۔ میں، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

82۔ میرا یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

83۔ ہم یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

84۔ مجھے یعنی ملا عبد القادر بدایونی۔

85۔ مجھے، ملا عبد القادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

86۔ میری، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

87۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

88۔ ہمارا، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

89۔ میں اور میری سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

90۔ بغرا: ایک طرح کی غذا ہے جس کو ہندستان میں بغرا خان نے ایجاد کیا تھا۔ آئین اکبری میں ملتا ہے کہ یہ ایک قسم کا پلاؤ ہے جو چنے کے میدے، سرکہ، چاول اور گوشت سے تیار کیا جاتا ہے۔

91۔ سراندیپ: موجودہ سری لنکا ہے۔

92۔ سیلون. پہلے یہ سراندیپ اور سیلون سری لنکا کے دو حصے تھے۔ بعد میں سری لنکا کو سیلون کے نام سے پکارا جانے لگا یعنی موجودہ نام سے قبل یہ ملک اس نام سے جانا جاتا تھا۔

93۔ ہم: صاحبِ تصنیف ملا عبدالقادر بدایونی کے کہنے کا مفہوم ہے کہ منتخب کے گزرے ابواب میں ان کا ذکر ہو چکا ہے۔

94۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

95۔ ہم، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

96۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

97۔ مجھے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

98۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

99۔ میں، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

100۔ میری، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

101۔ میں، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

102۔ ہم سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

103۔ میرے، سے مراد ملا عبدالقادر بدایونی ہیں۔

104۔ مجھے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

105۔ میرے، ملا عبدالقادر بدایونی کے لیے استعمال ہوا ہے۔